ضیاء النبی ﷺ
پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی - پاکستان

ضیاء النبی ﷺ
پیر محمد کرم شاہ الازہری
ضیاء القرآن پبلی کیشنز
گنج بخش روڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ضیاء النبی

جلد ہفتم

حدیث رسول ﷺ اور سیرت طیبہ پر مستشرقین کے
اعتراضات، الزامات اور ان کے جوابات

پیر محمد کرم شاہ الازہری

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
گنج بخش روڈ۔ لاہور

نام کتاب	ضیاء النبی ﷺ (جلد ہفتم)
مصنف	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
	علامہ عبدالرسول ارشد گولڈ میڈلسٹ
	فاضل دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
کتابت	کمپیوٹر کمپوزنگ، الفاروق کمپیوٹرز، لاہور
تعداد اشاعت	پانچ ہزار
تاریخ اشاعت	ذیقعد ۱۴۱۸ ہجری
ایڈیشن	اول
طابع	تخلیق مرکز پرنٹرز، لاہور۔ فون: ۷۲۴۵۵۵۷
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ گنج بخش روڈ، لاہور

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُونَ الضَّلٰلَةَ
وَيُرِيدُونَ أَنْ تَضِلُّوا السَّبِيلَ ۝
وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَآئِكُمْ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ

وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيرًا ۝

(سُورۃ النساء — ۴۵، ۴۴)

ترجمہ :

کیا نہیں دیکھا آپ نے اُن لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے ، وہ مول لے رہے ہیں گمراہی کو اور (یہ بھی) چاہتے ہیں کہ بھٹک جاؤ تم بھی راہ راست سے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے تمھارے دشمنوں کو اور کافی ہے (تمھارے لئے) اللہ حمایتی اور کافی ہے (تمھارے لئے) اللہ مددگار۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مُستشرقین اور

سُنتِ رسُول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم

مستشرقین اور سنت رسول اللہ ﷺ

ہم نے اس کتاب کے آغاز میں اس حقیقت کو کافی تفصیل سے بیان کر دیا ہے کہ مستشرقین کی تحقیقی کاوشوں کا سب سے بڑا مقصد اسلام کو ختم کرنا یا اسے کمزور کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہر حربہ استعمال کیا۔ میکاولی نے انہیں یہ سنہری اصول بھی سکھا دیا تھا کہ مقصد عظیم ہو تو اس کے حصول کے لئے ہر ذریعہ استعمال کرنا جائز ہے۔ میکاولی نے یہ اصول سیاستدانوں کے لئے تراشا تھا لیکن یورپ کے اصحاب قلم اور ارباب جبہ و دستار نے بھی اس اصول سے خوب استفادہ کیا۔

مستشرقین کے نزدیک اسلام کو ختم کرنا ایک عظیم مقصد تھا۔ ان کے راہبوں، قسیسوں، پادریوں اور ربیوں نے ان کے سامنے اس مقصد کی عظمت کو بڑے شاطرانہ انداز میں بیان کیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ ان کے پیش نظر اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے سے بڑا مقصد کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ مقصد جو مستشرقین کی نظروں میں اتنا عظیم تھا، اس کے حصول کے لئے انہوں نے جھوٹ، فریب، دھوکا اور بہتان تراشی کے کسی حیلے کو بھی کراہت کی نظر سے نہیں دیکھا۔

مستشرقین نے ملت اسلامیہ کی قوت کے سوتوں کا سراغ لگایا اور پھر ان سوتوں کو بند کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اسلام کی قوت کا پہلا منبع قرآن حکیم ہے انہوں نے اس منبع قوت پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ انہوں نے قرآن حکیم کے خلاف اپنے ترکش کا ہر تیر آزمایا لیکن ان کی ہر کوشش نے ان کی حسرتوں میں مزید اضافہ کیا۔ قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ پروردگار عالم نے خود لے رکھا تھا، اس لئے ہزاروں سالوں کی تخریبی کاوشوں کے باوجود مستشرقین اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور خود مستشرقین اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود قرآن حکیم میں کسی زبر یا زیر کی تبدیلی بھی نہیں آئی۔

قرآن حکیم کے خلاف مستشرقین کی سازشیں ابھی بند نہیں ہوئیں بلکہ جاری ہیں لیکن قرآن کے محاذ پر مسلسل شکستوں نے انہیں اسلام کے خلاف ایک نیا محاذ کھولنے پر

مجبور کر دیا۔ قرآن حکیم کی مخالفت کرتے ہوئے مستشرقین کو یہ مشکل پیش آئی کہ وہ قرآن حکیم کی من مانی تشریح نہیں کر سکتے تھے کیونکہ قرآن حکیم کی وہ تشریح جو حضور ﷺ نے خود کی تھی، وہ احادیث طیبہ کی شکل میں مسلمانوں کے پاس موجود تھی۔ تاریخ کے کسی دور میں جب کسی قسمت آزمانے قرآن حکیم کو اپنی مرضی کے معانی پہنانے کی کوشش کی تو ملت اسلامیہ کے علمائے ربانیین نے احادیث طیبہ کی مدد سے ان کا منہ توڑ جواب دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کی معنوی تحریف کی کوششیں ہمیشہ احادیث طیبہ کی مضبوط چٹان کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہوئیں۔

مستشرقین نے اسلام کے قصر رفیع کو منہدم کرنے کے لئے اسلامی ادب کا تفصیل سے مطالعہ کیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں کی قوت اور اسلام کی ابدیت کا راز کن چیزوں میں پوشیدہ ہے اور ان کی نظر اسلام کے ان پہلوؤں پر بھی تھی جن کو توڑ مروڑ کر وہ اسلام کے خلاف استعمال کر سکتے تھے۔ وہ حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے بھی آگاہ تھے:

تَرَکْتُ فِیکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِہِمَا کِتَابَ اللہِ وَسُنَّۃَ نَبِیِّہٖ (1)

"میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول اللہ ﷺ۔"

مستشرقین حضور ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں رکھتے تھے لیکن اپنے تجربات کی بنا پر وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ حضور ﷺ کی زبان پاک سے جو بات نکلتی ہے وہ حق ہوتی ہے اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ انہیں یقین تھا کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان ضرور سچ ثابت ہو گا کہ مسلمان جب تک قرآن وسنت کے ساتھ اپنے دامن کو وابستہ رکھیں گے اس وقت تک گمراہ نہیں ہوں گے، اسی لئے انہوں نے مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے والی ان دونوں چیزوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ قرآن حکیم کے بعد انہوں نے اسلام کے خلاف جو محاذ کھولا وہ احادیث طیبہ کا محاذ تھا۔

قرآن حکیم کے متعلق مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کے بیان میں یہ بتایا گیا ہے کہ

1۔ مالک بن انس، "موطا امام مالک" (فرید بکسٹال لاہور۔ 1983ء)، باب النہی عن القول بالقدر، صفحہ 753

مستشرقین قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے حضور علیہ السلام کا کلام سمجھتے ہیں اور یہی وہ واحد نقطہ ہے جس پر سارے مستشرقین الاماشاء اللہ، متفق ہیں۔

مستشرقین جب قرآن حکیم کو حضور علیہ السلام کا کلام کہتے تھے، تو وہ مجبور تھے کہ احادیث طیبہ کے متعلق کوئی اور مفروضہ تراشیں۔ یہ بات انہیں مناسب معلوم نہیں ہوتی تھی کہ قرآن حکیم اور احادیث طیبہ دونوں کو حضور علیہ السلام کا کلام قرار دیں۔ مستشرقین کے تخیل کی پرواز ویسے ہی بہت بلند ہوتی ہے، اس لئے انہوں نے احادیث طیبہ کے مصادر تلاش کرنے کے لئے بھی اپنے تخیل کے گھوڑے دوڑائے اور ایک نہیں بلکہ احادیث طیبہ کے کئی مصادر تلاش کر لئے۔

انہوں نے دعویٰ کیا کہ ابتدا میں مسلمانوں کے ہاں احادیث طیبہ کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ دوسری یا تیسری صدی ہجری میں، جب مسلمانوں کو نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑا اور ان میں باہم مذہبی اور سیاسی اختلافات نے زور پکڑا، تو انہوں نے اپنے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے خود احادیث تراشیں اور انہیں حضور علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔ مستشرقین یہ الزام صرف کسی گمراہ فرد یا فرقے پر نہیں لگاتے بلکہ ان کے اس الزام کی زد میں مسلم حکومتیں، فقہائے کرام اور محدثین عظام سب آتے ہیں۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ، امام زہری اور امام بخاری جیسی ہستیاں جن کی زندگیاں احادیث رسول علیہ السلام کی حفاظت اور خدمت کے لئے صرف ہوئیں، مستشرقین احادیث گھڑنے کا الزام لگاتے ہوئے ان کو بھی معاف نہیں کرتے۔

مستشرقین کی کتابوں کے عمیق مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مستشرق اسلام کے خلاف کوئی شوشہ چھوڑتا ہے تو دوسرے مستشرقین اس شوشے کو ہوا دینے کو ہی غیر جانبدارانہ اور معروضی تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ حدیث پاک کے متعلق جس مستشرق نے زیادہ شہرت حاصل کی ہے وہ مشہور یہودی مستشرق گولڈزیہر (Goldziher) ہے۔

"دائرہ معارف اسلامیہ" کا مقالہ نگار اس کے متعلق لکھتا ہے:

> "گولڈزیہر نے حدیث کے متعلق جو لکھا ہے، علم اس کا مرہون منت ہے۔ مستشرقین کی اسلامی تحقیقات پر جتنا اثر انداز گولڈزیہر ہوا ہے، اتنا اس کا کوئی دوسرا معاصر مستشرق نہیں ہوا۔" (1)

1۔ دکتور محمود حمدی زقزوق، "الاستشراق والخلفية الفكرية للصراع الحضاري"، (دار المنار قاہرہ 1989ء) صفحہ 122

فانملر (Pfannmueller) گولڈزیہر کی حدیث کے متعلق تحقیقات کا نچوڑ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

"گولڈزیہر احادیث نبوی کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے اپنی کتاب "دراسات محمدیہ" کے دوسرے حصے میں حدیث کے ارتقاء پر بڑی عمیق بحث کی ہے۔ حدیث کے متعلق اسے جو گہری معلومات اور بے مثال ملکہ حاصل تھا اس کی بنا پر اس نے حدیث کے داخلی اور خارجی ارتقاء پر ہر پہلو سے بحث کی ہے۔ حدیث کے موضوع پر مسلسل اور عمیق تحقیق نے اس کے دل میں حدیث کے متعلق شکوک پیدا کر دیئے اور احادیث پر اس کا اعتماد ختم ہو گیا...... بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ گولڈزیہر احادیث پاک کو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اسلام کے دینی، تاریخی اور اجتماعی ارتقاء کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ لہٰذا گولڈزیہر کے نقطہ نگاہ سے حدیث کو اسلام کے دور اول یعنی عہد طفولیت کی تاریخ کے لئے قابل اعتماد دستاویز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ حدیث ان کوششوں کا نتیجہ ہے جو اسلام کے دور عروج میں اسلام کے ارتقاء کے لئے کی گئیں۔ گولڈزیہر اس بات پر بڑے پرزور دلائل پیش کرتا ہے کہ اسلام متحارب قوتوں کے درمیان ارتقائی منازل طے کرتا ہوا منظم شکل میں رونما ہوا۔ وہ حدیث کے تدریجی ارتقاء کی بھی تصویر کشی کرتا ہے اور ناقابل تردید دلائل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ حدیث کس طرح اپنے زمانے کی روح کا عکس تھا اور کس طرح مختلف نسلوں نے احادیث کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کیا اور کس طرح اسلام کے مختلف گروہ اور فرقے اپنے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے موسس اسلام کا سہارا لیتے تھے اور کس طرح انہوں نے ایسی باتوں کو اپنے رسول (ﷺ) کی طرف منسوب کیا جو ان کے موقف کی حمایت کرتی تھیں۔" (1)

گولڈزیہر نے حدیث پاک کے متعلق جو زہر افشانیاں کی ہیں، ان کا خلاصہ ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق نے مصطفیٰ السباعی کے حوالے سے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"اس طرح اموی دور میں جب امویوں اور علمائے صالحین کے درمیان نزاع

1۔ دکتور محمود حمدی زقزوق، "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، (دار المنار قاہرہ 1989ء) صفحہ 123

نے شدت اختیار کی تو احادیث گھڑنے کا کام ہیبت ناک سرعت سے مکمل ہوا۔ فسق و ارتداد کا مقابلہ کرنے کے لئے علماء نے ایسی احادیث گھڑنی شروع کر دیں، جو اس مقصد میں ان کی مدد کر سکتی تھیں۔ اسی زمانے میں اموی حکومت نے بھی علماء کے مقابلے میں یہ کام شروع کر دیا۔ وہ خود بھی احادیث گھڑتی اور لوگوں کو بھی ایسی احادیث گھڑنے کی دعوت دیتی جو حکومتی نقطہ نظر کے موافق ہوں۔ حکومت نے بعض ایسے علماء کی پشت پناہی بھی کی جو احادیث گھڑنے میں حکومت کا ساتھ دیتے تھے۔ احادیث گھڑنے کا معاملہ سیاسی مسائل تک محدود نہ رہا بلکہ یہ آگے بڑھ کر دینی معاملات اور عبادات میں بھی داخل ہو گیا اور کسی شہر کے لوگ جن باتوں کو اپنے خیال کے مطابق نہیں سمجھتے تھے، ان کے خلاف حدیثیں گھڑ لیتے تھے۔ احادیث گھڑنے کا یہ کام دوسری صدی ہجری میں بھی جاری رہا۔" (1)

ڈاکٹر فواد گولڈ زیہر کی کوششوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"گولڈ زیہر نے اپنے ان خیالات کا اظہار اپنی کتاب "دراسات محمدیہ" میں کیا جو 1890ء میں جرمن زبان میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد حدیث پر تحقیق کے لئے یہ کتاب اہل مغرب کیلئے بنیادی دستاویز بن گئی۔ بیشتر مستشرقین اس کتاب کے حوالے سے اپنے نتائج فکر پیش کرتے رہے۔ پروفیسر شاخت (J. Schacht) نے فقہی احکام سے متعلق احادیث پر کام کیا، گلیوم (A.Guillaume) کی "ٹریڈیشنز آف اسلام" وجود میں آئی، جو گولڈ زیہر کی تحقیقات کا چربہ تھی۔ مارگولیتھ (Margoliouth) کے گولڈ زیہر کے افکار کی روشنی میں اپنے نظریات پیش کئے۔ علاوہ ازیں ھوروفتش، (J.Horowitz) ھورست (H.Hosrt)، فون کریمر (A.Von.Kremer)، مویر (W.Wuir) کیتانی (L.Caetani) اور نکلسن (A.R, Nicholoson) وغیرہ نے بھی اس میدان میں اپنے اپنے نتائج فکر بیان کئے ہیں، جو سارے کے سارے کم و بیش گولڈ زیہر ہی کے افکار کی صدائے بازگشت ہیں۔" (2)

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 124

2۔ ڈاکٹر فواد سزگین، "مقدمہ تاریخ تدوین حدیث"، مترجم سعید احمد (ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔ 1985)، صفحہ 18

ہم یہاں چند دیگر مستشرقین کی تحریروں کے اقتباسات نقل کرتے ہیں، جن سے قارئین کرام کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح مستشرقین حدیث کے متعلق اپنی نگارشات میں گولڈ زیہر کے خیالات کو دوہراتے ہیں۔

آرتھر جیفری (Arthor Jeffery) اپنی کتاب "Islam, Muhammad and his religion" میں لکھتا ہے:

"After the prophet's death, however, the growing community of his followers found that a great many problems of religion, and even more of community life, were arising for which there was no specific guidance in the Quran. Guidance was therefore sought in the Traditions, Hadith, as to what the prophet had said and done, or was reported to have said and done. This vast accumulation of genuine, partly genuine, and quite spurious traditions was presently digested into the collections of Hadith, six of which are considered to be the canonical collections. But as these canonical collections were primarily concerned with material of Juristic nature, it follows that much material of importance for the religion of Islam had do be drawn from the other, uncanonical collections. It was well known to Muslims that much of the hadith material was spurious. but for the study of Islam even those traditions which the community invented and attributed to Muhammad have their value, often as much value as those which may actually have come from him." (1)

"تاہم پیغمبر (ﷺ) کے انتقال کے بعد، ان کے پیروکاروں کی بڑھتی ہوئی جماعت نے محسوس کیا کہ مذہبی اور معاشرتی زندگی میں بے شمار ایسے مسائل ابھر رہے ہیں جن کے متعلق قرآن میں کوئی راہنمائی موجود نہیں، لہٰذا ایسے

1۔ آرتھر جیفری، "اسلام محمد اینڈ ہز ریلیجن"، (بابس میرل ایجوکیشنل پبلشنگ انڈیاناپولس۔1979ء)، صفحہ 12

مسائل کے متعلق راہنمائی حدیث میں تلاش کی گئی۔ احادیث سے مراد وہ چیزیں ہیں جو پیغمبر (ﷺ) نے اپنی زبان سے کہیں یا آپ ان پر عمل پیرا ہوئے یا وہ چیزیں جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ پیغمبر (ﷺ) کے اقوال یا افعال ہیں۔ صحیح، جزوی طور پر صحیح اور جعلی احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ حدیث کی کتابوں میں جمع کر دیا گیا۔ حدیث کے چھ مجموعوں کو مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ کتب صحاح میں زیادہ تر وہ حدیثیں تھیں جن کا تعلق فقہی مسائل سے تھا، اس لئے اکثر دیگر مذہبی اہمیت کے معاملات کے لئے غیر مستند مجموعوں کی احادیث پر اعتماد کرنا ضروری تھا۔ اس بات کا مسلمانوں کو اچھی طرح علم تھا کہ حدیث کا اکثر مواد جعلی ہے، لیکن اسلام کے مطالعہ کے لئے ان احادیث کی بھی اہمیت تھی جو مسلمانوں نے خود گھڑی تھیں اور انہیں محمد (ﷺ) کی طرف منسوب کر دیا بلکہ ایسی موضوع احادیث کو بعض اوقات ان احادیث جیسی اہمیت دی جاتی ہے جو سچ مچ پیغمبر (ﷺ) سے منقول ہیں۔"

آرتھر جیفری اپنی اس تحریر میں گولڈزیہر کی پیروی کرتے ہوئے، یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ حدیث کا حضور ﷺ کی حیات طیبہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ آپ کے انتقال کے بعد جب نئے مسائل پیش آئے تو مسلمانوں نے ان کا حل تلاش کرنے کے لئے حضور ﷺ کے افعال و اقوال کا سہارا لیا، احادیث گھڑ کر آپ کی طرف منسوب کیں اور موضوع احادیث کو بعض اوقات صحیح احادیث پر فوقیت بھی دی۔

ایچ۔ اے۔ آر۔ گب (H.A.R.Gibb) یہ تو تسلیم کر رہا ہے کہ مسلمانوں نے احادیث کو تلاش کیا جو حضور ﷺ سے مروی تھیں لیکن وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ احادیث طیبہ کو حجت شرعیہ کے طور پر بعد کے مسلمانوں نے استعمال کیا۔ یعنی حضور ﷺ کے زمانے میں اس بات کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی گئی۔ اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

> "Where such traditions were found to exist, it was held, the rulings they contained, explicitly or implicitly, were decisive and mandatory for all Muslims. The sunnah (Practice) of the Prophet obviously superseded all other sunnas, and still more any speculative

reasoning .This argument (elaborated by the jurist al-Shafi-i, d 820) was clearly unchallengeable that it was perforce accepted in principle by all the schools of law." (1)

"یہ فیصلہ کیا گیا کہ جہاں اس قسم کی احادیث موجود ہوں، ان سے جو احکام صراحتاً یا ضمناً مستنبط ہوں وہی فیصلہ کن ہوں گے اور تمام مسلمانوں کے لئے ان پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔ پیغمبر (ﷺ) کی سنت کو دیگر تمام سنتوں اور قیاسی فیصلوں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ احادیث کی حجیت کے تصور کی وضاحت امام شافعی نے ایسے مدلل اور لاجواب انداز میں کی تھی کہ تمام مکاتب فکر کو اسے مجبوراً تسلیم کرنا پڑا۔

ایچ۔ اے۔ آر۔ گب کی تحریر کو آغاز سے پڑھنے والا شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ احادیث طیبہ کے متعلق مثبت رویہ اختیار کر رہا ہے لیکن اس کے مذکورہ بالا جملوں نے اس حقیقت سے پردہ ہٹا دیا ہے کہ "گب" بھی اپنے دیگر مستشرق بھائیوں کا ہمنوا ہے اور وہ احادیث پر حملہ کرتے ہوئے قدرے مہذب انداز اختیار کرنے کی کوشش کر رہا ہے وگرنہ اس کا یہ کہنا کہ احادیث کی حجیت کو امت مسلمہ میں متعارف کرانے کا سہرا حضرت امام شافعی کے سر بندھتا ہے، اسلام کی بنیادیں کھودنے کے مترادف ہے۔

منٹگمری واٹ احادیث طیبہ کی اسناد کے متعلق ایک عجیب شوشہ چھوڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"The insistence on complete chains is to be associated with the teaching of ash-shafi-i, who was roughly a contemporary of al-WAqidi. Once it became fashionable to give complete isnads, scholars must have been tempted to extend their chains backwards to contemporaries of Muhammad. Even when thus added to the chains, however, their addtions may have been sound, since they probably knew in a general way where their predecessors had obtained information. This means only that we cannot rely so fully on the early links

---

1۔ گب، "اسلام" مشمولہ "دی انسائیکلوپیڈیا آف لونگ فیتھ" (ہچنسن کمپنی لندن۔ 1984)، صفحہ 171

of the chains as on the later ones".(1)

"احادیث کی مکمل اسناد بیان کرنے کو "الشافعی" کی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے جو تقریباً واقدی کے ہم عصر تھے۔ جب احادیث کی مکمل اسناد بیان کرنے کا رواج ہو گیا تو لازماً علماء کی یہ خواہش ہوتی ہو گی کہ وہ اپنی اسناد کو حضرت محمد (ﷺ) کے صحابہ تک پہنچائیں۔ خواہ انہیں اپنی اسناد میں (اپنی طرف سے) اضافہ کرنا پڑے۔ تاہم اس قسم کے اضافوں کو بھی قابل اعتبار سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ غالباً وہ عام طور پر جانتے تھے کہ ان کے پیشروؤں نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم جس طرح اسناد کی آخری کڑیوں پر اعتبار کر سکتے ہیں اس طرح ان کی ابتدائی کڑیوں پر اعتبار نہیں کر سکتے۔"

منٹگمری واٹ کا یہ شوشہ یا تو مسلمانوں کے اصول حدیث کے فن سے اس کی کلیۃ جہالت کا نتیجہ ہے اور یا پھر احادیث طیبہ کے قصر رفیع کی بنیادوں پر عمد اًکلہاڑا چلانے کی بہت بڑی سازش ہے۔ منٹگمری واٹ بظاہر یہ دعویٰ نہیں کر رہا کہ مسلمان احادیث گھڑتے تھے، بلکہ وہ شوشہ یہ چھوڑ رہا ہے کہ مسلمان احادیث طیبہ کی اسناد گھڑا کرتے تھے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ہاں اسناد ہی احادیث طیبہ کو قابل اعتبار بناتی ہیں اور جب اسناد مشکوک ہو جائیں گی تو احادیث طیبہ خود بخود پایہ اعتبار سے گر جائیں گی۔

ول ڈیوران (Will Durant) ان احادیث طیبہ کے متعلق جن میں حضور ﷺ کی کسی معجزانہ شان کا ذکر ہے، یہ تبصرہ کرتا ہے:

"Many of the traditions put a new color upon the moslem creed. Mohamad had not claimed the power of miracles, but hundreds of pretty traditions told of his wonder-working: how he fed a multitude from food hardly adequate for one man; exorcised demons; drew rain from heaven by one prayer, and stopped it by another; how he touched the udders of dry goats and they gave milk; how the sick were healed by contact with his clothes or his shorn hair. Christian influences

---

1۔ منٹگمری واٹ، "محمد ایٹ مدینہ"، (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی۔ 1981)، صفحہ 338

seem to have molded many of the traditions; love towards one's enemies was inculcated, though Mohammad had sterner views; the Lord's Prayer was adopted from the Gospels; the parables of the sower, the wedding guests, and the laborers in the vineyard were put into Mohammed's mouth; all in all, he was transformed into an excellent Christian, despite his nine wives". (1)

بہت ساری احادیث نے مذہب اسلام کو ایک نیا رنگ دے دیا ہے۔ محمد (ﷺ) نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ان کے پاس معجزات دکھانے کی قوت ہے، لیکن سینکڑوں حدیثیں ان کے معجزانہ کارناموں کا پتہ دیتی ہیں، کہ کس طرح انہوں نے اس کھانے سے ایک مجمع کو سیر کیا جو صرف ایک آدمی کے لئے بمشکل کافی تھا، اور کس طرح وہ جن نکالتے تھے، ایک دعا سے آسمانوں سے بارش اتارتے اور دوسری دعا کے ذریعے اسے روک دیتے، وہ ایک بے شیر بکری کی کھیری کو ہاتھ لگاتے اور وہ دودھ دینے لگتی، بیمار ان کے کپڑوں یا تراشیدہ بالوں کو چھو کر صحت یاب ہو جاتے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اکثر احادیث عیسائی تعلیمات کے زیر اثر تشکیل پذیر ہوئیں۔ دشمن کے ساتھ محبت کرنے کی تعلیم دی گئی حالانکہ محمد (ﷺ) کا موقف سخت تر تھا۔ خدا کے حضور دعا کا تصور بائبل سے لیا گیا۔ کاشتکار، شادی کے مہمانوں اور انگور کے کھیت کے مزدوروں کی (بائبل کی نقل میں) محمد (ﷺ) کی زبان سے ادا کروائی گئیں۔ مختصر یہ کہ نو بیویوں کے باوجود انہیں ایک بہترین عیسائی کے روپ میں پیش کیا گیا۔"

"ول ڈیوران" کا یہ اقتباس بتا رہا ہے کہ اس کی نظر میں وہ تمام احادیث جن میں حضور ﷺ کی کسی معجزانہ شان کا ذکر ہے یا وہ احادیث جن میں کوئی ایسی بات بیان کی گئی ہے جو عیسائیت کے ہاں بھی متعارف تھی، ایسی تمام احادیث بعد کے مسلمانوں نے خود گھڑ کر حضور ﷺ کی طرف منسوب کی ہیں۔

ہم نے سطور بالا میں احادیث طیبہ کے متعلق چند مستشرقین کی آرا نقل کی ہیں۔

1۔ ول ڈیوران "ایج آف فیتھ"، (نیویارک۔ 1950ء)، صفحہ 12-211

قارئین کرام نے غور فرمایا ہوگا کہ یہ تمام آرا "گولڈزیہر" کی آرا کا ہی چربہ ہیں، اور جن خطوط پر گولڈزیہر نے احادیث کے موضوع پر تحقیق کی تھی، ان تمام مستشرقین کی تحقیق کا انداز وہی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اصول حدیث اور تاریخ حدیث پر مسلمانوں کی بیشمار کتابیں دنیا کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ احادیث طیبہ کے متعلق مسلمانوں کا جو موقف ابتدا سے رہا ہے وہ ہر دور کی تصانیف میں درج ہے، لیکن مستشرق محققین نہ تو مسلمانوں کے موقف کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں اور نہ ہی حدیث کے متعلق مسلمانوں کے چودہ سوسالہ ادب کو کوئی اہمیت دیتے ہیں، بلکہ ان پر جب حدیث کے متعلق تحقیق کا بھوت سوار ہوتا ہے تو وہ گولڈزیہر اور اس کے نقالوں کی تصانیف کو ہی قابل اعتماد مصادر قرار دیتے ہیں۔

کیا مستشرقین تحقیق کا یہ انداز اسلام کے علاوہ کسی اور موضوع کی تحقیق کے دوران بھی اپنانے کو جائز سمجھتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کا قصور صرف یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے الہام (Inspiration) کی مدد سے لکھتا ہے، بلکہ اس کے مقابلے میں نہایت ایمان داری سے بتا دیتا ہے کہ اس نے یہ بات کس ذریعے سے حاصل کی ہے؟

مستشرقین کی اکثریت یہودیت اور عیسائیت کے مذاہب سے تعلق رکھتی ہے۔ گولڈزیہر بذات خود کٹر یہودی ہے۔ ان کے پاس اپنی مذہبی کتابوں کے متعلق یہ ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں کہ وہ کتابیں جن ہستیوں کی طرف منسوب ہیں، واقعی وہ انہی کی زبان یا قلم سے نکلی ہیں۔ انجیل کے مصنفین کے متعلق بھی عیسائیوں کو کچھ علم نہیں کہ وہ کون ہیں اور انہوں نے کن مصادر کی مدد سے یہ کتابیں لکھی ہیں۔ کتابوں کے مصنف بھی اپنے مصادر کے تذکرے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ صرف اس دعوے کے ساتھ ان کی کتابوں کو معتبر دستاویزات قرار دیا جاتا ہے کہ وہ لوگ ملہم (Inspired) تھے اور اسی الہام (Inspiration) کی مدد سے انہوں نے وہ کتابیں لکھی تھیں۔ عیسائی اپنی کتابوں کو صرف اسی دعوی کی وجہ سے قابل اعتبار تسلیم کر لیتے ہیں۔ وہ نہ یہ دیکھتے ہیں کہ لکھنے والوں کے پاس اپنی بات کا کوئی ثبوت بھی ہے یا نہیں اور نہ ہی وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کتابوں کے متن میں جو باتیں درج ہیں ان کو عقلاً تسلیم کرنا ممکن بھی ہے یا نہیں بلکہ وہ بائیبل کے

مصنفین کی ہر بات کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کی اسی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے کہ ایک کٹر یہودی "سینٹ پال" جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دنیوی زندگی میں آپ کا اور آپ کے مذہب کا دشمن رہا، آپکے رفع آسمانی کے بعد وہی مذہب عیسوی کا بانی بن بیٹھا اور عیسائیوں نے اس کی ہر مشرکانہ بات کو مذہب عیسوی کی بنیادی تعلیم سمجھ کر قبول کر لیا۔ ان کے مذہبی صحائف میں بے شمار باتیں ایسی ہیں جنہیں عقل سلیم تسلیم نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ ان کی تشریح اپنے عوام کے سامنے کر سکتے ہیں۔ وہ ایسی باتوں کو معمے (Mysteries) کہ کر اپنے مذہب کی صداقت کا بھرم رکھتے ہیں اور مسلمانوں سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے مذہبی صحف کی حفاظت اسی طرح کرتے جس طرح انہوں نے کی ہے۔

مسلمانوں نے واقعی اپنی مذہبی کتابوں اور دینی اقدار کی حفاظت کے لئے وہ طریقہ کار اختیار نہیں کیا جو یہودیت اور عیسائیت کا طرز امتیاز ہے بلکہ انہوں نے اس کام کے لئے وہ طریقہ کار اختیار کیا ہے جو نہ صرف انسانوں کے دلوں کو مطمئن کرتا ہے بلکہ جو شخص تعصب کی عینک اتار کر مسلمانوں کی ان کوششوں کو دیکھتا ہے جو انہوں نے قرآن و حدیث کی حفاظت کے لئے کی ہیں، وہ مسلمانوں کے خلوص، ہمت اور عبقریت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مستشرقین نے احادیث طیبہ کے خلاف جو زہر اگلا ہے، اس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ وہ کمزور اور موضوع روایات کی بنیادوں پر اپنی تحقیق کا محل تعمیر کرتے ہیں اور احادیث کی کتابوں میں موضوع روایات کی موجودگی کو اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ احادیث کا سارا سرمایہ مشکوک ہے کیونکہ اس سرمائے میں جب کچھ احادیث کا موضوع ہونا ثابت ہے تو پھر، ان کے خیال میں، اس بات کی کوئی دلیل باقی نہیں رہتی کہ دیگر احادیث بھی اسی طرح مشکوک نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث کی کتابوں میں موضوع احادیث کی موجودگی کوئی ایسی بات نہیں جس کے انکشاف کا سہرا مستشرقین کے سر بندھتا ہو بلکہ مسلمان ہر زمانے میں اس قسم کی حدیثوں سے آگاہ رہے ہیں اور امت مسلمہ کے علماء نے اپنے دینی بھائیوں کو ہمیشہ ایسی احادیث سے آگاہ اور خبردار کیا ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ مستشرقین کو ایسی احادیث کے موضوع ہونے کا پتہ ہی مسلمانوں کی خوشہ چینی سے چلا ہے۔ وگرنہ جو قوم بائیبل کے ہر

رطب ویابس کے کلام الٰہی ہونے پر یقین رکھتی ہے، اسے کیا خبر کہ صحیح حدیث کون سی ہے اور موضوع حدیث کون سی؟

مستشرقین تو اسلام کے دشمن ہیں اور ان کا کام ہی اسلام کے قصر رفیع کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا ہے، وہ اگر اسلام کے کسی شعار کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہیں تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن احادیث کے موضوع پر کئی مسلمان اہل قلم نے بھی وہی رویہ اپنایا ہے جس کی بنیاد مستشرقین نے رکھی تھی۔ مسلمانوں کی صفوں میں منکرین سنت کا ایک ٹولہ موجود ہے جو احادیث طیبہ کے خلاف وہی زبان استعمال کرتے ہیں جو زبان مستشرقین نے استعمال کی ہے۔ اس سانحے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ جب سے یورپ نے صنعتی میدان میں ترقی کی ہے، ان کی یونیورسٹیاں علم کا مرکز بنی ہیں اور ان کے مقابلے میں عالم اسلام علمی، صنعتی اور معاشی میدانوں میں تنزل کا شکار ہوا ہے، اس وقت سے مسلمانوں کا ایک طبقہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ طبقہ یورپ کی ہر چیز کو اپنی ہر چیز سے بہتر قرار دینے کا عادی ہو گیا ہے۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں بے شمار فرزندان اسلام نے تعلیم حاصل کی ہے اور کئی مغربی علماء اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اس لئے عالم اسلام میں مستشرقین کے شاگردوں کی ایک معقول تعداد آباد ہے، جو اسلام کا مطالعہ اسی نظر سے کرتے ہیں جس نظر سے مستشرقین اسلام کو دیکھتے ہیں۔ جو لوگ علم حدیث کو "گولڈ زیہر" کی کتابوں کی مدد سے سیکھنے کی کوشش کریں گے، ظاہر ہے ان کی نظروں میں احادیث طیبہ، امت مسلمہ کی تاریخ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا نتیجہ قرار پائیں گی، اور جس چیز نے حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے جنم لیا ہو اسے شریعت اسلامیہ کا ماخذ ثانی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کے شاگردوں نے احادیث طیبہ کے ثبوت، ان کی اہمیت اور ان کی حجیت سب کا انکار کر دیا ہے اور جن نفوس قدسیہ نے ہدایت کے اس نور کی حفاظت کیلئے اپنی زندگیاں وقف کی تھیں، انہوں نے ان کے کردار پر اتنے رکیک حملے کئے ہیں جو کوئی شریف انسان کسی دوسرے انسان کے خلاف نہیں کر سکتا۔

مستشرقین کا وار بڑا خطرناک تھا۔ انہوں نے احادیث طیبہ کے متعلق ایسا موقف اختیار کیا تھا کہ وہ کسی حدیث کو کسی بھی وقت مسترد کر سکتے تھے اور کسی حدیث کو ان کے

خلاف بطور ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر احادیث طیبہ کی اہمیت اور حجیت کا ثبوت صرف احادیث طیبہ اور تاریخ اسلام کی مدد سے پیش کرنا پڑتا تو مستشرقین اپنے مزعومات کے مطابق اسے بڑی آسانی سے رد کر سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ "بکل شی علیم" ہے۔ وہ اسلام کے خلاف اٹھنے والے ان سب فتنوں کو جانتا تھا، اس لئے اس نے احادیث طیبہ کی اہمیت اور حجیت کو قرآن حکیم کے ذریعے بیان کر دیا۔ قرآن حکیم کی بے شمار آیتیں احادیث طیبہ کی اہمیت کو ثابت کر رہی ہیں۔ مستشرقین کی ایک معقول تعداد اب یہ تسلیم کرتی ہے کہ آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں جو قرآن ہے یہ بعینہ وہ ہے جو حضور ﷺ نے اپنی امت کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس لئے وہ قرآن حکیم کی کسی آیت کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعد کے مسلمانوں نے خود گھڑی ہے۔ جب قرآن حکیم کی بے شمار آیات کریمہ احادیث طیبہ اور سنت رسول کی اہمیت کو بیان کر رہی ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دور رسالت کے مسلمانوں نے احادیث طیبہ کو کوئی اہمیت نہ دی ہو اور صدی، ڈیڑھ صدی بعد مسلمانوں کو مجبوراً احادیث کی طرف متوجہ ہونا پڑا ہو؟

ہم اپنے قارئین کے سامنے پہلے قرآن حکیم کی آیات کے ذریعے یہ ثابت کریں گے کہ (ا) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حضور ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔

(ب) مسلمان قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے احادیث طیبہ کے محتاج تھے اور قرآن حکیم نے یہ وضاحت کی تھی کہ حضور ﷺ کا کام صرف قرآن حکیم کو اپنی امت تک پہنچا دینا ہی نہیں بلکہ قرآن حکیم کی تشریح اور تبیین بھی حضور ﷺ کے فرائض نبوت میں شامل ہے۔

(ج) قرآن حکیم نے شریعت کے جو ضابطے بیان کئے ہیں، حضور ﷺ کی تشریح یا آپ کے عملی نمونے کے بغیر ان پر عمل کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

اور پھر یہ ثابت کریں گے کہ حضور ﷺ نے خود اپنی امت کو اپنی سنت پر محافظت کی تاکید فرمائی تھی اور ساتھ ہی ان لوگوں کیلئے ابدی نعمتوں کی بشارت سنائی تھی جو احادیث طیبہ کی حفاظت اور اشاعت کے لئے کوشش کریں گے اور ان لوگوں کے لئے غضب خداوندی کی خبر دی تھی جو ان باتوں کو غلط طور پر آپ کی طرف منسوب کریں گے جو آپ کی زبان پاک سے نہیں نکلی تھیں۔ اس کے بعد ہم امت مسلمہ کی ان مساعی کا خاکہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں گے جو اس نے احادیث رسول ﷺ کی حفاظت اور اشاعت

کے لئے کی تھیں۔

احادیث طیبہ کی اہمیت اور حجیت کے متعلق قرآنی آیات

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (1)

"(اے محبوب!) آپ فرمائیے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہ اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی اتباع کو محبت خدا کے دعوے کی واحد دلیل قرار دے رہا ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کو اپنی محبوبیت اور گناہوں کی بخشش کا مژدہ سنا رہا ہے جو حضور ﷺ کی اتباع کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کی اتباع جو محبت خدا کے لئے بھی ضروری ہے اور جو گناہوں کی بخشش کا ذریعہ بھی ہے، وہ حدیث رسول اور سنت رسول ﷺ کے بغیر ممکن ہی نہیں کیونکہ اتباع کا مفہوم ہے:

اَلْاِتِّبَاعُ فِي الْفِعْلِ هُوَ التَّأَسِّيْ بِعَيْنِهٖ وَالتَّأَسِّيْ اَنْ تَفْعَلَ مِثْلَ فِعْلِهٖ عَلٰى وَجْهِهٖ مِنْ اَجْلِهٖ (2)

"یعنی کسی کے فعل کے اتباع کا یہ معنی ہے کہ اس کے فعل کو اسی طرح کیا جائے جس طرح وہ کرتا ہے اور اس لئے کیا جائے کیونکہ وہ کرتا ہے۔"

اتباع کی اس تشریح سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ حضور ﷺ نے جو کام کئے ہیں، وہ اسی طرح کئے جائیں جس طرح آپ نے کئے اور اس لئے کئے جائیں کیونکہ آپ نے کئے۔ ہم مستشرقین اور ان کے شاگردوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن حکیم کے اس ارشاد پر احادیث طیبہ کی مدد کے بغیر عمل کرنا ممکن ہے؟ قطعاً نہیں۔ کیونکہ حضور ﷺ جو کام کرتے تھے اور جس طرح کرتے تھے اس کا پتہ ہمیں فقط احادیث طیبہ سے چلتا ہے اس لئے ہم قرآن حکیم کے اس ارشاد پر عمل کرنے اور اس ارشاد خداوندی میں جن انعامات کا ذکر

1۔ سورۂ آل عمران: 31

2۔ "ضیاء القرآن"، جلد 1، صفحہ 223

ہے ان کو حاصل کرنے کے لئے احادیث طیبہ کے محتاج ہیں۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (1)

"آپ فرمائیے اطاعت کرو اللہ کی اور (اس کے) رسول کی۔ پھر اگر وہ منہ پھیریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کفر کرنے والوں کو۔"

یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ حضور ﷺ کی اطاعت کا حکم دے رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے حکم پر تو ہم قرآن حکیم کی تعلیمات کو اپنا کر عمل کر سکتے ہیں لیکن حضور ﷺ کی اطاعت صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ آپ کے افعال، اقوال اور تقریرات (2) کی تفصیلات ہمارے سامنے ہوں۔ یہ تمام تفصیلات ہمیں احادیث طیبہ میں ہی میسر آتی ہیں اس لئے ہم قرآن حکیم کے اس حکم پر احادیث طیبہ کے بغیر عمل نہیں کر سکتے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (3)

"اور جو شخص فرمانبرداری کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی، داخل فرمائے گا اسے اللہ تعالیٰ باغوں میں بہتی ہوں گی جن کے نیچے نہریں۔ ہمیشہ رہیں گے وہ ان میں اور یہی ہے بڑی کامیابی۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حقیقت عظمیٰ سے آگاہ فرما رہا ہے کہ انسان کی اصل اور حقیقی کامیابی یہ ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو اور دنیا سے کوچ کرنے کے بعد وہ جنت کی ابدی بہاروں سے بہرہ ور ہو۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو بھی واضح فرما دیا ہے کہ اس کامیابی کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت چونکہ احادیث طیبہ کے بغیر ممکن نہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے، اپنی تاریخ کے کسی دور میں، احادیث طیبہ سے بے اعتنائی ممکن ہی نہ تھی۔

مستشرقین کی اکثریت زندگی کی مادی تشریح کی عادی ہے۔ ان کے لئے شاید یہ سمجھنا ممکن ہی نہیں کہ کس طرح مسلمان دنیوی زندگی کی نعمتوں سے بے نیاز ہو کر اخروی زندگی

1۔ سورۂ آل عمران: 32

2۔ ایسے کام جو حضور ﷺ کے سامنے کیے گئے اور آپ نے منع نہیں فرمایا۔

3۔ سورۃ النساء 13

کی کامیابی کیلئے کوشاں تھے۔ مسلمانوں نے کسی مادی مفاد کے بغیر اپنی جائدادیں، اپنا گھربار، اپنے عزیز واقارب اور اپنی اولاد، سب کچھ چھوڑ دیا اور جب کبھی وقت آیا تو جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی ان قربانیوں کو مستشرقین کی عقل تسلیم نہیں کرتی، اس لئے وہ مسلمانوں کی تاریخ کو خلاف عقل قرار دینے سے بھی باز نہیں آتے۔ وجہ یہ ہے کہ مستشرقین مسلمانوں کی ان بے مثال قربانیوں کی کوئی مادی توجیہ نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی ان قربانیوں کے پس منظر میں کوئی مادی مقصد تھا ہی نہیں۔ وہ تو یہ قربانیاں اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے دے رہے تھے جسے ان کے رب نے فوز عظیم قرار دیا تھا۔ جب مسلمانوں کی ساری قربانیاں اسی فوز عظیم کی خاطر تھیں تو پھر وہ اطاعت خدا اور اطاعت رسول کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے، جسے پروردگار عالم نے اس کامیابی کے لئے شرط اول قرار دیا تھا؟

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا تَنَٰجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَٰجَوْا۟ بِٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ وَمَعْصِيَتِ ٱلرَّسُولِ وَتَنَٰجَوْا۟ بِٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ٱلَّذِىٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (1)

"اے ایمان والو! جب تم خفیہ مشورہ کرو تو مت خفیہ مشورہ کرو گناہ، زیادتی اور رسول (کریم) کی نافرمانی کے متعلق بلکہ نیکی اور تقویٰ کے بارے میں مشورہ کیا کرو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کی (بارگاہ میں) تمہیں جمع کیا جائے گا۔"

اسلام مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے قومی امور باہم مشورہ سے طے کیا کریں لیکن یہ آیت کریمہ انہیں بتا رہی ہے کہ باہمی مشورہ کا یہ مطلب نہیں کہ جو ان کے جی میں آئے کرتے رہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ باہمی مشورہ سے کوئی فیصلہ کریں تو یہ فیصلہ گناہ، حدود سے تجاوز اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کے زمرے میں نہ آتا ہو۔ احکام خداوندی کی خلاف ورزی گناہ ہے۔ خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز عدوان ہے اور سنت رسول کی مخالفت معصیت الرسول ہے۔ مسلمانوں کی پارلیمانی تنظیموں اور مشاورتی اداروں کو یہ آیہ کریمہ حکم دے رہی ہے کہ خبردار قومی امور میں مشاورت کے وقت، وہ

1۔ سورۂ مجادلہ: 9

مادر پدر آزادی کا مظاہرہ نہ کریں۔ وہ قومی امور کے متعلق فیصلے کرتے وقت مغربی جمہوریت کی نقل نہ کریں جو کثرت رائے سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینے سے بھی باز نہیں آتی۔ یہ آیت کریمہ مسلمانوں کو متنبہ کر رہی ہے کہ تمہارا کوئی اجتماعی یا اکثریتی فیصلہ جو احکام خدا اور احکام رسول کے خلاف ہو گا وہ غلط ہو گا اور قیامت کے دن تمہیں اس کیلئے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ مسلمان، خصوصاً عہد صحابہ کے مسلمان اپنے معاملات ہمیشہ باہمی مشورہ سے طے کرتے رہے ہیں۔ ان کی مجلس مشاورت جب بھی منعقد ہوتی تھی یقیناً یہ آیت کریمہ ان کی نظروں کے سامنے ہوتی تھی اور انہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ایسا مشورہ جو حکم خدا اور حکم رسول کے خلاف ہو گا وہ خدا کی نافرمانی کے زمرے میں آئے گا۔ اگر احادیث طیبہ ان کے ہاں محفوظ نہ ہوتیں تو ان کیلئے یہ معلوم کرنا کیسے ممکن تھا کہ وہ جو مشورہ کر رہے ہیں، یہ فرمان رسول کے خلاف ہے یا نہیں؟ اس لئے اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ اگر مسلمانوں کے پاس ذخیرہ احادیث محفوظ نہ ہوتا تو وہ قرآن حکیم کی اس آیت طیبہ پر عمل پیرا نہ ہو سکتے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (1)

"جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے حتی کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے، اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم دے رہا ہے اور اہل کتاب پر جو فرد جرم عائد فرما رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور نہ وہ دین حق کے پیروکار ہیں۔ گویا مسلمانوں کو حکم ہے کہ جو

1۔ سورۃ التوبہ: 29

لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جن کو رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا ہے، وہ ان کے خلاف جنگ کریں۔ اگر مسلمانوں کے پاس احادیث طیبہ کا ذخیرہ موجود نہ ہو تو انہیں یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ حضور ﷺ نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے احادیث طیبہ کے بغیر مسلمانوں کے لئے قرآن حکیم کی اس آیت طیبہ پر عمل کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (1)

"اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں اس سے رک جاؤ۔"

یہ آیت کریمہ مسلمانوں کو حکم دے رہی ہے کہ امور حیات میں تمہیں حضور ﷺ جو کام کرنے کا حکم دیں اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دو اور جس کام سے روکیں اس کے نزدیک بھی نہ جاؤ۔ حضور ﷺ کے اوامر و نواہی کا علم احادیث طیبہ کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے مسلمان قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ پر عمل کرنے کے لئے بھی احادیث طیبہ کے محتاج ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (2)

"اے ایمان والو! آگے نہ بڑھا کرو اللہ اور اس کے رسول سے۔ اور ڈرتے رہا کرو اللہ تعالیٰ سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔"

علامہ ابن جریر لکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنے امام یا پیشوا کے ارشاد کے بغیر خود ہی امر و نہی کے نفاذ میں جلدی کرے تو عرب کہتے ہیں:

فُلَانٌ يُقَدِّمُ بَيْنَ يَدَيْ اِمَامِهٖ

"یعنی فلاں شخص اپنے امام کے آگے آگے چلتا ہے۔"

علامہ ابن کثیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس جملہ کی تفسیر ان الفاظ میں نقل کی ہے:

1۔ سورۃ الحشر: 7
2۔ سورۃ الحجرات: 1

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ لَا تَقُوْلُوْا خِلَافَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ

"کہ کتاب وسنت کی خلاف ورزی نہ کرو۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کے بعد کسی کو یہ حق ہی نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے رب کریم اور اس کے رسول مکرم کے ارشاد کے علی الرغم کوئی بات کہے یا کوئی کام کرے۔ جب انسان اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتا ہے تو وہ اس امر کا بھی اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ آج کے بعد اس کی خواہش، اس کی مرضی اور اس کی مصلحت خدا اور اس کے رسول کے ہر حکم پر بلا تامل قربان کر دی جائے گی۔ یہ ارشاد فقط اہل ایمان کی شخصی اور انفرادی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ قومی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی کو بھی محیط ہے۔ نہ کسی مقننہ کو حق پہنچتا ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنائے جو کتاب وسنت سے متصادم ہو اور نہ کسی عدالت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ احکام شرعی کے برعکس کوئی فیصلہ کرے۔(1)

یہ آیت کریمہ مسلمانوں کو حکم دے رہی ہے کہ زندگی میں کوئی کام کرنے سے پہلے یہ دیکھ لو کہ آیا خدا اور خدا کے رسول نے اس کام کی اجازت دی ہے یا نہیں۔ ہم مستشرقین سے مودبانہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ ذرا وضاحت فرمائیں کہ اگر مسلمان احادیث طیبہ کو نظر انداز کر دیں تو کیا وہ اس آیت کریمہ پر عمل کر سکتے ہیں جو ہر کام سے پہلے خدا اور خدا کے رسول کا حکم معلوم کرنے کی تعلیم دے رہی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (2)

"پس (اے مصطفےٰ!) تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ان کے درمیان پھر نہ پائیں اپنے نفسوں میں تنگی اس سے جو فیصلہ آپ نے کیا اور تسلیم کر لیں دل وجان سے۔"

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد 1، صفحہ 577

2۔ سورۃ النساء 65

اس آیت کریمہ کا حکم صرف عہد نبوی کے مسلمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے سب مسلمانوں کے لیئے ہے۔ یہ آیت کریمہ اعلان کر رہی ہے کہ جو لوگ اپنے امور حیات میں حضور ﷺ کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتے یا فرمان نبوت پر عمل کرتے ہوئے، ان کے دل تنگی محسوس کرتے ہیں، ان کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مومن کی ساری متاع حیات ہی ایمان ہے اور اسی قوت ایمانی کے سہارے وہ زندگی کی تمام سختیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔ جب اطاعت رسول کے بغیر ایمان ہی معتبر نہیں تو پھر ایک مسلمان اطاعت رسول کے بغیر دین کے باقی احکام پر کیسے عمل پیرا ہو سکتا ہے؟ حضور ﷺ کے فیصلوں کا علم ہمیں احادیث طیبہ سے ہوتا ہے اس لئے مسلمان کبھی احادیث طیبہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ احادیث طیبہ کے مطابق عمل ہی اس کے مومن ہونے کی نشانی ہے اور احادیث طیبہ پر عمل کے بغیر بارگاہ خداوندی میں اس کا ایمان ہی معتبر نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (1)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (مکرم) کی اور نہ ضائع کرو اپنے عملوں کو۔"

وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (2)

"اور اگر تم (سچے دل سے) اطاعت کرو گے اللہ اور اسکے رسول کی تو وہ ذرا کمی نہیں کرے گا تمہارے اعمال میں۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

مذکورہ بالا دو آیات میں سے پہلی آیت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دے رہی ہے اور ساتھ ہی تنبیہ کر رہی ہے کہ خبردار اگر تم نے اطاعت خدا اور اطاعت رسول میں کوتاہی کی تو اپنے اعمال کو ضائع کر بیٹھو گے۔ دوسری آیت یہ یقین دہانی کرا رہی ہے کہ جو بندہ خدا کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرے گا، اس

1۔ سورۂ محمد: 33

2۔ سورۃ الحجرات: 14

کو اس کے اعمال حسنہ کا اجر ضرور ملے گا۔ اس کے اعمال ضائع نہ ہوں گے۔

مستشرقین کو شاید اس حقیقت کا علم نہ ہو کہ کسی بھی مذہب کے پیروکار جب مذہب کے حلقے میں داخل ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اس مذہب کو نجات اخروی کا سبب سمجھتے ہیں۔ گو کوئی سچا مذہب دنیوی فوز و فلاح کو بھی نظر انداز نہیں کرتا، لیکن مذہب کی نظر میں دنیوی زندگی، چند روزہ زندگی ہوتی ہے اور حقیقی زندگی اخروی زندگی ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر مذہب اخروی زندگی کی فلاح و کامرانی کے لئے اپنے پیروکاروں کو اعمال صالحہ کی طرف بلاتا ہے۔ اسلام ایک سچا مذہب ہے اور وہ اپنے پیروکاروں کو اعمال صالحہ کا حکم دیتا ہے اور ساتھ ہی بتاتا ہے کہ اعمال صالحہ ہی قیامت کے روز ان کے کام آئیں گے۔ ایمان کے بعد مومن کی سب سے بڑی متاع اعمال صالحہ ہیں۔ یہ آیات ہمیں بتا رہی ہیں کہ اعمال صالحہ انہی لوگوں کے موثر اور کار آمد ہوں گے جن کی زندگیاں اطاعت خدا اور اطاعت رسول کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوں گی۔ اور جو لوگ اطاعت رسول کو چھوڑ کر صرف اطاعت خدا کو ہی کافی سمجھیں گے، ان کے دفتر عمل انہیں قیامت کے روز نیکیوں سے خالی نظر آئیں گے۔ وہ مسلمان جنہوں نے اپنی زندگیوں میں اعمال صالحہ کے سوا کوئی کمائی نہیں کی، مستشرقین کو ان سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ ایسا کام کریں گے جس سے ان کے اعمال صالحہ برباد ہو جائیں۔

چونکہ اطاعت رسول ہی مومن کے اعمال صالحہ کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہے، اس لئے مسلمان اطاعت رسول کے معاملے میں غفلت نہیں برت سکتے۔ اور اطاعت رسول کے لئے وہ احادیث طیبہ کے محتاج ہیں لہذا احادیث طیبہ ان کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہیں اور اس سرمائے کی حفاظت کے لئے ان کا ہر ممکن کوشش کرنا ایک قدرتی بات ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے قرآن حکیم کی چند ایسی آیات کریمہ درج کی ہیں جن میں پروردگار عالم نے مسلمانوں کو حضور ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور اطاعت رسول کو محبت خدا، اخروی فوز و فلاح اور ایمان و اعمال صالحہ کی حفاظت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے اطاعت رسول کے لئے ہم حضور ﷺ کے افعال و اقوال کے محتاج ہیں اور آپ کے افعال و اقوال اور تقریرات کا نام ہی حدیث ہے۔

قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیات پر تو احادیث طیبہ کی مدد کے بغیر عمل کرنے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن احادیث طیبہ کی اہمیت اور ضرورت صرف انہی آیات قرآنی پر عمل کرنے تک محدود نہیں جن میں براہِ راست حضور ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ بیشمار احکام قرآنی جو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نافذ کئے گئے ہیں، ان پر بھی حضور ﷺ کی عملی یا قولی راہنمائی کے بغیر عمل کرنا ممکن نہیں۔ ہم یہاں چند مثالیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، جن سے پتہ چلے گا کہ سنت رسول کو نظر انداز کر کے احکام قرآنی پر عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

(۱) قرآن حکیم نے بار بار اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فرما کر مسلمانوں کو نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ نماز اسلام کا دوسرا رکن ہے اور مسلمانوں کے ہاں احکام اسلامی میں اس کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن نماز کی وہ صورت جس پر آج ساری دنیا کے مسلمان عمل پیرا ہیں، اس کا قرآن حکیم میں کہیں ذکر نہیں۔ قرآن حکیم نے نہ تو اوقات صلوۃ کی وضاحت کی ہے، نہ نماز کی رکعتوں کی اور نہ دیگر تفصیلات کی۔ لغت کی کتابیں بھی لفظ "صلوۃ" کا وہ مفہوم نہیں بتاتیں جو آج مسلمانوں کے ہاں مروج ہے، بلکہ لغت کی کتابیں اس لفظ کا معنی ہمیں یہ بتاتی ہیں:

صَلَی اللَّحْمَ اِذَا شَوَاہُ اَوْ اَلْقَاہُ فِی النَّارِ لِلْاِحْرَاقِ (1)

"یعنی جس وقت گوشت بھونا جائے یا جلانے کے لئے آگ میں ڈالا جائے تو عرب کہتے ہیں صَلَی اللَّحْمَ"

اَلصَّلٰوۃُ مِنَ الصَّلْوَیْنِ: اَلْعِرْقَیْنِ فِی الظَّھْرِ (2)

"یعنی صلوٰۃ "صلوین" کا مفرد ہے۔ اور یہ ان دو رگوں کو کہتے ہیں جو پیٹھ میں ہوتی ہیں۔

قَالَ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ اللُّغَۃِ ھِیَ الدُّعَآءُ یُقَالُ صَلَّیْتُ لَہٗ اَیْ دَعَوْتُ لَہٗ وَفِی الْقُرْاٰنِ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (3)

یعنی اکثر اہل لغت کی رائے یہ ہے کہ اس کا معنی دعا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "صلیت لہ" میں نے اس کے لئے دعا کی اور قرآن حکیم میں ہے: اے محبوب! تیری دعا ان کے لئے باعث

1۔ پیر محمد کرم شاہ، "سنت خیر الانام علیہ الصلوۃ والسلام"، (ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور۔ 1977)، صفحہ 59، بحوالہ مفردات راغب

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

تسکین و طمانیت ہے۔

صلوٰۃ کے ان لغوی معانی میں سے کوئی معنی بھی اس حکم کی تفصیلات کو بیان نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ نے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے الفاظ میں اپنے حبیب ﷺ کے امتیوں کو دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ وہ اپنے بندوں کو کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جس کی مراد ان کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے حکم کی وضاحت نہ قرآن حکیم کی کوئی دوسری آیت کرتی ہے اور نہ ہی لغت۔ اس کے مفہوم کی وضاحت صرف سنت رسول کرتی ہے۔ حضور ﷺ نے خود اپنے غلاموں کے سامنے نماز پڑھی اور انہیں حکم دیا کہ جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو، تم بھی اسی طرح نماز پڑھا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم قرآن حکیم کے ذریعے دیا اور اس کا طریقہ اور دیگر تفصیلات اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ نے اپنی سنت کے ذریعے سکھائیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک سنت رسول شریعت کی دلیل نہ ہوتی تو نماز کی تمام تفصیلات قرآن حکیم میں مذکور ہوتیں۔ نماز جیسے عظیم رکن کی تفصیلات کا قرآن حکیم میں مذکور نہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کا ان تفصیلات کو سنت رسول پر چھوڑ دینا، اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے لئے جس طرح کتاب اللہ کے احکام کی پیروی ضروری ہے، اسی طرح ان کے لئے سنت رسول کے احکام کی پیروی بھی ضروری ہے کیونکہ ان دونوں کا باہمی تعلق اجمال و تفصیل اور مفسر و مفسّر کا ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی سنت رسول سے بے نیاز ہو کر قرآن کے احکام پر عمل کرنا ممکن ہے۔

(2) قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حج کا حکم دیا ہے لیکن اس حکم کی تفصیلات ہمیں سنت رسول ہی سے ملتی ہیں۔ قرآن حکیم فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً (1)

"اور اللہ کے لئے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی۔"

یہ آیت کریمہ یہ تو بتاتی ہے کہ حج ان لوگوں پر فرض ہے جو اس کی استطاعت رکھتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتی کہ حج ذی استطاعت مسلمانوں پر زندگی میں ایک بار فرض ہے یا ہر

1۔ سورۃ آل عمران: 97

سال۔ یہ حضور ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا فیض ہے کہ مسلمانوں کو یہ بتادیا گیا کہ زندگی میں ایک بار حج کر لینے سے اس حکم خداوندی کی تعمیل ہو جائے گی۔ اگر حضور ﷺ اس بات کی وضاحت نہ فرماتے تو آیت کے الفاظ سے مسلمان یہی مفہوم مراد لیتے کہ جب بھی حج کا موسم آئے، مسلمانوں پر حج فرض ہے۔ اس طرح یہ حکم مسلمانوں کیلئے مشقت کا باعث بنتا اور حج جیسی عظیم عبادت تشتت وافتراق کا شکار ہو جاتی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اگر سنت رسول کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے شرعی دلیل نہ بنایا ہوتا تو قرآن حکیم میں اس حکم کی وضاحت کر دی جاتی اور کوئی ابہام باقی ہی نہ رکھا جاتا۔

حج ہی کے متعلق قرآن حکیم یہ تو بتاتا ہے کہ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (1) کہ حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں لیکن یہ نہیں بتاتا کہ وہ مہینے کون سے ہیں اور ان کی کون سی تاریخوں میں ارکان حج ادا کرنے کا حکم ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم یہ تو بتاتا ہے کہ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ (2) کہ جب تم واپس آؤ عرفات سے۔" لیکن قرآن حکیم یہ نہیں بتاتا کہ عرفات سے کب لوٹنا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم یہ تو بتاتا ہے: "وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ" (3) اور طواف کریں ایسے گھر کا جو بہت قدیم ہے، لیکن قرآن حکیم یہ نہیں بتاتا کہ طواف میں خانہ کعبہ کے کتنے چکر لگانے ہیں اور اس کے آداب کیا ہیں۔

حج کی عبادت جس کے سارے ارکان امور تعبدی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں انسانی عقل و دانش کا فتویٰ نہیں چل سکتا، اس کی تفصیلات بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بیان نہیں فرمائیں بلکہ اپنے رسول مکرم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنے خداداد علم سے حج کے متعلق ان قرآنی احکام پر عمل کر کے اپنی امت کو دکھائیں اور ان کی تفصیلات ان کو سکھائیں تاکہ وہ اس طریقے سے حج کر سکیں جو منشائے خداوندی کے مطابق ہو۔

خدا کے کسی حکم پر عمل اسی صورت میں عبادت کی شکل اختیار کر سکتا ہے جب وہ منشائے خداوندی کے مطابق ہو۔ منشائے خداوندی کو اگر اللہ تعالیٰ خود اپنے کلام میں بیان نہ فرمائے تو عقل انسانی کی پرواز اتنی بلند نہیں کہ وہ خود منشائے خداوندی کا سراغ لگا سکے۔ نماز

1۔ سورۃ البقرہ: 197

2۔ ایضاً، 198

3۔ سورۃ الحج: 29

اور حج جیسی عبادات کے متعلق منشائے خداوندی بیان کرنے کا فریضہ پروردگار عالم نے اپنے حبیب ﷺ کو سونپا ہے۔ حدیث پاک کی اہمیت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن حکیم کو اپنے بندوں کے لئے حجت بنایا ہے، اسی طرح اس نے اپنے حبیب ﷺ کی سنت کو بھی ان کے لئے حجت بنایا ہے۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ جب قرآن حکیم کے اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہیں یا قرآن حکیم کے مشکل مقامات کی توضیح کرتے ہیں تو وہ بھی اپنی مرضی سے نہیں کرتے بلکہ یہ بھی آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کرتے ہیں کیونکہ قرآن حکیم نے آپ کے متعلق یہ وضاحت فرمادی ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۞ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۞(1)

"اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔ نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔"

گویا وحی جلی کے ذریعے جو احکام نازل ہوتے ہیں، وحی خفی کے ذریعے ان کی تفصیل اور تشریح بیان کردی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں پر کتابوں کے ساتھ حکمت بھی نازل فرماتا ہے

جو لوگ احادیث طیبہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں پر صرف کتاب نازل فرماتا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ پر بھی صرف قرآن حکیم نازل فرمایا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث طیبہ حضور ﷺ کے اپنے اجتہاد اور فکر کا نتیجہ ہیں اور ان کا مصدر وحی سے کوئی تعلق نہیں۔ ان مفروضات سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضور ﷺ کی تشریحات، آپ کے اپنے دور کے لئے موزوں ہوں تو ہوں وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ ان کے خیال میں جس طرح حضور ﷺ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن حکیم کی تشریح کی، اسی طرح ہر دور کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن حکیم کی تشریح کر سکتے ہیں۔

1۔ سورۃ النجم 4-3

جو لوگ ان خطوط پر سوچتے ہیں، انہوں نے نہ تو قرآن حکیم کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور نہ ہی وہ منصب رسالت کی حقیقت کو سمجھ سکے ہیں۔ قرآن حکیم کی بے شمار آیات کریمہ واضح الفاظ میں یہ اعلان کر رہی ہیں کہ سنت الٰہی یہ ہے کہ وہ جب کوئی رسول مبعوث فرماتا ہے تو اسے صرف کتاب ہی عطا نہیں فرماتا بلکہ کتاب کے ساتھ ساتھ اسے حکمت بھی عطا فرماتا ہے۔ ہمارے کرم فرما مستشرقین چونکہ احادیث کو کسی قسم کی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں، اس لئے ہم سر دست صرف قرآنی آیات کے حوالے سے ہی اپنے موقف کی وضاحت کر رہے ہیں۔ کتاب کے ساتھ حکمت کے منزل من اللہ ہونے پر بھی ہم قرآن حکیم کی آیات سے ہی استشہاد کریں گے۔

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ یہ محفل ارض و سما سجنے سے پہلے، پروردگار عالم نے اپنے انبیائے کرام کی روحوں سے ایک میثاق لیا تھا جس کی تفصیل قرآنی الفاظ میں یوں ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ (1)

"اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے یہ عہد لیا تھا کہ جس وقت میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو ان (کتابوں) کی جو تمہارے پاس ہیں تو تم ضرور ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور ضرور مدد کرنا اس کی۔ (اس کے بعد) فرمایا: کیا تم نے اقرار کر لیا اور اٹھا لیا تم نے اس پر میرا بھاری ذمہ؟ سب نے عرض کی: ہم نے اقرار کیا۔ (اللہ نے) فرمایا: تو گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔"

اس آیت کریمہ کے جس حصے پر ہمیں اپنے موضوع کے لحاظ سے غور کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انبیائے کرام سے فرما رہا ہے کہ جب وہ وقت آئے جب میں تمہیں کتاب اور حکمت عطا کروں اور پھر تمہارے پاس میرا حبیب تمہارا مصدق بن کر تشریف

1۔ سورۃ آل عمران: 81

لائے تو تم ضرور اس کی تصدیق بھی کرنا اور اس کی مدد بھی کرنا۔ یہاں اللہ تعالیٰ اپنے انبیائے کرام کو صرف کتاب عطا فرمانے کا ذکر نہیں فرمارہا بلکہ کتاب کے ساتھ حکمت عطا فرمانے کا ذکر بھی فرمارہا ہے۔ قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ منصب رسالت کے متعلق اس حقیقت کو واضح کررہی ہے کہ رسول جب مبعوث ہوتا ہے تو صرف کتاب لے کر ہی نہیں آتا بلکہ اس کتاب کی تعلیمات کے منشاء و مدعا کی وضاحت کے لئے اسے بارگاہ خداوندی سے حکمت بھی عطا ہوتی ہے۔

قرآن حکیم میں حضور ﷺ پر بھی کتاب کے ساتھ حکمت نازل ہونے کا بیان ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (1)

"اور اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور سکھادیا آپ کو جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر فضل عظیم ہے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ جہاں حضور ﷺ کو کتاب عطا فرمانے کا ذکر فرمارہا ہے، وہاں ساتھ ہی حکمت عطا فرمانے کا ذکر بھی فرمارہا ہے۔ قرآن حکیم ہمیں صرف یہ نہیں بتاتا کہ حکمت کتاب کے ساتھ نازل ہوتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کاشانہ نبوت میں کتاب کے ساتھ ساتھ حکمت کی تلاوت بھی ہوتی ہے۔ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ ازواج النبی ﷺ کو ارشاد فرمارہا ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ☆ (2)

"اور یاد رکھو اللہ کی آیتوں اور حکمت کی باتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا لطف فرمانے والا، ہر بات سے باخبر ہے۔"

حضور ﷺ پر کتاب کے ساتھ جو حکمت نازل ہوئی، وہی سنت رسول اور احادیث طیبہ

1۔ سورۃ النساء 113

2۔ سورۃ الاحزاب 34

کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ چونکہ یہ بھی "منزل من اللہ" ہے اس لئے علمائے ملت نے اس کو وحی خفی کا نام دیا ہے۔

ہم "سنت خیر الانام علیہ الصلوۃ والسلام" کے حوالے سے حکمت کا مفہوم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، جس کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی کہ واقعی رسالت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، ایک نبی کو کتاب کے ساتھ حکمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے جب انہیں کتاب عطا فرماتا ہے، تو ساتھ ہی حکمت بھی عطا فرماتا ہے۔

لفظ حکمت کے مفہوم کی تحقیق

اب دیکھنا یہ ہے کہ حکمت ہے کیا؟ اس کا لغوی مفہوم کیا ہے اور قرآنی اصطلاح میں اس کا کیا معنی ہے؟

حکمت کا مادہ ہے حَکَمَ اور حَکَمَ کا معنی ہے: مَنَعَ مَنعًا لِلْاِصْلَاحِ (مفردات راغب) کسی کی اصلاح کیلئے اس کو کسی امر سے باز رکھنا۔ اسی لئے لگام کو بھی حَکَمَۃٌ کہتے ہیں کیونکہ اس سے گھوڑے کو سرکشی سے باز رکھا جاتا ہے۔ ایک مصرع ہے۔

اَبَنِیْ حَنِیْفَةَ اَحْکِمُوْا سُفَهَآئَکُمْ

"اے بنی حنیفہ! (عرب کے ایک قبیلے کا نام) اپنے احمقوں کو شرارت سے روک لو۔"

اسی مناسبت سے حکمت کہتے ہیں: وَضْعُ الْاَشْیَآءِ فِیْ مَوَاضِعِهَا یعنی اشیا کو اپنے صحیح محل پر رکھنا اور ان کو غیر صحیح محل پر استعمال کرنے سے روکنا۔ صاحب تاج العروس نے مزید تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

اَلْحِکْمَةُ اَلْعَدْلُ فِی الْقَضَآءِ وَالْعِلْمُ بِحَقَائِقِ الْاَشْیَآءِ عَلٰی مَا هِیَ عَلَیْهِ وَالْعَمَلُ بِمُقْتَضَاهُ وَلِهٰذَا اِنْقَسَمَتْ اِلٰی عِلْمِیَةٍ وَّ عَمَلِیَةٍ (تاج العروس فصل الحاء من باب المیم)

یعنی کسی جھگڑے کا عادلانہ فیصلہ کرنے کو حکمت کہتے ہیں۔ کیونکہ مدعی اور مدعی علیہ کے متضاد بیانات سے حقیقت شکوک و شبہات کے پردہ میں پنہاں ہو جاتی ہے۔ اس پردہ کو ہٹا کر

حقیقت کو واشگاف کر دینا اور صاحب حق کو اس کا حق دلانا عدل ہے اور یہی حکمت ہے۔ اس کا دوسرا معنی اشیاء کی صحیح حقیقت کو جان لینا اور اس صحیح علم کے مطابق اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اسی لئے حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ حکمت علمی یعنی اشیاء کی ماہیت و حقیقت کا صحیح علم اور دوسری قسم حکمت عملی یعنی اس صحیح علم کے تقاضا کے مطابق اس پر عمل پیرا ہونا۔

حکمت کے اس مفہوم کو ذہن نشین کر کے جب آپ ان آیات قرآنی کا مطالعہ کریں گے جن میں کتاب کے ساتھ حکمت نازل ہونے کا ذکر ہے تو آپ فوراً اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ یہاں حکمت سے مراد حکمت کتاب ہے۔ یعنی کتاب (قرآن حکیم) میں جو اوامر و نواہی، جو احکامات و ارشادات، جو دروس و عبر اور جو پند و نصائح مذکور ہیں ان کی ماہیت و حقیقت کا صحیح علم اور ان پر صحیح عمل۔ یہ صحیح علم اور صحیح عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر رسول کو کتاب کے ساتھ عطا فرمایا جاتا ہے۔ اس طرح رحمت عالم ﷺ کو بھی اپنی کتاب کا علم و عمل اللہ تعالیٰ نے ہی مرحمت فرمایا اور یہی حضور ﷺ کا علم و عمل ہے جس کی تعبیر سنت سے کی جاتی ہے۔

اگر ان حضرات کو لفظ سنت سے بیر ہے اور اتباع سنت نبوی سے چڑ ہے تو وہ حکمت اور اتباع حکمت نبوی کے الفاظ استعمال کر لیں۔ بہر حال انہیں قرآن پر عمل کرنے کے لئے حضور ﷺ کے اقوال و اعمال پر عمل کرنا ہی پڑے گا اور طوعاً و کرھاً یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ سنت یا حکمت قرآن بمطابق آیات سابقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی اور قرین قیاس بھی یہی ہے کہ حکمت یعنی سنت، منزل من اللہ ہو کیونکہ اگر کتاب اللہ کے احکام کے مصداق و مدلول کا تعین عقل نسانی کے سپرد کر دیا جائے تو احکام الٰہی اہل خرد کی موشگافیوں کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور امت کی وحدت و یکجہتی جو اس کی زندگی کی کفیل اور بقا کی ضامن ہے، کسی ٹھوس اور مضبوط نظام حیات کی غیر موجودگی کے باعث تشتت و افتراق کی نذر ہو جائے گی۔ (1)

حکمت کے منزل من اللہ ہونے کی وضاحت خود حضور ﷺ نے اپنی احادیث طیبہ میں بھی فرمائی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَلَاۤ اِنِّیۡ اُوۡتِیۡتُ الۡکِتٰبَ وَمِثۡلَهٗ مَعَهٗ اَلَاۤ اِنِّیۡ اُوۡتِیۡتُ

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 58-56

الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ اَلَا يُوْشِكُ رَجُلٌ يَنْثَنِيْ شَبْعَانًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَقُوْلُ عَلَيْكُمْ بِالْقُرْاٰنِ فَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ (1)

"خبردار! مجھے کتاب اور اس کے ساتھ اس کی مثل (حکمت) عطا کی گئی ہے۔ خبردار! مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اس کی مثل عطا کی گئی ہے۔ خبردار! ایسا نہ ہو کہ ایک آدمی پیٹ بھر کر اپنی مسند پر جھومتے ہوئے یہ کہہ رہا ہو: تم قرآن حکیم کو لازم پکڑو، قرآن میں جس چیز کے حلال ہونے کا ذکر ہے اسے حلال سمجھو اور جس چیز کے حرام ہونے کا ذکر ہے اسے حرام سمجھو۔"

اس حدیث پاک میں حضور ﷺ وضاحت سے بیان فرما رہے ہیں کہ آپ کو اپنے پروردگار کی طرف سے صرف قرآن ہی نہیں بلکہ قرآن کی مثل ایک اور شے بھی عطا ہوئی ہے۔ یہ وہی شے ہے جسے خود قرآن حکیم حکمت کے نام سے یاد فرماتا ہے اور جو سنت رسول ﷺ کے نام سے متعارف ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نگاہ نبوت مستقبل میں اٹھنے والے انکار سنت کے فتنے کو دیکھ رہی ہے اور حضور ﷺ بروقت اپنی امت کو اس خوفناک فتنے سے آگاہ فرما رہے ہیں۔

حضور ﷺ کی ایک اور حدیث پاک اس مضمون کی مزید وضاحت کر رہی ہے:

عَنْ اَبِيْ رَافِعٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَاْتِيْهِ الْاَمْرُ مِنْ اَمْرِيْ مَا اَمَرْتُ بِهٖ اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُوْلُ لَا اَدْرِيْ مَا وَجَدْنَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اِتَّبَعْنَاهُ (2)

"حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ وہ اپنی

1۔ احمد محمد شاکر، مقدمہ نگار "مفتاح کنوز السنۃ عربی" (مصر۔ 1933ء)، صفحہ "د" بحوالہ مسند احمد و ابوداؤد

2۔ امام ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب "مشکوۃ المصابیح"، (فرید بکسٹال لاہور، 1986ء) باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جلد 1، صفحہ 55

مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو۔ اس کے پاس کوئی ایسا معاملہ آئے جس کے متعلق میں نے کوئی حکم دیا ہو یا کسی کام سے منع کیا ہو تو وہ کہے: ہم اس کو نہیں جانتے، ہمیں جو کچھ قرآن حکیم میں ملے گا ہم اس کی پیروی کریں گے۔ اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور البیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے۔"

مستشرقین تو اسلام کے دشمن ہیں، خدا اور خدا کے رسول کی مخالفت کو ہی انہوں نے اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے، وہ تو سنت رسول کا انکار کریں تو کوئی عجیب بات نہیں لیکن وہ ارباب جبہ و دستار جو اپنے آپ کو مسلمان، اہل قرآن اور ملت اسلامیہ کے بہی خواہ سمجھتے ہیں اور سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو نظر انداز کر کے صرف قرآن حکیم پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کارنامسعود میں اپنی پیروی کی ترغیب دیتے ہیں، وہ ذرا غور فرمائیں کہ حضور ﷺ مندرجہ بالا احادیث میں جس کام سے منع فرما رہے ہیں، کیا وہ بعینہ اسی کام کو کرنے پر بضد نہیں ہیں؟ اور جو لوگ اس گمراہی میں ان کے پیروکار بننے کیلئے تیار نہیں، کیا وہ ان کو اپنے فتووں بلکہ دشنام طرازیوں کا نشانہ نہیں بناتے؟

ممکن ہے یہ لوگ کہیں کہ یہ احادیث موضوع ہیں اور گھڑنے والوں نے ان کے نظریات کے خلاف گھڑی ہیں لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ جن لوگوں نے ان احادیث طیبہ کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، انہوں نے ان کے فتنے کے سر اٹھانے سے بہت پہلے یہ کتابیں مرتب کی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ یہ احادیث طیبہ کوئی ایسا مسئلہ بیان نہیں کر رہیں جو نیا ہو بلکہ یہ احادیث طیبہ وہی کچھ کہہ رہی ہیں جو خود قرآن حکیم کہتا ہے۔ اگر یہ احادیث طیبہ نہ بھی ہوں تو بھی یہ حضرات سنت رسول ﷺ کا انکار کر کے ان آیات قرآنی کا انکار کرتے ہیں جن میں قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ پر حکمت کے بھی نازل ہونے کا ذکر ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی پیغمبرانہ ذمہ داریاں

منکرین سنت اپنے مزعومات کا محل تعمیر کرنے سے پہلے یہ مفروضہ قائم کر لیتے ہیں کہ نبی کا کام صرف اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنی امت تک پہنچا دینا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ مفروضہ ہی

لوگ قائم کر سکتے ہیں جو نبوت ور سالت کی روح سے نا آشنا ہوں۔ نبوت ور سالت اس ربانی ادارے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی راہنمائی کے لئے قائم فرمایا ہے۔ دنیوی زندگی کا سفر انسانی زندگی کا کٹھن ترین مرحلہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر شیطان کے بچھائے ہوئے جال انسان کو پھانسنے کے لئے تیار ہیں۔ ذریت شیطان نے جادہ مستقیم کے ہر طرف گڑھے کھود رکھے ہیں۔ ہر قدم پر شیطان نے ایسے ایجنٹ مقرر کر رکھے ہیں جو صراط مستقیم کے مقابلے میں ان پگڈنڈیوں پر چلنے کی انسان کو ترغیب دیتے ہیں جن پر چلنے والے کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ خود انسان کی خواہشات نفسانی اسے انہی راستوں پر چلانے کی کوشش کرتی ہیں جن کو شیطان نے مزین کر رکھا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم ہے۔ جادۂ زیست کی انہی مشکلات کے پیش نظر اس نے نبوت و رسالت کا ادارہ قائم فرمایا ہے تاکہ اسکے بندے اس ادارے کی راہنمائی میں راستے کے ان تمام خطرات سے دامن بچاتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ سکیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ رسول اور نبی مبعوث فرماتا ہے۔ انہیں کتاب اور حکمت عطا فرماتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ کتاب وحکمت کی خداداد روشنی میں قافلہ امت کو منزل مقصود تک پہنچائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کتاب دی تھی۔ اگر ان کا کام صرف کتاب کو اپنی امت تک پہنچادینا ہوتا تو قصر فرعون میں ساحران فرعون کے ساتھ ان کی معرکہ آرائیں تاریخ کا حصہ نہ بنتیں۔ نہ وہ بنو اسرائیل کو مصر سے نکالنے کی کوشش کرتے، نہ فرعون کو ان کے تعاقب کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی خدا کی قدرت کی اس نشانی کا ظہور ہوتا جس میں سمندر کی موجیں قوم موسیٰ کے لئے رک گئی تھیں اور انہی موجوں نے فرعون کو اس کے لشکر کے ساتھ ہڑپ کر لیا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام صرف کتاب کا پہنچادینا ہوتا تو آپ کو قدم قدم پر اپنی قوم کو ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے سرزنش نہ کرنی پڑتی۔

اکثر انبیائے بنو اسرائیل اپنی امتوں کی طرف سے مظالم کا شکار ہوئے اور ان میں سے کتنے ہی اپنے فریضہ نبوت کی ادائیگی میں اپنی قوم کے ہاتھوں شہید بھی ہوئے۔ اگر انبیائے کرام کا مقصد صرف کتاب پہنچادینا ہوتا تو یہ سب کچھ ظہور پذیر نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرام کا فریضہ صرف کتابیں اپنی امتوں تک پہنچادینے تک محدود نہ تھا بلکہ ان کا فریضہ یہ تھا کہ وہ یہ الہامی کتابیں اپنی امتوں تک پہنچائیں، ان کتابوں کے احکام میں جو

منشائے خداوندی ہے اس کی وضاحت کریں، قوم وملت کو اس الہامی ہدایت کی روشنی میں صراط مستقیم پر چلائیں اور اپنے اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔

حضور ﷺ خاتم النبیین بھی ہیں اور سید المرسلین بھی۔ جب دیگر تمام انبیائے کرام کا مشن صرف کتاب کو اپنی امت تک پہنچا دینا نہ تھا تو ظاہر ہے حضور ﷺ کا فریضہ بھی صرف کتاب کو امت تک پہنچا دینے تک محدود نہ تھا۔ حضور ﷺ نے طائف کی گلیوں میں اپنا جسد اطہر لہولہان کرایا۔ منڈیوں اور میلوں میں جمع ہونے والے لوگوں کو حق کی طرف بلایا۔ مکہ جیسے مقدس شہر کو الوداع کہا۔ احد میں دندان مبارک شہید کرائے۔ آپ نے یہ سب کچھ اپنے فریضہ نبوت کی ادائیگی کی خاطر کیا۔ اگر آپ کا فریضہ صرف کتاب پہنچا دینا ہوتا تو یہ سب کچھ پیش نہ آتا۔ یہ تمام واقعات اس لئے پیش آئے کہ آپ قرآن حکیم کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کی دعوت بھی دیتے تھے۔ جو لوگ ان تعلیمات پر عمل کرتے تھے، آپ ان کو جنت کی ابدی بہاروں کی بشارتیں دیتے تھے اور جو بدنصیب اس دعوت سے منہ پھیرتے تھے، آپ ان کی حماقت کا اعلان فرماتے تھے۔ آپ نے بتوں کی بے کسی کو عیاں کیا۔ جو لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے انہیں عقل سے کام لینے کی تلقین کی۔ ان سے فرمایا: اپنے ہاتھوں سے بت تراش کر ان کے سامنے سربجود ہو جانا کہاں کی عقلمندی ہے؟ حضور ﷺ کی یہی کوششیں بت پرستوں کو چبھتی تھیں اور وہ آپ کو اور آپ کے پیروکاروں کو اذیتیں دینے کے لئے نت نئے طریقے ایجاد کرتے تھے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضور ﷺ کا کام صرف قرآن حکیم کو امت تک پہنچا دینا تھا، سو آپ نے اپنا یہ فریضہ ادا کر دیا، اب قرآن حکیم امت کے پاس محفوظ ہے، قرآن کا جو مفہوم امت کی سمجھ میں آئے وہ اس پر عمل کرے، اب حضور ﷺ کے ارشادات کی ضرورت نہیں، ایسے لوگ فریضہ نبوت کو سمجھے ہی نہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے فریضہ رسالت کو ابہام میں نہیں رکھا بلکہ قرآن حکیم کی بے شمار آیات حضور ﷺ کے فریضہ کی صاف الفاظ میں وضاحت کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے:

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (1)

"اور ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کیلئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تاکہ وہ غور و فکر کریں۔"

یہ آیت کریمہ بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان قرآن کا منصب حضور ﷺ کو سونپا ہے۔ قرآن حکیم کتاب ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی راہنمائی کے لئے نازل فرمائی ہے اور احادیث رسول ﷺ اس کتاب ہدایت کا بیان ہیں کیونکہ یہ اس ہستی کی زبان پاک سے نکلی ہیں جس کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے بیان قرآن کا فریضہ کیا ہے۔

حضور ﷺ کے اس دنیا پر تشریف لانے سے ہزاروں سال پہلے آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل میں جس رسول عظیم کے مبعوث ہونے کی دعا کی تھی، اس دعا میں آپ نے ان کاموں کا بھی ذکر کیا تھا جو کام وہ نبی اس دنیا میں آکر سرانجام دے گا۔ آپ نے عرض کی تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (2)

"اے ہمارے رب! بھیج ان میں ایک برگزیدہ رسول انہی میں سے تاکہ پڑھ کر سنائے انہیں تیری آیتیں اور سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی کی باتیں اور پاک صاف کر دے انہیں۔ بیشک تو ہی بہت زبردست اور حکمت والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ ان کی دعا کے مطابق ان کی نسل میں ایک عظیم رسول معبوث فرمایا اور وہی کام اس رسول کے سپرد کئے جن کی دعا حضرت خلیل علیہ السلام نے کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا

1۔ سورۃ النحل: 44

2۔ سورۃ البقرہ: 129

لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (1)

"جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے، پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے۔"

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (2)

"وہی (اللہ) ہے جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان (کے دلوں) کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

ایک اور آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کے فرائض نبوت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (3)

"وہ نبی حکم دیتا ہے انہیں نیکی کا اور روکتا ہے انہیں برائی سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان سے ان کا بوجھ اور (کاٹتا ہے) وہ زنجیریں جو جکڑے ہوئے تھیں انہیں۔"

1۔ سورۃ البقرہ 151

2۔ سورۃ الجمعہ 2

3۔ سورۃ الاعراف 157

مذکورہ بالا آیات قرآنی کی مدد سے فرائض نبوت کا چارٹ اس طرح مرتب ہوگا:

(ا) اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر لوگوں کو سنانا۔

(ب) اپنے پیروکاروں کو قرآن حکیم سکھانا، اس کے احکام کی وضاحت کرنا اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا طریقہ سکھانا۔

(ج) اپنے روحانی تصرف سے دلوں کے آئینوں کو جلا دینا تاکہ حقائق و معارف ان دلوں میں جلوہ گر ہو سکیں۔

(د) اپنے امتیوں کو ان علوم سے بہرہ ور کرنا جو ان کو حاصل نہیں۔

نوٹ:۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اس شق میں جس تعلیم کا ذکر ہے، وہ تعلیم کتاب و حکمت کے علاوہ ہے کیونکہ قرآن حکیم نے جہاں تعلیم کتاب و حکمت کے فریضہ نبوت کا ذکر کیا ہے وہاں وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔ یعنی کتاب و حکمت کی تعلیم کے علاوہ وہ تمہیں ایسی باتوں کی تعلیم بھی دیتے ہیں جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

"قاضی ثناء اللہ پانی پتی" اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> تَكْرَارُ الْفِعْلِ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ هٰذَا التَّعْلِيْمَ مِنْ جِنْسٍ اُخَرَ وَلَعَلَّ الْمُرَادَ بِهِ الْعِلْمُ اللَّدُنِّيُّ الْمَاخُوْذُ مِنْ بُطُوْنِ الْقُرْاٰنِ وَمِنْ مِشْكٰوةِ صَدْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِيْ لَا سَبِيْلَ اِلٰى دَرْكِهٖ اِلَّا الْاِنْعِكَاسُ
>
> "یعنی علم کا فعل دوبارہ ذکر کیا جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تعلیم پہلی تعلیم کتاب و حکمت سے الگ نوعیت کی ہے اور شاید اس سے مراد علم لدنی ہے جو قرآن کے باطن اور نبی مکرم ﷺ کے منور و روشن سینہ سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے حصول کا ذریعہ یہ مروجہ تعلیم و تعلم نہیں بلکہ انعکاس ہے۔ یعنی آفتاب قرآن کی کرنیں اور ماہتاب نبوت کی شعاعیں دل کے آئینہ پر منعکس ہوتی ہیں۔" (1)

(ہ) نیک کاموں کا حکم دینا۔

(و) برے کاموں سے روکنا۔

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد 1، صفحہ 106

(ز) پاک چیزوں کو امت کے لئے حلال قرار دینا۔

(ح) ناپاک چیزوں کو امت پر حرام قرار دینا۔

(ط) احکام کی سختی سے اپنی امت کو نجات دلانا۔

نبوت کی یہ گوناگوں ذمہ داریاں جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بیان فرمایا ہے، اگر ان میں سے رسول کی صرف ایک ذمہ داری یعنی تلاوت آیات کو تسلیم کیا جائے اور باقی تمام فرائض نبوت کا انکار کر دیا جائے، تو ماہتاب نبوت کی روپہلی کرنوں سے اپنے سینوں کو روشن کرنے کے سارے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔

حق یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے تمام فرائض نبوت کو کماحقہ پورا کیا۔ آپ نے قرآن حکیم کو پوری امانت و دیانت کے ساتھ اپنی امت تک پہنچایا، آپ نے اپنی امت کو قرآن حکیم کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا اور اسکے احکام پر عمل کرنے کا نہ صرف طریقہ بتایا بلکہ اپنے عمل سے اپنی امت کو ان احکام قرآنی کی تعمیل کیلئے نمونہ کمال مہیا فرمایا۔ آپ نے اپنے غلاموں کے دلوں کو یوں روشن اور پاک کیا کہ دنیا کی سب سے زیادہ اجڈ قوم آپ کے تزکیے کی برکت سے نسل انسانی کے لئے تہذیب و ثقافت کی معلم بن گئی۔ آپ نے اپنی امت کے لئے وہ بیش بہا علوم چھوڑے ہیں جن کو وہی نفوس قدسیہ سمجھ سکتے ہیں جو علم لدنی کے رمز آشنا ہیں۔ آپ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام پر نہ صرف عمل کیا بلکہ ان کاموں کو اپنی امت کا اجتماعی فرض قرار دیا۔ آپ نے بیشمار چیزوں کے حلال ہونے کا بھی اعلان فرمایا اور آپ نے بیشمار ایسی چیزوں کو حرام بھی قرار دیا جن کی حرمت کو قرآن حکیم نے بیان نہیں کیا تھا۔ آپ کی تشریف آوری سے اہل ایمان شریعت کی ان سختیوں سے بھی آزاد ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں پر لاگو تھیں۔

حضور ﷺ کی ان تمام کوششوں کا ریکارڈ ہمارے پاس احادیث طیبہ کی شکل میں موجود ہے، جس کی راہنمائی کی ہمیں قدم قدم پر ضرورت ہے اور احادیث طیبہ سے بے نیاز ہو کر ہم قرآن حکیم کے بے شمار احکام پر عمل کر ہی نہیں سکتے۔

مستشرقین کی تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کو نہ حدیث کی ضرورت پڑی اور نہ ہی انہوں نے حدیث کو کوئی اہمیت دی، مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ جب اسلام مختلف علاقوں میں پھیلا اور قانونی اور تمدنی زندگی میں نئے نئے تقاضے ابھرے تو مسلمانوں

نے نئے پیش آمدہ مسائل کا حل احادیث میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ تاریخ اسلام کی پہلی ڈیڑھ صدی کو حدیث کے روح پرور خزانے سے خالی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن گزشتہ صفحات میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں وہ مستشرقین کے اس مفروضے کو غلط ثابت کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تاریخ اسلام کے کسی دور میں بھی مسلمانوں کے لئے احادیث طیبہ سے بے نیاز رہنا ممکن نہ تھا۔ انہیں قدم قدم پر احادیث طیبہ کی ضرورت تھی اور وہ ہر دور میں احادیث طیبہ کو قرآن حکیم کے بعد علوم و معارف کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔

قرآن حکیم کے متعلق چونکہ مستشرقین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرون اولی کے مسلمانوں کے پاس وہ کتاب ہدایت کے طور پر موجود تھا، اس لئے ہم نے گزشتہ صفحات میں صرف آیات قرآنی کی مدد سے مندرجہ ذیل امور ثابت کئے ہیں:

1:۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی بے شمار آیات میں حضور ﷺ کی اطاعت اور اتباع کا حکم فرمایا ہے۔

2:۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ حکمت بھی عطا فرمائی ہے، اور حکمت عطا ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو احکام قرآنی کے اسرار و رموز اور ان احکام پر منشائے خداوندی کے مطابق عمل کرنے کا طریقہ سکھایا ہے۔

3:۔ حضور ﷺ کی سنت اسی حکمت کا دوسرا نام ہے۔

4:۔ حضور ﷺ کی سنت کی راہنمائی کے بغیر قرآن حکیم کے بے شمار احکام پر عمل نہیں ہو سکتا۔

5:۔ حضور ﷺ کی پیغمبرانہ ذمہ داری صرف قرآن حکیم کو اپنی امت تک پہنچا دینے تک محدود نہ تھی بلکہ آپ کی ذمہ داریاں مختلف اقسام کی تھیں اور حضور ﷺ کو یہ گوناگوں ذمہ داریاں سونپنے کا مقصد یہ تھا کہ امت آپ کی راہنمائی میں اور آپ کے عملی نمونے کی پیروی کرتے ہوئے قرآنی احکام پر منشائے خداوندی کے مطابق عمل کر سکے۔

ہم مستشرقین سے پوچھتے ہیں کہ:

کیا قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو ان تمام آیات قرآنی کا علم نہ تھا جن میں حضور ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے؟

کیاان مسلمانوں کو قرآن حکیم کو سمجھنے اور اس کے احکام پر منشائے خداوندی کے مطابق عمل کرنے کیلئے حضور ﷺ کی راہنمائی کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی؟

کیا انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ ان کا نبی صرف مبلغ کتاب ہی نہیں بلکہ معلم کتاب و حکمت بھی ہے؟

وہ چیزیں جن کی حرمت کا فیصلہ قرآن حکیم نے نہیں بلکہ حضور ﷺ نے کیا تھا، کیا قرون اولی کے مسلمان ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے تھے؟

بڑی عجیب بات ہے کہ مستشرقین اور ان کے ہمنوا دیگر اہل مغرب چودھویں صدی کے مسلمانوں کو تو بنیاد پرست سمجھتے ہیں اور قرون اولی کے مسلمانوں کے متعلق سمجھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی بے شمار آیات جو اطاعت رسول کا حکم دے رہی تھیں، ان آیات کی طرف ان کی توجہ ہی نہ تھی۔ اگر یہ سچ ہے کہ ہر زمانے کے مسلمان حضور ﷺ کی اطاعت کو فرض سمجھتے تھے، قرآن حکیم کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے حضور ﷺ کی راہنمائی کو ضروری سمجھتے تھے، وہ احکام قرآنی پر حضور ﷺ کے عملی نمونے کی روشنی میں عمل کرتے تھے، وہ حضور ﷺ کو معلم کتاب و حکمت اور مزکی قلوب سمجھتے تھے، تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ وہ جس طرح قرآن حکیم کو دین کا مصدر اول سمجھتے تھے، اسی طرح وہ سنت رسول اور احادیث طیبہ کو دین کا مصدر ثانی سمجھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی نظر ان آیات قرآنی پر بھی تھی جو ان خوش نصیب لوگوں کیلئے رحمت خداوندی کی وسعتوں کی بشارت دیتی ہیں جو حضور ﷺ کی اتباع کرتے ہیں۔ یقیناً ان کی نظروں سے قرآن حکیم کہ یہ آیت کریمہ او جھل نہ تھی:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ (1)

"میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر سو میں لکھوں گا اس کو ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ادا کرتے ہیں زکوۃ اور وہ ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس

1۔ سورۃ الاعراف 7-156

رسول کی جو نبی امی ہے جس (کے ذکر) کو وہ پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات میں اور انجیل میں۔"

اور یقیناً دور اول کے مسلمانوں کی نظر ان آیات پر بھی تھی جو منکرین سنت کے لئے ابدی حسرتوں کا اعلان کر رہی ہیں۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا (1)

"جس روز وہ منہ کے بل آگ میں پھینکے جائیں گے تو (بصد یاس) کہیں گے: اے کاش، ہم نے اطاعت کی ہوتی اللہ تعالیٰ کی اور ہم نے اطاعت کی ہوتی رسول اکرم کی۔"

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (2)

"اس روز تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور نافرمانی کی رسول کی کہ کاش، (انہیں دبا کر) ہموار کر دی جاتی ان پر زمین اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات۔"

کیا صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما جیسے مسلمان، جنہوں نے خدا اور رسول کی رضا اور آخرت کی ابدی نعمتوں پر دنیا کی ہر نعمت کو قربان کر دیا تھا، ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے ان آیات کریمہ پر غور نہیں کیا ہو گا جن میں اطاعت رسول پر ابدی نعمتوں کی نوید سنائی گئی ہے یا جن میں اطاعت رسول سے سرتابی کو ابدی حسرتوں کا باعث قرار دیا گیا ہے؟

یقیناً ان نفوس قدسیہ سے یہ توقع فضول ہے۔ وہ تو اپنے محبوب راہنما کے وضو کے پانی کے قطروں کو بھی زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے اور آپ کے تراشیدہ بالوں کو اپنے پاس بطور تبرک محفوظ رکھتے تھے۔ ان سے یہ توقع قطعاً نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے اپنے محبوب راہنما کے افعال و اقوال کی ضرورت محسوس نہیں کی ہو گی یا انہوں نے اس راہبر اعظم کے فرمودات اور نمونہ عمل کی حفاظت نہیں کی ہو گی جس کی حیات طیبہ کو رب قدوس نے ان کے لئے نمونہ قرار دیا تھا۔

1۔ سورۃ الاحزاب: 66

2۔ سورۃ النساء: 42

احادیث طیبہ کو کذب وافتراء سے محفوظ رکھنے کا اہتمام

مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کے بعد بڑے مشکل مراحل سے گزرنا پڑا۔ ہجرت کے ساتھ ہی ان کی کفار مکہ کے ساتھ جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ ہجرت سے لے کر فتح مکہ تک تقریباً آٹھ سال کا عرصہ مسلمان، کفار کے ساتھ حالت جنگ میں رہے۔ مسلمانوں کا دشمن صرف ایک نہ تھا بلکہ ان کے دشمن مدینہ طیبہ کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ خود مدینہ طیبہ کے اندر ایسے مارہائے آستین کی کمی نہ تھی جو کسی بھی وقت مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپ سکتے تھے۔ فطری طور پر ایسے حالات افواہوں کی گرم بازاری کے لئے بڑے موزوں ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی صفوں میں منافقین بھی تھے اور مخلص مسلمانوں سے بھی ایسی غلطی سرزد ہونے کا امکان تھا کہ وہ کوئی افواہ سنیں تو بغیر تحقیق اس کی تشہیر کر دیں اور اس سے امت کے لئے گوناگوں مسائل پیدا ہوں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس قسم کی افواہوں کی تشہیر سے منع فرمادیا اور انہیں حکم دیا:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (1)

"اور جب آتی ہے ان کے پاس کوئی بات اطمینان یا خوف کی تو چرچا کرنے لگتے ہیں اس کا۔ اور اگر لوٹا دیتے اسے رسول (کریم) کی طرف اور بااقتدار لوگوں کی طرف اپنی جماعت سے تو جان لیتے اس خبر (کی حقیقت) کو وہ لوگ جو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں بات کا ان میں سے۔ اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور (نہ ہوتی) اس کی رحمت تو ضرور تم اتباع کرنے لگتے شیطان کی سوائے چند آدمیوں کے۔"

یہ آیت کریمہ مسلمانوں کو حکم دے رہی ہے کہ جب وہ کوئی نئی بات سنیں تو اسے بارگاہ رسالت میں پیش کریں یا امت کے اصحاب علم و دانش اس بات کی تحقیق کر کے اس

1۔ سورۃ النساء: 83

کے متعلق مناسب لائحہ عمل تیار کریں۔ جب عام دنیوی اور سیاسی امور میں اس احتیاط کا حکم ہے تو حضور علیہ السلام کی احادیث طیبہ کے بارے میں اس قسم کی احتیاط کو کیوں مد نظر نہ رکھا جائے گا، جو دین اسلام کا مصدر ثانی ہے اور جس کے ہر قسم کے شکوک وشبہات سے پاک ہونے پر فہم قرآن کا دارومدار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بات کی تحقیق کا حکم ایک اور آیت کریمہ میں اس طرح دیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (1)

"اے ایمان والو! اگر لے آئے تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم ضرر پہنچاؤ کسی قوم کو بے علمی میں، پھر تم اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔"

قرآن حکیم کی یہ آیات مسلمانوں کو حکم دے رہی ہیں کہ جب ان کے پاس کوئی خبر پہنچے تو اس کے متعلق کاروائی کرنے سے پہلے تحقیق کریں اور یہ بھی دیکھ لیں کہ وہ خبر لانے والا کس قسم کا آدمی ہے۔ قرآن حکیم کے یہ ارشادات عام امور حیات سے متعلق ہیں۔ سیاسی اور معاشرتی زندگی میں غلط خبریں تباہی مچا دیتی ہیں اس لئے اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ کسی خبر کو سن کر جلدبازی سے کام نہ لیں بلکہ تحقیق کریں اور تحقیق کے بعد اقدام کریں۔

قوموں کے سیاسی اور معاشرتی امور بھی بڑے اہم ہوتے ہیں لیکن مذہب کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ جب عام امور کے متعلق مسلمانوں کو اتنی احتیاط کا حکم تھا تو وہ دین جو اللہ تعالیٰ کا آخری دین تھا اور جس نے قیامت تک ساری نسل انسانی کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا تھا، اس کے متعلق مسلمانوں سے معمولی سی غفلت یا بے اعتنائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر علیہ السلام کی وساطت سے قرآن وحدیث کی شکل میں جو احکام اور اخبار پہنچیں، ان کے متعلق انہوں نے دوہری احتیاط کا مظاہرہ کیا۔ ایک طرف تو یہ تحقیق کی کہ وہ بات حضور علیہ السلام کی زبان پاک سے نکلی ہے یا نہیں اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ بات واقعی حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمائی ہے تو پھر اس کی حفاظت کے لئے انہوں نے ہر ممکن طریقہ اور وسیلہ استعمال کیا۔ احتیاط کے اسی ماحول میں قرآن حکیم کو محفوظ کیا گیا اور

1۔ الحجرات: 6

احادیث طیبہ کی حفاظت کے لئے بھی انہی احکام خداوندی کو پیش نظر رکھا گیا۔

یہود و نصاریٰ نے اپنی الہامی کتابوں کو بازیچہ اطفال بنا رکھا تھا۔ وہ الہامی کتابوں میں جس چیز کو اپنی منشا کے خلاف پاتے، اسے چھپانے کی کوشش کرتے اور اپنی مرضی کی چیزوں کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر خدا کی طرف منسوب کر دیتے۔ قرآن حکیم نے بنو اسرائیل کے اس رویے کی شدید الفاظ میں مذمت کی ہے اور اپنے حبیب ﷺ کی امت کو بھی بڑے سخت الفاظ میں تنبیہ کی ہے کہ خبردار وہ یہود و نصاریٰ کے اس فعل شنیع کے قریب تک نہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ گھڑنے کے جرم کو بے ایمان لوگوں کا شیوہ قرار دیا۔ ارشاد خداوندی ہوا

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (1)

"وہی لوگ تراشا کرتے ہیں جھوٹ جو ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیات پر اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔"

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۗ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (2)

"اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان لگایا اللہ پر جھوٹا، یا جھٹلایا اس کی آیتوں کو۔ بے شک فلاح نہیں پائیں گے ظلم کرنے والے۔"

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۞ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (3)

"آپ فرمائیے: جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ (چند روزہ) لطف اندوزی ہے دنیا میں، پھر ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر ہم چکھائیں گے انہیں سخت عذاب بوجہ اس کے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے۔"

1۔ سورۃ النحل: 105

2۔ سورۃ الانعام: 21

3۔ سورۃ یونس: 69-70

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عبرت ناک انجام سے ڈرا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہیں اور جھوٹی باتوں کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کوئی بات خود گھڑ کر کہے کہ یہ خدا کا کلام ہے، تو یہ بھی افتراء علی اللہ ہے اور اگر کوئی شخص خود حدیث گھڑ کر حضور ﷺ کی طرف منسوب کرے تو یہ بھی افترا علی اللہ ہے کیونکہ حدیث رسول کلام خدا کا بیان اور اس کی تفصیل ہے۔ اور جس طرح قرآن حکیم خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اسی طرح حدیث بھی منزل من اللہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اعلان فرما دیا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (1)

"اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔ نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔"

حضور ﷺ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے والوں کے لئے مندرجہ بالا تنبیہات ہی کم نہ تھیں لیکن حضور ﷺ نے اس جرم کی شناعت کو اور زیادہ واضح کر دیا اور فرمایا:

اِنَّ كَذِبًا عَلَيَّ لَيْسَ كَكَذِبٍ عَلٰى اَحَدٍ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (2)

"مجھ پر جھوٹ گھڑنا ایسا نہیں جیسا کسی عام آدمی پر جھوٹ گھڑا جائے۔ جو آدمی جان بوجھ کر کسی غلط بات کو میری طرف منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔"

حضور ﷺ نے صرف اپنی طرف سے حدیث گھڑ کر اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب کرنے والے کو ہی جہنمی قرار نہیں دیا بلکہ ایسا شخص جو جانتے بوجھتے کسی جھوٹی حدیث کو روایت کرتا ہے، اسے بھی آپ نے جھوٹا قرار دیا ہے۔ فرمایا:

مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ بِحَدِيْثٍ يَرٰى اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ (3)

"جو میری طرف سے کسی ایسی حدیث کو روایت کرے جس کے بارے

1۔ سورۃ النجم: 3-4

2۔ دکتور محمد بن محمد ابو شھبہ، "الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر"، (مکتبۃ السنۃ قاہرہ۔ 1408)، صفحہ 16، بحوالہ بخاری و مسلم۔

3۔ ایضاً، صفحہ 17

میں اسے علم ہو کہ وہ جھوٹی ہے، وہ شخص بھی جھوٹوں میں سے ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک طرف تو یہ حکم دیا کہ وہ کسی کی بات کو سن کر فوراً یقین نہ کر لیں بلکہ اس کی تحقیق کریں اور ساتھ ہی مسلمانوں کو بڑے سخت الفاظ میں خدا اور رسول کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے کی ممانعت فرمائی۔ یہ تمام تنبیہات قرآن اور حدیث کو ہر قسم کے التباس سے محفوظ رکھنے کا اہتمام ہیں۔ قرون اولیٰ کے مسلمان، جن کی قربانیوں کی کوئی مادی توجیہ ممکن نہیں، انہوں نے یہ ساری قربانیاں خدا اور خدا کے رسول کی رضا کی خاطر دی تھیں۔ وہ نفوس قدسیہ جنہوں نے خدا اور خدا کے رسول کو راضی رکھنے کیلئے دنیا کی ہر مرغوب شے کو ٹھکرا دیا تھا، ان سے یہ توقع رکھنا غلط ہے کہ انہوں نے کسی دنیوی فائدے یا کسی دنیوی خواہش کی تکمیل کے لئے ایسے کام کئے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنتے۔

شمع اسلام کو بجھانے کی کوششیں کرنے والوں کی بھی ہر دور میں کثرت رہی ہے اور ہم اس بات کا بھی انکار نہیں کرتے کہ خود مسلمانوں کی صفوں میں بھی ایسی کالی بھیڑیں ہر دور میں موجود رہی ہیں جنہوں نے مار آستین بن کر اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن اس حقیقت میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ جہاں اسلام کے دشمن ہر دور میں اپنی کاروائیوں میں مصروف رہے ہیں وہاں اسلام کے قصر رفیع کے چوکیدار بھی ہمیشہ ہوشیار رہے ہیں۔ احادیث پاک کا بیش بہا سرمایہ ہمارے پاس انہی لوگوں کی مسلسل کاوشوں سے پہنچا ہے، جن کے دلوں میں دین اسلام کی اشاعت کا جذبہ اپنے پورے جوبن پر تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین اس قافلہ عشق کے سرخیل ہیں اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے اس فریضے کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کہ دشمنان اسلام نے سنت رسول کے چشمہ صافی کو گدلا کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے ایسی باتوں کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کرنے کی کوشش بھی کی جو آپ نے نہ فرمائی تھیں، لیکن صورت حال یہ نہ تھی کہ ایسے کم بختوں کی مذموم کاروائیوں کو کسی نے روکا نہ ہو۔ حدیث گھڑنے والے گھڑتے رہے، لیکن وہ لوگ جن کی نظریں قرآن حکیم کی ان آیات پر تھیں جو کسی خبر پر یقین کرنے سے پہلے تحقیق کرنے کا سبق دیتی ہیں، یا جو افتراء علی اللہ کو ظلم عظیم قرار دیتی ہیں اور جن لوگوں کی نظریں

حضور علیہ السلام کی اس حدیث پاک پر تھیں جو جھوٹی حدیث گھڑنے والوں کو دوزخ کا ٹھکانا دکھا رہی ہے، ایسے لوگوں نے کبھی ان لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقعہ نہیں دیا جو احادیث طیبہ کے چشمہ صافی کو گدلا کرنا چاہتے تھے۔

قرآن حکیم نے انہیں فاسق کی خبر کے متعلق محتاط رہنے کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے اس ارشاد خداوندی کی تعمیل اس خوب صورت طریقے سے کی کہ لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کے شب و روز، ان کے اخلاق و کردار اور ان کے انداز زیست کا ریکارڈ اسماء الرجال کی شکل میں جمع کر دیا اور ہر خبر کے مخبروں کے سلسلے کا کھوج لگایا تاکہ یہ پتہ چلایا جا سکے کہ کسی خبر کے مخبروں کے سلسلے میں کسی فاسق کا نام تو نہیں آتا۔

احادیث طیبہ کو ہر قسم کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے جو اہتمامات کئے گئے، ان کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں کہ کسی شخص نے کوئی غلط بات حضور علیہ السلام کی طرف منسوب کرنے کی جسارت کی ہو اور امت اس شخص کی اس شرارت پر آگاہ نہ ہوئی ہو۔

مستشرقین جو مسلمانوں کی تصنیفات میں موضوع روایات کی موجودگی کو تمام ذخیرہ احادیث کے غیر معتبر ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں، وہ ان کوششوں کو دیکھتے ہی نہیں جو احادیث طیبہ کو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک رکھنے کے لئے کی گئی ہیں۔ اسلامی کتابوں میں احادیث موضوعہ کی موجودگی کوئی ایسی بات نہیں جس کا پتہ دنیا کو مستشرقین کی تحقیق سے چلا ہو بلکہ مستشرقین کو تو اس بات کا علم مسلمان علماء کی تحریروں سے ہی ہوا ہے کہ مسلمانوں کے علمی اور ادبی سرمائے میں احادیث موضوعہ موجود ہیں۔ مسلمانوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ کون سی حدیث موضوع ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کون سی حدیث کی نسبت حضور علیہ السلام کی طرف یقین سے ثابت نہیں اور ان کے علمی سرمائے میں بے شمار ایسی حدیثیں بھی ہیں جن کی حضور علیہ السلام کی طرف نسبت یقینی ہے اور اس نسبت کے انکار کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی یہ کوئی مجبوری نہیں کہ فرزندان عیسائیت کی تقلید کریں جو یا تو بائیبل کی ہر الٹی سیدھی بات کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں اور یا اس میں کچھ یقینی طور پر غلط باتوں کی موجودگی کو دلیل بنا کر ساری بائیبل کو مسترد کر دیتے ہیں، بلکہ مسلمانوں نے حق اور باطل، سچ اور جھوٹ میں تمیز کا ایک مکمل سسٹم تیار کر رکھا ہے، جو ملت مسلمہ کا خاصہ ہے۔ اس سسٹم کی مدد سے وہ ہر خبر کو پرکھتے ہیں۔ اگر وہ

عقل اور نقل کے کڑے معیار پر پوری اترتی ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں اور اگر اس معیار پر پوری نہیں اترتی تو اسے مسترد کر دیتے ہیں۔

مستشرقین کو اگر تعصب کے مرض نے اندھا نہ کر دیا ہوتا تو وہ اپنی علمیت اور بے لاگ تحقیق کا بھرم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو ان بے مثال مساعی پر داد دیتے جو انہوں نے احادیث طیبہ کو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک رکھنے کیلئے کی ہیں۔ لیکن اگر تعصب انہیں نصف النہار پر چمکتے ہوئے سورج کو تاریک کہنے پر مجبور کرے تو وہ لاعلاج مریض ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی انہیں ہدایت دے کر انسانیت کو ان کی ابلیسی کارروائیوں کے شر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

اشاعت حدیث کا اہتمام

مستشرقین ہمیں بتاتے ہیں کہ مسلمان دوسری یا تیسری صدی ہجری میں احادیث طیبہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سے پہلے نہ انہیں احادیث کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ انہوں نے ان کی طرف توجہ دی۔ مستشرقین کی اس تحقیق کے برعکس ہمیں قرآن حکیم میں ایسی آیات ملتی ہیں جو اشاعت حدیث کا تقاضا کرتی ہیں۔ ہمیں حضور ﷺ کی متعدد ایسی احادیث ملتی ہیں جن میں آپ اپنی امت کو اشاعت احادیث کی ترغیب دیتے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل ہمیں بتاتا ہے کہ انہوں نے احادیث طیبہ کی حفاظت اور اشاعت کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ ان حالات میں ہمارے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آنکھیں بند کر کے مستشرقین کے نتائج فکر کو تسلیم کر لیں اور ان کے مقابلے میں آیات قرآنی، احادیث نبوی اور معمولات صحابہ کو نظر انداز کر دیں۔

وہ تمام آیات قرآنی جو اطاعت رسول کا حکم دیتی ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ حضور ﷺ کی سنت کو عام کیا جائے تاکہ امت اطاعت رسول کے قرآنی حکم پر عمل کر سکے۔ اسلامی عبادات اور دیگر احکام کا تقاضا ہے کہ منشائے خداوندی کے مطابق ان احکام پر عمل کرنے کے لئے سنت نبوی کو عام کیا جائے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ☆ (1)

1۔ سورۃ التوبہ 122

"اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے۔ تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلہ سے چند آدمی تاکہ تفقہ حاصل کریں دین میں اور ڈرائیں اپنی قوم کو جب لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ نافرمانیوں سے بچیں۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کو حکم دے رہا ہے کہ اس کے ہر طبقے کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت تیار کرے جو دین کی سمجھ حاصل کرنے کے لئے مراکز علم و معرفت کی طرف جائیں اور علوم و معارف کے زیور سے آراستہ ہو کر جب اپنے علاقے میں واپس آئیں تو اپنے حاصل کردہ علوم کی مدد سے لوگوں کو غلط کاموں سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں وضاحت کی ہے کہ قرآن حکیم کے منشاء و مراد کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے طریقے کی سمجھ کا نام ہی حکمت ہے اور تفقہ فی الدین کا مطلب بھی یہی ہے اور اسی حکمت کا نام حدیث رسول ﷺ ہے۔ ہم اصطلاح میں جس علم کو فقہ کہتے ہیں، اس کے بنیادی ستون بھی قرآن اور حدیث ہی ہیں۔ قرون اولیٰ کے مسلمان تو علم سے مراد ہی حدیث لیتے تھے۔ اس لئے یہ آیت کریمہ جب تفقہ فی الدین کے لئے سفر اختیار کرنے کا حکم دے رہی ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ حدیث کو سیکھنے اور پھر اس کو سکھانے کی ترغیب دے رہی ہے۔

ہم یہاں حضور ﷺ کی چند احادیث طیبہ درج کرتے ہیں جن سے اس حکم قرآنی کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءً سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَوَعَاهَا فَاَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا (1)

"اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو پر نور کرے جس نے میری بات سنی پھر اسے خوب یاد کیا اور اس کے بعد جیسے سنا ویسے ہی اسے دوسرے لوگوں تک پہنچا دیا۔"

حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضور ﷺ نے جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس کے لاکھوں مسلمان گواہ ہیں۔ اس خطبے میں حضور ﷺ نے اسلامی احکام کا نچوڑ اپنی قوم کے سامنے پیش

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 100

فرمایا تھا۔ آپ نے اس خطبے کے آخر میں یہ انقلابی جملے ارشاد فرمائے تھے:

وَقَالَ فَاِنَّ دِمَآئَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا وَسَتَلْقَوْنَ رَبَّکُمْ فَیَسْأَلُکُمْ عَنْ اَعْمَالِکُمْ اَلَا فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ ضُلَّالًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ اَلَا لِیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ فَلَعَلَّ بَعْضَ مَنْ یُبَلِّغُهٗ اَنْ یَّکُوْنَ اَوْعٰی لَهٗ مِنْ بَعْضِ مَنْ سَمِعَهٗ (1)

"بیشک تمہاری جانیں، تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسے اس مبارک ماہ کا اس مقدس شہر (مکہ) میں یہ روز سعید۔ تم اپنے رب سے عنقریب ملو گے اور وہ ذوالجلال تمہارے اعمال کے متعلق تم سے پرسش کرے گا۔ دیکھو خبردار! کہیں میرے پیچھے پھر گمراہ نہ ہو جانا اور ایک دوسرے کی گردنوں کو نہ کاٹنا۔ کان کھول کر سن لو۔ جو اس جگہ موجود ہیں ان پر فرض ہے کہ وہ یہ احکام ان لوگوں تک پہنچائیں جو اس وقت موجود نہیں۔ ممکن ہے جن لوگوں کو یہ احکام پہنچائے جائیں وہ سننے والوں سے زیادہ یاد رکھنے والے سمجھ دار ہوں۔"

حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور ﷺ نے صرف آیات قرآنی کی تلاوت ہی نہیں کی تھی بلکہ خداداد حکمت کے ذریعے آپ نے پیغام قرآنی کا جو مفہوم سمجھا تھا اس کا لب لباب آپ نے امت کے سامنے پیش کیا تھا۔

آپ کا خطبہ گویا ایک حدیث تھی جس کے متعلق آپ نے مجمع عام میں اعلان فرمایا: اَلَا لِیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ اس حدیث رسول کو ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں۔ اور اس کی وجہ بھی بتا دی کہ یہ خطبہ ارشاد فرمانے یا رسول معظم ﷺ کی زبان پاک سے اس پیغام کے ادا ہونے کا سبب یہ ہے کہ امت اپنے دین کو سمجھ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو غور و فکر کی مختلف صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ ممکن

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 100

ہے جو لوگ یہاں موجود نہیں ان میں سے کسی کی غور و فکر اور استنباط مسائل کی صلاحیتیں ان لوگوں سے زیادہ ہوں جو یہاں موجود ہیں۔ حدیث پاک کا یہ جملہ وضاحت کر رہا ہے کہ یہ الفاظ جتنے زیادہ لوگوں تک پہنچیں گے، تفہیم دین کے لئے اتنا ہی مفید اور موزوں ہو گا۔

یہ حکم کسی ایک زمانے تک محدود نہیں بلکہ جس طرح ہر زمانے کے مسلمان فہم دین کے محتاج ہیں، اسی طرح ہر زمانے میں ان ارشادات رسول کی اشاعت کا حکم دیا جا رہا ہے۔

اگر کوئی شخص اس بات کا بھی انکار کرنے کی جسارت کرے جو لاکھوں کے مجمع عام میں کہی گئی اور جس کی روایت کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہے، تو اس شخص کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تاریخ انسانی کے کسی بھی واقعے کو تسلیم کرے کیونکہ تاریخ میں ایسے واقعات آپ کو بہت ہی کم ملیں گے جن پر ہزاروں لوگوں کی عینی شہادت موجود ہو۔

حضور ﷺ کی ایک اور حدیث پاک حدیث رسول کو قرآن حکیم کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دے رہی ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ خَلَّفْتُ فِيْكُمْ شَيْئَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ وَلَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَى الْحَوْضِ (1)

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تمہارے لئے اپنے پیچھے دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ (اگر تم ان پر عمل پیرا رہے تو) ہر گز گمراہ نہیں ہو گے۔ (وہ دو چیزیں) اللہ کی کتاب قرآن ہے اور میری سنت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی یہاں تک کہ قیامت کے دن حوض پر دونوں ایک ساتھ وارد ہوں۔"

حضور ﷺ اس حدیث پاک میں اپنی امت کو بتا رہے ہیں کہ میرے بعد تمہاری ہدایت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ تم قرآن اور سنت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھو۔

مستشرقین ہمیں تلقین کرتے ہیں کہ ہم ان کے اس مفروضے کو تسلیم کر لیں کہ دور اول کے مسلمانوں کو تو حدیث کے ساتھ کوئی شغف نہ تھا، بعد کے مسلمانوں نے بامر مجبوری احادیث کی طرف رجوع کیا۔ لیکن ہم مستشرقین کی یہ منطق کیسے تسلیم کر لیں کہ صدیق و

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 101

فاروق رضی اللہ عنہما جیسے مسلمانوں نے اس بات کو کوئی اہمیت ہی نہ دی تھی جس پر حضور ﷺ نے تا قیامت امت کی ہدایت کو منحصر قرار دیا تھا۔ ہم مستشرقین کی یہ بات کیسے مان لیں کہ بعد کے مسلمانوں نے حدیث کو اپنایا لیکن ان کا اس کو اپنانا بھی حضور ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے نہ تھا بلکہ حالات نے انہیں احادیث کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

حضور ﷺ، زیر بحث حدیث پاک میں یہ پیشین گوئی بھی فرما رہے ہیں کہ دین اسلام کے یہ دونوں بنیادی مصادر، قرآن حکیم اور سنت رسول، قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ احادیث طیبہ کو حضور ﷺ نے امت کی ہدایت کے لئے اتنا ہی ضروری قرار دیا جتنا قرآن حکیم کو اور ساتھ ہی پیشین گوئی فرمائی کہ یہ دونوں چیزیں تا قیامت اکٹھی رہیں گی۔ جن صحابہ کرام نے اس حدیث پاک کو حضور ﷺ کی زبان پاک سے سنا تھا، ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اس سے چشم پوشی کریں، اسی لئے انہوں نے اس حدیث پاک کے مطابق جس طرح قرآن حکیم کی حفاظت کر کے اسے پوری امانت اور دیانت کے ساتھ بعد والی نسلوں کی طرف منتقل کیا، اسی طرح انہوں نے احادیث طیبہ کو بھی محفوظ کر کے بعد والی نسلوں کو منتقل کیا۔

یہاں ایک بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ قرآن حکیم کا ایک خاصا یہ ہے کہ اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ قدرت پر لے رکھی ہے۔ حدیث پاک کو یہ ضمانت حاصل نہیں ہے لیکن جہاں تک انسانوں کی کوششوں کا تعلق ہے، صحابہ کرام نے نہ تو قرآن حکیم کی حفاظت میں کوئی کسر اٹھا رکھی اور نہ ہی احادیث طیبہ کی حفاظت میں انہوں نے کسی قسم کی سستی کا مظاہرہ کیا۔ البتہ قرآن و حدیث میں کسی قسم کے التباس کے شائبے کو دور کرنے کے لئے کتابت حدیث کا وہ اہتمام نہ کیا گیا جو قرآن حکیم کی کتابت کے لئے کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کی ایک ایک آیت تواتر سے ثابت ہے لیکن احادیث طیبہ کی اکثریت تواتر کے درجے تک نہیں پہنچتی۔ لیکن تواتر سے ثابت نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ احادیث موضوع ہیں۔ کیونکہ اگر یہ اصول بنا لیا جائے کہ جو چیز تواتر سے ثابت نہ ہو وہ غلط اور موضوع ہوتی ہے تو نہ کوئی الہامی کتاب اس قانون کی زد سے محفوظ رہ سکے گی اور نہ کوئی تاریخ۔ صرف قرآن حکیم، کچھ احادیث طیبہ اور بہت کم تاریخی واقعات اس معیار پر پورے اتریں گے اور مستشرقین اور ان کے شاگردوں کو اپنے اس اصول سے

گلو خلاصی پر مجبور ہونا پڑے گا۔

حضور ﷺ نے قرآن و سنت کے تا قیامت ایک ساتھ رہنے کی جو پیشین گوئی فرمائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے بڑی عجیب شان سے پورا فرمایا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں مستشرقین اور ان کے شاگرد امت مسلمہ کو یہ یقین دہانیاں کرانے میں مصروف ہیں کہ احادیث رسول ﷺ کی آج ضرورت نہیں یا یہ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے احادیث کے متعلق کسی قسم کا خاص اہتمام نہیں کیا، یہ بعد کے لوگوں نے اپنی اغراض پوری کرنے کیلئے گھڑی تھیں، لیکن ان کی ان مساعی اور امت مسلمہ کے دینی رجحان میں شدید کمی کے باوجود عالم اسلام کے مختلف کونوں میں ایسی تحریکیں ابھر رہی ہیں جو اپنے اپنے ممالک میں قرآن و سنت کے قوانین کو نافذ کرانے کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار نظر آتی ہیں۔ مستشرقین اور ان کے شاگردان رشید یوں ہی ٹکریں مارتے رہیں گے اور انشاء اللہ العزیز قرآن حکیم اور سنت رسول کا جو ربط خدا اور اس کے رسول نے قائم کیا ہے، وہ ہمیشہ سلامت رہے گا۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں ان حقائق کی وضاحت کی ہے کہ قرآن حکیم اطاعت رسول کا حکم دیتا ہے اور اطاعت رسول احادیث طیبہ پر عمل کئے بغیر ممکن نہیں۔ احادیث طیبہ دراصل قرآن حکیم کا بیان اور تفصیل ہیں اور یہ اسی حکمت کا دوسرا نام ہے جو قرآن حکیم کے ساتھ حضور ﷺ پر نازل ہوئی۔ قرآن حکیم نے حضور ﷺ کے بے شمار ایسے فرائض بیان کئے ہیں جو تبلیغ کتاب کے علاوہ ہیں، حضور ﷺ نے اپنے وہ فرائض بھی سرانجام دیئے اور ان کا ریکارڈ ہمارے پاس احادیث طیبہ کی شکل میں ہی موجود ہے۔

ہم نے مندرجہ بالا تمام باتوں کے ثبوت کے لئے قرآن حکیم کی آیات کریمہ ہی سے استشہاد کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مستشرقین جو اس بحث میں فریق ثانی ہیں اور ان کے خوشہ چین احادیث طیبہ کو اتھارٹی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ قرآن حکیم کی بے شمار آیات کریمہ جو احادیث طیبہ کے مختلف پہلوؤں کے متعلق وضاحتیں فرما رہی ہیں، ان کی موجودگی میں مستشرقین کے قصر استدلال کے سارے ستون گر جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے دعویٰ ہی یہ کیا ہے کہ احادیث طیبہ متاخر مسلمانوں کی اختراع ہیں۔ ان کے اس دعویٰ کو مندرجہ بالا آیات قرآنی باطل قرار دے رہی ہیں کیونکہ یہ آیات قرآنی، احادیث طیبہ کو

قرآن حکیم کے ساتھ یوں منسلک ثابت کر رہی ہیں کہ ان کو نہ تو قرون اولیٰ کے مسلمان قرآن حکیم سے علیحدہ کر سکتے تھے اور نہ ہی متاخر مسلمان۔ جب مستشرقین کے اس دعوے کے برعکس قرآنی آیات یہ ثابت کر رہی ہیں کہ ہر زمانے کے مسلمان قرآن حکیم کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے احادیث طیبہ کی راہنمائی کے محتاج تھے، تو یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ احادیث طیبہ ہر زمانے میں دین کے مصدر ثانی کے طور پر مسلمانوں کے پاس محفوظ رہی ہیں اور وہ اپنی زندگی کے مختلف معاملات میں ان سے راہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا احادیث طیبہ معتبر دینی دستاویز بھی ہیں اور مستند تاریخی دستاویز بھی۔ مستشرقین کا احادیث طیبہ کی حیثیت کو کلیۃً مسترد کر دینا، نہ علم ہے اور نہ تحقیق۔ یہ صرف ہٹ دھرمی اور تعصب ہے جو مستشرقین کی تحریک کے بنیادی ستون ہیں۔

"گولڈ زیہر" اور اس کے متبعین کا، تحریک اسلامی کی تاریخ کو دور طفولیت اور دور کہولت میں تقسیم کرنا بھی ان لوگوں کے تخیل کی اختراع ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دور، اسلام کا دور طفولیت تھا اور بعد میں جب امت مسلمہ نے زندگی کے مختلف میدانوں میں حیرت انگیز ترقیاں کیں، قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور افلاطون و ارسطو کی علمی خامیوں کی اصلاح کی، تو وہ دور، اسلام کا دور عروج تھا۔

مستشرقین کا یہ شوشہ بھی کلیۃً بے بنیاد ہے کیونکہ اسلام اور مسلم امت کا دور عروج وہی تھا جب خدا کا حبیب شمع محفل بن کر مدینہ طیبہ کی مقدس زمین پر جلوہ فرما تھا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پروانہ وار اس شمع کی تنویرات سے اپنے قلوب واذہان کو منور کر رہے تھے۔ جب قرآن ناطق ان کے سامنے کلام خداوندی کی عملی تفسیر پیش کر رہا تھا اور صحابہ کرام اس تفسیر قرآنی کے سانچے میں اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یہی مقدس دور، اسلام کا دور عروج تھا اور اسی دور عروج میں رب قدوس نے اعلان فرمایا تھا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (1)

1۔ سورۃ المائدہ 3

"آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لئے تمہارا دین اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین۔"

یہ آیت کریمہ اعلان کر رہی ہے کہ حضور ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے سے پہلے دین مکمل ہو چکا تھا۔ دین صرف قرآن کا نام نہ تھا بلکہ احادیث طیبہ بھی دین کا دوسرا مصدر تھیں۔ اس لئے یہ آیت کریمہ سنت رسول کے بھی کمال تک پہنچنے کا اعلان کر رہی ہے۔

ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق اس سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

وَهٰذِهِ الْاٰيَةُ الْكَرِيْمَةُ تَتَضَمَّنُ اَيْضًا اِكْمَالَ السُّنَّةِ لِاَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُبَلِّغٌ وَّ مُبَيِّنٌ لِمَا فِي الْكِتَابِ كَمَا سَبَقَ اَنْ اَشَرْنَا فَالْحَدِيْثُ عَنْ مَرْحَلَةِ نُضُوْجِ الْاِسْلَامِ بَعْدَ وَفَاةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثٌ لَا اَسَاسَ لَهُ لِاَنَّ النُّضُوْجَ كَانَ قَدْ تَمَّ بِالْفِعْلِ قَبْلَ وَفَاتِهِ (1)

"یہ آیت کریمہ سنت رسول کے مرتبہ کمال تک پہنچ جانے کو بھی متضمن ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ تعلیمات قرآنی کے مبلغ اور مبین ہیں۔ اس لئے حضور ﷺ کے انتقال کے بعد، اسلام کے دور کھولت کا قول بے بنیاد ہے کیونکہ اسلام حضور ﷺ کے انتقال سے پہلے ہی اپنے کمال تک پہنچ چکا تھا۔"

اسی طرح احادیث طیبہ کو ملت اسلامیہ کی تاریخ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا نتیجہ قرار دینا بھی بے بنیاد ہے کیونکہ حضور ﷺ نے اپنی امت کو اپنی حیات طیبہ میں ہی بتا دیا تھا کہ:

اِنِّیْ خَلَّفْتُ فِيْكُمْ شَيْئَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُمَا كِتَابَ اللهِ وَسُنَّتِيْ وَلَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَى الْحَوْضِ (2)

"یعنی میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ تم ان دونوں پر

1۔ دکتور محمود حمدی زقزوق، "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، (دار المنار قاہرہ۔ 1989ء)، صفحہ 127

2۔ سنت خیر الانام، صفحہ 101

عمل کرو گے تو گمراہ نہیں ہو گے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری میری سنت۔ اور یہ دونوں ایک دوسری سے جدا نہیں ہوں گی حتیٰ کہ حوض پر دونوں ایک ساتھ وارد ہوں۔"

مسلمانوں کے نزدیک جو احادیث طیبہ دین کا مصدر ثانی ہیں، ان کو حضور ﷺ اپنی حیات طیبہ میں ہی اپنی امت کے سپرد کر چکے تھے۔ حضور ﷺ کے انتقال کے بعد قول و فعل رسول کی روایت تو ممکن تھی لیکن کسی نئی سنت یا حدیث کا جنم لینا ممکن نہ تھا۔ حضور ﷺ کے بعد اہل بدعت نے جو باطل اقوال حضور ﷺ کی طرف منسوب کئے، مستشرقین انہیں اسلام کا حصہ قرار دیتے ہیں جب کہ مسلمان ان کو جھوٹ اور یہ جھوٹ تراشنے والوں کو جہنمی قرار دیتے ہیں۔ اور ان کی روایت کرنے والوں کو بھی جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کے علماء نے امت کو اس فتنے سے محفوظ رکھنے کے لئے موضوعات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور جھوٹی احادیث وضع کرنے والوں کی فہرستیں تیار کر کے امت کے سامنے پیش کر دی ہیں تاکہ کوئی مسلمان ان کے دھوکے میں نہ آئے۔

کتنا ظلم ہے کہ حدیث کے جس سرمائے کو مسلمان اپنی جانوں سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، ان کو تو پرکاہ کی بھی وقعت نہ دی جائے اور جو باتیں ان کے دشمنوں نے ان کے دین کی بنیادیں ہلانے کے ناپاک ارادے سے وضع کی ہیں، ان کے دور کو حدیث کا دور عروج قرار دیا جائے۔ حق یہ ہے کہ اگر دین حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں مکمل نہ ہو چکا ہوتا اور آپ کے انتقال کے بعد سنت رسول اور احادیث طیبہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے مرتبہ کمال تک پہنچتیں تو آج دنیا کے تمام مسلمانوں کی عبادات اور معاملات میں وہ یکسانیت مفقود ہوتی جس کے مظاہرے آج دنیا کے کونے کونے میں ہو رہے ہیں۔ آج ساری دنیا کے مسلمان اگر ایک ہی انداز سے نمازیں پڑھتے ہیں، ایک ہی وقت پر حج کرتے ہیں، ایک ہی مہینے میں روزے رکھتے ہیں اور دین کے تمام اساسی معاملات میں متحد ہیں تو یہ اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ حدیث جو دین کا مصدر ثانی ہے وہ بھی حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی مکمل طور پر ملت کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔

مستشرقین نے احادیث طیبہ کے متعلق جتنے مفروضے قائم کیے ہیں، وہ سب

مفروضے بے بنیاد ہیں اور اس قسم کی بے بنیاد باتیں اسلام کے اس شجرہ طیبہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں جس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ (1)

"جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔"

1۔ سورۂ ابراہیم: 24

حفاظتِ حدیث

حفاظت حدیث

مستشرقین نے تدوین حدیث کو دوسری یا تیسری صدی ہجری سے منسلک کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی ادوار میں چونکہ احادیث مدون نہیں ہوئی تھیں اور ان کی تدوین ڈیڑھ دو صدی بعد عمل میں آئی، اس لئے حدیث کو دین اسلام کا مصدر قرار دینا بھی صحیح نہیں اور اسلام کے ابتدائی ادوار کے متعلق حدیث کو ایک معتبر تاریخی دستاویز بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔

مستشرقین کے اس مفروضے کو غلط ثابت کرنے کے لئے کئی علمائے امت نے قلم اٹھایا اور پرزور دلائل کے ذریعے مستشرقین کے اس مفروضے کو غلط ثابت کیا لیکن کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مستشرقین کے وسوسوں اور الزامات کا جواب دیتے ہوئے دور حاضر کے اکثر مسلمان مصنفین نے احادیث طیبہ کی کتابت کے مختلف ادوار، تدوین حدیث اور اصول حدیث پر تو کماحقہ زور دیا ہے لیکن انہوں نے احادیث طیبہ کی حفاظت کے باقی طریقوں پر کماحقہ توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ عام مصنفین نے "تدوین حدیث" کے عنوان کے تحت ہی حفاظت حدیث کے متعلق اپنے نتائج فکر کو بیان کیا ہے۔ ہم نے "تدوین حدیث" کی بجائے "حفاظت حدیث" کو اپنے موضوع کا عنوان بنانا مناسب سمجھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے حدیث طیبہ کی حفاظت کے لئے صرف تدوین حدیث کے طریقے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس کار خیر کے لئے متعدد ایسے طریقے اپنائے ہیں جن کی مستشرقین کو ہوا بھی نہیں لگی۔

مستشرقین کے ساتھ مباحثے میں ضروری نہیں کہ ہم ہمیشہ اسی محاذ پر ان کا مقابلہ کریں جس محاذ کو وہ خود منتخب کریں۔ اگر تدوین کے بغیر دینی پیغام کی حفاظت کا کوئی طریقہ مستشرقین کے ہاں مروج نہیں تو یہ ان کا قصور ہے، ہم ان کی اس کوتاہی کی وجہ سے امت مسلمہ کی ان خصوصیات کو کیوں نظر انداز کر دیں جو اس ملت کا طرۂ امتیاز ہیں؟

ہم نے گزشتہ صفحات میں اپنے موقف کے ثبوت کے لئے زیادہ تر استشہاد آیات

قرآنی سے کیا ہے کیونکہ مستشرقین احادیث طیبہ کو معتبر تاریخی دستاویز ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی نظروں میں چونکہ احادیث طیبہ صدیوں بعد کی اختراع ہیں، اس لئے ان کو اسلام کے دور اول کے متعلق قابل اعتبار تاریخی دستاویز تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے ان کے اس مفروضے کو قرآنی آیات کے ذریعے غلط ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ قرآن اور حدیث لازم وملزوم ہیں۔ یہ ہمیشہ ایک ساتھ رہی ہیں اور ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گی۔ اس لئے حفاظت حدیث کے متعلق ہم جو باتیں لکھیں گے، ان میں ہمارا ابھروسہ احادیث طیبہ اور اسلامی تاریخ پر ہی ہوگا کیونکہ مستشرقین اگر اسلامی تاریخ کو ناقابل اعتبار قرار دے دیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بھی اپنی تاریخ کو اٹھا کر باہر پھینک دیں۔

ہر قوم اپنی علمی، دینی، سیاسی اور اجتماعی تاریخ خود مرتب کرتی ہے۔ مسلمانوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی تاریخ خود مرتب کریں۔ ہم مستشرقین کو یہ اختیار دینے کے لئے تیار نہیں کہ وہ بغیر دلیل کے ہماری چودہ سو سالہ تاریخ کو بیک جنبش قلم مسترد کر دیں اور پھر اپنے تخیل کے زور پر ہمیں "ہماری" ایک تاریخ بنا کر دیں جس کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے ہم اپنی عمریں برباد کر دیں۔

مستشرقین کا یہ علمی حق تو ہے کہ اسلامی تاریخ، جسے مسلمان خود اپنی تاریخ قرار دیتے ہیں، اس پر تنقید کریں، اس کے قابل اعتراض پہلوؤں کی نشاندہی کریں اور اگر کسی تاریخی واقعہ کے متعلق یہ ثابت کرنا چاہیں کہ مسلمانوں نے اس کو اپنی تاریخ میں غلط بیان کیا ہے تو ناقابل تردید دلائل کے ذریعے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کریں، لیکن ان کو یہ حق کسی نے نہیں دیا کہ وہ مسلمانوں کی اس ساری تاریخ کو مسترد کر دیں جو مسلمانوں کی چودہ سو سالہ کاوشوں کا ثمر ہے اور اس کے مقابلے میں اپنے تخیل کے زور پر ایک اسلامی تاریخ تراشیں اور اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیں۔

مسلمانوں نے اپنے علمی سرمائے کو محفوظ رکھنے کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ کسی دوسری قوم نے اپنے علمی سرمائے کی حفاظت کے لئے نہیں کیں۔ حیرت کی بات ہے کہ جن لوگوں کو اپنے دینی اور علمی ورثے کی حفاظت کا سلیقہ نہ تھا وہ اس ملت کے علمی سرمائے پر ہاتھ صاف کرتے ہیں جس ملت نے اپنے علمی سرمائے کی حفاظت کے لئے بے نظیر کام کیا ہے۔ احادیث طیبہ کی حفاظت کے لئے مسلمانوں نے مختلف طریقے استعمال کئے۔

احادیث طیبہ کے حصول کے لئے محیر العقول کاوشیں، احادیث طیبہ کو سینوں میں محفوظ کرنا، احادیث طیبہ کے پیغام اور تعلیم کو فرد و قوم کی عملی زندگی میں جذب کرنا، احادیث سننے اور سنانے کی محفلیں منعقد کرنا، تدریس حدیث کے حلقے، حدیث کی کتابت، حدیث کی تدوین، فن اصول حدیث متعارف کرانا، احادیث کی سندوں کی چھان بین، احادیث کے متن کو پرکھنا، رواۃ حدیث کے حالات زندگی اور ان کے اخلاق و کردار کو محفوظ کرنا، احادیث کے مختلف درجے متعین کرنا، ایسی کتابوں کی تیاری جن میں صرف صحیح احادیث کا بیان ہو، ہر حدیث کی فنی حیثیت متعین کرنا، ان راویوں سے ملت کو آگاہ کرنا جو وضع حدیث کے لئے مشہور ہیں اور ایسی کتابیں مرتب کرنا جن میں تمام موضوع روایات کو جمع کر دیا جائے تاکہ لوگ ان موضوع روایات کو قول رسول ﷺ سمجھ کر دھوکا نہ کھا جائیں۔ یہ وہ مختلف طریقے تھے جو مسلمانوں نے حدیث رسول ﷺ کے بیش بہا خزانے کی حفاظت کے لئے استعمال کئے۔

ہم حفاظت حدیث کیلئے ملت کی ان تمام مساعی کے متعلق اختصار سے گفتگو کریں گے تاکہ مسلمان مستشرقین کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنے دین کے متعلق کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہ ہوں بلکہ وہ اغیار کی محفل میں آنکھ اٹھا کر یہ کہہ سکیں کہ ان کے اسلاف نے اپنے دین کی حفاظت جس انداز میں کی ہے اس کی مثال کسی دوسری قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

حصول حدیث کی کوششیں

قرآن حکیم نے مسلمانوں کو اطاعت خدا اور اطاعت رسول کا حکم دیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کو ان کے لئے نمونہ کمال بنایا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو اطاعت رسول کے قرآنی حکم کی تعمیل کے لئے اور اسوۂ رسول کے مطابق اپنی زیست کے شب و روز گزارنے کے لئے احادیث طیبہ کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنے رسول مکرم سے محبت تھی اور یہی محبت ان کے ایمان کی جان تھی۔ اس محبت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے محبوب کی ہر نشانی کی حفاظت کریں۔ احادیث طیبہ ان کشتگان خنجر وفا کے لئے نظام زندگی بھی تھیں اور اپنے محبوب راہنما کی نشانی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کے انمول سرمائے کے حصول کے لئے انہوں نے جو کاوشیں کیں، انہیں صرف وہی خوش نصیب سمجھ سکتے ہیں جو وادی عشق میں آبلہ پائی کی لذت سے آشنا ہوں کیونکہ

عقل سے فتویٰ لینے والے حکایت عشق کی بے شمار کڑیوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

صحابہ کرام نے احادیث رسول کی حفاظت کے لئے جو کوششیں کیں، ان کی ایک جھلک ہمیں اصحاب صفہ کی زندگی میں ملتی ہے جنہوں نے ہر دنیوی لذت کو ٹھکرا کر در حبیب پر ڈیرے ڈال دیئے۔ مقصد یہ تھا کہ حبیب خدا ﷺ کی زبان گہر بار سے وقتاً فوقتاً جو موتی ٹپکیں، انہیں اپنے دامن کی زینت بنالیں۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ حضور ﷺ کی جس ادا کا مشاہدہ کریں یا آپ کی زبان پاک سے جو بات سنیں، اسے سینے سے لگالیں اور پھر خود بھی ان پاک اداؤں کی تنویرات سے اپنی زندگی کو منور کریں اور دوسرے دینی بھائیوں کو بھی اس نعمت عظمیٰ میں شریک کریں۔

جو لوگ اپنے دنیوی کاروبار اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے ہمہ وقت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر رہنے سے قاصر تھے، انہوں نے بھی اس لازوال دولت کو نظر انداز نہیں کیا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل سے جنم لے رہی تھی۔ ایسے دو دینی بھائی آپس میں معاہدہ کرتے۔ ایک دن ایک شخص کاروبار کرتا اور دوسرا بارگاہ حبیب میں حاضری دیتا اور قرب حبیب میں اس کے دل و نگاہ جس دولت دارین سے آشنا ہوتے، شام کو وہ اپنے دوسرے ساتھی کو بھی اس دولت میں اپنا شریک بنالیتا اور جو کچھ حضور ﷺ سے سنا ہوتا یا آپ کے جس عمل کا مشاہدہ کیا ہوتا، وہ اپنے دوسرے دینی بھائی کو بھی بتادیتا۔ دوسرے روز وہ اپنے کاروبار میں مصروف رہتا اور اس کا دوسرا بھائی دیدار حبیب کے جلووں سے شاد کام ہوتا اور شام کو اپنے دوسرے بھائی کو وہ بتادیتا جو دن بھر اس نے دیکھا یا سنا ہوتا۔ اس طرح ان کا دنیوی کاروبار بھی جاری رہتا اور حصول علم اور حصول حدیث کا شغل بھی جاری رہتا۔

جو قبائل اسلام قبول کر لیتے ان کے وفود احادیث طیبہ کے حصول، احکام قرآنی کے عملی نمونے کے مشاہدے اور دیدار حبیب کے جلووں سے شاد کام ہونے کے لئے مدینہ طیبہ حاضر ہوتے۔ کوئی مہینہ بھر وہاں قیام کرتا اور کسی کو دو مہینے دیار حبیب کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کا موقعہ ملتا۔ وہ حبیب خدا ﷺ کے اقوال، آپ کے افعال اور آپ کی اداؤں کا مشاہدہ کرتے، انہیں یاد کرتے، انہیں اپنی زندگیوں میں نافذ کرتے اور اپنے قبائل میں واپس جاکر اپنے دوسرے دینی بھائیوں کو بھی علم کی اس دولت سے آگاہ کرتے۔

صحابہ کرام کے حصول حدیث کے شوق اور اس کام کے لئے ان کے زبردست اہتمام

کا اندازہ ان واقعات سے لگایا جا سکتا ہے، جن سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابہ کرام نے ایک ایک حدیث کے حصول کے لئے طویل سفر اختیار کئے۔ ہم یہاں اس قسم کے چند واقعات درج کرتے ہیں:

(1) حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جنہیں مدینہ طیبہ میں شہنشاہ دوسرا کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا، آپ نے ایک حدیث اپنے محبوب کریم سے سنی تھی لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں اس حدیث کے صحیح الفاظ میں کچھ اشتباہ سا ہو گیا۔ اس وقت ان کے علاوہ فقط ایک اور صحابی عقبہ بن عامر زندہ تھے جنہوں نے یہ حدیث سرورِ کائنات ﷺ سے سنی تھی اور وہ ان دنوں مصر میں تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ عازم مصر ہوئے۔ لق و دق صحراؤں اور کٹھن منزلوں کو طے کرتے کرتے ایک ماہ بعد مصر پہنچے۔ انہیں حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی جائے رہائش کا پتہ نہ تھا اس لئے پہلے مسلمہ بن مخلد انصاری امیر مصر کے ہاں تشریف لے گئے اور وہاں پہنچتے ہی ان سے کہا کہ میرے ساتھ ایک آدمی بھیجو جو مجھے عقبہ کے مکان تک پہنچا دے۔ چنانچہ ان کے ہاں پہنچے، انہیں خبر ہوئی تو دوڑے آئے اور فرط اشتیاق سے گلے لگا لیا اور تشریف آوری کی وجہ پوچھی۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مومن کی پردہ داری اور عیب پوشی کے متعلق جو حدیث تم نے حضور ﷺ سے سنی ہے فقط وہ پوچھنے آیا ہوں۔ عقبہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ سَتَرَمُؤْمِنًا فِی الدُّنْیَا عَلٰی عَوْرَۃٍ سَتَرَہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

"میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جس نے دنیا میں کسی مومن کے عیب کو چھپایا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے عیبوں کو چھپا دے گا۔"

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے سن کر تصدیق فرمائی اور فرمایا: مجھے اس حدیث کا پہلے بھی علم تھا لیکن مجھے اس کے الفاظ میں وہم سا ہو گیا تھا اور میں نے گوارا نہ کیا کہ تحقیق سے پہلے لوگوں کو یہ حدیث سناؤں۔

سبحان اللہ! کمال احتیاط کا کیا انوکھا نمونہ ہے۔ ایک حدیث میں ذرا سا وہم ہو گیا۔ فقط

اس کے ازالہ کے لئے اتنا لمبا سفر اختیار کیااور حدیث سننے کے بعد اسی روز اپنی سواری پر سوار ہو کر مراجعت فرمائے دیار محبوب ہوئے۔(1)

(2) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ ایک شخص کے پاس حضور ﷺ کی ایک حدیث ہے اور وہ آج کل شام میں مقیم ہے۔ اسی وقت ایک اونٹ خریدا اور شام کی طرف چل پڑے۔ پورے ایک مہینے کے بعد شام پہنچے اور اس صحابی کے مکان پر گئے جن کا نام عبد اللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام سنتے ہی باہر آئے اور ان سے بغلگیر ہوئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ایک حدیث ہے جو میں نے نہیں سنی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کے سننے سے پہلے ہی داعی اجل کو لبیک نہ کہنا پڑے۔ اس لئے جلدی جلدی آیا ہوں۔ مجھے وہ حدیث سنائیے۔ وہ کہنے لگے میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُنَادِيهِمْ بِصَوْتٍ يَسْمَعُهُ مَنْ بَعُدَ كَمَا يَسْمَعُهُ مَنْ قَرُبَ اَنَا الْمَلِكُ الدَّيَّانُ لَا يَنْبَغِيْ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ اَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ وَوَاحِدٌ مِّنْ اَهْلِ النَّارِ يَطْلُبُهُ بِمَظْلِمَةٍ حَتّٰى يَقْتَصَّهُ مِنْهُ حَتّٰى اللَّطْمَةِ (2)

"قیامت کے دن لوگ جمع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی آواز سے ندا دیں گے جسے دور والے بھی اسی طرح سنیں گے جس طرح قریب والے سنیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں محاسبہ کرنے والا بادشاہ ہوں۔ کوئی جنتی اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو جب تک کسی دوزخی کا اس کے ذمے کسی ظلم کا حساب باقی ہو اور وہ قصاص نہ دے لے۔ حتی کہ ایک تھپڑ کے ظلم کا حساب بھی نہ چکا دے۔"

(3) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضور ﷺ کے چچازاد بھائی تھے اور ہر وقت بارگاہ رسالت میں مصروف خدمت نظر آتے۔ حضور ﷺ نے بارہا ان کے لئے یہ دعا فرمائی: اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ اے اللہ تعالیٰ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما۔ حضور ﷺ

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 17-116 بحوالہ عینی و فتح الباری

2۔ ایضاً

کے وصال کے وقت ان کی عمر تیرہ برس تھی۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک انصاری سے کہا کہ حضور ﷺ داغ مفارقت دے گئے ہیں لیکن ابھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین موجود ہیں، انہیں سے کسب علم کریں۔ وہ بولے: میاں! رہنے دو۔ اتنے اکابر صحابہ کی موجودگی میں کسے کیا پڑی ہے کہ ہم سے آکر مسائل دریافت کرے۔ میں نے ان کی اس نصیحت پر کان نہ دھرے اور حصول علم پر کمر ہمت باندھ لی۔ جس کے متعلق مجھے علم ہوتا کہ اس نے کوئی حدیث حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنی ہے، اس کے پاس جاکر وہ حدیث سنتا اور یاد کر لیتا۔ بعض لوگوں کے پاس جاتا تو وہ سو رہے ہوتے۔ اپنی چادر ان کی چوکھٹ پر رکھ کر بیٹھ رہتا اور بسا اوقات گرد و غبار سے میرا چہرہ اور جسم اٹ جاتا۔ جس وقت وہ بیدار ہوتے، اس وقت ان سے وہ حدیث سنتا۔ وہ حضرات کہتے بھی کہ آپ محبوب خدا ﷺ کے برادر عم زاد ہیں۔ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں اٹھائی۔ ہمیں یاد کیا ہوتا، ہم آپ کے گھر آجاتے لیکن میں کہتا کہ میں علم حاصل کرنے والا ہوں، اس لئے میں ہی حاضری دینے کا زیادہ مستحق ہوں۔ بعض حضرات دریافت کرتے کہ کب سے بیٹھے ہو تو میں کہتا: بہت دیر سے۔ تو وہ برہم ہو کر کہتے کہ آپ نے اپنی آمد کی اطلاع اسی وقت کیوں نہ بھجوادی تاکہ ہم اسی وقت آجاتے اور آپ کو انتظار نہ کرنا پڑتا۔ میں کہتا: میرا دل نہ چاہا کہ آپ میری وجہ سے اپنی ضروریات سے فراغت پانے سے پہلے آجائیں۔

اسی جانفشانی اور عرق ریزی کا ثمرہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صغر سنی کے باوجود انہیں ممتاز علماء کی صف میں جگہ دیتے۔

؎ قیاس کن زگلستان من بہار مرا (1)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حصول حدیث کے لئے یہی جذبہ تھا جس نے ان میں سے بعض کو کثیر الروایہ صحابہ کرام کے طور پر شہرت عطا کی۔ محدثین کثیر الروایہ صحابی، اسے شمار کرتے ہیں، جس سے ایک ہزار سے زیادہ احادیث طیبہ مروی ہوں۔ (2)

حضرت ابو سعید خدری، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت انس، حضرت ابن عباس حضرت جابر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کثیر الروایہ ہونے کا

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 18-117 بحوالہ عینی و فتح الباری

2۔ محمد بن علوی المالکی الحسنی، "المنہل اللطیف فی اصول الحدیث"، (دار الفکر بیروت۔ 1978ء)، صفحہ 30

شرف حاصل ہے۔(1)

حصول حدیث کا جو جذبہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں موجزن تھا، وہ ان سے تابعین کو منتقل ہوا۔ تابعین کے حالات زندگی کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب علمائے امت نے احادیث طیبہ کو ہر قسم کی تلبیس اور ملاوٹ سے پاک رکھنے کے لئے ایسی کوششیں کیں جو صرف امت مسلمہ ہی کا حصہ ہیں۔

احادیث طیبہ کو یاد کرنے، انہیں عملی زندگی میں نافذ کرنے اور ان کی نشر و اشاعت کی کوششیں

صحابہ کرام احادیث طیبہ کو یاد کرنے کا خصوصی اہتمام فرماتے۔ "حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے حدیثیں سنتے تھے۔ جب آپ مجلس سے اٹھتے تو ہم آپس میں حدیثوں کا دور کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی کل حدیثیں بیان کر جاتا، پھر دوسرا پھر تیسرا۔ بعض اوقات ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے تھے اور ساٹھوں باری باری حدیث بیان کرتے تھے۔ اس کے بعد ہم اٹھتے تو حدیثیں اس طرح یاد ہوتیں کہ گویا ہمارے دلوں میں بو دی گئی ہیں۔(2)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عہد نبوی میں فرض نمازوں کے بعد صحابہ کرام مسجد میں بیٹھ جاتے اور قرآن پاک اور حدیث نبویہ کا اندازہ (دور) کرتے تھے۔(3)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ صحابہ کرام کہیں بیٹھتے تو ان کی گفتگو کا موضوع فقہ یعنی حضور ﷺ کی حدیثیں ہوتی تھیں۔ یا پھر یہ کہ کوئی آدمی قرآن پاک کی کوئی سورۃ پڑھے یا کسی سے پڑھنے کو کہے۔(4)

دور کے علاوہ انفرادی طور پر بھی حدیثوں کو یاد کرنے کا بڑا اہتمام تھا اور جن کو کوشش کے باوجود حدیثیں یاد نہ ہوتیں وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثوں کو محفوظ رکھنے کی تدابیر معلوم کیا کرتے۔ جیسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے اپنے

1۔ محمد بن علوی المالکی الحسنی، "المنہل اللطیف فی اصول الحدیث"، (دار الفکر بیروت۔ 1978ء)، صفحہ 30

2۔ علامہ سید محمود احمد رضوی، "فیوض الباری فی شرح صحیح البخاری"، (مکتبہ رضوان لاہور۔ س ن)، جلد 1، صفحہ 20، بحوالہ مجمع الزوائد

3۔ ایضاً، بحوالہ مستدرک

4۔ ایضاً

حافظہ کے متعلق عرض کیا تھا۔ نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں حدیثوں کو دل سے یاد کرتا تھا اور حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ازبر کرنے کے ساتھ ساتھ لکھتے بھی جاتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم حدیثیں یاد کرتے تھے۔(1)

حفاظت حدیث کا یہ شغل صرف عہد نبوی تک محدود نہ تھا بلکہ عہد صحابہ میں حصول حدیث، حفظ حدیث اور اشاعت حدیث کا شوق اپنے جوبن پر تھا۔ مستشرقین حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ روایت حدیث سے منع کرتے تھے اور احادیث روایت کرنے والوں کو سزا دیتے تھے، لیکن مستشرقین نے شاید ان کوششوں کی طرف توجہ مبذول نہیں کی جو اشاعت حدیث کے لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور ہمایوں میں کی گئیں۔

عہد فاروقی میں حفاظت حدیث کی کوششوں کے سلسلہ میں "سنت خیر الانام" سے ایک طویل اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خلافت اسلامی کے گوشے گوشے میں حدیث پاک کی تعلیم کے لئے ایسے صحابہ کرام کو روانہ فرمایا جن کی پختگی سیرت اور بلندی کردار کے علاوہ ان کی جلالت علمی تمام صحابہ کرام میں مسلم تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ازالۃ الخفاء میں تحریر فرماتے ہیں:

> چنانکہ فاروق اعظم عبد اللہ بن مسعود را با جمعے بکوفہ فرستاد و مغفل بن یسار و عبد اللہ بن مغفل و عمران بن حصین را بہ بصرہ و عبادہ بن صامت و ابو درداء را بشام و بہ معاویہ بن سفیان کہ امیر شام بود قد غن بلیغ نوشت کہ از حدیث ایشاں تجاوز نہ کند۔
>
> "قرآن و سنت کی تعلیم کے لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ بھیجا۔ مغفل بن یسار، عبد اللہ بن مغفل اور عمران بن حصین کو بصرہ اور عبادہ بن صامت اور ابو درداء کو شام بھیجا اور امیر معاویہ کو جو

1۔ علامہ سید محمود احمد رضوی، "فیوض الباری فی شرح صحیح البخاری"، (مکتبہ رضوان لاہور۔ س ن)، جلد 1، صفحہ 20، بحوالہ مسلم

اس وقت شام کے گورنر تھے سخت تاکیدی حکم لکھا کہ یہ حضرات جو احادیث بیان کریں، ان سے ہرگز تجاوز نہ کیا جائے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کو بھی ایک خط بھیجا، جس میں تحریر فرمایا:

اِنِّیْ قَدْ بَعَثْتُ اِلَیْکُمْ عَمَّارَبْنَ یَاسِرٍ اَمِیْرًا وَعَبْدَ اللہِ ابْنَ مَسْعُوْدٍ مُعَلِّمًا وَّ وَزِیْرًا وَھُمَا مِنَ النُّجَبَآءِ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمِنْ اَھْلِ بَدْرٍ فَاقْتَدُوْا بِھِمَا وَاسْمَعُوْا وَقَدْ اٰثَرْتُکُمْ بِعَبْدِ اللہِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَلٰی نَفْسِیْ

"میں تمہاری طرف عمار بن یاسر کو امیر بنا کر اور عبداللہ ابن مسعود کو معلم بنا کر بھیج رہا ہوں اور یہ دونوں حضور ﷺ کے بزرگ ترین صحابہ میں سے ہیں اور بدری ہیں، ان کی پیروی کرو اور ان کا حکم مانو۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تمہاری طرف بھیج کر میں نے تمہیں اپنے نفس پر بھی ترجیح دی ہے۔"

علامہ خضری نے "تاریخ التشریع الاسلامی" میں مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

وَقَدْ قَامَ فِی الْکُوْفَۃِ یَأْخُذُ مِنْہُ اَھْلُھَا حَدِیْثَ رَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ مُعَلِّمُھُمْ وَقَاضِیْھِمْ

"یعنی اس کے بعد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مدت تک کوفہ میں قیام پذیر رہے اور وہاں کے باشندے ان سے احادیث نبوی سیکھتے رہے۔ وہ اہل کوفہ کے استاد بھی تھے اور قاضی بھی۔"

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بصرہ کی امارت پر حضرت ابو موسیٰ الاشعری کو مقرر کیا اور وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے اپنے آنے کی غرض وغایت ان الفاظ میں بیان کی:

بَعَثَنِیْ اِلَیْکُمْ عُمَرُ لِاُعَلِّمَکُمْ کِتَابَ رَبِّکُمْ وَسُنَّۃَ نَبِیِّکُمْ

"مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ تم کو

میں تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت کی تعلیم دوں۔"

اس کے علاوہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی صوبوں کے حکام اور قضاۃ اور عساکر اسلامیہ کے قائدین کو خط لکھتے تو انہیں کتاب اللہ اور سنت نبوی پر کاربند رہنے کی سخت تاکید فرماتے۔ آپ کا ایک تاریخی خط ہے جو آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ارسال کیا۔ اس میں قاضی کے فرائض اور مجلس قضا کے آداب کو اس حسن و خوبی اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر اسے اسلام کا بدترین دشمن بھی پڑھے تو جھوم جائے۔ دیگر امور کے علاوہ آپ نے انہیں یہ بھی تحریر فرمایا:

ثُمَّ الْفَهْمَ الْفَهْمَ فِيْمَا اُدْلِيَ اِلَيْكَ مِمَّا وَرَدَ عَلَيْكَ مِمَّا لَيْسَ فِيْ قُرْاٰنٍ وَلَا سُنَّةٍ ثُمَّ قَايِسِ الْاُمُوْرَ عِنْدَ ذَالِكَ

"ان واقعات کا جن کے لئے تمہیں کوئی حکم قرآن و سنت میں نہ ملے، فیصلہ کرنے کیلئے عقل اور سمجھ سے کام لو اور ایک چیز کو دوسری پر قیاس کیا کرو۔"

آپ کا ایک مکتوب جو قاضی شریح کو روانہ کیا گیا، اس میں آپ ان کے لئے ایک منہاج مقرر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِذَا اَتَاكَ اَمْرٌ فَاقْضِ بِمَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ اَتَاكَ بِمَا لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَاقْضِ بِمَا سَنَّ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

"جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو اس کا فیصلہ کتاب اللہ کے حکم کے مطابق کرو۔ اور اگر کوئی ایسا واقعہ پیش ہو جس کا حکم قرآن میں نہ ہو تو پھر رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق اس کا فیصلہ کرو۔"

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں جب حج کرنے کے لئے گئے تو مملکت اسلامیہ کے تمام والیوں کو حکم بھیجا کہ وہ بھی حج کے موقعہ پر حاضر ہوں۔ جب وہ سب جمع ہو گئے تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک تقریر فرمائی۔

قَالَ: اَيُّهَا النَّاسُ! اِنِّيْ مَا اُرْسِلُ اِلَيْكُمْ عُمَّالًا لِيَضْرِبُوْا اَبْشَارَكُمْ وَلَا لِيَاْخُذُوْا اَمْوَالَكُمْ وَاِنَّمَا اُرْسِلُهُمْ اِلَيْكُمْ

لِيُعَلِّمُوْكُمْ دِيْنَكُمْ وَسُنَّةَ نَبِيِّكُمْ فَمَنْ فُعِلَ بِهٖ شَيْءٌ سِوٰى ذَالِكَ فَلْيَرْفَعْهُ اِلَيَّ فَوَالَّذِيْ نَفْسُ عُمَرَ بِيَدِهٖ لَاُقِصَّنَّهٗ مِنْهُ (تاریخ ابن الاثیر و کتاب الخراج)

"آپ نے کہا اے لوگو! میں نے تمہاری طرف جو حکام بھیجے ہیں، وہ اس لئے نہیں بھیجے تا کہ وہ تمہیں زدوکوب کریں اور تمہارے اموال تم سے چھینیں۔ میں نے انہیں صرف اس لئے تمہاری طرف بھیجا ہے تا کہ وہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں۔ حکام میں سے اگر کسی نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہو تو پیش کرو، اس ذات پاک کی قسم جس کے دست قدرت میں عمر کی جان ہے، میں اس حاکم سے قصاص لئے بغیر نہیں رہوں گا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے محبوب و کریم رسول ﷺ کی سنت کی نشر و اشاعت اور تمام قلمرو اسلامی میں اس پر سختی سے عمل کرانے کی جو مساعی کیں، یہ اس کا نہایت ہی مختصر خاکہ ہے لیکن اس سے کم از کم یہ حقیقت تو ہویدا ہو جاتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت امت پر قیامت تک فرض ہے اور اسی میں ان کی ترقی، عزت اور ہیبت کا راز پنہاں ہے، اسی لئے تو آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ میں جلیل القدر صحابہ کرام کو بھیجا کہ وہ لوگوں کو ان کے رسول کی سنت کی تعلیم دیں اور حکام کو بار بار اتباع سنت کے لئے مکتوب روانہ فرمائے۔(1)

احادیث طیبہ کے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ کے ارشادات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے فقط متبرک جملے ہی نہ تھے، جنہیں صرف تبرک کے لئے یاد کر لیا جاتا بلکہ ان کی زندگی کا ہر پہلو انہی ارشادات کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ ان کے دل کے ان لطیف احساسات سے لے کر جنہیں پابند الفاظ نہیں کیا جا سکتا، ان کی طبعی خواہشات تک، سب کے سب سنت مصطفوی کے پابند تھے۔ ان کی خلوتوں کا سوز و گداز اور ان کی جلوتوں کا خروش عمل ان کی شب بیداریاں اور ان کے قیلولے سب فرمان نبوی کے تابع تھے اور جو قول، فعل سے ہر وقت ہمکنار رہے وہ کیسے

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 113-110

فراموش ہو سکتا ہے اور وہ فرمان جس کے متعلق یقین ہو کہ اس کی تعمیل میں ہماری فلاح دارین ہے، اس کی یاد کے نقوش کیسے دھندلے پڑ سکتے ہیں؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جو عشق تھا محبوب خدا سے، جو جنون تھا اس کے ہر ارشاد کی تعمیل کا، جو سودا تھا حصول علم کا، جو جذبہ تھا تبلیغ دین قیم کا، اس کے پیش نظر ایک اجنبی بھی پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور ﷺ کا ایک فرمان بھی فراموش نہ ہونے دیا ہوگا۔ (1)

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی حیات طیبہ کو تمام ملت کے لئے اسوہ حسنہ بنایا تھا۔ یہ اسوہ حسنہ، دین متین کا یہ نمونہ کامل اور قرآن حکیم کی یہ تفسیر مجسم، ان کے سامنے تھے۔ عبادات میں تو رسول اللہ ﷺ کی اتباع کے بغیر ان کے لئے کوئی چارہ کار ہی نہ تھا، ان کو تو وہ رسول ﷺ کے عملی نمونے کو دیکھے بغیر ادا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، لیکن ان کی اتباع رسول عبادات تک محدود نہ رہی بلکہ انہوں نے اپنے محبوب اور اپنے رب کے حبیب ﷺ کی ہر عادت اور ہر ادا کو اپنانے کی کوشش کی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خواہش ہوتی کہ ان کی نشست و برخواست، ان کی گفتار، ان کا کردار، ان کا سونا اور جاگنا اور ان کا کھانا اور پینا، سب حضور ﷺ کے نمونے کے مطابق ہو۔ اگر کسی نے حضور ﷺ کے گریبان کو کھلا دیکھا تو اس نے اپنے حبیب کی اس ادا کو اپنانا ہی اپنے لئے باعث سعادت سمجھا۔ اگر کسی نے حضور ﷺ کو کسی بات کے بعد مسکراتے دیکھا تو اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا کہ وہ بھی اس بات کے بعد اپنے حبیب ﷺ کی اتباع میں مسکرائے گا۔ ہم یہاں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سنت رسول سے عشق کی چند مثالیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

حضور ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں شہدائے موتہ کا انتقام لینے کے لئے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک لشکر تیار فرمایا۔ حضور ﷺ کے انتقال کے سبب، لشکر بروقت روانہ نہ ہو سکا۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے تو انکار زکوۃ، ارتداد اور دعویٰ ہائے نبوت جیسے کئی فتنوں نے نوخیز اسلامی ریاست کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان حالات میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر اسامہ کو روانہ کرنے

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 19-118

کا تہیہ کیا۔ اہل الرائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان حالات میں لشکر اسامہ کو روانہ نہ کرنے کی درخواست کی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہ ٹھیک ہے کہ حالات ناسازگار ہیں مگر ماحول کے پر فتن دباؤ کے باوجود لشکر اسامہ ضرور روانہ ہو گا اور اس لئے روانہ ہو گا کہ حضور علیہ کا حکم ہے:

انفذوا جيش اسامة

"یعنی لشکر اسامہ کو روانہ کرو۔"

اس موقعہ پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پر جوش لہجے میں یہ الفاظ بھی فرمائے:

"بخدا اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ اس لشکر کے روانہ کر دینے کی بنا پر مرکز کمزور ہو جائے گا اور درندے آ کر مجھے کھا جائیں گے تو بھی حکم نبوی علیہ السلام کی تعمیل ضرور کروں گا۔" کیونکہ

إنما أنا منفذ لأمر أمر به صلى الله عليه وسلم

"میں اپنا حکم نہیں بلکہ رسول کریم علیہ کا حکم نافذ کر رہا ہوں۔" (1)

اس موقعہ پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ بھی مروی ہیں۔ فرمایا:

ما كان لي أن أحل لواء عقده رسول الله صلى الله عليه وسلم (2)

"میری یہ مجال نہیں کہ اس جھنڈے کو کھول دوں جس کو حضور علیہ نے اپنے دست اقدس سے باندھا ہے۔"

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا تو آپ کا پہلا جواب یہ تھا:

كيف أفعل شيئا لم يفعله رسول الله صلى الله عليه وسلم (3)

"میں وہ کام کیسے کروں جو حضور علیہ نے نہیں کیا۔"

1۔ فیوض الباری، جلد 1، صفحہ 18

2۔ الدکتور محمد عجاج الخطیب، "السنہ قبل التدوین"، (دار الفکر بیروت۔ 1980)، صفحہ 80

3۔ "فیوض الباری"، جلد 1، صفحہ 17

جب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے بھی پہلے وہی جواب دیا جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کسی کام کو کرنے سے پہلے حضور ﷺ کے نمونہ عمل کا جائزہ لیتے تھے۔ اگر انہیں حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کام کی مثال ملتی تو اس پر عمل پیرا ہوتے ورنہ اسے ترک کر دیتے۔

حضور ﷺ کے انتقال کے بعد حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے میراث طلب کی تو آپ نے فرمایا: میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے:

اِنَّ النَّبِیَّ لَا یُوْرَثُ

"نبی کسی کو اپنے متروکات میں وارث نہیں بناتے۔"

اس کے بعد فرمایا:

فَاِنِّیْ اَخْشٰی اِنْ تَرَکْتُ شَیْئًا مِّنْ اَمْرِہٖ اَنْ اَزِیْغَ

"میں ڈرتا ہوں کہ آپ کے کسی حکم کو چھوڑ دوں تو بھٹک جاؤں گا۔"

بلکہ آپ نے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

لَسْتُ تَارِکًا شَیْئًا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعْمَلُ بِہٖ اِلَّا عَمِلْتُہٗ (1)

"میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعمال شریفہ سے کوئی عمل ایسا نہ چھوڑوں گا جس پر عمل نہ کروں۔"

عبداللہ بن السعدی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں آپ کے پاس حاضر ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں کے کام کرتے ہو اور جب تمہیں اجرت دی جاتی ہے تو اسے لینا ناپسند کرتے ہو، کیا یہ بات صحیح ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں یہ صحیح ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اس سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: مجھ پر اللہ کا فضل ہے۔ میرے پاس گھوڑے بھی ہیں اور غلام بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ میری اجرت مسلمانوں کے لئے

1۔ "فیوض الباری"، جلد 1، صفحہ 18-17

صدقہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو کیونکہ ایک دفعہ میں نے بھی وہی ارادہ کیا تھا جو تم نے کیا ہے۔ حضور ﷺ مجھے کوئی چیز عطا کرتے تو میں عرض کرتا کہ کسی ایسے شخص کو عطا فرمادیں جو مجھ سے زیادہ اس کا محتاج ہے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے مجھے کچھ مال عطا فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ کسی ایسے شخص کو عطا فرمادیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو تو حضور ﷺ نے فرمایا: یہ مال لے لو، اسے اپنی ملکیت بناؤ اور پھر اسے صدقہ کر دو۔ جو مال دنیا تمہارے پاس اس حال میں آئے کہ نہ تم اس کے لئے سوال کرو اور نہ تمہاری نظریں اس پر لگی ہوں تو ایسے مال کو لے لو اور جو مال اس طرح نہ آئے، اس کے متعلق اپنے دل میں خواہش کو جگہ نہ دو۔"(1)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین زندگی کے ہر شعبے میں حضور ﷺ کی سنت سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی عادات، اپنے اخلاق اور اپنے طرز حیات کو حضور ﷺ کے رنگ میں رنگنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ وہ صرف خود ہی اپنی زندگیوں کو حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے سانچے میں ڈھالنے کے مشتاق نہ تھے بلکہ وہ ایک دوسرے کو حضور ﷺ کے نمونہ عمل کو اپنانے کی تلقین بھی کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب مسلمانوں کو فارغ البالی کی حالت میں دیکھا اور دیکھا کہ مسلمانوں کے پاس ان چیزوں کی کثرت ہو گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حلال قرار دی ہیں تو آپ کی آنکھوں میں فوراً کاشانہ رسول کا نقشہ بندھ گیا اور آپ نے فرمایا:

لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَظَلُّ الْيَوْمَ يَلْتَوِىْ مَايَجِدُ دَقَلاً يَمْلَأُ بِهٖ بَطْنَهٗ (2)

"میں نے حضور ﷺ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ (بوجہ اشتہا) آپ سارا دن خمیدہ کمر رہتے اور پیٹ بھرنے کے لئے آپ کے پاس ایک خشک کھجور تک نہ ہوتی۔"

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زخمی کر دیا گیا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ کسی کو اپنا خلیفہ مقرر فرمادیں، تو آپ نے فرمایا:

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 81

2۔ ایضاً، صفحہ 83، بحوالہ مسند امام احمد

اِنْ اَتْرُكْ فَقَدْ تَرَكَ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنِّيْ: رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِنْ اَسْتَخْلِفْ فَقَدْ اِسْتَخْلَفَ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنِّيْ اَبُوْبَكْرٍ (1)

"اگر میں اس معاملے کو ویسے ہی چھوڑ دوں تو ایسا اس نے کیا ہے جو مجھ سے بہتر ہے یعنی رسول اللہ ﷺ اور اگر خلیفہ مقرر کر دوں تو یہ بھی اس کی پیروی ہو گی جو مجھ سے بہتر ہے یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ۔

حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مجلس میں تشریف فرما دیکھا۔ آپ نے آگ پر پکا ہوا کھانا منگایا، اسے تناول فرمایا پھر نماز کے لئے کھڑے ہوئے، نماز پڑھی اور فرمایا: میں اس انداز میں بیٹھا جو حضور ﷺ کے بیٹھنے کا انداز ہے۔ میں نے اس طرح کھایا جیسے حضور ﷺ تناول فرماتے تھے اور میں نے اس طرح نماز پڑھی جس طرح حضور ﷺ نماز پڑھتے تھے۔(2)

حضرت میسرہ بن یعقوب الطہوی فرماتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا تو عرض کیا: آپ کھڑے ہو کر پانی پی رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اگر میں کھڑے ہو کر پانی پیوں تو بھی ٹھیک ہے کیونکہ میں نے حضور ﷺ کو کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا ہے اور اگر میں بیٹھ کر پانی پیوں تو بھی ٹھیک ہے کیونکہ میں نے حضور ﷺ کو بیٹھ کر پانی پیتے بھی دیکھا ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے:

كُنْتُ اَرٰى اَنَّ بَاطِنَ الْقَدَمَيْنِ اَحَقُّ بِالْمَسْحِ مِنْ ظَاهِرِهِمَا حَتّٰى رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ ظَاهِرَهُمَا (3)

"میری رائے یہ تھی کہ پاؤں کے نیچے والے حصے پر مسح کرنا، اوپر والے حصے پر مسح کرنے کی نسبت زیادہ بہتر ہے، حتی کہ میں نے حضور

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 83

2۔ ایضاً، صفحہ 84

3۔ ایضاً

صلی اللہ علیہ وسلم کو پاؤں کے اوپر والے حصے پر مسح کرتے دیکھا۔"

گویا باب مدینۃ العلم نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر اپنی رائے کو قربان کر دیا۔ مومن کا کام ہی یہ ہے: عقل قربان کن بہ پیش مصطفیٰ۔

حضرت علی بن ربیعہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سواری کے لئے ایک جانور حاضر کیا گیا۔ جب آپ نے رکاب میں پاؤں رکھا تو پڑھا: بِسْمِ اللّٰہِ۔ جب آپ چوپائے پر سیدھے بیٹھ گئے تو پڑھا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ

"تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس نے فرماں بردار بنا دیا ہے اسے ہمارے لئے اور ہم اس پر قابو پانے کی قدرت نہیں رکھتے اور یقیناً ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔"

پھر آپ نے تین مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پڑھا اور تین مرتبہ تکبیر کہی اور پھر یہ کلمات پڑھے:

سُبْحَانَکَ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ قَدْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ

"تو پاک ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے، مجھے معاف فرما۔"

اس کے بعد آپ مسکرائے۔ میں نے عرض کیا: امیر المومنین! آپ کے مسکرانے کی وجہ کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کام کرتے دیکھا ہے جو کام میں نے اب کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کے بعد مسکرائے تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مسکرانے کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ بندہ جب رَبِّ اغْفِرْلِیْ یعنی اے میرے رب مجھے معاف فرما دے، کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے اور فرماتا ہے: میرے بندے کو یقین ہے کہ میرے بغیر کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔ (1)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کی اتباع کرتے تھے

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 5-84، بحوالہ مسند امام احمد

خواہ انہیں اس کی علت معلوم ہوتی یا نہ ہوتی اور خواہ وہ اس کی حکمت کو سمجھتے یا نہ سمجھتے۔
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سنت پر محافظت کی وجہ سے مشہور تھے۔ نماز، روزہ، حج بلکہ زندگی کے روزمرہ معمولات میں بھی وہ حضور علیہ السلام کے نقش پا پر قدم رکھتے۔ وہ اکثر یہ آیہ کریمہ پڑھا کرتے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (1)

"بیشک تمہاری راہنمائی کے لئے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں خوب صورت نمونہ ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، جو چیز حضور علیہ السلام سے سنتے یا آپ کے جس عمل کو دیکھتے، وہ خود بھی ہو بہو اس کے مطابق عمل کرتے، نہ ذرہ برابر کمی کرتے اور نہ ہی ذرہ برابر اضافہ کرتے۔(2)

حضرت مجاہد فرماتے ہیں: ہم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ دوران سفر آپ راستے سے ذرا ہٹ گئے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ نے اس طرح کیوں کیا تو فرمایا: میں نے حضور علیہ السلام کو ایسے کرتے دیکھا ہے، اس لئے میں نے بھی ایسا کیا ہے۔

آپ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک درخت کے پاس جب بھی جاتے، اس کے نیچے قیلولہ فرماتے اور لوگوں کو بتاتے کہ حضور علیہ السلام بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔

فتح مکہ کے موقعہ پر حضور علیہ السلام نے مشرکین مکہ پر مسلمانوں کی قوت و شوکت ظاہر کرنے کے لئے مسلمانوں کو حکم فرمایا تھا کہ وہ اپنے کندھوں کو کھلا رکھیں اور طواف میں رمل(3) کریں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو قوت و شوکت عطا کر دی تو کندھے کھولنے اور رمل کرنے کا سبب تو ختم ہو گیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

فِيْمَ الرَّمْلَانُ اَلْاٰنَ وَالْكَشْفُ عَنِ الْمَنَاكِبِ وَقَدْ اَطَّأَ اللّٰهُ الْاِسْلَامَ وَنَفَى الْكُفْرَ وَاَهْلَهٗ وَمَعَ ذَالِكَ لَا نَدَعُ شَيْئًا كُنَّا نَفْعَلُهٗ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (4)

1۔ سورۃ احزاب: 21
2۔ السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 85
3۔ دوڑنے کے انداز میں چلنے کو رمل کہا جاتا ہے۔
4۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 7-86

"اب رمل اور کندھے کھولنے کی ضرورت کیا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمادیا ہے اور کفر اور اہل کفر کو ختم کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود ہم اس کام کو ترک نہیں کریں گے جو ہم حضور ﷺ کے عہد ہمایوں میں کیا کرتے تھے۔"

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے عرض کیا گیا: صلوٰۃ سفر کا ذکر ہمیں قرآن حکیم میں نہیں ملتا۔ آپ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ بَعَثَ اِلَيْنَا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا نَعْلَمُ شَيْئًا فَاِنَّمَا نَفْعَلُ كَمَا رَأَيْنَا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ وَكُنَّا ضُلَّالًا فَهَدَانَا اللّٰهُ بِهٖ فَبِهٖ نَقْتَدِيْ (1)

"ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ لہٰذا ہم وہی کچھ کریں گے جو ہم نے حضور ﷺ کو کرتے دیکھا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم گمراہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے ذریعے ہمیں ہدایت دی، اس لئے ہم آپ ہی کی پیروی کریں گے۔"

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سنت رسول کے مقابلے میں کسی کی رائے کو کوئی وقعت نہیں دیتے تھے۔ اگر ان کے سامنے کوئی کسی خلاف سنت فعل کا ارتکاب کرتا تو وہ غضب ناک ہو جاتے۔ وہ اپنے عزیز ترین رشتہ داروں سے بھی خلاف سنت فعل کے ارتکاب پر سخت ناراض ہوتے۔

حضرت عبد اللہ بن مغفل کے پاس ان کا بھتیجا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک کنکر اپنی انگلیوں میں رکھ کر پھینکا۔ حضرت عبد اللہ بن مغفل نے اسے منع کیا اور فرمایا: حضور ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ اس طرح کنکریاں پھینکنے سے نہ تو آپ کسی جانور کو شکار کر سکتے ہیں، نہ آپ اس سے دشمن کو مار سکتے ہیں، یہ یا تو کسی کا دانت توڑے گی یا کسی کی آنکھ نکال دے گی۔ حضور ﷺ کا یہ ارشاد سننے کے بعد حضرت عبد اللہ کے بھتیجے

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 87

نے پھر کنکریاں پھینکیں تو آپ نے اس سے فرمایا: میں تمہیں حضور ﷺ کی حدیث سنا رہا ہوں کہ آپ نے اس کام سے منع فرمایا ہے، اس کے باوجود تم دوبارہ کنکریاں پھینک رہے ہو، میں کبھی تمہارے ساتھ بات نہیں کروں گا۔(1)

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: خدا کی کنیزوں (عورتوں) کو نماز پڑھنے سے نہ روکو۔ حضرت سالم کے ایک بیٹے نے آپ سے یہ حدیث سننے کے بعد کہا: ہم تو ضرور انہیں مسجد میں نماز پڑھنے سے روکیں گے۔ اس پر حضرت سالم غضب ناک ہو گئے اور فرمایا:

أُحَدِّثُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَقُوْلُ اِنَّا لَنَمْنَعُهُنَّ (2)

"میں تمہارے سامنے حضور ﷺ کی حدیث پڑھ رہا ہوں اور تم کہتے ہو: ہم عورتوں کو ضرور منع کریں گے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قرآن وسنت کے مطابق حج تمتع کے صحیح ہونے کا فتویٰ دیتے تو لوگ آپ سے کہتے: آپ کے والد ماجد نے حج تمتع سے منع فرمایا ہے، آپ اس کی اجازت دے کر اپنے والد ماجد کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ اس پر حضرت عبداللہ ان سے فرماتے: تم ہلاک ہو جاؤ، کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حج تمتع سے منع کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ تم عمرہ اس طرح کرو کہ اس طرح تمہیں کامل عمرہ کا ثواب ملے۔ تم اسے حرام قرار کیوں دیتے ہو جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے اور حضور ﷺ نے اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ کیا حضور ﷺ اطاعت کے زیادہ مستحق ہیں یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تم سے یہ نہیں فرمایا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ حرام ہے بلکہ ان کا ارشاد تو یہ ہے کہ کامل عمرہ یہ ہے کہ تم حج کے مہینوں کے علاوہ اسے ادا کرو۔(3)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بڑے متقی، پرہیزگار اور عبادت گزار تھے۔

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 8-87

2۔ ایضاً، 88

3۔ ایضاً، صفحہ 90

حضور ﷺ نے ان کے لئے یہ رخصت فرمائی تھی کہ وہ ہر مہینے میں چند دن روزہ رکھ لیا کریں لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اس سے زیادہ روزے رکھنے پر قادر ہیں اس لئے انہوں نے مسلسل روزے رکھنے کا ارادہ کر لیا۔

زندگی کے آخری ایام میں وہ کمزور ہو گئے تو انہوں نے فرمایا:

لَانْ اَكُوْنَ قَبِلْتُ رُخْصَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا عُدِلَ بِهٖ اَوْ عَدَلَ لٰكِنِّيْ فَارَقْتُهٗ عَلٰى اَمْرٍ اَكْرَهُ اَنْ اُخَالِفَهٗ اِلٰى غَيْرِهٖ (1)

"حضور ﷺ کی طرف سے عطا کی جانے والی رخصت کو قبول کر لینا، میرے لئے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہے لیکن حضور ﷺ سے مفارقت کے وقت میں جس کام پر کاربند تھا، وہ چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔"

ایسی مثالوں سے کئی دفتر مرتب ہو سکتے ہیں جن میں حضور ﷺ کے صحابہ کرام کے اطاعت رسول کے جذبے کا عکس جلوہ گر ہو لیکن یہاں ہم ان چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ مثالیں اس حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کافی ہیں کہ حضور ﷺ کی سنت اور آپ کی احادیث طیبہ کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نظر انداز نہیں کیا تھا بلکہ وہ ان کے سینوں میں بھی محفوظ تھیں اور دیکھنے والوں کو ان کا عکس صحابہ کرام کی زندگیوں میں بھی عیاں نظر آتا تھا۔

مستشرقین تدوین کو ہی حفاظت کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن ہم ان سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ ذرا وہ اس بات کی وضاحت فرمائیں کہ کیا وہ چیز زیادہ محفوظ رہتی ہے جس کو خوب صورتی کے ساتھ مدون کر کے کتب خانوں کی الماریوں کی زینت بنا دیا جائے یا وہ چیز زیادہ محفوظ رہتی ہے جسے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں میں نافذ کر دیا جائے؟ اقوام متحدہ کا حقوق انسانی کا چارٹر بلاشبہ عمدہ ترین شکلوں میں مدون ہے لیکن اس عمدہ تدوین کے باوجود وہ انہی ممالک میں زندہ ہے جہاں یہ حقوق انسانی عملاً بھی نافذ ہیں۔ جن ممالک میں جنگل کا قانون رائج ہے، جہاں طاقتور جو کچھ کرنا چاہے، اسے عملاً اس کا حق حاصل

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 1-90

ہے اور کمزور کو جینے کا حق بھی نہیں دیا جاتا، وہاں اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر کو کوئی نہیں جانتا۔ ان ممالک کے غریب انسانوں کے لئے اس چارٹر کی مردہ لاش کی کوئی حیثیت نہیں۔ جن ممالک میں یہ حقوق عملاً نافذ ہیں، وہاں کوئی شخص ان میں تحریف یا تبدیلی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن جن ممالک میں یہ عملاً نافذ نہیں اور صرف چند قانون دان ان کو جانتے ہیں، وہاں ان کی حالت کو بگاڑ کر پیش کرنا کسی قسمت آزما کے لئے مشکل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے احادیث طیبہ کی حفاظت کے لئے سب سے پہلے یہ طریقہ اختیار کیا کہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں ان کو محفوظ کر کے، کروڑوں انسانوں کی زندگیوں میں انہیں نافذ کر دیا۔ آندھیاں چلتی رہیں، طوفان اٹھتے رہے، ملت اسلامیہ سیاسی اور عسکری طور پر کمزور ہوتی رہی لیکن ہدایت انسانی کا وہ چارٹر جو احادیث طیبہ کی شکل میں مدتوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں میں نافذ رہا، نہ اس کی اہمیت کو ختم کیا جا سکا اور نہ ہی اس کو صفحہ ہستی سے مٹایا جا سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیث طیبہ کی حفاظت کا یہ ایسا بے نظیر طریقہ ہے جو صرف ملت اسلامیہ ہی کا حصہ ہے۔

روایت حدیث میں احتیاط

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو سنت رسول ﷺ کے رنگ میں اپنی زندگیوں کو رنگنے اور اسے صحیح صحیح اپنی آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کو اپنا دینی فرض سمجھتے تھے، انہوں نے حدیث رسول ﷺ کو ہر قسم کے جھوٹ کی ملاوٹ سے پاک رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ حدیث رسول کو حاصل کرنے کے لئے جہاں وہ اپنی زندگیاں وقف کرتے اور طویل سفر اختیار کرتے، وہاں وہ یہ بھی پوری احتیاط کرتے کہ جس چیز کو وہ حدیث رسول ﷺ سمجھ کر قبول کر رہے ہیں، وہ واقعی حدیث رسول ہے یا نہیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین احادیث رسول کو قبول کرنے میں بھی انتہائی احتیاط برتتے، انہیں روایت کرتے وقت بھی حضور ﷺ کی اس حدیث کو ذہن میں رکھتے جس میں آپ نے اپنی طرف غلط بات منسوب کرنے والوں کو ہولناک انجام سے ڈرایا تھا اور بزرگ صحابہ کرام دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کثرت سے احادیث روایت کرنے سے روکتے بھی تھے۔

ان تمام احتیاطی تدابیر کا سبب یہ تھا کہ حدیث رسول ہر قسم کے شائبہ کذب سے محفوظ رہے۔ یہاں ہم قبول حدیث اور روایت حدیث میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی احتیاط کی چند مثالیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے اپنے پوتے کی وراثت میں سے حصہ مانگا۔ وراثت میں داوی کے حصے کے متعلق نہ قرآن حکیم میں ذکر تھا اور نہ ہی اس بارے میں کوئی حدیث پاک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سن رکھی تھی۔ آپ نے لوگوں سے اس کے متعلق پوچھا تو حضرت مغیرہ اٹھے اور عرض کیا: مجھے معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے داوی کو چھٹا حصہ دیا تھا۔ انہوں نے یہ حدیث پیش کی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: تم اس حدیث پر گواہ پیش کرو۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے گواہی دی کہ حضرت مغیرہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ ٹھیک ہے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پاک کے مطابق اس عورت کو اس کے پوتے کی وراثت میں سے چھٹا حصہ ادا کیا۔ (1)

ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو باہر سے تین دفعہ سلام کیا لیکن جواب نہ ملا اور آپ واپس لوٹ آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں بلوا بھیجا اور ان سے لوٹ جانے کی وجہ پوچھی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: جو شخص تین دفعہ سلام کہے اور اسے صاحب خانہ اندر جانے کی اجازت نہ دے تو وہ خواہ مخواہ اندر جانے پر مصر نہ ہو بلکہ واپس لوٹ جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: اس حدیث کی صحت پر گواہ پیش کرو ورنہ میں تمہاری خبر لوں گا۔ وہ صحابہ کے پاس گئے تو ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ صحابہ کرام نے وجہ پوچھی تو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ صحابہ کرام نے کہا کہ ہم نے بھی حضور ﷺ سے یہ حدیث سنی ہے۔ چنانچہ ایک شخص ان کے ساتھ گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی تصدیق کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سختی کی وجہ بھی بیان فرما دی۔

قَالَ عُمَرُ اِنِّیْ لَمْ اَتَّهِمْكَ وَلٰكِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ یَّتَقَوَّلَ

1۔ محمد بن علوی المالکی الحسنی، "المنہل اللطیف فی اصول الحدیث الشریف"، (دار الفکر بیروت۔ 1978ء)، صفحہ 31

اَلنَّاسُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (1)

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابو موسیٰ! میرا ارادہ تمہیں متہم کرنے کا نہ تھا لیکن میں نے اس خوف سے اتنی سختی کی ہے تاکہ لوگ بے سروپا باتیں حضور ﷺ کی طرف منسوب نہ کرنے لگیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسجد نبوی کو وسیع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مسجد کے قبلہ کی طرف حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکان تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے مسجد کے لئے مکان فروخت کرنے کی درخواست کی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔ دونوں حضرات حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ انہوں نے جب صورت حال کے متعلق سنا تو فرمایا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں ایک حدیث پاک سنا سکتا ہوں جو اس مسئلے میں تمہاری راہنمائی کرے گی۔ انہوں نے فرمایا: سناؤ۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کریں جس میں اس کو یاد کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کے لئے جگہ کا تعین بھی فرما دیا۔ اس جگہ پر بنو اسرائیل کے ایک شخص کا گھر تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس شخص سے گھر بیچنے کیلئے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ اس شخص سے وہ جگہ زبردستی حاصل کر لیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ اے داؤد! میں نے تمہیں اپنا گھر تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا جس میں میرا ذکر کیا جائے اور تم میرے گھر میں غصب کو داخل کرنا چاہتے ہو۔ غصب کرنا میری شان کے شایان نہیں ہے اور تمہاری اس غلطی کی سزا یہ ہے کہ میرا گھر تعمیر کرنے کے شرف سے محروم رہو گے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگار! کیا میری اولاد اس گھر کو تعمیر کر سکے گی؟ فرمایا: ہاں تمہاری اولاد کو یہ شرف حاصل ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث سنی تو ان کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا: میں تمہارے پاس ایک مسئلہ لے کر آیا تھا اور تم نے ایک ایسا مسئلہ پیدا کر دیا ہے جو اس پہلے مسئلے سے بھی شدید تر ہے۔ تمہیں اپنے قول کے گواہ پیش کرنا

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 9-108

ہوں گے۔ وہ انہیں پکڑ کر مسجد میں لے آئے اور انہیں صحابہ کرام کے ایک حلقے کے پاس لا کر کھڑا کیا۔ ان صحابہ کرام میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مجمع صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ جس شخص نے حضور ﷺ سے وہ حدیث سنی ہو جس میں حضرت داؤد علیہ السلام کو بیت المقدس کی تعمیر کا حکم ملنے کا ذکر ہے، وہ اسے بیان کرے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے یہ حدیث حضور ﷺ سے سنی ہے۔ ایک اور آدمی کھڑا ہوا۔ اس نے بھی کہا: میں نے بھی یہ حدیث حضور ﷺ سے سنی ہے۔ ایک تیسرے آدمی نے بھی یہی گواہی دی تو حضرت عمر نے حضرت ابی رضی اللہ عنہما کو چھوڑ دیا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: عمر! کیا تم مجھ پر حضور ﷺ کی حدیث کے متعلق تہمت لگاتے ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں متہم نہیں کرتا۔ میں نے تو حدیث کے سلسلہ میں احتیاط کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔(1)

حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ فرماتے سنا:

میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، جس کی قدرت سے زمین و آسمان قائم ہیں، کیا تم جانتے ہو کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

اِنَّا لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَةٌ (2)

"ہماری وراثت تقسیم نہیں ہوتی، ہم جو مال چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس سوال پر ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا: ہاں! خدا کی قسم، ہمیں اس حدیث پاک کا علم ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: میں جب حضور ﷺ سے کوئی حدیث سنتا تو اللہ تعالیٰ اس حدیث سے جو چاہتا مجھے نفع عطا فرماتا۔ جب کوئی دوسرا میرے سامنے کوئی حدیث بیان کرتا تو میں اس سے قسم لیتا۔ جب وہ قسم اٹھاتا تو میں اس کی

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 15-114

2۔ ایضاً، صفحہ 116، بحوالہ مسند امام احمد

حدیث کو تسلیم کرلیتا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے حدیث سنائی اور انہوں نے سچ فرمایا کہ انہوں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

"جب کوئی آدمی گناہ کر بیٹھتا ہے، پھر وضو کرتا ہے اور عمدہ طریقے سے وضو کرتا ہے، پھر دو رکعت نماز پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادیتا ہے۔" (1)

اس سختی سے صحابہ کرام کا مقصد یہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کے حوالے سے جو بات بھی سنیں، اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ ہو۔ انہوں نے اس احتیاط کے لئے کوئی مخصوص شرط مقرر نہیں کی۔ نہ تو کوئی حدیث قبول کرنے کیلئے ایک سے زیادہ راویوں کی شرط لگائی۔ نہ حدیث کی صداقت کو اس بات پر منحصر قرار دیا کہ حدیث کا راوی قسم کھا کر کہے کہ وہ سچ بیان کر رہا ہے بلکہ ان کے پیش نظر صرف یہ بات ہوتی تھی کہ حدیث پاک کے متعلق انہیں یقین کامل اور وثوق حاصل ہو جائے۔ یہ یقین کامل خواہ گواہوں کے ذریعے حاصل ہوتا، خواہ قسم کے ذریعے خواہ کسی اور قرینے سے۔

صحابہ کرام جس طرح حدیث کو قبول کرنے کے لئے پوری پوری احتیاط برتتے تھے، اسی طرح وہ حدیث کو روایت کرنے کے لئے بھی انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس احتیاط کا سبب ان کا یہ خوف تھا کہ کہیں وہ کوئی حدیث بیان کرنے میں غلطی نہ کر بیٹھیں اور اس طرح کسی غلط بات کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کرنے کے مجرم قرار پائیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے روایت حدیث میں اعتدال کا طریقہ اپنایا بلکہ ان میں سے اکثر نے بہت کم احادیث روایت کرنے کو ترجیح دی۔ اسی لئے بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جو سفر و حضر میں حضور ﷺ کے ساتھ رہے، ان سے بہت کم احادیث مروی ہیں، جیسے حضرت ابو بکر صدیق، حضرت زبیر، حضرت عبیدہ اور حضرت عباس بن عبد المطلب رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

بعض صحابہ کرام جب حدیث روایت کرنے کا ارادہ فرماتے تو حضور ﷺ کی حدیث پاک کے رعب کی وجہ سے ان پر رعشہ طاری ہو جاتا۔ حضرت عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: "میں ہر جمعرات کی شام بلاناغہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ

1۔1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 116

تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتا لیکن میں نے کبھی آپ کی زبان سے یہ الفاظ نہیں سنے کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔ ایک شام ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔" راوی کہتے ہیں کہ یہ الفاظ کہتے ہی وہ جھک گئے، میں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ کھڑے تھے، ان کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے، آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا اور گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔(1)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر مجھے یہ خوف نہ ہو کہ مجھ سے غلطی سرزد ہو جائے گی تو میں تمہیں بہت سی ایسی باتیں سناؤں جو میں نے حضور ﷺ سے سنی ہیں۔" حضرت انس جب حضور ﷺ کی حدیث بیان فرماتے تو آپ پر خوف طاری ہو جاتا اور آپ حدیث بیان کرنے کے بعد یہ الفاظ کہتے:

اَوْ کَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

"یا جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔"

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی معمول تھا۔(2)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں تمہیں زیادہ احادیث سنانے سے اس لئے باز رہتا ہوں کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "جو مجھ پر عمداً جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم کو بنانے کی تیاری کرے۔"(3)

حضرت عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں: میں نے انصار میں سے حضور ﷺ کے ایک سو بیس صحابہ کرام ایسے دیکھے ہیں کہ جب ان میں سے کسی صحابی کو کوئی حدیث بیان کرنی پڑتی تو اس کی خواہش یہی ہوتی کہ کاش اس کا کوئی دوسرا بھائی اس حدیث کو بیان کر دیتا اور اس کو وہ حدیث بیان نہ کرنی پڑتی، اسی طرح اگر ان میں سے کسی سے کوئی فتویٰ پوچھا جاتا تو ان کی خواہش یہی ہوتی کہ ان کا کوئی دوسرا بھائی یہ مسئلہ بیان کر دے تاکہ ان کو یہ بوجھ نہ اٹھانا پڑے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ان سے کسی سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ سائل کو دوسرے صحابی کے پاس بھیج دیتے، دوسرا تیسرے کے پاس، اس طرح مسئلہ چکر

1۔ "اسوہ صحابہ"، صفحہ 93، بحوالہ سنن ابن ماجہ

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

لگاتے لگاتے پھر پہلے صحابی کے پاس پہنچ جاتا۔(1)

روایت حدیث کے متعلق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رویے کو سمجھنے کے لئے مندرجہ بالا حدیث انتہائی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس حدیث پاک سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک طرف تو حدیث کی اس امانت کو ملت کے سپرد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے جو انہیں حضور ﷺ سے ملی تھی لیکن ساتھ ہی کسی قسم کی غلطی ہو جانے کے امکان کی وجہ سے وہ حدیث بیان کرتے ہوئے کانپتے بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ تو حدیث کو اپنے سینوں میں چھپا کر رکھا اور نہ ہی حدیث کی روایت کو مشغلہ سمجھا۔ اس کے برعکس ان کی خواہش یہی ہوتی کہ ان کے پاس جو حدیث ہے اس کو بیان کرنے کا بار گراں اگر کوئی دوسرا مسلمان اٹھالے تو اس طرح ان کی ذمہ داری بھی پوری ہو جائے اور ان کو یہ بوجھ بھی نہ اٹھانا پڑے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو اس بات سے بھی ڈرتے تھے کہ ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو خلاف واقعہ ہو۔ جب عام جھوٹ کے متعلق احتیاط کا یہ عالم تھا تو حضور ﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے کے تصور سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر جو گزرتی ہو گی، اسے وہ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔

جن احادیث طیبہ میں حضور ﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے کو بہت بڑا جرم قرار دیا گیا ہے ان احادیث کے رعب کی وجہ سے صحابہ کرام انفرادی طور پر بھی قلت روایت کی طرف مائل تھے اور اجتماعی طور پر بھی ایسی کوششیں کی جاتی تھیں کہ لوگ روایت حدیث میں انتہائی محتاط رویہ اختیار کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت حدیث اور قبول حدیث میں سخت احتیاط کو ملت کا عمومی منہاج بنانے کے لئے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ نے حدیث کے راویوں میں احتیاط کے جس رویے کو پیدا کر دیا تھا، اس کا اندازہ ہمیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے ہوتا ہے۔ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ جس طرح اب احادیث روایت کرتے ہیں، کیا آپ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی احادیث روایت کرتے تھے؟ آپ نے جواب دیا:

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 94

لَوْ كُنْتُ اُحدِّثُ فِیْ زمانِ عُمرَ مثلَ ما اُحدِّثُکُمْ لضربنی بمخفقتہ (1)

"اگر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یوں ہی احادیث روایت کرتا جیسے اب روایت کرتا ہوں تو وہ مجھے ضرور اپنے درے سے مارتے۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو منہاج مقرر فرمایا تھا، وہ صرف آپ کے عہد تک محدود نہیں رہا بلکہ بعد کے خلفاء بھی اسی منہاج پر کاربند رہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

لا یحلُّ لاحدٍ یرْوِیْ حدیثًا عنْ رَسُوْلِ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم لمْ اسْمعْ بہٖ فِیْ عھدِ ابِیْ بکرٍ ولا عھدِ عُمرَ (2)

"کسی شخص کو ایسی حدیث روایت کرنے کی اجازت نہیں جو میں نے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانوں میں نہیں سنی۔"

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی روایت حدیث میں اسی منہاج پر قائم رہے اور آپ کے بعد بھی مسلمانوں نے اس رویہ کو نہیں چھوڑا۔

روایت ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ فرمایا کرتے تھے:

اِتَّقُوا الرِّوایاتِ عنْ رَسُوْلِ اللہ صلّی اللہُ علیْہِ وسلّمَ اِلاّ ما کانَ یُذکرُ منْھا فِیْ زمنِ عُمرَ فَاِنَّ عُمرَ کانَ یُخوِّفُ النّاسَ فِی اللہِ تعالیٰ (3)

"حضور ﷺ کی احادیث روایت کرنے کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ صرف وہ احادیث بیان کیا کرو جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد ہمایوں میں روایت ہوتی تھیں کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 96

2۔ ایضاً، صفحہ 97

3۔ ایضاً، صفحہ 98

عنہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں لوگوں کو ڈرایا کرتے تھے۔"

حیرت ہے جس عہد کے لوگ روایت حدیث کے بارے میں اتنے محتاط ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی روایت کردہ احادیث کے علاوہ کسی حدیث کو قبول کرنے کے روادار نہیں، وضع حدیث کو اس دور کا کارنامہ کہا جاتا ہے۔

متاخر ائمہ حدیث نے بھی احادیث کے متعلق اسی احتیاط کو پیش نظر رکھا۔ اس حقیقت کی وضاحت حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول سے ہو جاتی ہے:

اَدْرَكْتُ سَبْعِيْنَ مِمَّنْ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اُؤْتُمِنَ وَاحِدٌ مِّنْهُمْ عَلٰى بَيْتِ مَالٍ لَكَانَ اَمِيْنًا لَمْ اٰخُذْ عَنْهُمْ لِاَنَّهُمْ لَمْ يَكُوْنُوْا مِنْ اَهْلِ هٰذَا الشَّاْنِ (1)

"میں نے ستر ایسے راویان حدیث سے ملاقات کی ہے کہ اگر ان میں سے کسی کو بھی بیت المال کی ذمہ داری سونپی جاتی تو وہ امانت دار ثابت ہوتا لیکن میں نے ان سے حدیث قبول نہیں کی کیونکہ ان کا مقام وہ نہیں تھا جو رسول خدا کی حدیث کے ایک راوی کا ہونا چاہئے۔"

یعنی بیت المال ملت اسلامیہ کی مادی زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے۔ اس کے لئے بھی انتہائی دیانت دار کارکنوں کی ضرورت ہے لیکن احادیث طیبہ کی روایت کیلئے دیانت کا اس سے بھی کہیں ارفع معیار درکار ہے۔ کیونکہ یہ قوم کی دینی زندگی کی بنیاد ہیں اور ملت کی زندگی کے تمام شعبوں کا دارومدار انہی احادیث طیبہ پر ہے۔

صحابہ کرام اور تابعین نے احادیث طیبہ کی محافظت کے لئے یہ منہاج اس لئے اپنایا تھا تاکہ احادیث کے ذخیرے میں جھوٹ راہ نہ پا جائے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہوتی جو مخصوص مفادات یا مخصوص خواہشات کے تحت غلط باتیں مشہور کرنے سے باز نہیں آتے۔ ایسے لوگوں کی شرارتوں سے احادیث طیبہ کے چشمہ صافی کو محفوظ رکھنے کے لئے ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اتنی احتیاط کا طریقہ اپنایا ہے۔ صحابہ کرام کی یہ تمام کاروائیاں اس لئے نہیں تھیں کہ وہ لوگوں کو حدیث سے دور رکھنا چاہتے تھے، یا ان کے

1۔ "المنہل اللطیف فی اصول الحدیث الشریف"، صفحہ 32

نزدیک احادیث کی کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ وہ تو احادیث طیبہ کو دین اسلام کا بنیادی ستون سمجھتے تھے اور اس ستون کو ہر قسم کی شرانگیزیوں سے محفوظ رکھنے کو اپنا مذہبی فریضہ گردانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایسا طریقہ کار اپنایا کہ ایک طرف تو وہ علم جو احادیث طیبہ کی شکل میں ان کے ہاں محفوظ تھا، وہ منجمد نہ ہونے پائے اور وہ ملت کی نئی نسلوں کو منتقل ہو اور دوسری طرف اس میں کسی قسم کے کذب کی ملاوٹ کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو۔

جو لوگ دین اسلام کے دشمن تھے، انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی احادیث طیبہ کے متعلق اس احتیاط کو غلط معنی پہنائے اور یہ مشہور کر دیا کہ اکابر صحابہ احادیث کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اور لوگوں کو احادیث روایت کرنے پر سزائیں دیتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ان احتیاطی تدابیر کو مخالفت سنت کا نام وہی شخص دے سکتا ہے جو صحابہ کرام کے کردار سے بالکل ناآشنا ہو۔ وہ احادیث طیبہ جن میں روایت حدیث کے متعلق صحابہ کرام کی سختی کا ذکر ہے، وہ احادیث اس سختی کے سبب کی بھی وضاحت کرتی ہیں لیکن جن لوگوں کے دل مریض ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کی بات لے لیتے ہیں اور جو بات ان کے مطلب کے خلاف ہو اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے حفاظت حدیث کے جن طریقوں کا ذکر کیا ہے وہ صرف ملت اسلامیہ ہی کا حصہ ہیں۔ جس پیغام کی حفاظت کا طریقہ یہ اپنایا جائے کہ وہ پیغام ملت کے کثیر افراد کے سینوں میں بھی محفوظ ہو، پوری ملت کا کردار اسی پیغام کے رنگ میں رنگا ہو اور پوری ملت شب و روز اسی پیغام کی اشاعت میں مصروف ہو، اس پیغام کے مٹ جانے یا اس میں کسی قسم کی ملاوٹ ہو جانے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

ملت اسلامیہ جب تک اس منہاج پر قائم رہی، اس وقت تک احادیث طیبہ کا پیغام لاکھوں چلتے پھرتے انسانوں کی زندگیوں میں جلوہ گر نظر آتا رہا اور کسی کو احادیث طیبہ میں کذب کی آمیزش کی جرات نہ ہوئی لیکن جب مسلمانوں کی زندگیوں میں اتباع سنت کا عنصر کمزور ہوتا گیا تو کچھ بد نہادوں نے وضع حدیث کی کوششیں کیں۔ کچھ لوگوں نے اس منہاج کو مد نظر نہ رکھا جو قبول حدیث کے سلسلہ میں فاروق اعظم اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مقرر کیا تھا، اور ان لوگوں نے اپنی تصنیفات میں ایسی روایات کو بھی جگہ دے دی جو موضوع تھیں لیکن علمائے ملت کی اکثریت جو اسی منہاج پر کاربند

تھی جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مقرر کیا تھا، انہوں نے جھوٹ کو سچ سے الگ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگائی اور امت کو احادیث گھڑنے والوں کے فتنے سے خبر دار کر کے، اس فتنے کو سر اٹھاتے ہی کچل دیا۔

کتابت و تدوین حدیث

ہم نے حفاظت حدیث کی جن کوششوں کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا ہے، مستشرقین اور ان کے خوشہ چین ان کوششوں کو تو خاطر میں نہیں لاتے اور کہتے ہیں کہ چونکہ احادیث طیبہ دوسری یا تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئیں اور تدوین کا کام کرنے والوں کا بھروسہ صرف اور صرف زبانی مصادر پر تھا اس لئے، ان کے خیال میں، جو چیز صدیوں غیر مدون شکل میں رہی، اس کے متعلق یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی اصلی حالت میں ہے۔

گو مستشرقین کا یہ شوشہ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ تدوین کے بغیر کسی چیز کی حفاظت ممکن نہیں اور اس کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ برطانیہ جو اکثر مستشرقین کا وطن ہے، اس ملک کا آئین تحریری شکل میں موجود نہیں لیکن مدون نہ ہونے کے باوجود وہ آئین محفوظ ہے اور برطانوی لوگ اسی آئین کے مطابق اپنے ملک کو چلا رہے ہیں اور دعوی کرتے ہیں کہ ان کا ملک ہی اصل جمہوری ملک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا آئین ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکا ہے، اس لئے تحریری شکل میں موجود نہ ہونے کے باوجود وہ زندہ ہے اور ان آئینوں کی نسبت زیادہ قوت کے ساتھ زندہ ہے جو تحریری شکل میں موجود تو ہیں لیکن متعلقہ قوموں کی زندگیوں میں ان کی روح نظر نہیں آتی۔

مسلمانوں نے جس انداز میں احادیث طیبہ کو اپنی زندگیوں میں نافذ کیا تھا، اگر احادیث تحریری شکل میں موجود نہ ہوتیں تو بھی احادیث کی صحت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر رہتی لیکن یہ تصور کرنا بالکل غلط ہے کہ مسلمانوں نے پورے دو سو سال احادیث طیبہ کی تدوین کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ حق یہ ہے کہ گو مسلمانوں نے حفاظت حدیث کے سلسلہ میں کتابت کے علاوہ دیگر وسائل پر زیادہ بھروسہ کیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے احادیث کی کتابت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

مستشرقین اسلام کے ابتدائی زمانے میں احادیث کے نہ لکھے جانے کے نظریے کی

تائید مختلف مفروضوں سے کرتے ہیں۔ کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ عرب لکھنے پڑھنے کے فن سے کلیۃً ناآشنا تھے۔ وہ بدویانہ زندگی گزارتے تھے اور تہذیب سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے بے خبر تھے۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے احادیث لکھنے کی سختی سے ممانعت فرما دی تھی، اس لئے مسلمانوں نے احادیث کو لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام اور تابعین میں بکثرت لوگ ایسے تھے جو احادیث کی کتابت کے مخالف تھے۔ اس لئے مسلمانوں میں حدیث کی کتابت کا رواج پذیر ہونا ممکن نہ تھا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتابت و تدوین حدیث کے متعلق مسلمانوں کی کوششوں کے تذکرے سے پہلے ان مفروضوں کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا جائے تاکہ قارئین کے اذہان ہر قسم کے وسوسوں سے محفوظ رہیں۔

کیا عرب نوشت وخواند سے کلیۃً ناآشنا تھے؟

مستشرقین نے اس سلسلے میں دو متضاد موقف اختیار کئے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اسلام سے پہلے عربوں میں صرف گنتی کے چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اس طرح وہ عربوں کو بالکل اجڈ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ عربوں میں لکھنے پڑھنے والوں کی کمی نہ تھی بلکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا عام رواج تھا۔ اس خیال کے لوگ اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے یہاں تک چلے جاتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں امت مسلمہ کو "امیین" (1) کے لقب سے یاد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں آئی تھی۔ گویا وہ دینی نقطہ نگاہ سے امی تھے۔ ان کو امی اس لئے نہیں کہا گیا کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

مستشرقین کے یہ دونوں موقف حق سے کوسوں دور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب نہ تو نوشت وخواند سے کلیۃً بے بہرہ تھے اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں میں لکھنے پڑھنے کا اتنا عام رواج تھا کہ انہیں امی کہا ہی نہ جا سکے۔

عربوں میں کتابت کے رواج کے متعلق ڈاکٹر فواد سزگین اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ تدوین حدیث" میں رقمطراز ہیں:

1۔ هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ الایۃ۔ (سورۃ الجمعہ 2)

اسلام سے ایک صدی قبل کے بعض شعراء کی روایات سے ہم کو کم از کم یہ پتہ چلتا ہے کہ دواوین سے روایت ان کے ہاں ایک رائج طریقہ تھا اور بعض شعراء کو تو لکھنے کی بھی عادت تھی۔

زہیر بن ابی سلمہ جیسے شعراء خود اپنے قصائد کی تنقیح کیا کرتے تھے......

یہ نظریہ کہ جاہلی شاعری کا سارا ذخیرہ زبانی روایت پر مبنی ہے، دور جدید ہی کی تخلیق ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک غلط خیال ہے کہ حدیث کی روایت محض زبانی ہوتی رہی ہے، بلکہ صدر اسلام میں نصوص مدونہ کو روایت کرنے کا رواج دور جاہلیہ کی عادت پر مبنی ہے۔(1)

عربوں میں نوشت وخواند کے رواج کے متعلق ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب اپنی کتاب "السنۃ قبل التدوین" میں لکھتے ہیں:

تَدُلُّ الدِّرَاسَاتُ الْعِلْمِيَّةُ عَلَى اَنَّ الْعَرَبَ كَانُوْا يَعْرِفُوْنَ الْكِتَابَةَ قَبْلَ الْاِسْلَامِ فَكَانُوْا يُؤَرِّخُوْنَ اَهَمَّ حَوَادِثِهِمْ عَلَى الْحِجَارَةِ (2)

"علمی تحقیقات اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہیں کہ عرب لوگ اسلام سے پہلے لکھنا جانتے تھے اور وہ اپنی اجتماعی زندگی کے اہم واقعات کو پتھروں پر لکھ دیتے تھے۔"

یہی مصنف ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

وَهٰذَا يَدُلُّ عَلَى وُجُوْدِ بَعْضِ الْكَتَاتِيْبِ فِى الْجَاهِلِيَّةِ يَتَعَلَّمُ فِيْهَا الصِّبْيَانُ الْكِتَابَةَ وَالشِّعْرَ وَاَيَّامَ الْعَرَبِ وَيُشْرِفُ عَلَى هٰذِهِ الْكَتَاتِيْبِ مُعَلِّمُوْنَ ذُوْ مَكَانَةٍ رَفِيْعَةٍ اَمْثَالُ اَبِى سُفْيَانَ بْنِ اُمَيَّةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ...... (3)

"اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ مدارس موجود تھے، جن میں بچے، کتابت، شاعری اور عربی تاریخ سیکھتے تھے اور ان مدارس کے سربراہ

1۔ مقدمہ تاریخ تدوین حدیث، صفحہ 31

2۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 295

3۔ ایضاً

بڑے بااثر معلم ہوتے تھے جیسے ابوسفیان بن امیہ بن عبد شمس وغیرہ۔"

وَكَانَ الْعَرَبُ يُطْلِقُوْنَ اِسْمَ "الكامِلِ" عَلى كُلِّ رَجُلٍ يَكْتُبُ وَيُحْسِنُ الرَّمْيَ وَيُجِيْدُ السِّبَاحَةَ (1)

"جو شخص کتابت، تیر اندازی اور تیراکی کا ماہر ہوتا، عرب اسے "کامل" کا لقب عطا کرتے تھے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات تو اسلام سے پہلے عرب میں کتابت کے رواج کا پتہ دیتے ہیں لیکن اسلام نے جہاں زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں دوررس تبدیلیاں کیں، وہاں اس نے عربوں کی علمی حالت میں بھی ایک انقلاب برپا کیا۔ قرآن حکیم کی بے شمار آیات قلم اور کتابت کی اہمیت کا پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اللہ تعالی نے قلم کو علم سکھانے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ سورۃ العلق میں ارشاد خداوندی ہے:

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (2)

"پڑھیے، آپ کا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم کے واسطے سے۔"

قرآن حکیم کے نزدیک قلم و کتابت کی اہمیت کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی ایک سورۃ کو "القلم" کا نام دیا گیا ہے اور اس سورۃ میں اللہ تعالی نے قلم کی بھی قسم کھائی ہے اور ان چیزوں کی بھی قسم کھائی ہے جنہیں قلم لکھتا ہے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (3)

"ن۔ قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔"

قرآن حکیم میں ان کے علاوہ اور بھی بے شمار آیات کریمہ کتابت اور علم کے تعلق کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی امت کو فن کتابت کے زیور سے آراستہ کرنے کے لئے خصوصی اہتمام فرمایا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کے مشن کا تقاضا ہی یہ تھا کہ آپ کی امت میں وہ لوگ کثیر تعداد میں موجود ہوں جو لکھنے پڑھنے کے فن میں

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 296

2۔ سورۃ العلق 3-4

3۔ سورۃ القلم 1

تک ہوں کیونکہ آپ ایک عالمی دین لے کر تشریف لائے تھے جس نے قیامت تک ساری نسل انسانی کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا تھا۔ آپ کے پیش نظر ایک ایسی امت کی تشکیل تھی جو اس خدائی پیغام کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلائے۔ دین کی حفاظت اور ملت کے دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اجتماعی امور کو سرانجام دینے کے لئے فن کتابت کی اشد ضرورت تھی اور قرآن حکیم کی کئی آیات کریمہ اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر کے موقعہ پر مکہ کے جو لوگ جنگی قیدی بنے، ان میں سے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان کی آزادی کے لئے حضور ﷺ نے فدیہ یہ مقرر فرمایا تھا کہ ان میں سے ہر ایک مسلمانوں کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ ہجرت سے پہلے ہی حضور ﷺ کے صحابہ کرام میں ایک معقول تعداد ان لوگوں کی تھی جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور کتابت وحی کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ ہجرت کے بعد تو حضور ﷺ نے دیگر علوم کی طرح فن کتابت کو بھی ترقی دینے کے لئے خصوصی اہتمام فرمایا۔ ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب لکھتے ہیں:

وَقَدْ كَثُرَ الْكَاتِبُوْنَ بَعْدَ الْهِجْرَةِ عِنْدَمَا اِسْتَقَرَّتِ الدَّوْلَةُ الْاِسْلَامِيَّةُ فَكَانَتْ مَسَاجِدُ الْمَدِيْنَةِ التِّسْعَةُ اِلٰى جَانِبِ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَحَطَّ اَنْظَارِ الْمُسْلِمِيْنَ يَتَعَلَّمُوْنَ فِيْهَا الْقُرْاٰنَ الْكَرِيْمَ وَتَعَالِيْمَ الْاِسْلَامِ وَالْقِرَاءَةَ وَالْكِتَابَةَ وَقَدْ تَبَرَّعَ الْمُسْلِمُوْنَ الَّذِيْنَ يَعْرِفُوْنَ الْكِتَابَةَ وَالْقِرَاءَةَ بِتَعْلِيْمِ اِخْوَانِهِمْ (1)

”ہجرت کے بعد جب اسلامی ریاست کو استحکام حاصل ہو گیا تو کاتبوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ طیبہ کی دیگر نو مساجد مسلمانوں کی نگاہوں کا مرکز تھیں اور ان مساجد میں مسلمان قرآن حکیم، اسلامیات اور قرات و کتابت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور جو مسلمان لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہ رضاکارانہ طور پر اپنے مسلمان بھائیوں کی تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔“

1۔ ”السنۃ قبل التدوین“، صفحہ 299

وَكَانَ اِلٰى جَانِبِ هٰذِهِ الْمَسَاجِدِ كَتَاتِيْبُ يَتَعَلَّمُ فِيْهَا الصِّبْيَانُ الْكِتَابَةَ وَالْقِرَاءَةَ اِلٰى جَانِبِ الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ (1)

"ان مساجد کے علاوہ کچھ مدارس بھی تھے جن میں بچے قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ قراءت اور کتابت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔"

یہ تفصیلات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عہد نبوی میں ملت اسلامیہ کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ کسی چیز کی تدوین کی اہلیت ہی نہیں رکھتی تھی، غلط ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے قرآن حکیم کو کامیابی کے ساتھ مدون کر لیا تھا، حدیث کی تدوین ان کے لئے ناممکن نہ تھی۔ اس لئے مستشرقین کا یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمانوں نے دور اول میں احادیث طیبہ کی تدوین اس لئے نہیں کی کہ وہ اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتے تھے۔

احادیث لکھنے کی ممانعت کا مسئلہ

مستشرقین کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا اس لئے بہت سے صحابہ کرام احادیث لکھنے کو ناپسند کرتے تھے اور لکھنے والوں کو منع کرتے تھے۔ بعد کے ادوار میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو تدوین حدیث کے خلاف تھے۔

مستشرقین کے اس اعتراض کو سمجھنے اور اس کے جواب کے لئے قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضور ﷺ کی بعض ایسی احادیث موجود ہیں جن میں احادیث کو لکھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ بعض صحابہ کرام سے بھی ایسے آثار مروی ہیں کہ انہوں نے احادیث لکھنے کو ناپسند فرمایا۔ دور تابعین میں بھی ایسے لوگ نظر آتے ہیں جن کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ احادیث لکھنے کے خلاف تھے۔

رَوٰى اَبُوْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيُّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ: لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ شَيْئًا غَيْرَ الْقُرْاٰنِ وَمَنْ كَتَبَ عَنِّيْ شَيْئًا غَيْرَ الْقُرْاٰنِ فَلْيَمْحُهٗ (2)

"حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے

1۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 299

2۔ "المنہل اللطیف فی اصول الحدیث الشریف"، صفحہ 17

ہیں کہ آپ نے فرمایا: میری طرف سے سوائے قرآن حکیم کے کوئی چیز نہ لکھو۔اور جس نے قرآن حکیم کے بغیر کچھ لکھا ہو، وہ اسے مٹا دے۔''

علامہ محمد بن علوی المالکی الحسنی فرماتے ہیں:

وَهٰذَا هُوَ الْحَدِيْثُ الصَّحِيْحُ الْوَحِيْدُ فِي الْبَابِ (1)

''اس موضوع پر یہی واحد صحیح حدیث ہے۔''

اس حدیث کے علاوہ بعض کتابوں میں اس مفہوم کی کچھ اور احادیث بھی مل جاتی ہیں۔ اس قسم کی احادیث، صراحۃً کتابت حدیث سے منع کر رہی ہیں۔ جو لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ احادیث طیبہ کی کتابت و تدوین دوسری یا تیسری صدی ہجری سے پہلے نہیں ہوئی، وہ صرف اسی مفہوم کی احادیث کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ احادیث کی کتابت سے منع کرنے والی ان احادیث کے ساتھ ساتھ ایسی احادیث بھی کثرت سے موجود ہیں جو احادیث طیبہ کو لکھنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اور بعض احادیث سے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ نے احادیث لکھنے کا حکم دیا۔

فتح مکہ کے موقعہ پر حضور ﷺ نے خطبہ دیا تو ایک یمنی شخص کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کا نام ابو شاہ تھا۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! (اس خطبہ کو) میرے لئے تحریر کروا دیجئے۔ اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اُكْتُبُوْا لَهٗ اسے لکھ دو۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: اُكْتُبُوْا لِاَبِيْ شَاهٍ یعنی اسے ابو شاہ کے لئے لکھ دو۔ (2)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

كُنْتُ اَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ اَسْمَعُهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُرِيْدُ حِفْظَهٗ فَنَهَتْنِيْ قُرَيْشٌ وَقَالُوْا تَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ سَمِعْتَهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِي الْغَضَبِ وَالرِّضَا فَاَمْسَكْتُ عَنِ الْكِتَابِ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

1۔ ''المنہل اللطیف فی اصول الحدیث الشریف''، صفحہ 17

2۔ ایضاً، صفحہ 18-17

فَاَوْ مَأَ بِاِصْبَعِهٖ اِلٰى فِيْهِ وَقَالَ: "اُكْتُبْ فَوَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ مَا خَرَجَ مِنْهُ اِلاَّ حَقٌّ" (1)

"میں حضور ﷺ سے جو کچھ سنتا اسے لکھ لیتا تھا۔ میرا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اسے حفظ کرلوں گا۔ قریش نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا تم جو کچھ حضور ﷺ سے سنتے ہو، اسے لکھ لیتے ہو حالانکہ حضور ﷺ بشر ہیں، آپ غصے اور رضا ہر حال میں کلام فرماتے ہیں۔ میں نے لکھنا چھوڑ دیا اور اس بات کا ذکر حضور ﷺ کی خدمت میں کیا۔ حضور ﷺ نے اپنی انگشت پاک سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: لکھا کرو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس زبان سے ہمیشہ حق بات ہی نکلتی ہے۔"

اس حدیث پاک کی تائید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بھی کرتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

مَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَدٌ اَكْثَرَ حَدِيْثًا عَنِّىْ اِلاَّ مَا كَانَ مِنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو فَاِنَّهٗ كَانَ يَكْتُبُ وَلاَ اَكْتُبُ (2)

"صحابہ کرام میں سے کسی کے پاس مجھ سے زیادہ احادیث پاک کا ذخیرہ نہیں سوائے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے کیونکہ وہ لکھا کرتے تھے اور میں لکھا نہیں کرتا تھا۔"

رُوِىَ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَجُلاً مِّنَ الْاَنْصَارِ كَانَ يَشْهَدُ حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلاَ يَحْفَظُهٗ فَيَسْاَلُ اَبَا هُرَيْرَةَ فَيُحَدِّثُهٗ ثُمَّ شَكَا قِلَّةَ حِفْظِهٖ اِلَى الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ النَّبِىُّ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلاَمُ: "اِسْتَعِنْ عَلٰى

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 4-303، بحوالہ سنن الدارمی

2۔ ایضاً، صفحہ 304، بحوالہ فتح الباری

حِفْظِكَ بِيَمِيْنِكَ" (1)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انصار میں سے ایک شخص حدیث رسول ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتا لیکن احادیث کو یاد نہ رکھ سکتا۔ پھر وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے درخواست کرتا تو وہ اسے احادیث سناتے۔ پھر اس نے اپنے حافظہ کی کمی کی شکایت حضور ﷺ سے کی تو آپ نے اس سے فرمایا: اپنے حافظے کی مدد اپنے دائیں ہاتھ سے کیا کرو یعنی حفظ کے ساتھ ساتھ احادیث کو لکھ لیا کرو۔"

رُوِیَ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ اَنَّهٗ قَالَ: قُلْنَا: یَارَسُوْلَ اللهِ! اِنَّا نَسْمَعُ مِنْكَ اَشْیَاءَ اَفَنَكْتُبُهَا؟ قَالَ: اُكْتُبُوْا وَلَا حَرَجَ (2)

"حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ہم نے عرض کیا:
یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ہم آپ سے کئی اشیاء سنتے ہیں، کیا ہم انہیں لکھ لیا کریں؟ آپ نے فرمایا: لکھ لیا کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

رُوِیَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهٗ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَيِّدُوْا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ (3)

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: علم کو تحریر کے ذریعے مقید کرلو۔"

ہم نے سطور بالا میں وہ حدیث بھی نقل کر دی ہے جو کتابت حدیث کی ممانعت پر دلالت کرتی ہے اور ساتھ ہی متعدد ایسی احادیث طیبہ بھی بیان کر دی ہیں جو کتابت حدیث کے جواز کو ثابت کرتی ہیں۔ بظاہر ان احادیث طیبہ میں تضاد نظر آتا ہے لیکن

1۔ ایضاً، صفحہ 304، بحوالہ فتح الباری

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

حقیقت میں یہاں تضاد نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ اصول حدیث میں احادیث کے مابین وہ تعارض ممتنع ہے جہاں کسی حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح بھی نہ دی جا سکے اور دونوں احادیث کو یکجا کرنا بھی ممکن نہ ہو۔ کتابت حدیث کی ممانعت اور اجازت کے متعلق احادیث طیبہ کو کئی طرح سے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ علامہ محمد بن علوی المالکی الحسنی فرماتے ہیں:

وَالْحَقُّ اَنَّهٗ لَا تَعَارُضَ وَقَدْ اِجْتَهَدَ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْعِلْمِ فِي الْجَمْعِ بَيْنَهُمَا وَاَحْسَنُ مَآ اَرَاهُ فِيْ ذَالِكَ هُوَ الْقَوْلُ بِنَسْخِ اَحَادِيْثِ النَّهْيِ عَنِ الْكِتَابَةِ (1)

"حق یہ ہے کہ یہاں کسی قسم کا تعارض نہیں۔ علماء نے ان احادیث میں تطبیق کی کئی صورتیں بیان کی ہیں جو رائے میرے نزدیک ان میں سب سے زیادہ اچھی ہے وہ یہ ہے کہ ایسی احادیث جن میں کتابت احادیث کی ممانعت کی گئی ہے وہ منسوخ ہیں۔"

اپنے موقف کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علامہ محمد بن علوی المالکی فرماتے ہیں:

"ہمیں دیکھنا ہے کہ کتابت حدیث کی ممانعت پر دلالت کرنے والی احادیث کا زمانہ مقدم ہے یا ان احادیث کا جن میں کتابت حدیث کی اجازت دی گئی ہے۔ اگر ممانعت والی احادیث ابتدائی زمانے کی ہوں اور اجازت والی احادیث بعد کے زمانے کی تو مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ جن احادیث میں کتابت حدیث کی اجازت ہے وہ مقدم ہیں اور ممانعت والی موخر تو اس سے وہ حکمت ہی فوت ہو جاتی ہے جس کے تحت احادیث لکھنے کی ممانعت کی گئی۔ وہ حکمت یہ تھی کہ قرآن اور حدیث میں التباس پیدا نہ ہو جائے، جیسے کہ حضور ﷺ کے ارشاد گرامی سے ظاہر ہے۔ آپ نے فرمایا:

اَمْحِضُوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَاَخْلِصُوْهُ (2)

"اللہ تعالیٰ کی کتاب کو ہر قسم کے شائبہ التباس سے پاک رکھو۔"

قرآن اور حدیث میں التباس کا خدشہ اسلام کے ابتدائی دور میں تو قابل فہم ہے جب ابھی فن کتابت بھی عام نہیں ہوا تھا اور مدینہ میں یہودی اور منافقین بھی تھے۔ ان حالات

1۔ المنہل اللطیف، صفحہ 19-18

2۔ ایضاً، صفحہ 19

میں قرآن اور حدیث کے درمیان التباس کا خدشہ تھا، اس لئے احادیث کی کتابت کو منع کر دیا گیا تا کہ لوگ قرآن حکیم کی طرف پوری پوری توجہ دیں اور کتابت قرآن کے ساتھ کتابت حدیث کی وجہ سے دونوں میں التباس پیدا نہ ہو۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ابتدا میں تو احادیث لکھنے کی اجازت ہو اور جب کتابت کا فن عام ہو گیا اور قرآن و حدیث میں التباس کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تو احادیث لکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ ممانعت والی احادیث اجازت والی احادیث سے مقدم ہیں اور ممانعت والی احادیث منسوخ ہیں۔

مستشرقین کو ناسخ اور منسوخ والا مسئلہ نا قابل فہم نظر آتا ہے۔ ہم نے ناسخ و منسوخ کی بحث میں یہ ثابت کیا ہے کہ خود عہد نامہ قدیم و جدید میں بے شمار مسائل ایسے ہیں جو منسوخ ہیں اور نسخ کو تسلیم کرنے کے بغیر ان مسائل کی توضیح کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ لیکن علمائے ملت اسلامیہ نے کتابت حدیث کی ممانعت اور جواز کے متعلق مرویہ احادیث میں تطبیق کی اور بھی کئی صورتیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ ممانعت ان لوگوں کے لئے ہے جن کا حافظہ اچھا ہے۔ ان کو کتابت سے اس لئے منع کیا گیا ہے تا کہ وہ کتابت پر بھروسہ کر کے احادیث کو حفظ کرنے کے معاملہ میں سستی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اور اجازت ان لوگوں کے لئے ہے جن کو اپنے حافظوں پر اعتبار نہ تھا جیسے "ابوشاہ" کہ اس کے لئے حضور ﷺ نے حدیث کو لکھنے کا خود حکم فرمایا۔ تطبیق کی ایک اور صورت علمائے کرام نے یہ بیان کی ہے کہ عام لوگوں کے لئے تو کتابت کی ممانعت تھی کیونکہ کتابت میں ماہر نہ ہونے کی وجہ سے التباس اور غلطی کا امکان موجود تھا لیکن جو لوگ فن کتابت کے ماہر تھے اور اس مہارت کی وجہ سے جن سے غلطی اور التباس کا امکان نہ تھا، ان کو احادیث لکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ جیسے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو حضور ﷺ نے احادیث لکھنے کی اجازت فرمائی کیونکہ وہ کتابت کے فن میں ماہر تھے اور ان سے غلطی کا اندیشہ نہ تھا۔

جس طرح حضور ﷺ کی احادیث طیبہ میں کتابت حدیث کی ممانعت کے ساتھ ساتھ اس کی اجازت بھی موجود ہے، اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل سے بھی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ احادیث لکھنے سے منع بھی کرتے ہیں لیکن اس کے

باوجود خود حدیث لکھتے بھی ہیں اور لکھنے کے بعد اسے مٹاتے بھی ہیں۔

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَرَادَ اَنْ يَّكْتُبَ السُّنَنَ فَاسْتَفْتٰى اَصْحَابَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ ذَالِكَ فَاَشَارُوْا عَلَيْهِ بِاَنْ يَّكْتُبَهَا فَطَفِقَ عُمَرُ يَسْتَخِيْرُ اللّٰهَ فِيْهَا شَهْرًا ثُمَّ اَصْبَحَ يَوْمًا فَقَدْ عَزَمَ اللّٰهُ لَهٗ فَقَالَ: اِنِّیْ كُنْتُ اُرِيْدُ اَنْ اَكْتُبَ السُّنَنَ وَاِنِّیْ ذَكَرْتُ قَوْمًا كَانُوْا قَبْلَكُمْ كَتَبُوْا فَاَكَبُّوْا عَلَيْهَا وَتَرَكُوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَاِنِّیْ وَاللّٰهِ لَا اَشُوْبُ كِتَابَ اللّٰهِ بِشَیْءٍ اَبَدًا (1)

"حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احادیث لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ آپ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرام کی رائے معلوم کی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے احادیث کو لکھنے کے حق میں رائے دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پورا مہینہ اس کے لئے استخارہ کرتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ پر معاملہ واضح فرمادیا اور آپ نے فرمایا: میں نے احادیث طیبہ کو لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن مجھے تم سے پہلی ایک قوم کا خیال آگیا۔ انہوں نے کئی کتابیں مرتب کیں۔ وہ ان کتابوں میں مشغول ہوگئے اور انہوں نے کتاب اللہ کو ترک کردیا۔ خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کبھی کسی چیز سے نہیں ملاؤں گا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس حضرت علقمہ رضی اللہ عنہما ایک صحیفہ لائے، جس میں احادیث تھیں۔ صحیفہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے پانی منگایا اور وہ صحیفہ پانی میں ڈال دیا پھر فرمایا: تمہارے دل برتن ہیں انہیں صرف قرآن میں مشغول رکھو اور اپنے دلوں کو قرآن حکیم کے سوا کسی چیز میں مشغول نہ کرو۔ (2)

یہی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 310

2۔ ایضاً، صفحہ 312

مَا کُنَّا نَکْتُبُ فِیْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلّٰی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلاَّ الْاِسْتِخَارَةَ وَالتَّشَهُّدَ (1)

"ہم حضور ﷺ کے زمانے میں استخارہ اور تشہد کے سوا کچھ نہیں لکھتے تھے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث قرآن حکیم کے علاوہ کچھ اور بھی لکھنے کا جواز مہیا کر رہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اَعْزِمُ عَلٰی کُلِّ مَنْ کَانَ عِنْدَهٗ کِتَابٌ اِلاَّ رَجَعَ فَمَحَاهُ فَاِنَّمَا هَلَكَ النَّاسُ حَیْثُ اِتَّبَعُوْا اَحَادِیْثَ عُلَمَآئِهِمْ وَتَرَکُوْا کِتَابَ رَبِّهِمْ (2)

"میں سب لوگوں کے لئے یہ ضروری قرار دیتا ہوں کہ جس کے پاس کوئی کتاب ہو، وہ واپس جا کر اسے مٹا دے کیونکہ پہلے لوگ بھی اسی لئے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے اپنے علماء کی باتوں کی پیروی شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو ترک کر دیا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ جن سے کتابت کی یہ ممانعت مروی ہے، خود ان کے پاس احادیث طیبہ کا ایک صحیفہ موجود تھا اور آپ لوگوں کو حصول علم اور کتابت کی ترغیب بھی دیتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کتابت حدیث کی کراہت بھی مروی ہے لیکن احادیث طیبہ بتاتی ہیں کہ ان کے پاس احادیث کا ذخیرہ کتابت شدہ موجود تھا اور انہوں نے حضرت بشیر بن نہیک کو اپنی احادیث لکھنے اور انہیں روایت کرنے کی اجازت بھی دی تھی۔(3)

ہم نے یہاں صرف چند صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رویے کا ذکر کیا ہے وگرنہ اس قسم کی مثالیں بے شمار ہیں۔ جو بات زیادہ قابل توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ کتابت

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 317

2۔ ایضاً، صفحہ 313

3۔ ایضاً، صفحہ 318

حدیث کی ممانعت اور جواز کا موقف اختیار کرنے والے دو مختلف فریق نہیں ہیں کہ ایک فریق احادیث طیبہ کی کتابت کو جائز سمجھتا ہو اور دوسرا فریق اسے ناجائز قرار دیتا ہو بلکہ جو لوگ ایک طرف حدیث کی کتابت سے منع کرتے ہیں بعینہ وہی لوگ دوسری طرف اس کی اجازت بھی دیتے ہیں اور عملاً خود احادیث کو لکھتے بھی ہیں۔ اس صورت حال کا دقت نظر سے جائزہ لینے والا شخص بآسانی اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس رویے کے دونوں پہلو قرآن وحدیث کی حفاظت کی خاطر تھے۔ جب ان کے ذہن میں مرور زمانہ سے احادیث طیبہ کے ضائع ہو جانے کا خیال پیدا ہوتا تو وہ احادیث کی کتابت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے اور اپنے قول و عمل سے کتابت حدیث کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتے اور جب ان کے اذہان اس طرف مائل ہوتے کہ کہیں ان کی ان کوششوں سے احادیث طیبہ میں کوئی غلطی نہ ہو جائے یا کتابت حدیث کے اہتمام سے قرآن حکیم کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹ نہ جائے، تو وہ حدیث کی کتابت کو منع کرتے اور بعض اوقات اپنے پاس موجود کتابت شدہ احادیث کو مٹا دیتے اور دوسروں کو مٹا دینے کا حکم دیتے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس رویے سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے نہ تو احادیث طیبہ کو لکھنے کا عام حکم دیا اور نہ ہی کتابت حدیث سے ممانعت والی احادیث صحابہ کرام کے نزدیک معمول بہا تھیں۔ کیونکہ اگر حضور ﷺ نے احادیث طیبہ کے لکھنے کا حکم دیا ہوتا تو نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ احادیث لکھنے کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ کرتے اور نہ ہی اس سلسلے میں استخارہ کرتے بلکہ ارشاد محبوب کے سامنے گردن جھکا دیتے اور تدوین حدیث کے سلسلہ میں وہ خدمات انجام دیتے جو ہمیشہ یاد رہتیں۔ اگر حضور ﷺ نے احادیث لکھنے کا حکم دیا ہوتا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کوئی بھی لکھی ہوئی احادیث کو تلف نہ کرتا۔

جس طرح حضور ﷺ کی طرف سے احادیث کو لکھنے کا حکم نہ تھا، اسی طرح آپ کی طرف سے احادیث کی کتابت کی ممانعت بھی نہ تھی۔ اگر آپ کتابت حدیث کی ممانعت فرما دیتے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کتابت حدیث کے مسئلے پر مشورے اور استخارے کی منازل سے نہ گزرتے بلکہ جو لکھنے کی کوشش کرتا اس کی خبر لیتے۔ اسی طرح اگر حضور ﷺ نے احادیث کو لکھنے سے منع فرما دیا ہوتا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے

لوگ احادیث کا مجموعہ تیار کر کے رات بھر بے چین نہ رہتے بلکہ آقا ﷺ کی ممانعت کے بعد ان کا قلم احادیث طیبہ کی کتابت کے لئے حرکت میں ہی نہ آتا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا کبھی احادیث طیبہ لکھنے کی طرف مائل ہونا اور پھر اس کام سے کنارہ کشی اختیار کرنا صرف اس لئے تھا کہ حضور ﷺ نے احادیث طیبہ کو لکھنے کی صرف اجازت فرمائی تھی، نہ حکم دیا تھا اور نہ منع فرمایا تھا۔ اس لئے یہ مسئلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ اگر ان کی مرضی ہو تو احادیث طیبہ کو لکھ لیں اور اگر نہ لکھنا چاہیں تو بھی مضائقہ نہیں۔ احادیث طیبہ کو لکھنے یا نہ لکھنے کا صحابہ کرام کو اختیار تھا لیکن اس اختیار کے باوجود انہیں اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ احادیث طیبہ دین کا مصدر ثانی ہیں اور انہیں امت مسلمہ کی آئندہ نسلوں تک حفاظت اور امانت سے منتقل کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس احساس کی وجہ سے وہ احادیث طیبہ کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے کتابت احادیث کی طرف مائل ہوتے تھے اور جب ان کے ذہن اس بات کی طرف مائل ہوتے کہ کہیں کتابت احادیث میں ان سے کوئی غلطی نہ ہو جائے یا ان کے اس فعل کا قرآن حکیم پر کسی قسم کا کوئی اثر نہ پڑ جائے تو اس خیال کی شدت سے وہ کانپ اٹھتے تھے اور کتابت حدیث سے کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اس احتیاط اور احساس ذمہ داری کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں احساس فرض کی نزاکتوں کا کچھ اندازہ ہو۔ جو لوگ اپنے آپ کو خدا کے سامنے بھی جوابدہ نہیں سمجھتے یا یوم جزا کے تصور سے بھی نا آشنا ہیں، ان کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس تعامل کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے بھی مخصوص حالات میں کتابت حدیث کی ممانعت فرمائی تھی۔ آپ کے پیش نظر بھی یہ مصلحت تھی کہ دین کے دو مصادر میں اختلاط نہ ہو جائے۔ آپ نے احادیث طیبہ کی کتابت کی ممانعت کے ساتھ ساتھ لوگوں کو احادیث یاد کرنے کی پرزور الفاظ میں تاکید کی تھی۔ جب التباس کا خطرہ ختم ہو گیا تو آپ نے احادیث کو لکھنے کی بھی اجازت دے دی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اکثریت کی رائے بھی احادیث کو لکھ لینے کے حق میں تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کتابت احادیث کے لئے جب صحابہ کرام سے ان کی رائے پوچھی، تو سب کی رائے کتابت احادیث کے حق میں

تھی لیکن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تقویٰ اور احتیاط کا فیصلہ اس کے برعکس تھا۔

ان حقائق سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ کی طرف سے کتابت حدیث کی ممانعت، تدوین حدیث کے راستے میں رکاوٹ نہیں تھی۔ حضور ﷺ کے عہد ہمایوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو احادیث طیبہ کی تدوین کا فریضہ سرانجام دے سکتے تھے۔ ان کے راستے میں کوئی شرعی مجبوری بھی حائل نہ تھی جو انہیں کتابت احادیث سے روکتی۔ اس لئے مستشرقین نے جو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ دور اول کے مسلمانوں میں لکھے پڑھے لوگوں کی بھی کمی تھی اور حضور ﷺ نے انہیں احادیث لکھنے سے منع بھی فرمادیا تھا، اس لئے انہوں نے حدیث کی تدوین کا اہتمام نہیں کیا، یہ دونوں تاثرات بالکل غلط ہیں۔

حق یہ ہے کہ کتابت حدیث کا کام ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ حضور ﷺ کے عہد ہمایوں میں بھی، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں بھی۔

مسلمانوں نے اپنے دینی مصادر کی حفاظت کے معاملے میں کبھی کوتاہی نہیں کی البتہ انہوں نے ہر زمانے میں دینی مصادر کی حفاظت کا وہی طریقہ استعمال کیا، جو اس زمانے کے تقاضوں پر پورا اترتا تھا۔ جب حالات بدلتے اور دین کی حفاظت کے لئے نئے ذرائع استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو مسلمان وقت کے تقاضوں کی پکار پر فوراً لبیک کہتے۔

قرآن اور حدیث کی حفاظت کی کوششیں کئی جہتوں سے ایک دوسری کی مماثل ہیں۔ حضور ﷺ کا زمانہ ہی اسلام کا دور عروج ہے۔ مستشرقین سب سے بڑا مغالطہ اسی مقام پر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ حضور ﷺ کے دور ہمایوں کو اسلام کا دور طفولیت قرار دیتے ہیں حالانکہ یہی دور اسلام کا دور عروج ہے۔ قرآن وحدیث کی حفاظت کا بھی یہی دور عروج ہے، جس کی مستشرقین کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں۔ عہد نبوی میں قرآن و حدیث کی حفاظت کی کوششوں کے متعلق مولانا محمد بدر عالم صاحب نے خوب لکھا ہے، ان کے الفاظ نذر قارئین ہیں۔

قرآن وحدیث کی حفاظت کا یہ دور دور شباب تھا۔ اس لئے حفاظ کی کثرت، صحابہ کی یکجہتی اور آنحضرت ﷺ کے فیض صحبت کے عمیق اثرات نے اس ضرورت کا احساس ہی

نہ ہونے دیا کہ وہ قرآن کے لئے کسی جدید نظم و نسق کا تخیل اپنے دماغوں میں لاتے۔ اسی طرح حدیث کا معاملہ بھی لوگوں کے اپنے اپنے انفرادی جذبہ تحفظ کی وجہ سے کسی مزید اہتمام کے قابل نہ سمجھا گیا۔ حتی کہ جب جنگ یمامہ میں دفعۃً صحابہ کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی تو اب حاملین قرآن کو ان اچانک اور غیر معمولی نقصانات سے قرآن کی حفاظت میں خلل پڑ جانے کا خطرہ بھی محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ یہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے الفاظ پورے غور کے ساتھ ملحوظ رکھئے:

اِنَّ الْقَتْلَ قَدْ اِسْتَحَرَّ یَوْمَ الْیَمَامَۃِ بِقُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّیْ اَخْشٰی اِنْ اِسْتَحَرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاءِ بِالْمَوَاطِنِ فَیَذْهَبُ کَثِیْرٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ

”جنگ یمامہ میں حفاظ بے طرح شہید ہوئے ہیں۔ خدانہ کردہ اگر کہیں آئندہ اسی طرح حفاظ قتل ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قرآن مجید کا بہت سا حصہ ضائع نہ ہو جائے۔ اس لئے آپ قرآن جمع کرنے کا سرکاری طور پر انتظام کیجئے۔“

دوسری طرف اب اس دور پر غور فرمائیے جبکہ صحابہ ایک ایک کر کے اٹھتے جارہے تھے۔ یعنی دیکھنے والوں کا دور تو ختم ہو رہا تھا اور ان کی جگہ اب ان مشاہدات کو الفاظی لباس میں دیکھنے والوں کی باری آرہی تھی۔ جمال جہاں آرا کو بے حجاب دیکھنے والوں کے سینوں میں جو حرارت بھڑک رہی تھی، آپ کے انتقال مکانی کا حجاب پڑ جانے سے اس کے شعلوں میں وہ تیزی باقی نہ رہنے کا امکان نظر آنے لگا تھا۔ اس لئے یہاں بھی دیکھنے والوں کے دل میں بے چینی پیدا ہونا شروع ہو گئی کہ کہیں اس محبوب عالم کی ادائیں ان کے رخ انور کے نظارہ کرنے والوں کے ختم ہو جانے سے تاریخ کا ایک صفحہ بن کر نہ رہ جائیں۔ اس لئے وہ انتظام کرنا چاہئے جو عالم کی تاریخ میں ایک یادگار رہ جائے۔ اگر یہ فقط ان کے اتمیانہ جذبات ہی کا کرشمہ ہوتا تو رسول اور امتی کے رشتے اس سے پہلے بھی بہت ہو چکے تھے مگر یہاں سب پیرائے ہی پیرائے تھے، اندرونی ہاتھ کوئی اور تھا جس نے اس تمام مشینری کو حرکت دے رکھی تھی۔ جس قدرت نے آپ کو تمام عالم کے لئے راہنما بنا کر بھیجا تھا، وہ ہرگز یہ گوارا نہ کرسکتی تھی کہ آپ کی تصویر بھی آئندہ نسلوں کے سامنے کرشن اور رام چندر کی

صرف کہانیوں کی طرح پیش کی جائے۔ ایک طرف نبوت ختم ہو چکی ہو، رسالت کا دروازہ مسدود ہو، دوسری طرف اس آخری رسول کے صفحات زندگی بھی محو شدہ اور مشتبہ صورت میں رہ جائیں حتی کہ آئندہ رسول کا دیکھنا تو درکنار ان کی سیرت کا صحیح مطالعہ بھی میسر نہ آسکے۔ اس لئے قرآن کریم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ حدیث کی حفاظت کی جہاں تک ضرورت تھی، اس کا احساس بھی قلوب میں پیدا کر دیا گیا۔ آخر حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابو بکر بن حزم کے نام یہ فرمان لکھ بھیجا:

أُنْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاكْتُبْهُ فَإِنِّيْ خِفْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَآءِ

"آنحضرت ﷺ کی احادیث تلاش کر کے قلمبند کر لو کیونکہ مجھے آئندہ علم کم ہونے اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔"

اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ، تقریباً نوے سال بعد کے ان الفاظ کے پہلو بہ پہلو رکھئے تو آپ کو ان دونوں میں وہ یکسانیت نظر آئے گی جو ایک ہی شخص اور ایک ہی دماغ کے خیالات میں نظر آتی ہے۔ وہاں بھی خدائی حفاظت کے وعدے نے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے ارادہ میں جنبش پیدا کی تھی اور یہاں بھی وہی وعدہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے اس اقدام کے لئے محرک بنا۔

باقی ع ماو شما را بہانہ ساختہ اند(1)

اب ہم مختلف ادوار میں کتابت و تدوین حدیث کی کوششوں کا مطالعہ اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر کر سکتے ہیں کہ صحابہ کرام کی ایک معقول تعداد لکھنا پڑھنا جانتی تھی اور فن کتابت سے عدم واقفیت تدوین حدیث کے راستے میں رکاوٹ نہ تھی۔ دوسری بات یہ کہ کتابت حدیث کی انہیں اجازت تھی، ممانعت نہ تھی اور جو مسلمان احادیث کو لکھنا چاہتا یا لکھنے کی ضرورت محسوس کرتا، وہ احادیث کو لکھ لیا کرتا تھا۔

عہد نبوی میں کتابت حدیث

مستشرقین دوسری یا تیسری صدی ہجری سے پہلے حدیث کی کتابت کو تسلیم نہیں

1۔ مولانا محمد بدر عالم، "ترجمان السنہ"، (ایچ ایم سعید کراچی، س ن)، جلد 1، صفحہ 207-205

کرتے۔ ان میں سے جو احادیث کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا نتیجہ قرار نہیں دیتے وہ بھی کہتے ہیں کہ دو سو سال یا اس سے زیادہ عرصہ مسلمانوں نے حفاظت حدیث کے لئے صرف اپنے حافظوں پر اعتبار کیا اور زبانی روایت کے ذریعے احادیث ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہیں۔ لیکن تاریخ مستشرقین کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ کتابت حدیث کا کام حضور ﷺ کے دور میں شروع ہوا اور ہر زمانے میں جاری رہا۔ حدیث کی کتابت تو دوسری یا تیسری صدی ہجری کی اختراع نہیں البتہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق تدوین حدیث کے رنگ بدلتے رہے۔ پہلے حدیث کی صرف کتابت ہوئی۔ پھر احادیث کی کتابیں عام انداز میں مدون ہوئیں۔ پھر ایسی کتب تصنیف ہوئیں جن میں صرف صحیح احادیث کو جمع کیا گیا اور پھر ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق یہ کوششیں نئے رنگ اختیار کرتی رہیں۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں وہ احادیث طیبہ درج کی ہیں جن میں حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو احادیث لکھنے کی اجازت فرمائی تھی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس اذن رسالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احادیث لکھی تھیں۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں صحابہ کرام کے احادیث کو لکھنے کے ارادے اور پھر اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں تردد کے کئی واقعات لکھے ہیں۔ ہم نے اس حقیقت کو بھی بیان کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تدوین احادیث کا ارادہ کیا تھا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کے اس ارادے کی تحسین بھی کی تھی لیکن پھر آپ کئی مہینوں کی سوچ بچار کے بعد اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے رک گئے تھے۔ لیکن صحابہ کرام کے اس تردد کے باوجود تاریخ شاہد ہے کہ حضور ﷺ نے خود کئی دستاویزات تیار کرائیں اور صحابہ کرام میں کئی ایسے بھی تھے جن کے پاس احادیث کے کتابت شدہ مجموعے موجود تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی حدیث گزر چکی ہے جو بتاتی ہے کہ وہ حضور ﷺ کی احادیث لکھا کرتے تھے۔ صحابہ کرام کے منع کرنے پر جب وہ کتابت حدیث سے رک گئے اور حضور ﷺ کو صورت حال سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا: ضرور لکھا کرو کیونکہ میری زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ حق ہوتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حضور ﷺ کے عہد میں احادیث لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ

حضور ﷺ نے یمن کے ایک شخص ابو شاہ کے لئے خطبہ تحریر کرنے کا حکم دیا تھا۔ آپ نے اس شخص کو احادیث لکھنے کا حکم بھی دیا تھا جس نے آپ کے سامنے شکایت کی تھی کہ حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے وہ احادیث طیبہ کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ آپ کے عہد میں صلح حدیبیہ کا معاہدہ تحریر ہوا، میثاق مدینہ لکھا گیا اور آپ نے مختلف ممالک کے حکمرانوں کے نام دعوت نامے لکھوائے۔

وہ مکاتیب جو مختلف اوقات میں حضور ﷺ نے لکھوائے، ان میں ملت اسلامیہ کے لئے علوم و معارف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ مکاتیب احادیث طیبہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ سنن دارمی میں حضرت عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ جملے منقول ہیں:

بَيْنَا نَحْنُ حَوْلَ رَسُوْلِ اللهِ نَكْتُبُ (1)

"ہم حضور ﷺ کے گرد بیٹھے لکھ رہے تھے۔"

قبیلہ جہینہ کو حضور ﷺ نے مردہ جانوروں کے متعلق احکام لکھوا کر بھیجے۔(2)

حضور ﷺ نے ہر قبیلہ والوں کو دیت (خون بہا) کے احکام لکھوا کر بھجوائے۔(3)

ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب نے اپنی کتاب "السنۃ قبل التدوین" میں یہ حدیث نقل کی ہے:

رُوِیَ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَتَبَ كِتَابَ الصَّدَقَاتِ وَالدِّيَاتِ وَالْفَرَائِضِ وَالسُّنَنِ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ وَغَيْرِهٖ (4)

"حضور ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ وغیرہ کے لئے ایک کتاب میں وہ احکام لکھوائے جن کا تعلق صدقات، دیات، فرائض اور سنن سے تھا۔"

علامہ سید محمود احمد رضوی نے مختلف کتب احادیث سے ان روایات کو "فیوض الباری" میں جمع کر دیا ہے جن میں عہد نبوی میں مختلف احکام اور احادیث کی کتابت کا ذکر ہے۔

1۔ "فیوض الباری"، جلد 1، صفحہ 21

2۔ ایضاً، بحوالہ مشکوۃ

3۔ ایضاً، بحوالہ مسلم

4۔ "السنۃ قبل التدوین"، صفحہ 305

فیوض الباری کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

سنن ابوداؤد میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں وہ تمام حدیثیں جن کا تعلق مسائل زکوۃ سے تھا، یکجا قلمبند کروادیں جس کا نام کتاب الصدقہ تھا مگر اس کو عمال و حکام کے پاس روانہ کرنے سے قبل ہی آپ کا وصال ہو گیا تو خلفائے راشدین میں سے سیدنا صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما نے اپنے زمانے میں اسے نافذ کیا۔ اس کے مطابق زکوۃ کے وصول و تحصیل کا ہمیشہ انتظام رکھا۔ (ابوداؤد۔ کتاب الزکوۃ)

امام بخاری نے اسی کتاب الصدقہ کا مضمون نقل کیا ہے جسے صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ کو بحرین کا حکم بنا کر بھیجتے وقت، ان کے حوالے کیا تھا۔ اس میں اونٹوں، بکریوں، چاندی اور سونے کی زکوۃ کے نصاب کا بیان ہے۔

کتاب الصدقہ حضور ﷺ نے ابو بکر بن حزم صحابی والی بحرین کو لکھائی تھی۔ اس میں زکوۃ کے احکام تھے۔ یہ اور امراء کو بھی بھیجا گیا تھا۔ (دار قطنی۔ مسند احمد بن حنبل) یہ تحریر خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے ابن حزم سے لے لی تھی۔ (دار قطنی)

محصلین زکوۃ کے پاس کتاب الصدقہ کے علاوہ اور بھی تحریریں تھیں۔ (دار قطنی)

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ صحابی کو حضور ﷺ نے نماز، روزہ، ربا اور شراب وغیرہ کے احکام لکھا دیئے تھے (معجم صغیر)

ضحاک بن سفیان صحابی کے پاس آنحضرت ﷺ کی تحریر کرائی ہوئی ایک ہدایت تھی، جس میں شوہر کی دیت کا حکم تھا (دار قطنی)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ کو ایک تحریر یمن بھیجی گئی جس میں سبزیوں، ترکاریوں پر زکوۃ نہ ہونے کا حکم تھا۔ (دار قطنی)

مدینہ بھی مثل مکہ کے حرم ہے، اس کے متعلق حضور ﷺ کی تحریر رافع بن خدیج رضی اللہ تعالی عنہ کے پاس تھی۔ (مسند احمد)

حضرت عبد اللہ بن مسعود نے ایک مجموعہ لکھا تھا جو ان کے صاحبزادے کے پاس تھا۔ (جامع بیان العلم)

حضور ﷺ نے ہرقل کو جو خط لکھا تھا، اس کا ذکر کتب صحاح میں ملتا ہے۔ اب اس خط کی فوٹو بھی شائع ہو چکی ہے۔ صحاح کے بیان اور فوٹو کی تحریر میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ (1)

1۔ فیوض الباری، جلد 1، صفحہ 23-21 (ملخص)

عہد صحابہ میں کتابت حدیث

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے، حدیث کی کتابت حضور ﷺ کے عہد ہمایوں میں شروع ہو گئی تھی۔ حضور ﷺ نے متعدد تحریریں خود قلم بند کروائی تھیں۔ حدیث پاک کی کتابت کا یہ کام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں بھی جاری رہا۔ گو اس دور میں بھی بعض صحابہ احادیث لکھنے سے ڈرتے تھے اور کبھی کبھی احادیث کے لکھے ہوئے مجموعوں کو تلف بھی کر دیتے تھے لیکن تاریخ نے ایسے کئی مجموعہ ہائے حدیث کو محفوظ رکھا ہے جو صحابہ کرام کے پاس موجود تھے۔

ایک مجموعہ احادیث حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس موجود تھا۔ اس صحیفہ کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے۔ حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

قُلْتُ لِعَلِیٍّ: هَلْ عِنْدَ کُمْ کِتَابٌ؟ قَالَ: لَا- اِلَّا کِتَابُ اللّٰهِ اَوْفَهْمٌ اُعطِیَهٗ رَجُلٌ مُسْلِمٌ اَوْ مَافِیْ هٰذِهِ الصَّحِیْفَةِ قُلْتُ فَمَا فِیْ هٰذِهِ الصَّحِیْفَةِ قَالَ الْعَقْلُ وَ فِکَاكُ الْاَسِیْرِ وَلَا یُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِکَافِرٍ- (بخاری) وَفِی الرِّوَایَاتِ الْاُخْرٰی لِهٰذَا الْحَدِیْثِ زِیَادَاتٌ عَنْ بَعْضِ مَسَائِلَ تَضَمَّنَتْهَا هٰذِهِ الصَّحِیْفَةُ (1)

"میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا: کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے؟ فرمایا: نہیں، سوائے کتاب اللہ کے اور اس فہم کے جو اللہ تعالیٰ ایک مرد مسلم کو عطا فرماتا ہے یا جو کچھ اس صحیفہ میں ہے۔ میں نے عرض کیا: اس صحیفہ میں کیا ہے؟ فرمایا: اس میں دیت، غلام کی آزادی اور کافر کے بدلے میں مسلمانوں کو قتل نہ کرنے کے مسائل ہیں (بخاری) اس حدیث کی بعض روایات میں اس صحیفہ میں مندرج کچھ مزید مسائل کا ذکر بھی ہے۔"

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہیں حضرت عمر رضی

1۔ المنہل اللطیف، صفحہ 21-20

اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار کے دستے میں سے ایک صحیفہ ملا، جس میں چرنے والے مویشیوں کی زکوٰۃ کا ذکر تھا۔(1)

ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب اس صحیفے کے متعلق لکھتے ہیں:

ممکن ہے یہ وہی صحیفہ ہو جو حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر کو وراثت میں ملا اور آپ سے یہ صحیفہ حضرت ابن شہاب زہری نے قراءۃ حاصل کیا۔ ہمارے اس خیال کی تائید عبد الرحمٰن انصاری کی یہ روایت کرتی ہے کہ جب حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ بنے تو انہوں نے مدینہ طیبہ میں آدمی بھیجے کہ وہ حضور ﷺ کی کتاب صدقات اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صحیفے کا سراغ لگائیں۔ حضرت عمر کی کتاب صدقات اور حضور ﷺ کی کتاب صدقات، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاندان والوں سے مل گئیں اور ان کی نقلیں حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کو بھیجی گئیں۔(2)

حضرت ابن حنفیہ محمد بن علی بن ابی طالب سے مروی ہے فرماتے ہیں: مجھے میرے والد ماجد نے فرمایا: یہ کتاب لے لو اور اسے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لے جاؤ کیونکہ اس میں صدقات کے متعلق حضور ﷺ کے احکام ہیں۔(3)

حضرت معن سے روایت ہے، فرماتے ہیں: عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن مسعود نے میرے لئے ایک کتاب نکالی اور میرے سامنے قسم کھا کر کہا کہ یہ کتاب میرے والد ماجد (عبد اللہ بن مسعود) نے اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔

حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی ایک یا چند کتابیں تھیں، جن میں حضور ﷺ کی کچھ احادیث درج تھیں۔ حضرت سعد کے صاحبزادے نے اپنے والد ماجد کی کتابوں سے کچھ احادیث روایت کی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں یہ صحیفہ حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کے صحیفے کی نقل تھی جو اپنے ہاتھ سے احادیث لکھتے تھے اور وہ جو لکھتے تھے، دوسرے لوگ ان کی تحریروں کو ان کے سامنے پڑھتے تھے۔(4)

حضور ﷺ کے غلام حضرت ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک کتاب تھی،

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 45-344

2۔ ایضاً، صفحہ 345

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً، 346

جس میں نماز شروع کرنے کے احکام درج تھے۔ انہوں نے وہ کتاب حضرت ابو بکر بن عبد الرحمن بن حارث کو دی تھی جو فقہائے سبعہ میں سے تھے۔ (1)

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک کتاب تھی جس میں حضور ﷺ کی کچھ احادیث جمع تھیں۔ (2)

جب حضرت محمد بن مسلمہ انصاری کا انتقال ہوا تو ان کی تلوار کے نیام میں سے ایک کتاب ملی جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اِنَّ لِرَبِّكُمْ فِيْ بَقِيَّةِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٍ فَتَعَرَّضُوْا لَهَا (3)

"میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: زمانے میں تمہارے رب کی رحمتوں کے نزول کی مخصوص گھڑیاں ہوتی ہیں، ان گھڑیوں کی تلاش میں رہا کرو۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کو قدرت نے حبیب خدا ﷺ کی برکت سے، بے پناہ قوت حافظہ عطا فرمائی تھی، انہوں نے بھی احادیث طیبہ کو سپرد قلم کر کے اپنے پاس محفوظ کر رکھا تھا۔ حضرت فضیل بن حسن بن عمرو بن امیہ الضمری، اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک حدیث پڑھی۔ آپ نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ میں نے عرض کیا: یہ حدیث میں نے آپ ہی سے سنی ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر واقعی تم نے یہ حدیث مجھ سے سنی ہے تو پھر یہ میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہو گی۔ پھر آپ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے گھر لے گئے۔ آپ نے ہمیں حضور ﷺ کی احادیث کی کئی کتابیں دکھائیں۔ وہاں وہ متعلقہ حدیث بھی موجود تھی۔ آپ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر یہ حدیث میں نے تمہیں سنائی تھی تو یہ ضرور میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہو

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 346

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً، صفحہ 47-346

گی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت بشیر بن نہیک کو اجازت دی تھی کہ وہ آپ کی جمع کردہ احادیث نقل کرلیں اور آپ نے ان کو ان احادیث کی روایت کی اجازت بھی عطا فرمائی تھی۔(1)

حضرت ہمام بن منبہ کا صحیفہ مشہور ہے۔ وہ اب چھپ چکا ہے۔ یہ صحیفہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔ اس مجموعہ کی اکثر احادیث مسند احمد، صحیح بخاری اور مسلم میں موجود ہیں۔ اس صحیفہ کے مندرجات اور اس کی جو احادیث کتب احادیث میں درج ہیں، ان کے موازنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ پہلی صدی ہجری کے صحیفے اور تیسری صدی ہجری کے مجموعوں کے مندرجات میں ہم آہنگی اس بات کی دلیل ہے کہ احادیث ہر قسم کی آمیزش سے محفوظ رہیں۔(2)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے بھانجے حضرت عروہ بن زبیر سے فرمایا: بیٹے! مجھے پتہ چلا ہے کہ تم مجھ سے سن کر ایک حدیث لکھتے ہو اور پھر جب واپس جاتے ہو تو اسے دوبارہ لکھتے ہو۔ (اس کی کیا وجہ ہے؟) انہوں نے عرض کیا: میں حدیث کے الفاظ آپ کی زبانی سنتا ہوں اور واپس جاتا ہوں تو ان سے قدرے مختلف الفاظ میں اس حدیث کو سنتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا حدیث کے مفہوم میں بھی تم کوئی اختلاف محسوس کرتے ہو؟ عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: پھر اس میں کوئی حرج نہیں۔(3)

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا: میری طرف کوئی حدیث لکھ کر بھیجو جو تم نے حضور ﷺ سے سنی ہو۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے آپ کو لکھا کہ حضور ﷺ فضول گفتگو، کثرت سے سوال کرنے اور مال ضائع کرنے سے منع فرماتے تھے۔(4)

زیاد بن ابی سفیان نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خط لکھ کر یہ مسئلہ پوچھا کہ جو حاجی قربانی کا جانور روانہ کرے، کیا قربانی کے جانور کے ذبح ہونے سے پہلے، اس پر وہ چیزیں حرام ہیں جو حاجی پر حرام ہوتی ہیں، جیسے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 48-347

2۔ فیوض الباری، صفحہ 23-22

3۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 318

4۔ ایضاً

تعالیٰ عنہما کا فتویٰ ہے؟ آپ نے جواب میں لکھا کہ حضور ﷺ نے قربانی کا جانور روانہ فرمایا تھا اور خدا کی حلال کردہ کسی چیز کو آپ نے قربانی کا جانور ذبح ہونے سے پہلے حرام قرار نہیں دیا تھا۔(1)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صبح اس وقت تک اپنے گھر سے باہر تشریف نہ لے جاتے تھے جب تک اپنی کتابوں کو ایک نظر دیکھ نہ لیتے۔(2)

خادم رسول حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دس سال تک حضور ﷺ کے کاشانہ اقدس میں آپ کی معیت کا شرف حاصل ہے۔ آپ اپنے بیٹوں سے فرمایا کرتے تھے: بیٹو! علم کو کتاب کے ذریعے محفوظ کرلو۔ آپ لوگوں کو احادیث طیبہ لکھوایا کرتے تھے۔ جب لکھنے والوں کی کثرت ہوگئی تو آپ کچھ صحیفے اٹھالائے۔ انہیں لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور فرمایا: یہ وہ احادیث ہیں جو میں نے حضور ﷺ سے سنیں، آپ کے پاس انہیں لکھا اور پھر یہ حدیثیں پڑھ کر حضور ﷺ کو سنائیں۔(3)

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں کثیر تعداد میں احادیث طیبہ درج تھیں۔ اس صحیفے کو آپ سے آپ کے بیٹے سلیمان نے روایت کیا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی صحیفہ ہو جو حضرت سمرہ بن جندب نے اپنے بیٹوں کی طرف بھیجا تھا۔ اس رسالے کے متعلق محمد بن سیرین کہتے ہیں: حضرت سمرہ نے اپنے بیٹوں کی طرف جو رسالہ روانہ کیا تھا، اس میں بہت علم ہے۔"(4)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حصول علم کے شوق کے لئے مشہور ہیں۔ حضور ﷺ کے انتقال کے بعد وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے احادیث سنتے اور انہیں لکھ لیتے تھے۔ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا انتقال ہوا تو آپ کی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ یہ کتابیں اتنی زیادہ تھیں کہ ایک اونٹ کا بوجھ بن جاتی تھیں۔(5)

ایک صحیفہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ تابعی جلیل قتادہ

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 19-318
2۔ ایضاً، صفحہ 320
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، صفحہ 348
5۔ ایضاً، صفحہ 352

بن دعامہ سدوسی اس صحیفہ حدیث کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔(1)

ایک صحیفہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے پاس تھا۔ پہلے اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کو کتابت حدیث کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی تھی اور آپ حضور ﷺ سے جو سنتے تھے اسے لکھ لیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے خود اس صحیفے کا نام "الصادقہ" رکھا تھا اور یہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ حضرت مجاہد بن جبیر نے یہ صحیفہ حضرت عبداللہ بن عمرو کے پاس دیکھا۔ وہ اس صحیفہ کی روایات کو حضرت عبداللہ سے حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس گئے تھے۔
حضرت عبداللہ بن عمرو نے خود اس صحیفے کے متعلق فرمایا:

هٰذِهِ الصَّادِقَةُ فِيهَا مَا سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ فِيهَا اَحَدٌ

"یہ صحیفہ صادقہ ہے۔ اس میں وہ احادیث درج ہیں جو میں نے خود حضور ﷺ سے سنی ہیں۔ اس کی روایت کے لئے میرے اور حضور ﷺ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہما کو یہ صحیفہ بہت عزیز تھا۔ آپ فرماتے تھے: زندگی میں میری دلچسپی جن چیزوں سے ہے ان میں ایک یہ صحیفہ ہے اور دوسری "وھط" نامی میری زمین ہے۔ حفاظت کے لئے آپ اس صحیفے کو ایک صندوق میں بند رکھتے تھے۔ آپ کے بعد آپ کے اہل خانہ نے بھی اس صحیفے کی حفاظت کی۔ اغلب یہ ہے کہ آپ کے پوتے حضرت عمرو بن شعیب اسی صحیفے سے روایت کرتے تھے۔ گو حضرت عمرو بن شعیب سے سارا صحیفہ مروی نہیں لیکن امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اس کے مندرجات کو روایت کر دیا ہے۔ احادیث کی دوسری کتابوں میں بھی اس صحیفے کی احادیث ملتی ہیں۔

اس صحیفے کی علمی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور اس سے حضور ﷺ کے سامنے احادیث کو لکھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو اپنے شاگردوں کو اس صحیفے کی احادیث املا کرایا کرتے تھے۔ آپ کے شاگرد حسین بن شفی ابن ماتع الاصبحی نے آپ سے دو کتابیں نقل کی ہیں۔ ایک میں حضور ﷺ کے فیصلوں کا ذکر

1۔ السہل اللطیف، صفحہ 21

ہے اور دوسری میں قیامت تک پیش آنے والے حوادث کا۔(1)

عہد نبوی اور عہد صحابہ میں کتابت حدیث کی جو کوششیں ہوئیں، ان کا ہم نے ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ مستشرقین کا یہ واویلا بے بنیاد ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں احادیث کی کتابت و تدوین نہیں ہوئی بلکہ احادیث زبانی روایت کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتی رہیں۔

حضور ﷺ کا احادیث لکھوانا، صحابہ کا احادیث کو لکھنا اور ان کی حفاظت کے لئے زبردست کوششیں کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک احادیث طیبہ کی حفاظت انتہائی اہم ذمہ داری تھی اور وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

عہد تابعین میں کتابت و تدوین حدیث

جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، مملکت اسلامی کی سرحدیں پھیلتی گئیں، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، صحابہ کرام ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہونے لگے، تو ان بدلتے ہوئے حالات میں احادیث طیبہ کو باقاعدہ طور پر مدون کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے سرکاری سطح پر احادیث طیبہ کی تدوین کے لئے اقدامات کئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے تدوین احادیث کے لئے جو احکامات جاری کئے، ان کا تعلق 100ھ سے ہے لیکن ان احکام کے صادر ہونے سے پہلے بھی عہد تابعین میں احادیث کی تدوین کے آثار ملتے ہیں۔

حضرت عروہ بن زبیر کا انتقال 93ھ میں ہوا۔ ان سے یہ قول مروی ہے:

كَتَبْتُ الْحَدِيْثَ ثُمَّ مَحَوْتُهُ فَوَدِدْتُ اَنِّيْ فَدَيْتُهُ بِمَالِيْ وَوَلَدِيْ وَاَنِّيْ لَمْ اَمْحُهُ (2)

"میں نے احادیث لکھ کر مٹا دیں۔ اب میرے دل میں یہ حسرت اٹھتی ہے کہ کاش میں نے ان احادیث طیبہ پر اپنی اولاد اور اپنا مال قربان کر دیا

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 52-348 (ملخص)

2۔ ایضاً، 354

ہوتااوران احادیث کو محو نہ کیا ہوتا۔"

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس صحیفے کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھی تھیں جو یوم حرہ کو نذر آتش ہو گئیں۔ آپ کتابوں کے اس ضیاع پر افسوس کا اظہار کرتے تھے، فرماتے:

وَدِدْتُ لَوْ اَنَّ عِنْدِیْ کُتُبِیْ بِاَھْلِیْ وَمَالِیْ (1)

"کاش میری کتابیں محفوظ رہتیں اور میرا مال اور میری اولاد ان کا فدیہ بن جاتی۔"

احادیث طیبہ کی باقاعدہ تدوین سے پہلے ہمیں ایک انتہائی اہم دستاویز کا پتہ چلتا ہے جو حضرت عمر بن عبد العزیز سے بہت پہلے تدوین حدیث کو ثابت کرتی ہے۔ یہ دستاویز حضرت ہمام بن منبہ کا صحیفہ ہے جس کا ذکر ہم نے اختصار سے عہد صحابہ میں کیا ہے لیکن یہاں ہم اس کی ذرا تفصیل بیان کرتے ہیں کیونکہ تدوین حدیث کی کوششوں کو سمجھنے کے لئے یہ صحیفہ بہت اہم ہے۔

حضرت ہمام بن منبہ جو کہ ایک جلیل القدر تابعی ہیں، ان کی ملاقات صحابی رسول حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی۔ انہوں نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کثیر تعداد میں احادیث حاصل کیں اور انہیں ایک صحیفے میں جمع کر دیا اور اس صحیفے کا نام "الصحیفہ الصحیحہ" رکھا۔ یہ صحیفہ جس طرح حضرت ہمام بن منبہ نے لکھا تھا، وہ کامل طور پر ہم تک پہنچا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کو اس صحیفے کے دو مخطوطے ملے ہیں، ایک دمشق میں اور دوسرا برلن میں۔ یہ دونوں مخطوطے بالکل ایک جیسے ہیں۔ چونکہ اس صحیفے کی احادیث امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں روایت کی ہیں اور امام بخاری نے بھی اس کی کثیر احادیث روایت کی ہیں اور یہ احادیث جس طرح حضرت ہمام کے صحیفے میں ہیں بالکل اسی طرح احادیث کی ان کتابوں میں بھی ہیں، اس لئے اس صحیفہ کی ثقاہت پر اعتماد اور پختہ ہو جاتا ہے۔ اس صحیفہ کی ثقاہت کو اس بات سے اور تقویت ملتی ہے کہ حضرت ابن حجر نے لکھا ہے کہ حضرت ہمام نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تقریباً ایک سو چالیس احادیث روایت کیں، جبکہ صحیفہ ہمام کی حدیثوں کی تعداد ایک سو اڑتیس ہے۔ گویا اس صحیفے کے دستیاب ہونے سے پہلے ہی محدثین کو یہ بات معلوم تھی کہ حضرت ہمام نے حضرت

1۔ السنہ قبل التدوین، صفحہ 354

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو احادیث روایت کی ہیں ان کی تعداد کتنی تھی۔

یہاں جو بات خصوصی طور پر توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ہمام بن منبہ نے یہ صحیفہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ دستاویز حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں مرتب ہوئی۔ حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال 59ھ میں ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صحیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی طرف سے تدوین حدیث کے متعلق احکامات صادر ہونے سے تقریباً نصف صدی پیشتر تحریر ہو چکا تھا۔ اس صحیفے کو عہد تابعین میں مندرج کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ صحیفہ حضرت ہمام بن منبہ کے نام سے مشہور ہے جو تابعی ہیں ورنہ حقیقت میں یہ صحیفہ دور صحابہ کا ہے کیونکہ یہ حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ہمام بن منبہ کو املا کرایا تھا۔ (1)

عہد نبوی، عہد صحابہ اور عہد تابعین میں کتابت و تدوین حدیث کی جو مثالیں ہم نے گزشتہ صفحات میں بیان کی ہیں، ان سے مستشرقین کے اس تاثر کی تردید ہو جاتی ہے کہ احادیث کی تدوین دوسری یا تیسری صدی ہجری میں ہوئی اور اس سے پہلے صرف زبانی طور پر احادیث کی روایت کا رواج تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں گو احادیث کی حفاظت کے لئے زیادہ انحصار زبانی یاد کرنے اور ان فرامین رسول ﷺ کو امت کی عملی زندگی میں نافذ کرنے پر تھا لیکن اس کے باوجود حفاظت حدیث کے لئے کتابت کے ذریعے کو مسلمانوں نے تاریخ اسلام کے ہر دور میں استعمال کیا ہے۔

ملت اسلامیہ چند غیر منظم لوگوں کے ہجوم کا نام نہ تھا بلکہ یہ تاریخ انسانی کی منظم ترین جماعت تھی۔ اس ملت کو اپنے الہامی پیغام پر صرف خود ہی عمل پیرا نہ ہونا تھا بلکہ ساری نسل انسانی کو اس حیات بخش پیغام کی طرف بلانا ان کا ملی فریضہ تھا۔ ملت اسلامیہ نے ریاست کے داخلی مسائل کو بھی حل کرنا تھا اور خارجی اور بین الاقوامی مسائل سے بھی نپٹنا تھا۔ اس ملت کا اپنا ایک علیحدہ آئین بھی تھا اور قانون بھی۔ ملت کے مقتدر حضرات کے سامنے قوم کے سیاسی، معاشی اور دینی مسائل کو حل کرنے کا چیلنج بھی تھا۔ ان کے لئے زندگی کے ان تمام شعبوں کے متعلق تفصیلی ہدایات احادیث پاک میں موجود تھیں۔ ملت کی ان گوناگوں ذمہ

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 57-355 (ملخص)

داریوں کو سرسری نظر سے دیکھ کر ہی انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ مسلمان احادیث طیبہ کی حفاظت کے لئے کتابت کے ذریعے کو نظرانداز کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

وہ قوم جس کے آئین کی ایک شق یہ ہو:

وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ (1)

"اور نہ اکتایا کرو اسے لکھنے سے خواہ (رقم قرضہ) تھوڑی ہو یا زیادہ، اس کی میعاد تک" اس ملت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ زبان رسالت سے حاصل ہونے والے علوم و معارف کی حفاظت کے لئے کتابت کے ذریعے کو نظرانداز کر دے۔"

جو دین آپس کے معمولی لین دین کو تحریر کرنے کا حکم دیتا ہے، یہ بات اس دین کے مزاج ہی کے خلاف ہے کہ وہ ان ہدایات کو ریکارڈ کرنے پر توجہ نہ دے جو قیامت تک ملت کی راہنمائی کے لئے ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملت کے مزاج کے عین مطابق مسلمانوں نے کسی دور میں کتابت حدیث کو نظرانداز نہیں کیا، البتہ ابتدائی زمانے میں ان کا زیادہ انحصار حفظ پر تھا۔ جو لوگ احادیث طیبہ کے مجموعے تیار کرتے تھے وہ بھی ان کو حفظ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کتابت حدیث کی ممانعت کی جو احادیث مروی ہیں ان میں احادیث لکھنے کی جو ممانعت کی گئی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ تحریر پر بھروسہ کر کے احادیث کو یاد کرنے میں سستی نہ کرنے لگیں۔

احادیث کی حفاظت کے لئے عہد نبوی ہی سے مسلسل کوششیں ہوتی رہیں لیکن جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عہد صدیقی میں قرآن حکیم کے متعلق یہ محسوس کیا تھا کہ گو قرآن حکیم مسلمانوں کے سینوں میں بھی محفوظ ہے اور مختلف اشیاء پر کتابت شدہ شکل میں بھی کاشانہ نبوت اور کئی صحابہ کرام کے پاس بھی موجود ہے لیکن اس کے باوجود وقت کا تقاضا ہے کہ قرآن حکیم کو باقاعدہ ایک صحیفے کی شکل میں جمع کر دیا جائے، بعینہ اسی طرح خلیفہ برحق، امام عادل، ثانی فاروق حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ بات شدت سے محسوس کی کہ حفاظت احادیث کے لئے جو کوششیں پہلے ہوتی رہی ہیں، گو ماضی میں تو وہ احادیث کی حفاظت کے مقصد کے لئے کافی تھیں لیکن

1۔ سورۃ البقرہ: 282

حالات کے بدلتے ہوئے تقاضے احادیث کی باقاعدہ تدوین کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اسی احساس کی وجہ سے انہوں نے 100ھ میں حضرت ابو بکر بن حزم والی مدینہ کو مندرجہ ذیل حکم بھیجا:

اُنْظُرْ مَاکَانَ مِنْ حَدِیْثِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاکْتُبْہُ فَاِنِّیْ خِفْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَذَھَابَ الْعُلَمَآءِ وَلَا تَقْبَلْ اِلَّا حَدِیْثَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلْیَفْشُوا الْعِلْمَ وَلْیَجْلِسُوْا حَتّٰی یَعْلَمَ مَنْ لَّا یَعْلَمُ فَاِنَّ الْعِلْمَ لَا یَھْلَکُ حَتّٰی یَکُوْنَ سِرًّا وَکَذٰلِکَ کَتَبَ اِلٰی عُمَّالِہٖ فِیْ اُمَّھَاتِ الْمُدُنِ الْاِسْلَامِیَّۃِ بِجَمْعِ الْحَدِیْثِ (1)

"حضور کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کی احادیث کو نہایت احتیاط سے لکھ دو کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں علم کے آثار مٹ نہ جائیں اور علماء اس دار فانی سے رخصت نہ ہو جائیں۔ اور رسول کریم ﷺ کے قول کے بغیر کسی کا قول قبول نہ کرنا چاہئے۔ علماء علم کو پھیلائیں اور جو ناواقف ہیں، ان کو سکھانے کے لئے بیٹھ جائیں کیونکہ علم اگر راز ہو جائے (یعنی چیدہ چیدہ لوگ اس سے واقف ہوں) تو اس کی فنا یقینی ہے۔ اسی طرح آپ نے مملکت اسلامیہ کے مشہور شہروں کے والیوں کی طرف بھی حدیث جمع کرنے کے احکام صادر فرمائے۔"

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے والی مدینہ حضرت ابو بکر بن حزم کے نام جو فرمان لکھا اس میں خصوصی طور پر یہ تاکید بھی تھی کہ وہ ان احادیث کو لکھ کر ان کی طرف روانہ کریں جو حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن انصاریہ اور حضرت قاسم بن محمد بن ابو بکر کے پاس موجود ہیں۔ (2)

حضرت عمر بن عبد العزیز نے صرف عمال حکومت کو احادیث مدون کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ آپ خود بھی احادیث لکھا کرتے تھے۔ حضرت ابو قلابہ سے روایت ہے، فرمایا:

1۔ سنت خیر الانام، صفحہ 5-134

2۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 329

خَرَجَ عَلَيْنَا عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ لِصَلٰوةِ الظُّهْرِ وَمَعَهٗ
قِرْطَاسٌ ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا لِصَلٰوةِ الْعَصْرِ وَهُوَ مَعَهٗ فَقُلْتُ
لَهٗ: يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ، مَا هٰذَا الْكِتَابُ؟ قَالَ حَدِيْثٌ
حَدَّثَنِيْ بِهٖ عَوْنُ بْنُ عَبْدِ اللهِ فَاَعْجَبَنِيْ فَكَتَبْتُهٗ (1)

"حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نماز ظہر کے لئے باہر تشریف لائے تو ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ پھر عصر کے لئے تشریف لائے تو پھر بھی وہ کاغذ ان کے پاس تھا۔ میں نے عرض کیا: امیر المومنین! یہ کتاب کیسی ہے؟ فرمایا: یہ حدیث پاک ہے جو عون بن عبداللہ نے مجھے سنائی۔ مجھے یہ حدیث پاک بہت پسند آئی اور میں نے اس کو لکھ لیا۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے تدوین حدیث کی ضرورت کا جو احساس کیا تھا، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے بہت جلد ملت کے اکابر علماء کو اس احساس میں اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا اور کتابت حدیث کی کراہت کا جو رویہ عہد صحابہ اور عہد تابعین کے ابتدائی دور میں موجود تھا، وہ رویہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور کے تقاضوں کی وجہ سے پہلے مدھم ہوا اور پھر ختم ہو گیا۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اس عہد میں بے شمار علماء نے تدوین حدیث کی کوششوں میں حصہ لیا۔ کتابت حدیث کے متعلق ملت کے رویے میں تبدیلی کے اسباب کا اندازہ حضرت امام زہری کے اس قول سے ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

لَوْلَا اَحَادِيْثُ تَأْتِيْنَا مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ نُنْكِرُهَا لَا
نَعْرِفُهَا مَا كَتَبْتُ حَدِيْثًا وَلَا اَذِنْتُ فِيْ كِتَابِهٖ (2)

"اگر وہ احادیث نہ ہوتیں جو مشرق کی طرف سے ہم تک پہنچتی ہیں اور ہم ان کے متعلق نہیں جانتے تو میں نہ تو احادیث کو لکھتا اور نہ اس کی اجازت دیتا۔"

گویا وقت کے تقاضوں نے احادیث طیبہ کی حفاظت کے لئے تدوین حدیث کو انتہائی ضروری قرار دے دیا تھا اور امام زہری اور دیگر علماء نے اس خطرے کو فوراً بھانپ لیا تھا کہ اگر

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 326

2۔ ایضاً، 9-328

تدوین حدیث کا کام سر انجام نہ دیا گیا تو اسلام دشمن قوتیں وضع حدیث کے فتنے کے ذریعے اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی کوشش کریں گی۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی دعوت کے جواب میں ریاست اسلامی کے تمام شہروں میں علماء نے احادیث کی تدوین کا کام شروع کر دیا۔ امام زہری کے علاوہ جن خوش نصیبوں کا شمار احادیث پاک کے ابتدائی مدونین میں ہوتا ہے، ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

مکہ مکرمہ میں: عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج البصری، (م 150ھ)

مدینہ طیبہ میں: امام مالک بن انس، (م 179ھ)، محمد بن اسحاق، (م 151ھ) اور محمد بن عبد الرحمن بن ابی ذئب، (م 158ھ)

بصرہ میں: ربیع بن صبیح، (م 160ھ)، سعید بن ابی عروبہ، (م 156ھ) اور حماد بن سلمہ، (م 167ھ)

کوفہ میں: سفیان ثوری (م 161ھ)

یمن میں: معمر بن راشد (م 153ھ)

شام میں: عبد الرحمن بن عمرو الاوزاعی، (م 158ھ)

خراسان میں: عبد اللہ بن مبارک، (م 181ھ)

واسط میں: ھشیم بن بشیر، (م 183ھ)

رے میں: جریر بن عبد الحمید (م 188ھ)

اور مصر میں عبد اللہ بن وھب، (م 198ھ)(1)

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم سے احادیث کے جو مجموعے تیار ہوئے، انہیں صرف حفاظت کے لئے سنبھال کر رکھ نہیں دیا گیا بلکہ امت میں ان کی اشاعت کے لئے خصوصی اہتمام کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے حضرت ابن شہاب الزھری نے احادیث مرتب کر کے حضرت عمر بن عبد العزیز کے پاس بھیجیں اور آپ نے ان کی نقلیں فوراً ریاست اسلامی کے مختلف علاقوں میں روانہ فرما دیں۔ حضرت ابن شھاب زہری نے خود وضاحت فرمائی ہے:

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 8-337، "المنہل اللطیف"، صفحہ 23

أَمَرَنَا عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ بِجَمْعِ السُّنَنِ فَكَتَبْنَاهَا دَفْتَرًا دَفْتَرًا فَبَعَثَ إِلَى كُلِّ أَرْضٍ لَهُ عَلَيْهَا سُلْطَانٌ دَفْتَرًا (1)

"حضرت عمر بن عبد العزیز نے ہمیں احادیث جمع کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے احادیث طیبہ کو کئی دفاتر میں مرتب کر دیا اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے ہر اس علاقے کی طرف ایک دفتر روانہ کر دیا جو ان کی سلطنت کا حصہ تھا۔"

حضرت عمر بن عبد العزیز نے احادیث طیبہ کی صرف تدوین کا ہی حکم نہیں دیا تھا بلکہ ساتھ ہی ان کی نشر واشاعت کا بھی حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ احادیث کو پھیلاؤ کیونکہ یہ علم ہے اور علم جب راز بن جائے تو ختم ہو جاتا ہے۔

گزشتہ بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ احادیث طیبہ کی حفاظت کے لئے کتابت کے ذریعے کو ابتدا ہی سے استعمال کیا جاتا رہا۔ احادیث طیبہ کو سینوں میں محفوظ رکھنے، اپنی زندگیوں کو انہی کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے اور احادیث کو تحریری شکل میں محفوظ رکھنے کی انفرادی کوششیں اتنی عمدہ تھیں کہ ان کی موجودگی میں سرکاری سطح پر احادیث کی باقاعدہ تدوین کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ لیکن پہلی صدی ہجری کے اختتام پر حالات نے خلیفہ وقت حضرت عمر بن عبد العزیز کو سرکاری سطح پر تدوین حدیث کی طرف راغب کیا اور ان کے حکم سے سرکاری سطح پر تدوین حدیث کی ابتداء ہوئی۔ اس کے بعد ہر زمانے کے علماء نے احادیث طیبہ کی خدمت میں حصہ لیا۔

امت مسلمہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر ہمیشہ کڑی نظر رکھی اور جب بھی قرآن وحدیث کی حفاظت کے لئے نئے اسلوب اپنانے کی ضرورت محسوس ہوئی، انہوں نے وقت کے تقاضوں پر لبیک کہنے میں ذرا سستی نہیں کی۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے سے پہلے سرکاری سطح پر احادیث کے مدون نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے ملت کے اصحاب اقتدار کو اس کا احساس نہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے اس اسلوب کو اپنانے کی ضرورت ہی

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 332

محسوس نہیں ہوئی۔ اس بات کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضرت عمر بن عبد العزیز نے مختلف علماء کو احادیث کی تدوین کے متعلق لکھا تھا، اسی طرح ان کے والد عبد العزیز بن مروان نے بھی اپنی مصر کی گورنری کے زمانے میں حضرت کثیر بن مرہ کو احادیث لکھنے کے متعلق لکھا تھا

حضرت لیث بن سعد کہتے ہیں:

حَدَّثَنِیْ یَزِیْدُ بْنُ اَبِیْ حَبِیْبٍ اَنَّ عَبْدَالْعَزِیْزِ بْنَ مَرْوَانَ کَتَبَ اِلٰی کَثِیْرِ بْنِ مُرَّۃَ الْحَضْرَمِیِّ وَکَانَ قَدْ اَدْرَکَ بِحِمْصَ سَبْعِیْنَ بَدْرِیًّا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیْثٌ: وَکَانَ یُسَمَّی الْجُنْدَ الْمُقَدَّمَ قَالَ: فَکَتَبَ اِلَیْہِ اَنْ یَّکْتُبَ اِلَیْہِ بِمَا سَمِعَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ اَحَادِیْثِھِمْ اِلاَّ حَدِیْثَ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ فَاِنَّہٗ عِنْدَنَا (1)

"یزید بن ابی حبیب نے مجھے بتایا کہ عبد العزیز بن مروان نے کثیر بن مرہ حضرمی کو، جن کی ملاقات حمص میں ستر بدری صحابہ کرام سے ہوئی تھی اور جن کو "الجند المقدم" کہا جاتا تھا، لکھا کہ انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جو احادیث سن رکھی ہیں وہ ان کے لئے تحریر کر دیں سوائے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی احادیث کے کیونکہ وہ پہلے ہی ان کے پاس موجود ہیں۔"

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ آیا حضرت کثیر بن مرہ نے گورنر مصر کے حکم کی تعمیل کی تھی یا نہیں لیکن گورنر مصر کی خواہش کے باوجود علمائے کرام تدوین حدیث کی طرف اس رفتار سے مائل نہیں ہوئے، جس رفتار سے ان کے صاحبزادے کے دور میں ان کی دعوت پر ہوئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ عبد العزیز بن مروان کے زمانے میں علماء نے اس کام کی ضرورت کو شدت سے محسوس نہ کیا تھا لیکن حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانے میں علمائے کرام نے اسی بات کو شدت سے خود بھی محسوس کیا جو خلیفہ وقت نے محسوس کی

1۔ السنۃ قبل التدوین، صفحہ 373

تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خلیفہ وقت کی دعوت پر علمائے کرام تدوین حدیث کی انتھک کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ اس بات سے اس حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ علمائے اسلام وقت کے حکمرانوں کے دباؤ میں آکر کوئی ایسا کام نہ کرتے تھے جسے وہ خود غیر ضروری یا نامناسب سمجھتے تھے۔ گورنر مصر کا حکم اس لئے نہ چل سکا کہ اس وقت کے علماء نے خود اس کام کی ضرورت محسوس نہ کی اور اسی گورنر کے بیٹے کا اسی نوعیت کا حکم پوری آب و تاب سے اس لئے نافذ ہو گیا کہ ان کے دور کے علماء نے خود بھی اس کام کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ احادیث ہر دور میں کتابت شدہ شکل میں موجود تھیں، تو اس سے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ ہر زمانے میں روایت حدیث میں کتابت کا دخل رہا ہے اور یہ تصور کلیۃً غلط ہے کہ احادیث کی باقاعدہ تدوین سے پہلے وہ صرف زبانی طور پر ہی ایک راوی سے دوسرے راوی کی طرف منتقل ہوتی رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتداہی سے کتابت شدہ مواد سے روایت کرنے کا رواج رہا ہے اور کتابت شدہ مواد سے روایت کرنے کا رواج اسلام سے پہلے کے عربوں میں بھی تھا۔

اصول حدیث کے سرسری مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں کہ ابتداہی سے مدونہ مواد سے روایت کرنے کا رواج رہا ہے۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ہم ان الفاظ پر غور کرتے ہیں جو راوی، حدیث روایت کرتے وقت، استعمال کرتا ہے۔ ان الفاظ سے فن اصول حدیث کا ماہر آسانی سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ راوی کو یہ حدیث کس طریقے سے پہنچی ہے۔

راوی حدیث روایت کرتے وقت کبھی حَدَّثَنِیْ کہتا ہے، کبھی حَدَّثَنَا۔ وہ کبھی سَمِعْتُ کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور کبھی سَمِعْنَا کے۔ کبھی وہ اَخْبَرَنِیْ کہتا ہے اور کبھی اَخْبَرَنَا۔

ماہرین اصول حدیث اس قسم کے الفاظ کو طرقِ تحمل حدیث کہتے ہیں اور انہوں نے ان کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔(1)

1: سماع: سماع یہ ہے کہ شاگرد ان مرویات کو سنتا ہے جو شیخ اپنے حافظے کی مدد سے اس کے سامنے پڑھتا ہے یا اپنی کتاب سے پڑھ کر سناتا ہے۔ شاگرد نے اس طریقے سے جو حدیث

1۔ مقدمہ تاریخ تدوین حدیث، صفحہ 30-28

حاصل کی ہوتی ہے، اسے روایت کرتے وقت وہ سَمِعْتُ عَنْ یا حَدَّثَنِیْ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

2 قراءت: اس سے مراد یہ ہے کہ شاگرد یا کوئی شخص کتاب سے ایک حدیث یا چند احادیث شیخ کے سامنے پڑھتا ہے یا اپنے حافظے کی مدد سے شیخ کو سناتا ہے اور شیخ اپنی کتاب کے نسخہ یا اپنے حافظہ میں محفوظ مواد سے خاموشی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ اس طریقہ سے حاصل کردہ حدیث کو روایت کرتے وقت یہ الفاظ بولے جاتے ہیں: اَخْبَرَنِیْ یا قرأتُ علی

3 اجازت: اس کی دو صورتیں ہیں۔

(ا) شیخ یا راوی مجاز کسی دوسرے آدمی کو ایک یا زیادہ متن روایت کرنے کی اجازت دے دیتا ہے۔

(ب) شیخ کسی دوسرے آدمی کو ان کتب کی روایت کرنے کی اجازت دے دیتا ہے جنکی تفصیل بیان نہیں کی ہوتی۔ مثلاً استاد اس طرح کہتا ہے: میں نے تمہیں اپنی تمام مرویات کی روایت کرنے کی اجازت دی۔ اس طریقے سے حاصل شدہ احادیث کو روایت کرتے وقت راوی اخبرنی اور اجازنی وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔

4 مناولہ: شیخ اپنے شاگرد کو اپنی اصل کتاب دے دیتا ہے یا وہ کتاب دے دیتا ہے جس سے اس نے روایت کی ہوتی ہے یا اس کتاب کا وہ نسخہ دے دیتا ہے، جس کے ساتھ اس نے اپنے نسخہ کا مقابلہ کر لیا ہوتا ہے اور کہتا ہے: "یہ میری کتاب ہے یا یہ میری روایت ہے، میں نے تمہیں اس کو روایت کرنے کی اجازت دی۔" یہ نسخہ کتاب شیخ اپنے شاگرد کو دے دیتا ہے جو اس کی ملکیت ہو جاتی ہے یا شیخ اپنے شاگرد کو اس شرط پر دے دیتا ہے کہ اسے نقل کرنے کے بعد اصل کتاب واپس کر دے گا۔ اس طریقے سے حاصل کردہ احادیث کو روایت کرنے کے لئے اخبرنی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور بعض مخصوص حالات میں لفظ نَاوَلَ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

5 کتابت یا مکاتبہ: اس سے مراد یہ ہے کہ شیخ خود اپنی کتاب یا اپنی مرویات سے ایک نسخہ تیار کرتا ہے، یا دوسرے شخص کو جو شاگردی ہوتا ہے اس سے دوسرا نسخہ نقل کرنے کے لئے مقرر کرتا ہے۔ یہاں شیخ کے لئے اپنے شاگرد سے یہ وضاحت کرنا ضروری نہیں ہے کہ میں نے تمہیں اس کی روایت کرنے کا اختیار دیا ہے۔ راوی جب اس قسم کے نسخے سے

روایت کرتا ہے تو کَتَبَ اِلَیَّ یا مِنْ کِتَابِ فُلَانٍ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

6: یا یہ کہ شیخ ایک کتاب یا روایت دوسرے آدمی کو دے کر ساتھ ساتھ اشارہ کر دیتا ہے کہ اس کی مجھ سے روایت کی گئی ہے لیکن دوسرے لوگوں کو اس کی روایت کرنے کی اجازت معلق رکھ چھوڑتا ہے۔ جو آدمی اس قسم کی کتاب سے روایت کرے، وہ اَخْبَرَنِیْ یا عَنْ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

7: وصیت: اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ اپنی وفات یا سفر سے قبل اپنی کسی کتاب یا چند کتابوں سے روایت کرنے کا حق اپنی وصیت کے مطابق دوسرے کو منتقل کر دیتا ہے۔ عام طور پر اس قسم کی حدیث کو روایت کرنے کے لئے اَخْبَرَنِیْ وَصِیَّۃً عَنْ یا وَصَّانِیْ کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

8: وجادہ: اس سے مراد کسی کی کتاب یا حدیث سے استفادہ کرنا ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ اس کا ہم عصر ہے یا اس سے پہلے کا۔ اس قسم کی حدیث روایت کرتے وقت یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں:

وَجَدْتُ- قَالَ- اُخْبِرْتُ- اور حُدِّثْتُ وغیرہ۔

قارئین کرام ان تمام اصطلاحات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صرف دو طریقوں، سماع اور قراءت کے علاوہ تحمل حدیث کا اور کوئی طریقہ ایسا نہیں جس میں کتاب کا ذکر نہ ہو۔ اور سماع اور قراءت میں بھی ضروری نہیں کہ کلیۃً اعتماد حافظے پر ہو بلکہ ان میں بھی شیخ کتاب کی مدد سے اپنے شاگردوں کو حدیث سنا سکتا ہے اور شاگرد بھی کتاب کی مدد سے اپنے شیخ کے سامنے احادیث پڑھ سکتے ہیں جسے قراءت کا طریقہ کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فواد سزگین نے روایت کی ان اصطلاحات اور تاریخ حدیث کو سامنے رکھ کر بڑے مضبوط دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ روایت حدیث میں کتابت کا سہارا ابتدائے اسلام ہی سے لیا جاتا رہا ہے۔ ہم ان کے حوالے سے یہاں چند مثالیں نذر قارئین کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا: عالم کے سامنے قراءت اس سے سماع کے برابر ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ تم میرے سامنے قراءت کرو کیونکہ میرے سامنے تمہاری قراءت ایسی ہے جیسے میں نے تمہارے سامنے قراءت کی۔

اسی طرح بعض صحابہ نے حضور ﷺ کے خطوط کی روایت کی ہے۔ عمرو بن حزم نے ان خطوط کی روایت کی ہے جو فرائض، زکوۃ اور دیات کے بارے میں ان کو بھیجے گئے تھے۔ بعد میں یہی خطوط حدیث کے مجموعات میں شامل ہو گئے۔

عبد اللہ بن کلیم جہنی جو مخضرمین میں سے ہیں، نے رسول اللہ ﷺ کے اس خط کی روایت کی ہے جو قبیلہ جہینہ کو بھیجا گیا تھا۔

حارث بن عمرو نے، جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیدا ہوئے، خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خط کی روایت کی ہے، جو انہوں نے نماز کے بارے میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔

تابعی بشیر بن نہیک نے حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے پوچھا کہ جو کتاب میں نے آپ سے نقل کی ہے، کیا میں آپ کے نام سے اس کی روایت کر سکتا ہوں؟ تو حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ نے موافقت میں جواب دیا۔ (1)

ڈاکٹر فواد سزگین نے مختلف راویوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی اپنے شیوخ سے روایات مدونہ مواد کے حوالے سے تھیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ یہ رائے عام تھی کہ حضرت قتادہ نے ابو قلابہ عبد اللہ بن زید سے سوائے چند کلمات کے کچھ نہیں سنا اور ان سے قتادہ کی روایات بطریق کتابت یا وجادہ تھیں۔ در حقیقت ابو قلابہ کی ایک کتاب ان کے پاس موجود تھی۔

سعید بن ابی عروبہ نے قتادہ سے تفسیر کی سماعت نہیں کی، اس لئے قتادہ سے ان کی روایت سماعاً نہیں بلکہ بواسطہ کتابت ہے۔

ابن جریج نے خود بیان کیا ہے کہ انہوں نے زہری سے حدیث نہیں سنی۔ زہری نے ان کو ایک کتاب دی تھی جس سے انہوں نے نقل کیا اور زہری نے انہیں اس کی روایت کا حق بھی دے دیا۔ (2)

ڈاکٹر فواد سزگین نے اس قسم کی اور مثالیں بھی لکھی ہیں لیکن ہم ان چند مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ عہد صحابہ ہی سے احادیث کو مدونہ مواد کے ذریعے روایت کرنے کا رواج شروع ہو گیا تھا تو پھر یہ کہنا کہ احادیث کی تدوین دوسری یا

مقدمہ تاریخ تدوین حدیث، صفحہ 32-31

2۔ ایضاً، صفحہ 38

تیسری صدی ہجری میں ہوئی اور اس سے پہلے احادیث کا سارا سرمایہ صرف حافظے کی مدد سے زبانی طور پر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہا، تعصب کی انتہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیث کی حفاظت کے لئے ابتدا ہی سے حافظہ کے ساتھ ساتھ کتابت کا ذریعہ استعمال ہوتا رہا، البتہ فرق یہ ہے کہ ابتدا میں زیادہ زور حافظے پر تھا اور جو لوگ احادیث کو لکھتے تھے، وہ ان کو حفظ بھی ضرور کرتے تھے اور حافظے کی مدد سے روایت کرنے کو ترجیح حاصل تھی لیکن جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، کتابت نے حافظے پر فوقیت حاصل کرلی اور حدیث ہر دور کے تقاضوں کے مطابق حفاظت کے مختلف ذرائع سے محفوظ ہو کر ہم تک پہنچی۔

تدوین صحیح

مسلمانوں کو قرآن حکیم نے حکم دیا تھا کہ ان کے پاس جو خبر آئے، اس کی تحقیق کے بغیر اسے فوراً تسلیم نہ کرلیا کریں۔ حضور ﷺ نے بھی ان لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت کی نعمتوں کی دعا کی تھی جو حدیث رسول کو سن کر اس کی حفاظت کرتے ہیں اور پھر پوری دیانت داری سے ان احادیث کو دوسرے لوگوں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی آپ نے ان لوگوں کو آگ کے ابدی عذاب سے ڈرایا تھا جو آپ کی طرف جھوٹی باتوں کو منسوب کرتے ہیں۔

خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے ان فرامین کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان حضور ﷺ کی احادیث طیبہ کے حصول اور ان کی روایت میں انتہائی احتیاط کا رویہ اپنائیں۔ اس احتیاط کی مثالیں ہمیں قبول حدیث کے متعلق صحابہ کرام کے رویے میں ملتی ہیں کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حدیث روایت کرنے والوں کو سختی سے اپنی روایت پر گواہ پیش کرنے کا حکم دیتے تھے اور دیگر صحابہ کرام بھی قبول حدیث کے لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالٰی عنہ کے اس منہاج کی پیروی کرتے تھے۔ یہ کام ایسا تھا جس کے لئے انفرادی کوششیں کافی نہ تھیں بلکہ احادیث کی جانچ پڑتال کے لئے ایک باقاعدہ سسٹم کی ضرورت تھی۔ یہ سسٹم ابتدا میں گواہوں یا قسم کی شکل میں شروع ہوا اور پھر اس نے اسناد کی شکل اختیار کرلی۔

صحیح مسلم کے مقدمہ میں ابن سیرین سے مروی ہے، فرمایا:

لَمْ يَكُوْنُوْا يَسْأَلُوْنَ عَنِ الْاَسْنَادِ فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ قَالُوْا سَمُّوْا لَنَا رِجَالَكُمْ فَيُنْظَرُ اِلَىٰ اَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ حَدِيْثُهُمْ وَيُنْظَرُ اِلَىٰ اَهْلِ الْبِدَعِ فَلَا يُؤْخَذُ حَدِيْثُهُمْ (1)

"پہلے اسناد کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا لیکن جب فتنوں نے سر اٹھایا تو، جن کے سامنے حدیث روایت کی جاتی، وہ کہتے، ان لوگوں کے نام لو جنہوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ متبعین سنت کی احادیث کو قبول کر لیا جاتا اور بدعتی لوگوں کی احادیث کو قبول نہ کیا جاتا۔"

جب کسی خبر کی قبولیت کا انحصار سند کی معرفت پر ہو گیا تو پھر ضروری تھا کہ یہ معلوم ہو کہ جن راویوں کے نام سند میں آتے ہیں، وہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں۔ اس مقصد کے لئے جرح اور تعدیل کا فن ظاہر ہوا۔ راویوں کے حالات قلمبند ہوئے اور ہر راوی کے حالات کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا گیا کہ آیا وہ اس قابل ہے کہ اس کی روایت کو قبول کیا جائے یا وہ اس قابل نہیں۔

مسلمانوں نے سند اور متن دونوں کو پرکھنے کے لئے قواعد وضع کئے۔ اور پھر ہر حدیث کو ان قواعد وضوابط پر پرکھ کر اس کا مقام متعین کیا۔

گو علم اصول حدیث ایک باقاعدہ فن کی شکل میں تدوین حدیث کے بعد منظر عام پر آیا لیکن اس علم کی اساسی اور بنیادی باتیں ابتدا ہی سے محدثین میں مروج تھیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی کوششوں سے تدوین حدیث کی جو تحریک اٹھی، اس میں مدونین ہر حدیث کے ساتھ اس کی پوری سند بیان کر دیتے تھے اور یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ سند اور متن کو پرکھ کر ہر حدیث کا مقام متعین کر لیں۔

جو لوگ فن حدیث کے ماہر تھے ان کے لئے تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ تو کسی حدیث کی سند کو دیکھ کر یہ معلوم کر لیتے تھے کہ ان میں کون سے راوی ثقہ ہیں اور کون سے ضعیف۔ احادیث وضع کرنے والے سازشی لوگ بھی ان کی نظروں سے نہیں بچ سکتے تھے۔ سند کو دیکھ کر وہ اس کے متصل اور منقطع ہونے کا بھی اندازہ لگا لیتے تھے اور ان لوگوں کیلئے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہ تھا کہ اس سند کے کس راوی نے اپنے شیخ سے کس ذریعے سے حدیث حاصل کی ہے۔ ماہرین فن حدیث کے برعکس دوسرے مسلمانوں کا معاملہ مختلف تھا۔ یہ

1۔ ڈاکٹر محمود طحان، "تیسیر مصطلح الحدیث"، (فاروقی کتب خانہ ملتان۔ س ن)، صفحہ 9-8

بات عام مسلمانوں کے بس میں نہ تھی کہ وہ صحیح اور ضعیف احادیث میں تمیز کر سکیں یا کسی موضوع روایت کی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں۔

متقدمین کی کتابوں میں صحیح اور سقیم میں تمیز کیے بغیر احادیث درج کرنے کا جو رواج تھا، اس سے امت کے لئے کئی مسئلے پیدا ہوئے۔ دشمنان دین نے موضوع اور ضعیف حدیثوں کے اسلامی مصادر میں موجود ہونے کو، اسلام کی جڑیں کھودنے کے لئے دل کھول کر استعمال کیا اور آج تک کر رہے ہیں۔

ملت اسلامیہ کے علمائے حق نے بروقت اس خطرے کو بھی بھانپ لیا اور وہ ایسی کتابیں مرتب کرنے کی طرف مائل ہوئے جن میں صرف صحیح احادیث درج کی جائیں تاکہ عام مسلمان پورے اعتماد کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہو سکیں۔ حضرت امام بخاری کے استاد حضرت اسحٰق بن راھویہ نے اپنے شاگردوں کے سامنے اس ضرورت کا ذکر کیا اور فرمایا:

لَوْ جَمَعْتُمْ كِتَابًا مُخْتَصَرًا لِصَحِيْحِ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (1)

"اگر تم ایک مختصر سی کتاب مرتب کرو جس میں حضور ﷺ کی صرف صحیح احادیث درج ہوں، تو کتنا اچھا ہو۔"

اپنے استاد محترم کی یہ بات حضرت امام بخاری کے دل میں گھر کر گئی اور انہوں نے اپنے استاد کی خواہش کے مطابق حفاظت حدیث کے لئے وہ کام کرنے کا تہیہ کر لیا جس نے انہیں رہتی دنیا تک ساری امت مسلمہ کا محسن بنا دیا۔ امام بخاری نے اپنی کتاب میں صرف وہ احادیث جمع کیں جن کی اسناد متصل تھیں اور ان کی اسناد اور متون ہر قسم کی علل سے پاک تھے اور جو ماہرین فن حدیث کے مطابق "احادیث صحیحہ" کہلانے کی مستحق تھیں۔ امام بخاری کے بعد پھر کئی دوسرے لوگوں نے یہی کام کیا جن میں امام مسلم خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ علمائے اسلام نے اس کام کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ہر معیار کی احادیث کو علیحدہ جمع کرنے کی کوششیں کیں۔ ہر حدیث کا مقام بیان کیا۔ بعض علماء نے موضوع روایات کو الگ کتابوں میں جمع کر دیا تاکہ کسی مسلمان کو ان سے دھوکا نہ ہو۔ حدیث کی حفاظت کے لئے یہ کوششیں صرف ملت اسلامیہ کا حصہ ہیں۔ حفاظت حدیث کے لئے

1۔ الحطہ اللطیف، صفحہ 25

مسلمانوں کی اتنی کوششوں کے باوجود احادیث کو ناقبل اعتبار وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کا فلسفہ یہ ہو کہ "جھوٹ اتنی کثرت سے بولو کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔"

راویان حدیث کے متعلق دشمنان اسلام کی ہرزہ سرائیاں

دنیا کی کوئی قوم تاریخی واقعات مرتب کرتے وقت یہ نہیں دیکھتی کہ ان واقعات کی خبر دینے والے لوگوں کی عدالت، امانت، دیانت اور اخلاق کا معیار کیا ہے۔ یہ امت مسلمہ کا طرہ امتیاز ہے کہ انہوں نے خبر کی تصدیق کے لئے مخبر کے کردار کو مد نظر رکھا ہے اور روایت حدیث کے لئے راوی کے کردار کے اس حد تک بلند ہونے کی شرط رکھی ہے کہ امام مالک نے ستر ایسے راویوں سے حدیث روایت کرنے سے انکار کر دیا جو اپنے کردار کے لحاظ سے اس قابل تو تھے کہ انہیں بیت المال کا نگران مقرر کیا جا سکے لیکن کردار کی اس بلندی کے باوجود امام مالک کی نظر میں ان کی عدالت ایک راوی حدیث کے معیار سے کم تر تھی۔

مسلمانوں نے اسماء الرجال میں ہر راوی کے کردار پر بے لاگ تبصرہ کیا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو بغیر کسی جھجک یا ذہنی تحفظ کے بیان کر دیا۔ یہ کام کرتے وقت ان کے راستے میں نہ تو کسی کا ظاہری تقویٰ حائل ہوا اور نہ ہی اس راوی کی طاقت اور اقتدار انہیں سچ لکھنے سے باز رکھ سکے۔ لیکن جو لوگ احادیث طیبہ کے قصر رفیع کو منہدم کرنے کی قسم کھائے بیٹھے تھے، ان کے لئے رجال حدیث کو متہم کئے بغیر چارہ کار نہ تھا۔ کیونکہ جب تک مسلمان ان کی ثقاہت پر یقین کامل رکھتے تھے، ان کی مرویات کو مسلمانوں کی نظروں میں مشکوک بنانا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث نے سرمایہ حدیث کو مشکوک بنانے کے لئے رجال حدیث کے پاک دامن پر ایسی ایسی تہمتیں لگائیں، جن کے تصور ہی سے جبین شرافت عرق انفعال کے قطروں سے تر ہو جاتی ہے۔

ان لوگوں نے اپنے حملوں کیلئے انہی نفوس قدسیہ کو ہدف بنایا، جنہوں نے سب سے زیادہ احادیث طیبہ کی خدمت کی تھی۔ اپنے حملوں کے لئے ان کی نگاہ انتخاب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت امام زہری جیسی عظیم شخصیات پر پڑی۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے اپنے علم، اخلاق، کردار اور خدمت دین کی وجہ سے امت اسلامیہ میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا۔ یہ ہستیاں علمائے جرح و تعدیل کے نزدیک تو عدالت کے بلند ترین مقام پر

فائز ہیں لیکن دشمنان اسلام کی نظروں میں (نعوذ باللہ) یہ ہستیاں دیانت کے زیور سے عاری ہیں۔ دشمنان دین نے ان نفوس قدسیہ پر سیاستدانوں کی خوشنودی کے لئے احادیث گھڑنے کا الزام لگایا ہے۔ یہ الزام لگانے والے وہ لوگ تھے جن کے طعن و تشنیع کے تیروں سے صدیق و فاروق جیسی ہستیاں بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔

مستشرقین نے ان ہستیوں پر لگائے جانے والے الزامات کو خوب اچھالا۔ انہوں نے ان حضرات کے بارے میں پوری امت مسلمہ اور فن رجال کے ماہرین کے موقف کو مسترد کر دیا اور ان کے مقابلے میں گمراہ فرقوں کے پروپیگنڈے کو ہی حقیقت قرار دیا۔ ہم یہاں نہ ان تہمتوں کی تفصیلات میں جانا چاہتے ہیں اور نہ ہی ان کے رد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کیونکہ مستشرقین کے نزدیک تو ساری امت مسلمہ ہی اس قسم کے الزامات کی زد میں آتی ہے اور اس کا ہم نے پہلے تفصیل سے جواب دے دیا ہے۔ یہاں ہم مسلمانوں کو صرف اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ اور امام زھری پر الزامات کی نوعیت وہی ہے، جو نوعیت ان الزامات کی ہے جو دشمنان اسلام نے کبھی حضور ﷺ پر لگائے، کبھی وہ الزامات انہوں نے صدیق و فاروق پر لگائے اور کبھی پوری ملت اسلامیہ کو ان الزامات کا نشانہ بنایا۔ اس قسم کے الزامات بے لاگ علمی تحقیق کا نتیجہ نہیں بلکہ حسد، بغض اور عناد کی پیداوار ہیں اور یہ اس قابل نہیں کہ ان کے علمی رد کی ضرورت محسوس کی جائے۔

احادیث طیبہ کے متعلق مستشرقین کی مثبت آراء

مستشرقین کا مقصد چونکہ علم و تحقیق کے نام پر اسلام کی شکل کو مسخ کرنا اور مسلمانوں کا اپنے دین پر اعتماد ختم کرنا ہے، اس لئے ان کی اکثر تحریریں اسلام کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کی شکل میں ہوتی ہیں لیکن اس پروپیگنڈے کے دوران، ان کے قلم سے ایسی باتیں بھی نکل جاتی ہیں جو مسلمانوں کے موقف کی تائید کرتی ہیں۔ مستشرقین میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تحریروں پر علمی رنگ غالب ہوتا ہے اور وہ ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں جن سے مسلمانوں کے خلاف مستشرقین کے موقف کی تردید ہوتی ہے۔

مستشرقین کی اکثریت گولڈ زیہر کی پیروی کرتے ہوئے، احادیث طیبہ کو دوسری اور

تیسری صدی ہجری کی اختراع قرار دیتی ہے لیکن بعض مستشرقین کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ہی مسلمان احادیث طیبہ پر عمل پیرا تھے اور بعد کے مسلمانوں تک حضور ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات باوثوق ذرائع سے منتقل ہوئے ہیں۔ ذیل میں ہم مستشرقین کی چند ایسی تحریریں پیش کرتے ہیں۔

فلپ۔ کے۔ ہٹی، نے جہاں احادیث کے متعلق دوسرے مستشرقین کے خیالات کی تائید کی ہے، وہاں اس کے قلم سے یہ الفاظ بھی نکلے ہیں:

"Throughout his lifetime Muhammad served as God's spokesman, thereby performing the triple function of legislator, judge, and executive.

The usage of prophet (sunnah, "custom," "use") including his deeds, utterances and tacit approval was available. It clarified the scriptural text, eleborated on it, supplemented it, and thus fulfilled new demands. The prophetic sunnah became in the first century after the hijrah the object of intensive study, next to the study of the Koran itself. the research involved collection, verification and recording". (1)

"محمد ﷺ نے اپنی پوری زندگی خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیئے اس طرح وہ ایک قانون ساز، جج اور منتظم کے سہ گونہ فرائض سرانجام دیتے رہے ...... (حضور ﷺ کے بعد) آپ کی سنت یعنی آپ کی عادات، آپ کا طریقہ کار، آپ کے اقوال، آپ کے افعال اور آپ کی تقریرات دستیاب تھیں۔ یہ چیزیں وحی کے متن کی تبیین اور تفسیر کرتیں اور اس طرح نئے تقاضوں کو پورا کرتی تھیں۔ ہجرت کے بعد کی پہلی صدی میں احادیث طیبہ، قرآن حکیم کے بعد زبردست تحقیق اور مطالعہ کا موضوع قرار پائیں۔ احادیث کی تحقیق میں، احادیث کو جمع کرنے، ان کی جانچ پڑتال کرنے اور ان کو ریکارڈ کرنے کے مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا۔"

1۔ فلپ۔ کے۔ ہٹی، "اسلام اے وے آف لائف"، (مینسوٹا پریس مینیپولس۔ 1971ء)، صفحہ 42

فلپ۔ کے۔ ہٹی کا یہ اقتباس مستشرقین کے تمام مزعومات کی قلعی کھول رہا ہے کیونکہ یہ حضور ﷺ کی زندگی میں آپ کے اقوال کی تشریعی حیثیت کو تسلیم کر رہا ہے، احادیث کے قرآن حکیم کے بیان اور تفسیر کے طور پر استعمال ہونے کو تسلیم کر رہا ہے اور ہجرت کے بعد پہلی صدی میں احادیث کی زبردست تحقیقات کا اقرار کر رہا ہے۔ فلپ ہٹی کے مطابق اس دور میں احادیث کو جمع بھی کیا گیا، انہیں پرکھا بھی گیا اور انہیں ریکارڈ بھی کیا گیا۔ یہ تمام باتیں عام مستشرقین کے مزعومات کے خلاف ہیں اور یہ باتیں احادیث طیبہ کی اہمیت اور ان کی حفاظت کے لئے کی جانے والی کوششوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

جان بیگٹ گلب (John Bagot Glubb) اپنی کتاب "The life times of Muhammad" میں لکھتا ہے:

"There were many minor legal and administrative problems to settle, his decisions in which were passed down in Muslim tradition and became unchanging laws for hundreds of millions of persons, for centuries to come." (1)

"بہت سے کم اہمیت کے قانونی اور انتظامی امور کو طے کرنا باقی تھا۔ ایسے امور کے متعلق محمد (ﷺ) کے فیصلے اسلامی روایات کی شکل میں بعد کے مسلمانوں کی طرف منتقل ہوئے اور صدیوں تک کروڑوں مسلمانوں کے لئے ناقابل تغیر قانون کی حیثیت اختیار کر گئے۔

یہاں مسٹر گلب کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ کے فیصلے اسلامی روایت کا حصہ بنے اور کروڑوں انسانوں کے لئے ناقابل تغیر قانون بن گئے۔ جبکہ عام مستشرقین احادیث کو حضور ﷺ کے فیصلے یا اقوال نہیں مانتے بلکہ انہیں بعد کے مسلمانوں کی اختراع قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر موریس بکائلے (Maurice Bucaille) لکھتے ہیں:

"During Muhammad's life and after his death, complementary information of legislative nature was indeed sought in the study of the words and deeds of the

---

1۔ جان بیگٹ گلب، "دی لائف ٹائمز آف محمد"، (ہاڈر اینڈ سٹاٹن لندن۔ (1970ء)، صفحہ 359

prophet." (1)

"محمد (ﷺ) کی زندگی میں اور آپ کے انتقال کے بعد قانونی نوعیت کی اضافی معلومات کو آپ کے افعال و اقوال میں تلاش کیا جاتا تھا۔"

احادیث کی جانچ پڑتال اور حفاظت کے متعلق مسلمانوں کی کوششوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر بکائلے لکھتے ہیں:

"Those who undertook to assemble them in collections made the kind of enquiries which are always very taxing before recording accounts of past events. They nevertheless had a great regard for accuracy in their arduous task of collecting information. This is illustrated by the fact that for all of the prophet's sayings, the most venerable collections always bear the names of those responsible for the account, going right back to the person who first collected the information from members of Muhammad's family or his companions." (2)

"جن لوگوں نے احادیث طیبہ کو مجموعوں میں مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا، انہوں نے احادیث کی جانچ پڑتال کے لئے وہ طریقے اختیار کئے، جن کو تاریخی واقعات کو قلمبند کرنے سے پہلے اختیار کرنا بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ احادیث جمع کرنے کے کٹھن کام میں روایات کی صحت ہمیشہ پورے احترام سے ان کے پیش نظر رہی۔ اس بات کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں احادیث کے جو مجموعے زیادہ مستند ہیں، ان کی تمام احادیث کی اسناد صحابہ کرام یا اہل بیت عظام تک متصل ہیں۔"

موریس بکائلے کے مندرجہ بالا اقتباسات احادیث کے متعلق مستشرقین کے مزعومات کی نفی کر رہے ہیں۔ جرمن مستشرق سپرنگر (A. Sprenger) احادیث طیبہ کے خلاف پروپیگنڈے میں گولڈزیہر کا بھی استاد ہے۔ اپنی اسلام دشمنی کے باوجود وہ مسلمانوں کے

1۔ موریس بکائلے، "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، (اسلامک بک کارپوریشن اسلام آباد۔ 1992ء)، صفحہ 259

2۔ ایضاً

فن اسماء الرجال کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ "الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ" کے مقدمے میں وہ لکھتا ہے:

"نہ ماضی میں کوئی قوم ایسی تھی اور نہ آج کوئی قوم ایسی ہے، جس نے علم اسماء الرجال میں وہ کارنامے سر انجام دیئے ہوں، جو مسلمانوں نے اس میدان میں انجام دیئے ہیں۔ اس عظیم فن میں مسلمانوں نے پانچ لاکھ انسانوں کے حالات زندگی کو مرتب کرنے کا کارنامہ سر انجام دیا ہے۔"(1)

1۔ محمد صدر الحسن ندوی، "المستشرقون والسنۃ النبویہ"، مشمولہ، "الاسلام والمستشرقین"، (جدہ۔1985ء)، صفحہ 434

مُستشرِقین اور
سیرتِ رسُول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

مستشرقین اور سیرت رسول اللہ ﷺ

مستشرقین نے ہر اس چیز کے خلاف اپنی فکری اور عملی، قولی اور فعلی، ذہنی اور قلبی صلاحیتیں صرف کی ہیں جس کا تعلق اسلام سے تھا۔ جو چیز قصر اسلام کے لئے جتنی زیادہ ناگزیر تھی، وہ اسی شدت کے ساتھ مستشرقین کی فتنہ انگیزیوں کا نشانہ بنی۔ انہوں نے قرآن حکیم کے خلاف دل کھول کر اپنا زور قلم استعمال کیا، احادیث طیبہ سے ملت کے اعتماد کو متزلزل کرنے کے لئے اپنے ترکش تزویر کا ہر تیر آزمایا، تاریخ اسلام کی تابناکیوں کو شکوک و شبہات کے غبار سے آلودہ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی اور تعلیمات اسلام کو، جنہوں نے دنیا کی اجڈ ترین قوم کو تہذیب و ثقافت کا امام بنا دیا تھا، اس انداز میں پیش کیا کہ جو بھی انہیں دیکھے کراہت محسوس کرے۔

اسلام کا جو شعار مستشرقین کے حملوں کا خصوصی نشانہ بنا، وہ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ تھی۔ وہ عظیم ہستی جس کے دامن پر ان لوگوں کو کوئی دھبہ نظر نہ آیا جو ایک ہی گھر کی چار دیواری میں برسوں اس کے ساتھ رہے، جنہوں نے اسی گھر میں آنکھ کھولی اور اس ہستی کی نجی زندگی کے ایک ایک شعبے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، جس ہستی کو ان لوگوں نے صادق اور امین کہا جنہوں نے آمنہ کی گود میں کھلنے والی اس کلی کو اپنی آنکھوں کے سامنے گل صد برگ بنتے دیکھا تھا، جس ہستی کے حسب و نسب کی رفعتوں کی گواہی ان لوگوں نے دی، جو اس کی شمع حیات کو گل کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے، جس ہستی کے دامن سے وابستگی کو ان لوگوں نے سعادت دارین سمجھا جن کی تلواریں مسلسل پندرہ بیس سال تک اس کے خلاف بے نیام رہی تھیں، اس ہستی کے دامن پر دھبے تلاش کرنا حماقت بھی ہے اور ظلم بھی۔

ابو سفیان، عکرمہ بن ابی جہل، عمرو بن عاص اور خالد بن ولید جیسے لوگوں نے جب تسلیم کر لیا کہ جس ہستی کو وہ دشمن سمجھتے رہے ہیں، وہ کسی کی دشمن نہیں بلکہ ساری خدائی کی

ہمدرد اور خیر خواہ ہے تو پھر کسی غیر جانبدار محقق کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس ہستی کو دشمن سمجھ کر اس کی ذات میں خامیاں تلاش کرنے کی کوشش کرے۔

ابو سفیان وغیرہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین اسلام اور ذات رسول ﷺ کو اپنے آبائی دین اور اپنی قومی روایات کا دشمن سمجھا تھا۔ انہوں نے حضور ﷺ کے مشن کو اپنے معاشی اور سماجی ڈھانچے کے لئے خطرہ محسوس کیا تھا۔ انہوں نے خانہ کعبہ کی مجلسوں میں حضور ﷺ پر آوازے کسنے سے لے کر محاصرہ مدینہ تک، حضور ﷺ کے خلاف اپنی تلواروں کی دھار کو آزمایا تھا۔ انہوں نے حضور ﷺ سے معاہدے بھی کئے تھے اور ان معاہدوں کے متعلق حضور ﷺ کے رویے کو بھی دیکھا تھا۔ ان کے ہم مشرب اور ہمنوا حضور ﷺ کے قیدی بھی بنے تھے اور انہوں نے ان قیدیوں کے ساتھ آپ کے سلوک کا بھی مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے اس حیران کن انقلاب کو بھی دیکھا تھا جو ان لوگوں کی زندگیوں میں رونما ہو گیا تھا جو ان کا ساتھ چھوڑ کر حضور ﷺ کے دامن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ابو سفیان نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس کی بیٹی دامن رسول سے وابستہ ہو کر اپنے مشرک باپ کو ناپاک کہنے کی جرات سے بہرہ ور ہو گئی ہے۔

ان لوگوں نے اسلام اس وقت قبول کیا تھا، جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ حضور ﷺ کی شخصیت ہدایت کا آفتاب ہے، جس کے سامنے کسی تاریکی کا ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے اسلام کے دامن میں پناہ اس وقت لی تھی جب انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ جس نظام کے دفاع کے لئے وہ برسوں کوشاں رہے ہیں، وہ ظلمتوں کے سوا کچھ نہیں۔ انہوں نے نعرہ حق اس وقت بلند کیا تھا جب ان کے دل، جو بت پرستی کے خوگر تھے، ان میں بت شکنی کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ عرب جو کٹ جانا جانتے تھے لیکن جھکنا نہ جانتے تھے، ان کا حضور ﷺ کے سامنے جھک جانا، آپ کی صداقت کی بھی دلیل ہے اور آپ کی عظمت کی بھی۔ یہ آپ کے کردار کی پاکیزگی کا بھی ثبوت ہے اور آپ کے اخلاق کی بلندی کا بھی۔

مستشرقین مذکورہ بالا سب حقیقتوں سے آشنا ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے بے شمار ساتھی جو ان کے شانہ بشانہ، آفتاب رسالت کی ضو کو کم کرنے کی مہم پر نکلے تھے، انہوں نے اس آفتاب عالمتاب کی نورانی کرنوں سے اپنے قلب و نظر کو منور کر لیا ہے، اس کے باوجود وہ اس آفتاب کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کی نامسعود کوششوں میں

مصروف ہیں۔ مستشرقین کے اس رویے کی توجیہ تعصب، ہٹ دھرمی، انانیت اور بد قسمتی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ آفتاب پھونکوں سے نہ پہلے بجھا ہے اور نہ آئندہ بجھے گا۔ پھونکیں مارنے والے اپنی ناکامیوں اور حسرتوں کی آگ میں جل کر بھسم ہو جائیں گے اور آفتاب رسالت ہمیشہ کی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ نصف النہار پر ضوفشاں رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے دامن کو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا ہے اور مستشرقین اس تابندہ ترین اور پاکیزہ ترین سیرت کے دامن پر دھبے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب انہیں سیرت رسول کے دامن پر کوئی دھبہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنے تخیل کی قوتوں سے کام لیتے ہیں۔ اپنے تخیل کے زور پر وہ نہ صرف سیرت رسول کے دامن پر فرضی دھبے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ سیرت رسول کے وہ پہلو جو پوری انسانیت کے لئے سرمایہ افتخار ہیں، ان کو بگاڑ کر اس طرح پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانیت کے نمونہ کامل کی خوبیاں، خامیاں نظر آنے لگیں اور وہ ہستی جس کی ایک جھلک دلوں کو شکار کر لیتی ہے، اس کا نام سننے والے اس سے نفرت کرنے لگیں۔

مستشرقین نے سیرت رسول کے خلاف جو کچھ لکھا ہے جھوٹ اور فریب کے سہارے لکھا ہے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے لیکن تہذیب و ثقافت کی ترقی کے اس دور میں جھوٹ بولنا ایک فن بن گیا ہے۔ ابو سفیان دربار ہرقل میں حضور ﷺ کے خلاف کوئی ایسی بات نہ کہہ سکا تھا جو جھوٹی ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حضور ﷺ کا کٹر دشمن ہونے کے باوجود فن دروغ گوئی کا ماہر نہ تھا۔ وہ کافر ضرور تھا لیکن اس کے نزدیک جھوٹ ایک اخلاقی مرض تھا، اس لئے وہ جھوٹ نہ بول سکا۔ مستشرقین کے نزدیک جھوٹ ایک اخلاقی مرض نہیں بلکہ ایک فن ہے، اور فن کوئی بھی ہو اس میں کمال، کمال ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنے کے لئے کسی علمی بنیاد کی ضرورت نہیں ہوتی صرف ذہن کی زرخیزی درکار ہوتی ہے اور مستشرقین کے اذہان منفی کاموں کے لئے بہت زرخیز ہوتے ہیں۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کے دامن کو داغدار کرنے کے لئے مختلف انداز اختیار کئے۔ انہوں نے آپ کو اپنے ڈراموں، فلموں اور تصویری کہانیوں کے ناپسندیدہ کردار کی شکل میں پیش کیا۔ کبھی آپ کے جسد انور کو جہنم کے پست ترین درجوں میں دکھایا۔ کبھی یہ ظاہر کیا کہ حضور ﷺ کا جسد انور زمین و آسمان کے درمیان معلق ہے۔ کبھی آپ کو دشمن

مسیح علیہ السلام بنا کر پیش کیا۔ کبھی آپ کو ایک بت کی شکل میں پیش کیا۔ کبھی انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ حضور ﷺ نے ایک کبوتر پال رکھا تھا، جو آپ کے کانوں پر آکر بیٹھتا اور آپ لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے کہ یہ فرشتہ ہے جو وحی لے کر آیا ہے۔

مستشرقین کی سیرت نویسی کا یہ انداز قرون وسطیٰ میں عام تھا اور آج بھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ سلمان رشدی نے "Satanic Verses" اسی انداز میں لکھی ہے جس انداز میں قرون وسطیٰ کے مستشرقین حضور ﷺ کے متعلق لکھتے رہے ہیں۔

حضور ﷺ کی عظمت اور صداقت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کے دشمن آپ کے خلاف کبھی کسی ایک الزام پر متفق نہیں ہو سکے۔ ایک مستشرق نے آپ کے خلاف جو الزام تراشا، دوسرے مستشرق نے اس کی تردید کر دی۔ ایک دشمن نے حضور ﷺ کے کردار کو مجروح کرنے کے لئے کوئی شوشہ چھوڑا تو کسی دوسرے دشمن نے اس کو بے بنیاد قرار دے دیا۔ ہمیں مستشرقین کی تحریروں میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جو لوگ حضور ﷺ کے خلاف لگائے جانے والے کسی الزام کی تردید کرتے ہیں، ان کے دل بھی آپ کے خلاف بغض اور کینے سے بھرے ہوتے ہیں۔ وہ ایک الزام کی تردید کرتے ہیں اور کوئی دوسرا الزام، اس پہلے سے بھی زیادہ ہولناک اور بے بنیاد، تراش کر حضور ﷺ کے کردار کو داغدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ٹار انڈرائے (Tor Andrae) نے اپنی کتاب "Muhammad the man and his faith" میں مغربی سیرت نگاروں کے، سیرت رسول کے متعلق، وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے رجحانات کی مختصر سی تاریخ لکھی ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق اہل مغرب کے رویے کو قارئین کے ذہن نشین کرانے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "ٹار انڈرائے" کے اس بیان کو یہاں درج کر دیا جائے۔ تفصیل سے بچنے کیلئے ہم یہاں ٹار انڈرائے کی عبارت کے صرف اردو ترجمے کو درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ مستشرق مذکور لکھتا ہے:

"ڈانٹے (Dante) محمد ﷺ کو جہنم کے اٹھائیسویں درجے میں دکھاتا ہے۔ ان کا جسم سر سے کمر تک دو لخت ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چاک کرتے نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ان ...... (1) روحوں کے سرخیل ہیں جنہوں نے مذہب میں فرقہ بندی کو متعارف

1۔ یہاں (ڈانٹے) نے جو لفظ استعمال کیا ہے اس کو نقل کرنے کی ضمیر اجازت نہیں دیتا۔

کرایا تھا۔ محمد (ﷺ) کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے ایک جھوٹے مذہب کو اختیار کیا تھا۔ قرون وسطیٰ کی ذہنیت کے مطابق ایسے مقدس الہام کے کسی دعوے کو صرف مقدس فراڈ ہی قرار دیا جا سکتا تھا، جس کی تعلیمات عیسائیت کی تعلیمات سے برتر بتائی گئی ہوں۔ آج کے سادہ لوح عیسائی حجت بازوں کی نظر میں بھی محمد (ﷺ) ایک جھوٹے نبی کے طور پر مشہور ہیں۔
عصر نور کے تصورات نے محمد ﷺ کی شخصیت کے متعلق زیادہ منصفانہ آرا کے مواقع فراہم کیے۔ اس دور کے مفکرین نے اپنے ناپختہ طریق کار کے مطابق پرانے واضعین قانون اور بانیان مذاہب کی عقل اور ان کی خوبیوں کی قدر کی اور انہوں نے عیسائیت کی قیمت پر دیگر مذاہب کی معقولیت پر زور دیا اور ان کی تعریف کی۔

غیر عیسائی مذاہب کی قدردانی کا جو رویہ انہوں نے اپنایا تھا، اسلام کے متعلق بھی انہوں نے اسی رحیمانہ رویے کو اختیار کیا۔ سیل،(1) جس کا ترجمہ قرآن 1734ء میں شائع ہوا جو طویل عرصہ ایک معیاری ترجمے کے طور پر متعارف رہا، اس نے محمد (ﷺ) کو نوما (Numa) اور تھیسیس (Theseus) کا ہم پلہ قرار دیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے ڈی۔ بولان ولیرز (De Boulainvilliers) نے محمد (ﷺ) کی سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب لکھنے سے اس کا واضح مقصد یہ تھا کہ اسلام کی عیسائیت پر فوقیت ظاہر کرے۔ اس نے محمد (ﷺ) کو ایک عقلمند اور روشن ضمیر واضع قانون کے طور پر پیش کیا، جس نے عیسائیت اور یہودیت کے مبہم عقائد کی جگہ ایک معقول مذہب متعارف کرانے کی کوشش کی۔

سیورے (Savary) کا ترجمہ قرآن جو 1752ء میں شائع ہوا، اس میں بھی اس رویہ کا اظہار کیا گیا۔ وہ محمد (ﷺ) کو ان غیر معمولی شخصیات میں سے ایک قرار دیتا ہے جو صفحات تاریخ پر کبھی کبھی نمودار ہوتی ہیں، اپنے ماحول کی تشکیل نو کرتی ہیں اور لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر کامیابی کی راہوں پر گامزن ہوتی ہیں۔ سیورے (Savary) کا خیال ہے کہ جو لوگ محمد (ﷺ) کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں، انہیں ان کی زندگی کے ان کارناموں پر حیرت کا اظہار کرنا چاہیے، جو موافق حالات میں بھی صرف ایسے لوگ سرانجام دیتے ہیں جو نابغہ روزگار ہوں۔ گو محمد (ﷺ) نے بت پرستی کے ماحول میں جنم لیا لیکن اس سطح سے بلند ہو کر وہ خدائے واحد کی عبادت تک پہنچے۔ انہوں نے اپنے سفروں میں مشاہدہ کیا کہ

1۔ یہ وہی جارج سیل ہے جس نے اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمے میں دل کھول کر اسلام پر وار کیے ہیں

فرقوں میں بٹے ہوئے عیسائی کس طرح ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں اور کس طرح یہودی، جو اپنے آپ کو حزب مختار سمجھتے ہیں، وہ اپنے ضابطوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں محمد (ﷺ) نے ایک نیا عالمی مذہب قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایسے سادہ عقائد وضع کئے جن کو عقل تسلیم کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اس خدائے واحد پر ایمان جو نیکیوں پر ثواب اور برائیوں پر عذاب دیتا ہے۔ لیکن سیورے (Savary) کا خیال ہے کہ لوگوں کو یہ مذہب قبول کرنے پر ابھارنے کے لئے محمد (ﷺ) کے لئے ضروری تھا کہ وہ مافوق البشر طاقت کا دعویٰ کریں، اس لئے انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں خدا کا رسول تسلیم کیا جائے۔ یہ ایک مقدس فراڈ تھا جو نظریہ ضرورت کے تحت ناگزیر ہو گیا تھا۔ انہوں نے عیسائیت اور یہودیت کے ان اخلاقی ضابطوں کو قائم رکھا جو گرم علاقوں میں رہنے والی اقوام کے مزاج سے مطابق رکھتے تھے۔ ان کی سیاسی اور عسکری اہلیت اور لوگوں پر حکومت کرنے کی صلاحیت غیر معمولی تھیں۔ سیورے (Savary) ایک روشن خیال مغربی شخص تھا جس نے بجا طور پر محمد (ﷺ) کو ایک پیغمبر کہنے سے انکار کر دیا لیکن وہ کم از کم اس بات پر مجبور ہو گیا کہ وہ محمد (ﷺ) کو تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیات میں سے ایک شمار کرے۔

1742ء میں والٹیر (Voltaire) نے اپنے المیے (Mahomet) میں محمد (ﷺ) کی شخصیت کی قدردانی کے رویے کے بالکل برعکس رویہ اختیار کیا۔ وہ اپنی کتاب کے دیباچے میں "بولان ویلیرز" اور "سیل" پر شدید تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر محمد (ﷺ) ایک پیدائشی شہزادے ہوتے یا رائے عامہ کی مدد سے مسند اقتدار تک پہنچے ہوتے اور انہوں نے اپنے ملک میں پرامن قوانین نافذ کئے ہوتے اور دشمن کے خلاف اپنے ملک کا دفاع کیا ہوتا، تو اس صورت میں ان کی عزت کرنا ممکن تھا۔ لیکن جب ایک اونٹ فروش بغاوت کو ہوا دے، جبرائیل علیہ السلام سے ہم کلامی کا دعویٰ کرے، ایک ایسی ناقابل فہم کتاب کے آسمان سے نازل ہونے کا دعویٰ کرے جس کا ہر صفحہ عقل سے متصادم ہو، جب وہ اس کتاب پر ایمان لانے کیلئے مردوں کو قتل اور عورتوں کو اغوا کرے تو اس رویے کے دفاع کے لئے کوئی شخص اسی وقت کھڑا ہو سکتا ہے جب کہ یا تو وہ "ترک" پیدا ہوا ہو اور یا اوہام پرستی نے اس کے باطن میں فطری روشنی کی ہر لہر کو بجھا دیا ہو۔

"والٹیر" تسلیم کرتا ہے کہ اس نے اپنے ڈرامے میں جن برائیوں کو محمد (ﷺ) کی طرف منسوب کیا ہے، ان برائیوں کا ارتکاب انہوں نے جان بوجھ کر نہیں کیا لیکن ایک آدمی جو اپنی ہی قوم کے خلاف تلوار اٹھاتا ہے اور وہ یہ کام خدا کے نام پر کرنے کی جسارت کرتا ہے، کیا وہ اس قابل نہیں کہ اس کے خلاف کچھ بھی کہا جا سکے؟" والٹیر" نے اپنی بعد کی ایک تصنیف "Essai Surles Moeurs" میں محمد (ﷺ) کے متعلق قدرے نرم رویہ اختیار کیا ہے۔ اس نے اس کتاب میں ان کی عظمت اور اہلیت کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن اس نرم رویے کے باوجود محمد (ﷺ) کو ظالم اور متشدد قرار دینے میں وہ اپنے سابقہ رویے پر برقرار رہا اور اس نے اس بات پر زور دیا کہ محمد (ﷺ) کے مذہب میں کوئی بات نئی نہیں، سوائے اس دعویٰ کے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔

"والٹیر" کی آرا فیشن کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ ڈیڈیروٹ (Diderot) نے دعویٰ کیا کہ محمد (ﷺ) عورتوں کے سب سے بڑے دوست اور عقل سلیم کے سب سے بڑے دشمن تھے۔

8/ مارچ 1840ء بروز جمعہ، جب کارلائل نے "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" پر اپنے دوسرے لیکچر میں محمد (ﷺ) کی شخصیت کا بیان شروع کیا تو اس نے کہا:

"عام خیال یہ ہے کہ محمد (ﷺ) ایک مکار اور مجسم جھوٹ تھے اور آپ کا مذہب بہروپیا پن اور حماقت کا امتزاج تھا لیکن (کارلائل کے خیال میں) اس قسم کے خیالات ہمارے اپنے کردار کی عکاسی کرتے ہیں۔ 18 کروڑ (1) انسان، اسلام کو سچا مذہب تسلیم کرتے ہیں۔ لاتعداد انسانوں کی زندگیوں کے لئے محمد (ﷺ) کے اقوال، روشنی کے ستاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کی مخلوق میں سے اتنی کثیر تعداد میں لوگ ایک ایسی چیز کی خاطر جئے اور مرے ہوں جو مقدس فراڈ قرار دیئے جانے کے قابل ہے؟ اگر بہروپے پن کو انسانی اذہان پر اتنی ہی قدرت حاصل ہے تو پھر ہمیں اس دنیا کے بارے میں کیا خیال کرنا چاہئے؟ یہ مفروضہ اس دور تشکیک کی پیداوار ہے اور ذہنی معذوری اور روحانی موت کی غمازی کرتا ہے۔ اس سے زیادہ بے خدا نظریہ کبھی پیش نہیں کیا گیا۔

کارلائل کے خیال میں محمد (ﷺ) مخلص تھے، جیسے کہ ہر عظیم انسان مخلص ہوتا ہے

1۔ یہ عدد کارلائل کے زمانے کا ہے

کیونکہ ان کے لئے مخلص ہونا ضروری تھا۔ خلوص کی کمی کے شدید احساس کے باوجود وہ مخلص تھے۔ عالم وجود کی عظیم سچائیوں نے انہیں اپنے نرغے میں لے رکھا تھا اور وہ ان سے دامن نہ بچا سکتے تھے۔ دوسرے لوگ حقیقت سے چشم پوشی کر سکتے ہیں اور خود فریبی میں زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن ان کی نظروں میں حقیقت ایک حیران کن چیز تھی، جو ایک چمکدار روشنی کی شکل میں ان کی نظروں کے سامنے رہتی تھی۔ اس قسم کا انسان، عظیم انسان ہوتا ہے۔"(1)

سطور بالا میں ہم نے "نارانڈرائے" کے الفاظ میں قارئین کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مستشرقین حضور ﷺ کی مقدس شخصیت کے متعلق کس قسم کے مفروضے گھڑتے اور انہیں پھیلاتے رہے ہیں۔ سیرت طیبہ کے متعلق بعض مستشرقین کی تحریروں کو پڑھنے والا صاحب دل مسلمان کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے آقا و مولیٰ کی نعت پڑھ رہا ہے جو ایک کافر کے قلم سے نکلی ہے۔ اس قسم کی چیزیں پڑھ کر مسلمان ان مستشرقین کی صاف دلی اور عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں جن کے قلم سے حضور ﷺ کی تعریف نکلی ہو۔ لیکن جو آدمی صرف ان چند جملوں تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتا اور حضور ﷺ کی تعریف کرنے والے مستشرقین کی تحریروں کو بالاستیعاب پڑھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ بہت جلد اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ مستشرق جو بظاہر منصف نظر آتے ہیں، انہوں نے بھی اسلام کے متعلق مستشرقین کے روایتی رویے سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی بلکہ انہوں نے صرف طریق کار بدلا ہے۔ تھامس کارلائل نے، مذکورہ بالا اقتباس میں، حضور ﷺ کے خلاف لکھنے والے مستشرقین کی خوب خبر لی ہے لیکن جب ہم کارلائل کے اسی لیکچر میں قرآن کے متعلق اس کے خیالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو کارلائل کے متعلق ساری غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ "منٹگمری واٹ" کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کے بارے میں نرم رویہ اختیار کیا ہے لیکن اس کی تصنیفات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے سیرت طیبہ کی ہر خوبی کو خامی بنا کر پیش کرنے کے لئے اپنا پورا زور قلم صرف کیا ہے۔

حضور ﷺ کی ذات ایک آئینہ ہے جس میں صدیق اکبر کو اپنا چہرہ نظر آتا ہے اور

1۔ نارانڈرائے، "محمد، دی مین اینڈ ہز فیتھ" (جارج ایلن اینڈ انون لمیٹڈ لندن۔ 1956ء)، صفحہ 76-173

ابو جہل کو اس آئینے میں اپنے وجود کی کراہتیں عیاں نظر آتی ہیں۔ اس آئینے میں مستشرقین کو بھی اپنی ہی شکلیں نظر آتی ہیں اور انہوں نے حضور ﷺ کی سیرت کی عکاسی کرتے وقت دراصل اپنے اپنے کردار کا عکس پیش کیا ہے۔ یہی بات کارلائل کے قلم سے نکل گئی کہ حضور ﷺ کو ایک مذموم کردار کی شکل میں دیکھنا ہمارے اپنے کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ جس مستشرق کے باطن میں جتنا زیادہ خبث جمع تھا، اس نے اتنی ہی سفاکی سے حضور ﷺ کی شخصیت پر وار کیے ہیں۔ اور جن کے ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی انہوں نے حضور ﷺ کے کردار میں کبھی کبھی روشنی کی کوئی کرن دیکھی ہے، وہ ان کے قلم پر بھی آئی ہے لیکن پھر تعصب اور مصلحت کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ گئی ہے۔ کچھ خوش نصیب مستشرقین ایسے بھی ہیں جنہوں نے سیرت رسول ﷺ سے اٹھنے والی نور کی کرن سے اپنے دلوں کو منور کیا ہے اور دشمنان رسول سے ناطہ توڑ کر غلامان رسول کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔

جو مسلمان ان الزامات کی تردید کرنا چاہتا ہے جو مستشرقین کی طرف سے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ پر لگائے گئے ہیں، اسے سب سے پہلے جس مشکل سے واسطہ پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ مستشرقین حضور ﷺ کے خلاف الزام تراشی میں کسی ایک نکتے پر متفق نہیں ہوتے بلکہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ مثلاً پورا عالم یہودیت و نصرانیت حضور ﷺ کے سر پر تاج نبوت سجنے کی وجہ سے، پوری نسل اسماعیل کا دشمن ہے اور اس دشمنی کے اظہار کیلئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لونڈی کی اولاد ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دوسری طرف استشراق کا لبادہ اوڑھنے والے کچھ یہودی اور عیسائی وہ ہیں جو حضور ﷺ کو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی نسل سے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کچھ مستشرق کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے دولت، شہرت اور اقتدار کے حصول کے لئے ایک نیا مذہب گھڑا تھا اور اس مذہب کے ذریعے دھوکے سے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنایا تھا لیکن کچھ وہ ہیں جو حضور ﷺ کے لئے دھوکے باز کا لفظ استعمال کرنے کی جرات نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے تھے، اس کی صحت و صداقت پر آپ کو کامل یقین تھا لیکن آپ اپنے اس عقیدے میں غلطی پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کے خیالات کی تردید کے لئے ان کے متضاد دعووں کا تعاقب کرنا پڑتا ہے۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کی سیرت پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ عربوں کے ہاں خاندانی وجاہت ایک بہت بڑا انسانی کمال شمار ہوتا تھا، مستشرقین حضور ﷺ کی خاندانی وجاہت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدید مادیت زدہ دور میں دولت کو انسانی عظمت کی کسوٹی سمجھا جاتا ہے، مستشرقین اس کسوٹی کو حضور ﷺ پر لاگو کر کے آپ کا مقام گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بیسویں صدی عیسوی کی مادی اقدار کو ساتویں صدی عیسوی کے عربوں پر منطبق کر کے مکہ کی مارکیٹ میں ایسے طاقتور اجارہ داروں کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں جو کمزور قبائل کو تجارت کے میدان میں سر اٹھانے کی مہلت نہ دیتے تھے۔ حضور ﷺ کو دھوکے باز ثابت کرنے کے لئے وہ پورا زور لگاتے ہیں تاکہ یہ ثابت کریں کہ حضور ﷺ نے یہودیت اور عیسائیت سے تعلیمات اخذ کیں، ان کی بنیاد پر ایک دین وضع کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ دین الہامی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ وہ حضور ﷺ کے اخلاق پر حملہ کرتے ہیں۔ آپ کو شہوت پرست اور ظالم قرار دیتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ کسی اصول کے پابند نہ تھے بلکہ جب ضرورت پڑتی تھی، اصولوں کو توڑ دیتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ انہیں وحی کے ذریعے اس غلط اصول کو توڑنے کا حکم ملا ہے۔

مستشرقین اپنے دعووں کو ثابت کرنے کے لئے مسلمانوں کی مصدقہ تاریخ کا انکار کرتے ہیں، قرآنی آیات کی من مانی تشریح کرتے ہیں اور ہر زعم باطل کو ثابت کرنے کے لئے اپنے تخیل کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہیں۔

حضور ﷺ کا دامن اتنا شفاف ہے کہ مستشرقین کی ذریت نہ اسے پہلے آلودہ کر سکی ہے اور نہ آئندہ کر سکے گی۔ آپ کا مقام اتنا بلند ہے کہ اسے گھٹانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ بات شیطان کو بھی معلوم ہے اور اس کی ساری ذریت کو بھی کہ جس ہستی کو عظمتیں عطا کرنے والا خود رب کائنات ہے اس کی عظمتوں کے محل کو مسمار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں لیکن شیطان اور اس کی ذریت کے حملے دراصل اس ذات ستودہ صفات کے مقام کو گھٹانے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ یہ حملے ان لوگوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہوتے ہیں جو اس ہستی کو وجہ تخلیق کائنات سمجھتے ہیں، جو اس ہستی کے دامن کے ساتھ وابستگی کو سعادت دارین سمجھتے ہیں، جنہیں وہ ہستی رحمۃ للعالمین نظر آتی ہے، جنہیں

اس ہستی کے کردار میں شبنم کی لطافت اور پھولوں کی پاکیزگی نظر آتی ہے۔ کئی سادہ لوح انسان شیطان اور اس کی ذریت کے وسوسوں میں آکر اس ہستی سے ناطہ توڑ لیتے ہیں اور ایمان کی دولت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس باب میں ہم کوشش کریں گے کہ مستشرقین نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کے گرد شکوک و شبہات کے جو جال بننے کی کوشش کی ہے، ہم ان کے تاروں کو توڑ کر سیرت طیبہ کو اس کی اصلی اور نورانی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ اس ہستی سے اپنی نسبت پر فخر کریں اور کوئی دشمن انسانیت ان کے ایمان پر ڈاکہ نہ ڈال سکے۔

حضور ﷺ کو خاندانی وجاہت سے محروم ثابت کرنے کی تدبیریں

مستشرقین نے حضور ﷺ کی خاندانی وجاہت کو گھٹانے کے لئے مختلف مفروضے قائم کئے ہیں۔ ان مفروضوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کا حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تعلق، آپ کے پیروکاروں کی خوش اعتقادی کی اختراع ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہونا کوئی فخر کی بات نہیں کیونکہ وہ خود ایک لونڈی کی اولاد تھے۔ تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ مکہ کے قبائل میں خاندان بنو ہاشم کی حیثیت معمولی تھی۔ مکہ میں دیگر قبائل معاشی اور سیاسی طور پر بڑے طاقتور تھے اور ان کے مقابلے میں خاندان بنو ہاشم کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

ہم یہاں ایک ایک کر کے ان تمام مفروضوں کی قلعی کھولتے ہیں تاکہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے اور مستشرقین کے مفروضے کسی کو دھوکا نہ دے سکیں۔

حضور ﷺ کا نسل اسماعیل سے ہونا

عربوں کی زندگی میں بے شمار خامیاں تھیں۔ وہ جہالت، بربریت، بدکاری اور نخوت و تکبر کی دلدل میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے لیکن ان انگنت خامیوں کے باوجود ان میں کچھ خوبیاں بھی تھیں جو انہیں پوری انسانی تاریخ میں ایک خصوصی مقام عطا کرتی ہیں۔ یہ قوم جرات اور بہادری میں بے مثال تھی۔ ان کو قدرت کی طرف سے حافظہ کی بے پناہ قوت ودیعت ہوئی تھی اور اپنے خیالات کے اظہار پر انہیں وہ قدرت حاصل تھی جو صرف

ان ہی کا حصہ ہے۔ ان کے سماجی اجتماعات میں ان ہی چیزوں کے مقابلے ہوتے تھے اور ان ہی خوبیوں میں کمال کی بنا پر معاشرے میں کسی آدمی یا اس کے خاندان کی قیمت متعین ہوتی تھی۔

انہوں نے اپنی خداداد قوت حافظہ کو اپنے نسب نامے حفظ کرنے کے لئے دل کھول کر استعمال کیا تھا۔ ہر قبیلے کا رکن صرف اپنے قبیلے کے نسب ناموں ہی کو یاد نہ کرتا تھا بلکہ ان تمام قبائل کے نسب ناموں کو یاد رکھنا بھی ان کے لئے ضروری تھا جن کے ساتھ کسی میدان میں ان کے تصادم کا امکان ہوتا۔ وہ اپنے اجداد کے کارناموں اور اپنے مخالفین کے نسب ناموں کی کمزوریوں کو یاد رکھتے تھے تاکہ وقت آنے پر مخالفین کے مقابلے میں اپنے نسب کو بلند ثابت کر سکیں۔

خاندانی وقار کی حفاظت کے لئے مختلف قبائل کی تلواریں ایک دوسرے کے خلاف بے نیام ہوتیں اور دونوں طرف سے بہادر جنگجو اپنی بہادری اور جنگی مہارت کے جوہر دکھاتے۔ بہادری کے یہ کارنامے پھر ان کی روایت کا حصہ بن جاتے اور آئندہ آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کی بہادری کے کارناموں کو نظم اور نثر کی شکل میں بڑے فخر سے لوگوں کے سامنے پیش کرتیں۔

ان حالات میں کسی شخص کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ کسی روایت کو توڑ مروڑ کر پیش کرے کیونکہ یہ روایتیں ان کے دشمنوں کو بھی ازبر ہوتی تھیں اور یہ سوچنا محال تھا کہ کوئی شخص اس قسم کی غلط بیانی کرے اور پکڑا نہ جائے۔

عرب واقعی برائیوں کی دلدل میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے لیکن اس حقیقت کے باوجود وہ جھوٹ سے نفرت کرتے تھے اور اس بات کو گوارا نہ کر سکتے تھے کہ لوگوں میں وہ جھوٹے مشہور ہوں، اس لئے وہ جھوٹ بولنے سے ڈرتے تھے۔ ابوسفیان اسی خوف کی وجہ سے، خواہش کے باوجود، دربار ہرقل میں حضور ﷺ کے خلاف کوئی جھوٹی بات نہ کہہ سکا تھا۔

عرب کی یہ روایتیں، جو کسی بھی تاریخی روایت سے زیادہ مستند قرار دی جاسکتی ہیں، ان روایات کے مطابق خانہ کعبہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا تھا۔ عربوں کی ایک قسم جو "عرب مستعربہ" کہلاتی تھی وہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی نسل سے تھی۔ قریش اس عربی نسل کا ایک قابل احترام قبیلہ تھا جس کی ایک معزز شاخ بنوہاشم تھی۔

سارے عرب قبیلہ قریش کا احترام کرتے تھے اور اس احترام کی وجہ یہ تھی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی اور خادم تھے جو حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے بنایا تھا۔ جس دور میں کوئی کارواں محفوظ نہ رہتا تھا، اس دور میں قریش کے تجارتی قافلے بلاخوف وخطر شام اور یمن کے چکر لگاتے تھے۔ کسی کو قریش کے نسل اسماعیل میں سے ہونے کے بارے میں شک نہ تھا کہ اچانک کچھ مستشرقین کے تخیل نے انگڑائی لی اور انہوں نے یہ انکشاف کیا:

"یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر (ﷺ) کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ثابت کئے جائیں، آنحضور (ﷺ) کو اپنی زندگی میں پیدا ہوئی ...... اور اس کے لئے آپ کے ابراہیمی نسب نامے کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے، نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے۔" (1)

یہ عجیب وغریب انکشاف کرنے والا مشہور مستشرق ولیم میور ہے جس نے اپنی کتاب "حیات محمد" (life of Muhammad) کے مقدمے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مستشرق موصوف یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ عربوں کی روایت میں حضرت محمد ﷺ اور قبیلہ قریش کا نسل ابراہیم واسماعیل سے ہونا مشہور نہ تھا، حضور ﷺ کے دل میں نسبی وجاہت اور خاندانی عظمت کی آرزو پیدا ہوئی اور آپ نے اپنے سلسلہ نسب کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جوڑنے کی تدبیریں کیں۔ اس مقصد کے لئے ایسے قصے گھڑے گئے جن سے حضرت محمد ﷺ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبی تعلق ثابت ہو سکے۔

ولیم میور نے جو مفروضہ گھڑا ہے، اس مفروضے کو ایک اور مستشرق منٹگمری واٹ نے زیادہ زور سے اچھالا ہے۔ منٹگمری واٹ اپنے خیال بلکہ مفروضے کی تائید کیلئے قرآن حکیم کی اس نزولی تاریخ کو استعمال کرتا ہے جو بعض مستشرقین نے محض اپنے منفی مقاصد کے تحت وضع کی ہے۔ "واٹ" کہتا ہے کہ قرآن حکیم کی وہ آیات جو حضور ﷺ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تعلق ثابت کرتی ہیں، وہ مدنی دور کی ہیں۔ مکہ مکرمہ میں قرآن حکیم کا جو حصہ نازل ہوا وہ اس سلسلے میں خاموش ہے۔ منٹگمری واٹ نے اس سلسلے میں کئی مفروضے

1۔ محمد احسان الحق سلیمانی، "رسول مبین"، (مقبول اکیڈمی لاہور۔ 1993ء)، صفحہ 94 بحوالہ حیات محمد از ولیم میور

تراشے ہیں۔اس مستشرق کا ایک طویل اقتباس پیش خدمت ہے تاکہ قارئین سمجھ سکیں کہ مستشرقین کس طرح کسی بے بنیاد بات کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ مستشرق مذکور لکھتا ہے:

'In the polemics of the Quran against the Jews a prominent place is taken by the conception of the religion of Abraham. This is an idea which is not found in the Meccan revelations and is presumably not based on pre-Islamic Arab legends. During the Meccan Period more prominence was given to Moses than to Abraham among the Prophets as a forerunner of Muhammad. Abraham is simply one of many prophets, and the people to whom he is sent are not specified; indeed, it seems to be implied that he was not sent to the Arabs, since Muhammad is said to be sent to a people who had never had a warner. Likewize there is no mention of any connexion of Abraham and Ishmael with the Kabah; Ishmael is named in lists of Prophets, but no details are given about him. The presumption is that at first the Muslims did not know about the connexion of Ishmael with Abraham and (according to the Old Testament) with the Arabs. At Medinah, however, in closer contact with the Jews they gained knowledge of such matters'. (1)

"قرآن حکیم میں یہودیوں کے خلاف جو باتیں ہیں، ان میں دین ابراہیم کے تصور کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو مکی قرآن میں نظر نہیں آتا۔اس لئے یہ بات فرض کی جا سکتی ہے کہ یہ تصور عربوں کی قبل از اسلام روایات پر مبنی نہیں ہے۔ مکی دور میں پیغمبروں میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو محمد (ﷺ) کے پیش رو کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 5-204

نسبت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ بہت سے پیغمبروں میں سے ایک ہیں اور جس قوم کی طرف آپ مبعوث ہوئے تھے اس کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے کیونکہ حضرت محمد (ﷺ) کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جن کے پاس پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا۔ اسی طرح ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) کے کعبہ کے ساتھ تعلق کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ خیال یہ ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کو علم نہ تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تعلق کیا ہے اور وہ اس بات کو بھی نہیں جانتے تھے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا عربوں سے تعلق کیا ہے۔ مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ رابطے کی وجہ سے ان کو ان چیزوں کا علم ہوا۔"

"منٹگمری واٹ" نے اس طویل عبارت میں حقائق کو مسخ کرنے کیلئے کئی پینترے بدلے ہیں۔ وہ سب سے پہلے یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ عربوں کے ہاں ابتدا میں دین ابراہیمی کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس لئے اسلامی ادب میں ہمیں دین ابراہیمی کا جو تصور ملتا ہے وہ عربوں کی روایات پر مبنی نہیں ہے۔ پھر یہ مستشرق یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ ابتدا میں مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ منٹگمری واٹ اس جملے سے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو زیادہ اہمیت دینا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے نسبی رشتے کا علم نہ تھا ورنہ وہ فطری طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زیادہ اہمیت دیتے۔ منٹگمری واٹ یہ کہہ کر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ ان کا عربوں سے تعلق نہ تھا ورنہ ان کی امت دعوت قوم عرب ہی ہوتی۔ پھر "واٹ" یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ تعمیر کعبہ کا ابراہیم و اسماعیل کے ہاتھوں انجام پانا، عربوں کے علم میں نہ تھا کیونکہ مکی قرآن میں اس بات کا ذکر نہیں ہے۔ پھر وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ مسلمانوں اور عربوں کو معلوم نہ تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یا عربوں سے کیا تعلق ہے۔

قارئین کرام نے ولیم میور اور منٹگمری واٹ کے خیالات کا مطالعہ فرمایا۔ ولیم میور تو کھلے الفاظ میں یہ اعلان کر رہا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی خاندانی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنا تعلق جوڑا تھا اور پھر اس رشتے کو ثابت کرنے کے لئے مختلف افسانے تراشے گئے تھے۔ گویا عربوں کا ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے نہ کوئی تعلق تھا اور نہ انہیں اس تعلق کا علم تھا، یہ تعلق تو حضور ﷺ کی خواہش کی پیداوار ہے۔

"منٹگمری واٹ" اس رشتے کا انکار تو نہیں کرتا لیکن وہ کہتا ہے کہ عربوں کو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے ساتھ اپنے تعلق کا علم نہ تھا اور مسلمانوں کو بھی ہجرت سے پہلے ان چیزوں کے متعلق معلومات حاصل نہ تھیں۔ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کا یہودیوں سے رابطہ ہوا تو انہیں پتہ چلا کہ وہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اولاد ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہی سچا دین تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ارجمند تھے اور ان دونوں نے مل کر خانہ کعبہ کو تعمیر کرنے کی سعادت حاصل کی تھی۔

"منٹگمری واٹ" بھی دراصل وہی بات کہنا چاہتا ہے جو ولیم میور نے کہی ہے لیکن اس نے یہ بات کہنے کے لئے ایک شاطرانہ چال چلی ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ عربوں کو اپنے حافظے پر ناز تھا، اپنے نسب نامے یاد کرنا اور انہیں فخر سے پیش کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اگر وہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اولاد ہوتے تو لازماً یہ بات ان کی قومی روایات میں موجود ہوتی۔ ان کی قومی روایات میں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا ذکر نہ ہونا اور قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں ان کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کا تذکرہ نہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے پاس ان ہستیوں کے ساتھ اپنے تعلق کو ثابت کرنے کا کوئی ثبوت نہیں کیونکہ انہوں نے یہ باتیں یہودیوں سے سیکھی ہیں اور یہودیوں اور ان کی کتابوں کو مسلمان قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔

ولیم میور اور منٹگمری واٹ کے یہ سارے مفروضے بے بنیاد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اولاد سمجھتے تھے، انہیں ان عظیم ہستیوں کی اولاد ہونے پر فخر بھی تھا، انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ خانہ کعبہ کو انہی نفوس قدسیہ نے تعمیر کیا تھا اور جس دین پر وہ کاربند تھے، ان کے خیال میں وہ دین ابراہیم ہی تھا اور

بزعم خویش وہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کر رہے ہیں۔

عرب روایات اور خلیل واسماعیل علیہما السلام

عربی روایات میں حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا ذکر نہ ہونے کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو عربوں کی تاریخ سے کلیۃً نا آشنا ہو اور یا پھر حسد، بغض اور تنگ نظری کی وجہ سے دن کو رات کہنے پر مصر ہو۔ عرب جو مذہبی زندگی گزار رہے تھے، اس کا مرکز ہی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھتے تھے۔ خانہ کعبہ کا احترام وہ اسی وجہ سے کرتے تھے کہ وہ ان کے آباء کا تعمیر کردہ خانہ خدا تھا۔ حج کی عبادت وہ اس لئے کرتے تھے کہ اس عبادت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے متعارف کرایا تھا۔ خانہ کعبہ کا طواف، صفا اور مروہ کے درمیان سعی منیٰ اور عرفات کی رسومات، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی ہی میں ادا کرتے تھے۔ وہ اپنے مردوں کو غسل بھی دیتے تھے، کفن بھی پہناتے تھے اور قبروں میں دفن بھی کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ یہ سب کام دین ابراہیمی کی پیروی میں کر رہے ہیں۔ حرمت والے مہینوں کی تعظیم اور سرزمین حرم کا احترام بھی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی میں کرتے تھے اور غالباً صرف یہی وہ چیزیں تھیں جن پر جزیرہ عرب کے مکینوں کی اکثریت متفق تھی۔

ان کی تمام دینی اور مذہبی رسومات دین ابراہیم کے نام پر تھیں، یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اس خالص دین توحید کی عبادات کو مشرکانہ رسموں میں بدل لیا تھا۔ وہ خانہ کعبہ کا طواف تو کرتے لیکن حالت برہنگی میں طواف کی رسم ایجاد کر کے انہوں نے طواف بیت اللہ کی روح کو قتل کر دیا تھا۔ وہ خانہ کعبہ کا احترام تو کرتے تھے اور اسے خانہ خدا بھی سمجھتے تھے لیکن اس مرکز توحید میں تین سو ساٹھ بتوں کو سجا کر انہوں نے عملاً خانہ کعبہ کے تقدس کو پامال کر دیا تھا۔ وہ میت کی الوداعی تقریبات میں دین ابراہیمی کی اصطلاحات تو استعمال کرتے لیکن ان کے جنازے میں نہ حمد خدا ہوتی تھی اور نہ میت کے لئے دعا۔ وہ میت کو بنا سنوار کر رکھتے اور پھر اس کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے اور اپنی ان بے مقصد رسومات کو جنازہ کا نام دیتے۔ وہ حرمت والے مہینوں کا احترام تو کرتے لیکن اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق سال میں ان مہینوں کو اپنے مقام سے آگے پیچھے بھی کرتے رہتے۔ مختصر

یہ کہ ان کے ہاں دین ابراہیمی کا نام تو پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا لیکن اس دین کی روح رخصت ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عرب میں بت پرستی عروج پر تھی، اس زمانے میں بھی صحرائے عرب میں خال خال نفوس ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ عرب دین ابراہیمی کے نام پر جو کچھ کر رہے ہیں وہ ابراہیمی دین نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان لوگوں نے عربوں کے مذہب سے بیزار ہو کر حقیقی دین ابراہیم کو تلاش کرنے کی کوششیں بھی کی تھیں۔ انہوں نے دین ابراہیم کی روشنی کو یہودیت اور نصرانیت میں تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن جس متاع گم گشتہ کی انہیں تلاش تھی وہ انہیں نہ یہودیت میں مل سکی اور نہ عیسائیت میں۔ کوئی الہامی راہنمائی ان کے پاس موجود نہ تھی لیکن وہ اپنے ضمیر کی روشنی کے زور پر اپنی قوم کو بتوں کی پوجا سے روکتے تھے، شراب نوشی سے منع کرتے تھے، بچیوں کو زندہ درگور کرنے کی بیہودہ رسم کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ قس بن ساعدہ الایادی، زید بن عمرو بن نفیل، امیہ بن ابی صلت، اسعد ابو کرب الحمیری، سیف بن ذی یزن اور ورقہ بن نوفل کا شمار ان خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے شرک و بت پرستی کی شب دیجور میں اپنے سینوں میں توحید کے چراغ روشن کر رکھے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کو تاریخ حنفاء کے نام سے یاد کرتی ہے۔ حنفاء، حنیف کی جمع ہے اور حنیف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکاروں کا لقب ہے۔ وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دین سے تعلق ہی کی وجہ سے حنفا کہلاتے تھے۔

یہ تمام باتیں عربوں کی روایات میں موجود ہیں۔ ولیم میور اور منٹگمری واٹ کو ان حقائق کا بخوبی علم ہے۔ لیکن ان حقائق کو تسلیم کرنا ان کے لئے مشکل اس وجہ سے ہے کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو ہر قسم کی عظمتوں سے معری ثابت کرنا چاہتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ان کے اپنے بھی جد امجد ہیں، ان کے ساتھ پیغمبر اسلام کی نسبت ان کو گوارا نہیں۔ اس لئے وہ کبھی جھوٹ اور کبھی فریب کے سہارے تاریخ کی ان روشن حقیقتوں کے گرد شکوک و شبہات کے جال تننا چاہتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی حقیقتیں کسی کے چھپانے سے نہیں چھپتیں اور بدخواہوں کی انتھک کاوشوں کے باوجود پوری آب و تاب کے ساتھ صفحہ ہستی پر جلوہ گر رہتی ہیں۔

عربوں میں پیغمبر کا نہ آنا

قرآن حکیم کی بعض آیات میں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ سے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے آپ کو اس قوم کی طرف مبعوث فرمایا ہے جس کی طرف پہلے نذیر نہیں آیا۔ جیسے:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ أُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (1)

"تاکہ آپ ڈرا سکیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو (طویل عرصہ سے) نہیں ڈرایا گیا، اس لئے وہ غافل ہیں۔"

بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (2)

"بلکہ وہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو، نہیں آیا جن کے پاس کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے تاکہ وہ ہدایت پائیں۔"

اس مفہوم کی آیات کریمہ سے "منگمری واٹ" نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے کیونکہ حضور ﷺ نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے ہیں جس قوم کی طرف پہلے کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ چونکہ حضور ﷺ عربوں کے لئے نذیر بن کر آئے تھے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ ان سے پہلے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام بھی عربوں کی طرف مبعوث ہوئے ہوں۔

"منگمری واٹ" یہ شوشہ عربوں کے ساتھ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے تعلق کو مشکوک بنانے کے لئے چھوڑ رہا ہے ورنہ اسے معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جو بابل میں تھی اور آپ نے اس مقام پر اپنا فریضہ نبوت ادا کرتے ہوئے اپنی قوم کی بت پرستی پر شدید ضربیں لگائی تھیں اور پھر مسکراتے ہوئے نار نمرود میں کود گئے تھے۔ قدرت خداوندی سے وہ نار آپ کے لئے گلزار بن گئی تھی اور پھر آپ راہ خدا میں اپنے وطن سے ہجرت کر گئے تھے۔ آپ نے مکہ کی بے

1۔ سورۂ یٰسین: 6

2۔ سورۃ السجدہ: 3

آب وگیاہ وادی میں اپنی عفت مآب اہلیہ اور اپنے جگر گوشے کو آباد کیا تھا اور پھر ان کے اس جگر گوشے کی پشت سے جو نسل چلی تھی، اسے تاریخ میں عرب مستعربہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عربوں سے تعلق یہ نہ تھا کہ آپ ان کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے بلکہ عربوں سے ان کا تعلق یہ تھا کہ وہ ان کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے۔ آپ کے یہ فرزند ارجمند بھی خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ وہ بھی دین ابراہیم ہی کے مشعل بردار تھے اور ان کو جس قوم کی طرف مبعوث فرمایا گیا تھا وہ عرب قوم ہی تھی۔ اس طرح عربوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبی رشتہ بھی تھا اور دینی رشتہ بھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام جن قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے وہ قومیں بھی عرب اقوام ہی تھیں لیکن یہ تمام انبیائے کرام جو عرب اقوام کی طرف مبعوث ہوئے، ان کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف توراۃ نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ اس طویل عرصہ میں عربوں کی طرف کوئی نبی اور رسول مبعوث نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس الہامی روشنی سے محروم ہو چکے تھے جو انہیں حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی وساطت سے عطا ہوئی تھی۔ اس زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنو اسرائیل میں بے شمار انبیائے کرام مبعوث ہوئے تھے لیکن اس زمانے میں عربوں کی طرف کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اپنے حبیب کو اس قوم کی طرف مبعوث فرمایا ہے جو مدتوں سے ہدایت کی روشنی سے محروم تھی۔ قرآن حکیم کی ان آیات کریمہ سے یہ مطلب نکالنا کہ جن اقوام پر عرب کا لفظ صادق آتا ہے، ان کے پاس حضور ﷺ سے پہلے کوئی نبی آیا ہی نہ تھا، جہالت بھی ہے اور تاریخ کے حقائق کو مسخ کرنے کی ایک نامسعود کوشش بھی۔

"منٹگمری واٹ" نے ایک شوشہ یہ بھی چھوڑا ہے کہ مکی دور میں مسلمانوں کو حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے ساتھ اپنے رشتے کا علم نہ تھا، بعد میں یہودیوں کے ساتھ رابطے سے ان کو اس رشتے کا علم ہوا۔ منٹگمری واٹ کا یہ شوشہ یہودیوں کو ہمہ دان اور عربوں کو اپنی تاریخ سے ناآشنا ثابت کرنے کی کوشش ہے وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں نے

مسلمانوں کو حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں ان میں سے اکثر کو تو مسلمانوں نے مسترد کر دیا تھا۔ یہودیوں نے تو انہیں بتایا تھا کہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام لونڈی زادہ تھے لیکن مسلمان حضرت ہاجرہ کو شاہ مصر کی شاہزادی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا محبوب فرزند سمجھتے تھے۔ یہودیوں نے تو انہیں بتایا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ کو اپنے فرزند سمیت گھر سے نکال دیا تھا، لیکن مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اپنے رب کے حکم پر اپنی اہلیہ اور اپنے فرزند ارجمند کو مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں آباد کیا تھا اور ان کو اپنے رب کے سپرد کر کے واپس آئے تھے۔ یہودیوں نے تو مسلمانوں کو بتایا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ تھا کہ تسلیم و وفا کی داستان کا یہ باب خلیل اللہ علیہ السلام نے منیٰ کے مقام پر رقم کیا تھا جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کا مسکن تھا نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی قربانی کی یاد میں عرب صدیوں سے قربانی کی رسم ادا کر رہے تھے اور وہ حج کی تمام رسومات کا تعلق بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سمجھتے تھے۔ یہودیوں نے تو مسلمانوں کو بتایا تھا کہ بنو اسرائیل خدا کی لاڈلی مخلوق ہیں اور باقی قوموں سے خدا کی خدائی کا تعلق "نعوذ باللہ" برائے نام ہے لیکن مسلمان اللہ تعالیٰ کو رب العالمین مانتے تھے اور انہوں نے یہودیوں کی اس خود فریبی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے متعلق جو معلومات تھیں ان کا مصدر یا تو عرب روایات تھیں اور یا ان کے اس معظم رسول کے ارشادات جو وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (1) کی شان کے ساتھ ان کے درمیان جلوہ گر تھا۔ مسلمانوں کو آفتاب اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے بھی، اپنی قومی روایات کے ذریعے، اس بات کا علم تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا

1۔ سورۃ النجم: 3,4۔ ترجمہ: اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے، نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔

کہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے تعاون سے تعمیر کیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہی سچا دین تھا۔ ان باتوں میں سے کوئی بات ایسی نہ تھی جو مسلمانوں کو ہجرت سے پہلے معلوم نہ ہو۔ یہ تمام باتیں عرب معاشرے کے مسلمہ حقائق تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسی نہ تھی جو بقول ولیم میور، حضور ﷺ کے نسب نامے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لئے گھڑی گئی تھی۔ ولیم میور اور منٹگمری واٹ نے عربوں کے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ رشتے کو مشکوک ثابت کرنے کی جو کوششیں کی تھیں، ان کی تردید بے شمار دوسرے مستشرقین نے کی ہے۔ یہاں ہم صرف نمونے کے لئے چند حوالے ذکر کرتے ہیں۔

عربوں کے نسل اسماعیل سے ہونے پر مستشرقین کی شہادت

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (Encyclopaedia of religion and ethics) کا مقالہ نگار "Chronicle of Sebeos" کے حوالے سے لکھتا ہے

"He was an Ishmaelite, who taught his country men to return to the religion of Abraham and claim the promises made to the descendants of Ishmael." (1)

"حضرت محمد (ﷺ) ایک اسماعیلی تھے جنہوں نے اپنے ہم وطن لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ دین ابراہیمی کی طرف رجوع کریں اور ان خدائی وعدوں سے بہرہ یاب ہوں جو نسل اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ کئے گئے ہیں۔"

گبن (Gibbon) وہ مورخ ہے جسے سارا مغرب قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ بھی دیگر مستشرقین کی طرح اسلام کے متعلق معاندانہ جذبات رکھتا ہے لیکن حضور ﷺ کے سلسلہ نسب کو مشکوک بنانے کی جو کوشش کئی دوسرے مستشرقین نے کی ہے، وہ اس پر شدید الفاظ میں تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے:

"The base and plebeian origin of Muhammad is an unskilful calumny of the christians who exalt instead of degrading the merit of their adversary." (2)

1۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس، جلد 8، صفحہ 872

2۔ ایڈورڈ گبن، "دی ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر"، (ڈینٹ اینڈ سنز لندن۔ 1962ء)، جلد 5، صفحہ 228

"محمد (ﷺ) کی اصل کو حقیر اور عامیانہ ثابت کرنے کی کوشش عیسائیوں کی ایک غیر دانشمندانہ تہمت ہے جس سے ان کے مخالف کا مقام بجائے گھٹنے کے مزید بڑھا ہے۔"

"Gibbon" کے اس جملے سے ہمیں مستشرقین کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک غیر جانبدار مورخ ہونے کا دعویدار ہے لیکن اس کی غیر جانبداری کا انداز دیکھئے کہ وہ عیسائیوں کو حضور ﷺ کے نسب نامے کو بگاڑنے کی کوششوں پر کوس رہا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ انہوں نے تاریخی حقائق کا خون کیا ہے بلکہ اس لئے کہ ان کی اس غیر ماہرانہ تہمت کے ذریعے حضور ﷺ کے مقام اور مرتبہ میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا ہے۔ "گبن" کی اس عبارت کے بعد سر سید احمد خان نے "سیرت محمدی" کے صفحہ 246 پر اور محمد احسان الحق سلیمانی نے "رسول مبین" کے صفحہ نمبر 107 پر یہ الفاظ بھی لکھے ہیں: "آپ کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہونا ایک تسلیم شدہ امر ہے اور عرب کی روایات سے ثابت ہے" لیکن "گبن" کی کتاب کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔

گبن گو (کتاب کے اس نسخے کے مطابق) خود تو دو ٹوک الفاظ میں حضور ﷺ کے نسل اسماعیل میں سے ہونے کا اقرار نہیں کر رہا لیکن وہ اپنی کتاب کے فٹ نوٹ میں بتا رہا ہے کہ:

"Theophanes the most ancient of the Greeks---. confesses that Muhammad was of the race of Ismael". (1)

"تھیوفینز" جو پرانے زمانے کے یونانیوں میں سے ہے، وہ تسلیم کرتا ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) نسل اسماعیل میں سے تھے۔"

گبن اپنی کتاب کے فٹ نوٹ میں یہ بھی لکھتا ہے کہ ابو الفداء اور گیگنئر (Gagnier) نے اپنی اپنی کتابوں میں محمد (ﷺ) کا وہ نسب نامہ درج کیا ہے جو مستند ہے۔

یاد رہے کہ یہ وہی نسب نامے ہیں جو حضور ﷺ کو نسل اسماعیل سے ثابت کرتے ہیں۔

مسٹر فاسٹر نے بھی اس حقیقت کی گواہی دی ہے، وہ لکھتا ہے:

"اب تک ہم نے قیدار کا سراغ قدیمی جغرافیہ سے لگایا ہے۔ اب اس بات کا دیکھنا باقی ہے کہ قدیمی روایتوں کو عربوں کی روایتوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے کیا ثبوت حاصل

1۔ ایڈ رورڈ گبن، "دی ڈیکلائین اینڈ فال آف رومن امپائر"، (ڈینٹ اینڈ سنز لندن۔ 1962ء)، جلد 5، صفحہ 228

ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یورپ کے نکتہ چینوں کی رائے میں عرب کی ایسی روایت جس کی تائید میں اور کوئی ثبوت نہ ہو گو کیسے ہی اعتراض کے قابل ہو، مگر روایت کی جانچ پڑتال کے جو قوانین مسلمہ ہیں، ان کے مطابق، ان پر غور کرنے سے اس بات کا انکار ناممکن ہے کہ وہ روایت مذہبی اور دنیاوی دونوں طرح کی تاریخ کے مطابق ہے۔ خاص عرب کے لوگوں کی یہ قدیمی روایت ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتدا میں حجاز میں آباد ہوئی تھی۔ چنانچہ قوم قریش اور خصوصاً مکہ کے بادشاہ اور کعبہ کے متولی ہمیشہ اس بزرگ کی نسل میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور خاص حضرت محمد (ﷺ) نے اسی بنیاد پر کہ اسماعیل کی نسل اور قیدار کی اولاد ہیں، اپنی قوم کی دینی اور دنیوی عظمتوں کے استحقاق کی تائید کی ہے۔"(1)

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ولیم میور اور منٹگمری واٹ نے حضور ﷺ کے اسماعیلی النسل ہونے کی حقیقت کو مشکوک کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ عربی روایتوں کے خلاف ہے بلکہ خود مغربی مورخین اور مستشرقین کی تحقیقات کے بھی خلاف ہے۔ مستشرقین ہزار کوششیں کریں وہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کو جھٹلا نہیں سکتے حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى مِنْ وُلْدِ اِبْرَاهِيْمَ اِسْمَاعِيْلَ وَاصْطَفٰى كِنَانَةَ مِنْ بَنِىْ اِسْمَاعِيْلَ وَاصْطَفٰى مِنْ بَنِىْ كِنَانَةَ قُرَيْشًا وَاصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِىْ هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِىْ مِنْ بَنِىْ هَاشِمٍ (2)

"حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم سے اسماعیل کو چنا، اولاد اسماعیل سے کنانہ کو چنا، بنی کنانہ سے قریش کو چنا، قریش سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم سے مجھے چنا۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مقام کو گھٹانے کی کوششیں

حضور ﷺ کے نسل اسماعیل سے ہونے کو تو اکثر مستشرقین تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ

1۔ سر سید احمد خان، "سیرت محمدی"، (مقبول اکیڈمی لاہور۔ 1988ء)، صفحہ 246

2۔ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، "سنن الترمذی"، (دار الکتب العلمیہ بیروت۔ 1988ء)، جلد 5، صفحہ 45-544

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبی عظمت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہودی اپنے آپ کو خدا کی لاڈلی مخلوق سمجھتے ہیں اور دیگر کسی قوم کو باعزت مقام دینے کے لئے تیار نہیں۔ یہودیوں نے حضور ﷺ کی نبوت کا انکار ہی محض اس بنا پر کیا تھا کہ وہ نبوت جیسی عظیم نعمت کو بنی اسرائیل کے علاوہ کسی اور قوم میں دیکھنے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ انہوں نے اپنے اس زعم باطل پر اپنی مذہبی کتابوں اور اپنے رسولوں کی تعلیمات کو قربان کر دیا اور حضور ﷺ کو پہچان لینے کے باوجود آپ کی نبوت ورسالت کا انکار کر دیا۔

بنو اسرائیل کو دیگر اقوام سے بہتر سمجھنے کی بیماری یہودیوں تک محدود نہ تھی بلکہ یہ بیماری عیسائیوں میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ بنو اسماعیل ان کے چچیرے بھائی تھے۔ انہیں یہ سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آنی چاہئے تھی کہ حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہما السلام دونوں اپنے والد ماجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبی عظمتوں کے وارث ہیں اور جس طرح حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنے نسبی رشتے پر فخر کرنے میں حق بجانب ہے اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد بھی خلیل اللہ علیہ السلام کی اولاد ہونے پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ لیکن تعصب اور خود فریبی نے انہیں اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے کی اجازت نہ دی۔ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے نسب پر باپ کی طرف سے تو کوئی اعتراض کر نہ سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں ان کی اپنی خاندانی عظمت بھی خاک میں ملتی تھی اس لئے انہوں نے ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ کی طرف سے ان کے مقام کو گھٹانے کی کوشش کی۔

حضرت ہاجرہ شاہ مصر کی بیٹی تھیں اور شاہ مصر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ کے روحانی کمالات دیکھ کر اپنی بیٹی کو ان کی خدمت کے لئے وقف کرنے کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھا تھا۔ یہود و نصاریٰ نے شاہ مصر کی بیٹی کو خادمہ سارہ و خلیل قرار دینے کی بجائے لونڈی قرار دیا اور اس طرح اسماعیلی نسل کے مقام و مرتبہ کو گھٹانے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے حضرت ہاجرہ کو لونڈی ثابت کرنے کے لئے حضرت سارہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے جو کتاب پیدائش، باب 21 آیات نو اور دس میں درج ہے۔ بائبل کے الفاظ یہ ہیں:

"And Sarah kept noticing the son of Hagar the

Egyptian, whom she had borne to Abraham, Poking fun. She began to say to Abraham," Drive out this slave girl and her son, for the son of this slave girl, is not going to be an heir with my son, with Isaac". (1)

"سارہ دیکھ رہی تھیں کہ ہاجرہ مصریہ کا بیٹا، جسے اس نے ابراہیم سے جنم دیا تھا، ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابراہیم سے کہنا شروع کر دیا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو، کیونکہ ایک لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے یعنی اسحاق کے ساتھ وارث نہیں بن سکتا۔"

یہود و نصاریٰ نے اپنی الہامی کتابوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس کے پیش نظر یہ یقین سے کہنا ممکن نہیں کہ مذکورہ بالا الفاظ واقعی حضرت سارہ کی زبان سے نکلے تھے یا نہیں۔ لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ واقعی حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ کے متعلق یہ الفاظ استعمال کئے تھے تو بھی عبارت کا سیاق و سباق یہ بتاتا ہے کہ یہ الفاظ وہ ہیں جو شدت جذبات میں ایک سوکن کے لئے دوسری سوکن کی زبان سے نکلے ہیں۔ یہ کتنی بدذوقی ہوگی کہ ایک سوکن نے غصے میں دوسری سوکن کے لئے جو الفاظ استعمال کئے، انہیں تاریخی حقیقت سمجھ لیا جائے اور اس کے مقابلے میں مسلمہ تاریخی حقائق کو مسترد کر دیا جائے۔

ہمارے اس موقف کی حمایت بائبل کی دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں حضرت ہاجرہ کے لئے خادمہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں لونڈی کے نہیں۔ کتاب پیدائش باب 16 آیت نمبر 1 کے الفاظ یہ ہیں:

"Now Sarai, Abraham's wife, had borne him no children; but she had an Egyptian maid servant and her name was Hagar". (2)

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ سارہ کی کوئی اولاد نہ ہوئی لیکن ان کی ایک مصری خادمہ تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔"

اسی باب کی آیت نمبر 5 اور 6 کے الفاظ یہ ہیں۔

"At this Sarai said to Abraham," The violence done me

1۔ کتاب پیدائش، باب 21، آیات 10-9

2۔ کتاب پیدائش، باب 16، آیت 1

be upon you. I myself gave my maidservant over to your bosom, and she became aware that she was pregnant, and I began to be despised in her eyes. May Jehovah judge between me and you. So Abraham said to Sarai." Look! Your maidservant is at your disposa.l Do to her what is good in your eyes. "Then Sarai began to humiliate her so that she ran away from her".

"اس پر سارہ نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا: مجھ پر جو زیادتی ہوئی ہے، اس کا اثر آپ پر بھی پڑے۔ میں نے خود اپنی خادمہ تمہارے حوالے کی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ حاملہ ہے اور اس کی نظروں میں میری عزت کم ہو گئی ہے۔ خدا ہی میرے اور آپ کے درمیان فیصلہ فرمائے۔ اس پر ابراہیم علیہ السلام نے سارہ سے کہا: دیکھو! تمہاری خادمہ کا معاملہ تمہاری صوابدید پر ہے۔ تم جو مناسب سمجھو، اس کے ساتھ سلوک کرو۔ تب سارہ نے اس کی توہین کرنا شروع کر دی اور وہ اس کے پاس سے چلی گئی۔

کتاب پیدائش، باب 25، آیت نمبر 12 کے الفاظ یہ ہیں:

"And this is the history of Ishmael the son of Abraham whom Hagar the Egyptian the maidservant of Sarah bore to Abraham".

"یہ تاریخ ہے اسماعیل بن ابراہیم کی جنہیں ہاجرہ مصریہ، سارہ کی خادمہ نے جنم دیا تھا۔"

سینٹ پال نے گلاتیوں کے نام جو خط لکھا، اس کے باب 4 کی آیت نمبر 22 میں بھی اس نے حضرت ہاجرہ کو خادمہ کہا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"For example, it is written that Abraham acquired two sons, One by the servant girl and one by the free woman".

"مثال کے طور پر، لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو دو بیٹے عطا ہوئے، ایک خادمہ کے بطن سے تھا اور دوسرا آزاد عورت کے بطن سے۔"

بائبل کے بیان کو اگر صحیح مان لیا جائے تو بھی اس میں حضرت ہاجرہ کے لئے خادمہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور خادمہ کا لفظ بھی اس لئے استعمال ہوا ہے کہ فرعون نے جب اپنی لخت جگر کو حضرت سارہ کے حوالے کیا تھا تو کہا تھا: "میری بیٹی کا اس گھر میں خادمہ ہو کر رہنا، دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔" (1)

یہ اظہار عقیدت کا مشرقی انداز ہے، جس کی مستشرقین کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اہل مشرق خدا کے ان پاکباز بندوں کا غلام اور خادم کہلانے پر فخر کرتے ہیں جن پر ان کے خالق کا خصوصی کرم ہوتا ہے۔ مدنی تاجدار ﷺ نے عربوں کو حریت کا درس دیا تھا اور حریت کی اسی تعلیم کی برکت سے انہوں نے غلامی کے ہر طوق کو اتار کر پھینک دیا تھا، لیکن غلامی رسول کا رشتہ انہیں اتنا عزیز تھا کہ وہ کسی قیمت پر، اس کو ختم کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے آزاد ہو کر اپنے باپ کے ساتھ جانے کے بجائے حضور ﷺ کی غلامی کو ترجیح دی تھی۔ یہ ایسی غلامی تھی جس پر ہزار آزادیاں قربان کی جاسکتی تھیں۔

خدا کے خلیل اور ان کی پاکباز اہلیہ کی خادمہ کہلانا حضرت ہاجرہ کے لئے باعث عار نہ تھا بلکہ سرمایہ افتخار تھا۔ شاہ مصر نے اسی اعزاز کی خاطر اپنی بیٹی کے لئے خادمہ کا لفظ استعمال کیا تھا، وگرنہ ایک معمولی عقل و سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ بادشاہ ایک برگزیدہ جوڑے کی روحانی عظمتوں سے متاثر ہو کر، ان کی خدمت میں ہدیئے اور تحفے پیش کر رہا تھا اور یہ تحائف پیش کرنے میں وہ اس حد تک نکل گیا تھا کہ اپنی شاہزادی بھی ان کے ہمراہ کر دی تھی۔ یقیناً بادشاہ نے اپنی شاہزادی کی خدمت کیلئے بھی لونڈیاں اور غلام ساتھ کئے ہوں گے۔ اس لئے ہاجرہ خانوادہ ابراہیم میں صرف خادمہ ہی نہیں بلکہ مخدومہ بھی تھی لیکن خادمہ خلیل ہونے کا اعزاز مخدومہ ہونے سے کہیں بڑا تھا، اس لئے وہی ان کے نام کے ساتھ مشہور ہو گیا۔

حضرت ہاجرہ کا تعارف مولنا عبد الماجد دریا آبادی نے مختصر الفاظ میں خوب کرلیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"His mother Hajira (Hagar), a princess of royal blood, a daughter of the reigning pharaoh of Egypt, was an

---

1۔ رسول مبین، صفحہ 97، بحوالہ تفسیر توراۃ از ربی شلومو احق

embodiment of piety and virtue'. (1)

"ان (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کی والدہ ہاجرہ، ایک شہزادی تھیں جن کی رگوں میں شاہی خون گردش کرتا تھا۔ وہ مصر کے اس فرعون کی بیٹی تھیں جو حاکم وقت تھا۔ یہ خاتون نیکی اور پارسائی کا نمونہ تھیں۔"

اس کے بعد مولنا عبدالماجد دریا آبادی "جیوش انسائیکلوپیڈیا" کے حوالے سے حضرت ہاجرہ کے بارے میں یہودی علماء کی آراء نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

Observe the unwilling admission of the Jews:- Hagar is held up as an example of the high degree of godliness prevalent in Abraham's time, for...Hagar was not frightened by the sight of the divine messenger. Her fidelity is praised for even after Abraham sent her away she kept the marriage vow.... Another explanation of the same name is, to adorn, because she was adorned with piety and good deeds. It was Isaac who, after the death of Sarah, went to bring back Hagar to the house of his father.... As a token of his love for Sarah the king deeded his entire property to her, and gave her the land of Goshen as her hereditary possession... He gave her also his own dauther as slave." (2)

"یہودیوں نے بادل نخواستہ جو اعترافات کئے ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیے: ہاجرہ کو اس تقویٰ اور پارسائی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں متعارف تھی ...... کیونکہ حضرت ہاجرہ مقدس فرشتے کو دیکھ کر بھی نہیں گھبراتیں۔ ان کی عفت مآبی کو اس بنا پر سراہا جاتا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے انہیں گھر سے باہر بھیج دیا تو بھی انہوں نے ازدواجی وفاداری میں فرق نہ آنے دیا...... ان کے نام کا ایک مطلب "آراستہ" بھی ہے اور یہ اس لئے کہ آپ نیکی اور تقویٰ کے زیور سے آراستہ تھیں۔ وہ حضرت اسحاق علیہ

1۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی "ہولی قرآن" "انگلش ٹرانسلیشن اینڈ کنٹری"، (تاج کمپنی کراچی۔ 1971ء)، جلد 1، صفحہ 21-C

2۔ ایضاً

السلام ہی تھے جو حضرت سارہ کے انتقال کے بعد حضرت ہاجرہ کو اپنے باپ کے گھر واپس لانے کے لئے گئے تھے...... بادشاہ کے دل میں حضرت سارہ کے لئے عقیدت کے جو جذبات پیدا ہو گئے تھے، ان کے اظہار کے لئے اس نے اپنی ساری جائیداد حضرت سارہ کے نام کر دی تھی اور "گوشن" کی سرزمین ان کے قبضے میں دے دی تھی۔ اس نے اپنی لڑکی بھی کنیز کے طور پر ان کے حوالے کر دی تھی۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں یہودیوں نے تسلیم کیا ہے کہ شاہ مصر نے خود اپنی بیٹی کو حضرت سارہ کے حوالے کیا تھا اور اس کے علاوہ آپ کو بے شمار تحائف بھی دیئے تھے۔ کیا تاریخ انسانی میں کبھی اس طریقے سے لونڈی غلام بنانے کا رواج رہا ہے کہ ایک وقت کے بادشاہ تو کیا کسی آزاد اور باحیثیت آدمی نے خود اپنی بیٹی یا بیٹے کو کسی کے حوالے کیا ہو اور اس کی حیثیت غلام اور لونڈی کی بن گئی ہو۔

لونڈی یا غلام یا تو وہ ہوتے ہیں جن کو لڑائی میں قیدی بنایا گیا ہو، یا وہ ہوتے ہیں جو زر خرید ہوں اور یا وہ لوگ لونڈی یا غلام بنتے ہیں جو کسی لونڈی یا غلام سے پیدا ہوئے ہوں۔ توراۃ میں بھی ان تینوں قسموں کے لونڈی غلاموں کے لئے مختلف اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔ پہلی قسم کے لونڈی غلاموں کے لئے عبرانی میں "شبلوث حرب"

دوسری قسم کے لونڈی غلاموں کے لئے، "مقنت کسف"

اور تیسری قسم کے لونڈی غلاموں کے لئے "یلید بایث" کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ (1)

حضرت ہاجرہ کو نہ تو مذکورہ طریقوں میں سے کسی طریقے سے لونڈی بنایا گیا اور نہ ہی توراۃ میں حضرت ہاجرہ کے بارے میں مذکورہ بالا اصطلاحات میں سے کوئی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ عبرانی توراۃ میں حضرت ہاجرہ کے لئے "امتی" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی "امۃ" کا ہم معنی ہے۔ اس لفظ کا معنی خادمہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ (2) لیکن توراۃ کے مختلف زمانوں میں ترجمے کرنے والوں نے حضرت ہاجرہ کی تاریخ کو مد نظر رکھے بغیر ان الفاظ کو ایسے معانی پہنائے ہیں جن سے حضرت ہاجرہ کی تنقیص کا پہلو نکل سکے۔ انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں نے اسے "Slave girl" بنا دیا اور اردو میں ترجمہ کرنے والوں نے اس کا معنی

1۔ رسول مبین، صفحہ 96 (2) ایضاً

"لونڈی" کردیا۔

مسلمان ہر اس ہستی کو اپنے سر کا تاج سمجھتے ہیں جس کا کسی نبی یا رسول سے تعلق ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تو مسلمانوں کا ایک خصوصی تعلق ہے اور اس تعلق کی وجہ سے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اہل بیت میں سے ہر ایک کی خاک پا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کو سعادت سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر یہودی اور عیسائی حضرت ہاجرہ کی تاریخ کو سمجھتے ہوئے بھی ان کو لونڈی قرار دینے پر مصر ہوں اور اس تعلق کی وجہ سے نسل اسماعیل کی خاندانی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کریں تو پھر خانوادہ بنو اسرائیل کی عظمت بھی برقرار نہیں رہ سکتی۔

بنو اسرائیل کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے بنو اسرائیل کہا جاتا ہے۔ اور وہ سب اس نسب پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے اور انہی سے بنو اسرائیل کی بارہ شاخیں نکلی ہیں۔ بنو اسرائیل ان تمام قبائل کو برابر عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ توراۃ کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ان کی چار بیویوں کی اولاد ہیں: لیاہ، راخیل، زلفہ اور بلہہ۔

راخیل اور لیاہ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی لڑکیاں ہیں، جو ان کے نکاح میں آئیں لیکن زلفہ اور بلہہ کو ان کے سسر نے اپنی بیٹیوں کو خادمہ کے طور پر عنایت کیا تھا۔ کتاب پیدائش، باب 29، آیۃ 24 میں ہے:

"Moreover, Laban gave to her Zilpah his maidservant, even to Leah his daughter, as a maidservant".

"لابان" نے اپنی خادمہ زلفہ کو بطور خادمہ اپنی بیٹی "لیاہ" کے سپرد کیا۔ اسی باب کی آیت نمبر 29 میں ہے:

"Besides, Laban gave Bilhah his maidservant to Rachel his dauther as her maidservant".

"اس کے علاوہ "لابان" نے اپنی خادمہ "بلہہ" کو بطور خادمہ اپنی بیٹی راخیل کے حوالے کیا۔ یہ دو خواتین جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے سسرال سے ان کی بیویوں کے ساتھ بطور خادمہ آئی تھیں، بعد میں اپنی ازواج کی خواہش پر

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان سے بھی نکاح کر لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضرت سارہ کی خواہش کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ سے نکاح کیا تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے چار بیٹے ان دو خواتین کے بطن سے ہیں، جن کو تورات خادمائیں کہتی ہے۔ اب اگر حضرت ہاجرہ کے خادمہ ہونے کی وجہ سے ان کے بیٹے کی نسل کا مقام گھٹتا ہے تو زلفہ اور بلہہ کے خادمائیں ہونے کی وجہ سے، ان کی نسل کا مقام کیسے برقرار رہے گا؟ جبکہ دونوں قسم کی خادماؤں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حضرت ہاجرہ، حضرت سارہ کی خادمہ کہلانے سے پہلے مصر کی شاہزادی تھیں، جبکہ زلفہ اور بلہہ تورات کے مطابق راخیل اور لیاہ کی خادمائیں بننے سے پہلے ان کے باپ "لابان" کی خادمائیں تھیں۔ شاہ مصر نے اپنی شاہزادی بطور عقیدت حضرت سارہ کے حوالے کی تھی اور "لابان" نے اپنی بیٹیوں کی خدمت کے لئے اپنی خادمائیں ان کے حوالے کی تھیں۔

بنو اسرائیل سے گزارش ہے کہ اگر وہ حضرت ہاجرہ کو زلفہ اور بلہہ سے بلند مقام دینے کے لئے تیار نہیں تو وہ ان کو کم از کم ان کے برابر مقام تو دیں اور پھر جو حکم زلفہ اور بلہہ کی اولاد پر لگائیں، وہی حضرت ہاجرہ کی اولاد پر بھی لگا دیں۔

اگر مستشرقین اور یہود و نصاریٰ صرف اس بنا پر حضرت ہاجرہ کو لونڈی کہنے پر مصر ہیں کہ حضرت سارہ نے ان کے لئے یہ لفظ استعمال کیا تھا، یا بائیبل میں کہیں ان کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوا ہے تو اس قاعدے کے مطابق انہیں حضرت راخیل اور لیاہ کو جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی بیٹیاں تھیں، انہیں بھی لونڈی قرار دینا پڑے گا کیونکہ ان کے متعلق لونڈی کا لفظ کسی دوسرے نے استعمال نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے لونڈی ہونے کا اقرار کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کے والد نے انہیں فروخت کیا ہے اور توراۃ اس بات پر گواہ ہے۔ کتاب پیدائش، باب 31 کی آیات 14 اور 15 کے الفاظ یہ ہیں:

"At this Rachel and Leah answered and said to him":Is there a share of inheritance for us anymore in the house of our father? Are we not realy considered as foreigners to him since he has sold us, so that he keeps eating continually even from the money given

for us?"

"اس کے جواب میں راخیل اور لیاہ نے آپ سے کہا: کیا ہمارے باپ کے گھر میں ہمارا کوئی حق وراثت باقی رہ گیا ہے؟ کیا درحقیقت ہم اپنے باپ کے لئے اجنبی نہیں ہو گئیں کیونکہ اس نے ہمیں فروخت کر دیا ہے اور ہمارے بدلے اسے جو رقم ملی ہے، اسے مسلسل کھا رہا ہے؟"

اس بیان میں تو معزز خواتین یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ ان کے باپ نے انہیں فروخت کر دیا ہے اور ان کے بدلے اسے جو رقم ملی ہے، اسے کھا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان خواتین سے حضرت ہاجرہ کا مقام بلند ہے جنہیں ان کے باپ نے فروخت نہیں کیا تھا بلکہ حضرت سارہ جیسی عظیم خاتون کی معیت کو اپنی بیٹی کے لئے سعادت سمجھا تھا اور نہ صرف اپنی بیٹی حضرت سارہ کے سپرد کی تھی بلکہ اس کے ساتھ بے شمار تحائف بھی ان کی نذر کئے تھے۔

حضرت ہاجرہ کے آزاد خاتون ہونے اور لونڈی نہ ہونے پر بائیبل میں ایک زبردست شہادت موجود ہے۔ اسرائیلی قانون میں لونڈی کی اولاد کبھی جائداد کی وارث نہیں بن سکتی۔ (1) اگر حضرت ہاجرہ لونڈی ہوتیں تو حضرت سارہ کے ذہن میں کبھی یہ بات نہ کھٹکتی کہ ہاجرہ کا بیٹا، ان کے اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے باپ کا وارث بنے گا۔ لیکن بائیبل ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت سارہ نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا اور حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو گھر سے نکلوانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں اسحاق کے ساتھ اسماعیل بھی اپنے باپ کا وارث قرار نہ پائے۔ کتاب پیدائش، باب 21 کی آیت نمبر 10 ہمیں بتاتی ہے:

'So she began to say to Abraham, Drive out this slave girl and his son, for the son of the slave girl is not going to be an heir with my son, with Isaac'.

"اس لئے اس (سارہ) نے ابراہیم سے کہنا شروع کر دیا: اس کنیز اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو کیونکہ اس کنیز کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وراثت کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔"

1۔ رسول مبین، صفحہ 96

مولنا عبد الماجد دریا آبادی نے علمائے یہود کے حوالے سے جو بات لکھی ہے کہ حضرت سارہ کے انتقال کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام خود حضرت ہاجرہ کو لینے کیلئے گئے تھے تا کہ وہ ان کے والد کے گھر میں قیام فرمائیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نظر میں حضرت ہاجرہ کا وہی مقام تھا جو ایک بیٹے کے دل میں اپنی مادر محترمہ کا ہوتا ہے۔ ان کی والدہ حضرت سارہ انتقال کر گئی تھیں اور وہ گھر جو کبھی اپنی والدہ کے دم سے انہیں رشک ارم دکھائی دیتا تھا، وہ اب انہیں سونا سونا محسوس ہونے لگا تھا۔ ان کے خیال میں حضرت سارہ کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا تھا اسے صرف حضرت ہاجرہ ہی پر کر سکتی تھیں۔ اس لئے آپ خود حضرت ہاجرہ کو لینے کیلئے تشریف لے گئے تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ کے دلوں میں کوئی جذبات رقابت تھے بھی تو وہ جلد ختم ہو گئے تھے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نظر میں حضرت ہاجرہ ان کی والدہ کی سوکن اور ان کی مخالف نہ تھیں بلکہ ان کی نظر میں ان کا مقام ایک ماں کا تھا کیونکہ وہ ان کے والد محترم کی زوجہ مطہرہ اور ان کے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ محترمہ تھیں۔

اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جو حضرت اسحاق علیہ السلام کے لئے اپنے گھر کے افراد اور انتہائی قابل احترام تھے، انہیں ان کی اولاد نے لونڈی اور لونڈی زادہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔

حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی روحانی عظمت

سینٹ پال جو موجودہ عیسائیت کا بانی ہے اس نے "گلیتیون" کے نام اپنے خط میں حضرت ہاجرہ کی اولاد کو بڑے عجیب انداز میں ہر قسم کی عظمتوں سے محروم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے یہاں بنو اسرائیل کو اعلیٰ اور بنو اسماعیل کو ادنیٰ ثابت کرنے کے لئے کسی تاریخی حقیقت کا نہیں بلکہ تمثیل کا سہارا لیا ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"But the one by the servant girl was actually born in the manner of flesh, the other by the free woman throrough a Promise." (1)

1۔ گلیتیون، باب 4، آیت 23

"لیکن وہ بیٹا جو خادمہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا، وہ در حقیقت جسمانی طور پر پیدا ہوا تھا اور دوسرا جو آزاد عورت کے بطن سے تھا وہ وعدہ کے طور پر پیدا ہوا تھا۔"

اس کے بعد سینٹ پال نے عجیب و غریب منطق جھاڑی ہے۔ وہ حضرت ہاجرہ اور حضرت سارہ کو تمثیل کے انداز میں پہلے دو عہد اور پھر دو پہاڑیاں قرار دیتا ہے۔ وہ حضرت ہاجرہ کو کوہ سینا اور حضرت سارہ کو یوروشلم قرار دیتا ہے اور پھر دعویٰ کرتا ہے کہ سینا جو عرب کا پہاڑ ہے اس کی مثال اس ماں کی سی ہے جو غلاموں کو جنم دیتی ہے اور یوروشلم ایسی ماں ہے جس کے فرزند آزاد ہوتے ہیں۔(1)

سینٹ پال اپنے اس ڈرامے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ روحانی عظمتیں حضرت سارہ کی اولاد کے لئے خاص ہیں اور حضرت ہاجرہ کی اولاد کو ان میں سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی ولادت جسمانی طور پر ہوئی تھی اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت روحانی طور پر۔ پھر وہ اپنے اسی خیال کو ترقی دے کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسرائیلی سرداری کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اسماعیلی غلامی کرنے کے لئے۔

اس قسم کے خیالات اسی بیمار ذہن میں جنم لے سکتے ہیں جو مقام آدمیت سے قطعاً ناآشنا ہو اور جو اللہ تعالیٰ کو "رب العالمین" سمجھنے کے بجائے صرف بنو اسرائیل کا رب سمجھتا ہو۔

اس قسم کی خام خیالی سینٹ پال تک محدود نہیں بلکہ بہت سے مستشرقین جو سینٹ پال کی روحانی اولاد ہیں، وہ بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام فرزند خلیل تھے اور انہیں خاندانی اور روحانی عظمتیں اپنے عظیم باپ سے ورثے میں ملی تھیں۔ اس بات کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ بائیبل جس کے لکھنے والوں نے نسل اسماعیل کے مقام کو گھٹانے کے لئے کئی صدیاں سر توڑ کوششیں کی ہیں، اس بائیبل میں ان گنت تحریفات کے باوجود آج بھی ایسی آیات موجود ہیں جن سے ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور ان کے فرزند ارجمند کی عظمت جھلکتی ہے۔ بائیبل میں جو عظمتیں حضرت سارہ اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے لئے بیان ہوئی ہیں، انہیں عظمتوں کا حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی حامل قرار دیا گیا ہے۔ بائیبل

1۔ گلتیون، باب 4، آیت 26-23

کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت سارہ کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کا نام خود رکھا تو اس نے حضرت ہاجرہ کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام بھی خود رکھا۔ کتاب پیدائش، باب 17، آیہ نمبر 19 میں اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرما رہا ہے:

"Sarah your wife is indeed bearing you a son, and you must call his name Isaac".

"تمہاری اہلیہ سارہ تمہارے ایک بچے کو جنم دیں گی، تم اس بچے کا نام اسحٰق رکھنا۔"

جب کہ کتاب پیدائش، باب 16، آیہ نمبر 11 میں خدا کا فرشتہ براہ راست حضرت ہاجرہ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

"Here you are Pregnant, and you shall give birth to a son and must call his name Ishmael; for Jehovah has heard your affliction".

"دیکھو! تم حاملہ ہو۔ تم ایک بچے کو جنم دو گی، تمہیں اس کا نام اسماعیل رکھنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے درد و غم کو سن لیا ہے۔"

بائبل کی مندرجہ بالا عبارتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ ان دونوں عظیم خواتین کے عظیم فرزندوں کے نام بارگاہ خداوندی نے خود تجویز کئے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ حضرت سارہ کو ان کا درد و غم سنے جانے، بیٹا عطا ہونے اور اس بیٹے کے نام کی بشارت حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کی وساطت سے دی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خلیل سے مخاطب ہے اور ان سے خطاب کے دوران حضرت سارہ کو ان کی وساطت سے خوش خبری دے رہا ہے، جب کہ حضرت ہاجرہ سے خدا کا مقدس فرشتہ مخاطب ہے۔ فرشتہ انہیں بتا رہا ہے کہ خدا نے تمہارا درد و غم سن لیا ہے، وہ تمہیں بیٹا عطا فرمائے گا اور اس نے تمہارے اس بیٹے کا نام اسماعیل رکھ دیا ہے۔ اب یہ فیصلہ سینٹ پال اور اس کی روحانی ذریت ہی بہتر کر سکتی ہے کہ روحانیت کے ساتھ اس کا تعلق زیادہ ہے جس کے ساتھ خدا کا مقدس فرشتہ ہم کلام ہے یا جس کو یہ خوش خبری خدا کے رسول کی وساطت سے مل رہی ہے۔

کتاب پیدائش، باب 17، آیت نمبر 16 میں حضرت سارہ کے متعلق بیان ہوا ہے:

"And I will bless her and also give you a son from her,

and I will bless her and she shall become nations; Kings of people will come from her".

"اور میں اس کو برکت دوں گا اور تمہیں اس سے ایک بیٹا دوں گا۔ میں اس کو برکت دوں گا اور اس کی اولاد سے کئی قومیں بنیں گی۔ اس کی اولاد میں سے قوموں کے بادشاہ ہوں گے۔"

یہی بات اسی باب کی آیت نمبر 20 میں حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کے متعلق بھی کہی گئی ہے:

"But as regards Ishmael I have heard you. Look! I will bless him and will make him fruitful and will multiply him very very much. He will certainly produce twelve chieftains, and I will make him become a great nation".

"لیکن جہاں تک اسماعیل کا تعلق ہے، اس کے متعلق میں نے تمہاری التجا سن لی ہے۔ دیکھو! میں اسے برکت دوں گا۔ میں اسے صاحب اولاد بناؤں گا اور اس کی نسل میں بہت زیادہ اضافہ کروں گا۔ اس کی نسل سے یقیناً بارہ عظیم سردار جنم لیں گے اور میں اسے ایک بہت بڑی قوم بناؤں گا۔"

بائبل جس طرح خدا کی معیت کو حضرت اسحاق علیہ السلام کے لئے ثابت کر رہی ہے، اسی طرح وہ اس اعزاز کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے بھی ثابت کر رہی ہے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق کتاب پیدائش، باب 26، آیہ نمبر 24 میں ہے:

"And Jehovah Proceeded to appear to him during that night and to say:" I am the God of Abraham your father. Do not be afraid, because I am with yuou, and I will bless you and multiply your seed on account of Abraham my servant".

"اس رات خدا اس کے سامنے ظاہر ہوا اور فرمایا: میں تمہارے باپ ابراہیم کا خدا ہوں۔ ڈرو مت، کیونکہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں برکت دوں گا اور اپنے بندے ابراہیم کی وجہ سے تمہاری نسل میں اضافہ کروں گا۔"

خدا کی یہی معیت حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی حاصل ہے۔ ان کے متعلق کتاب

پیدائش، باب 21، آیہ 20 میں ہے:

'And God continued to be with the boy, and he kept growing and dwelling in the wilderness; and he became an archer'.

"اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس لڑکے کے ساتھ تھا۔ ویرانے میں رہتے ہوئے وہ نشوونما پاتا رہا اور ایک تیرانداز بن گیا۔"

بائیبل یہود و نصاریٰ کی ان گنت تحریفات کے باوجود حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے بھی وہی روحانی عظمتیں ثابت کر رہی ہے جو حضرت سارہ اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کے لئے کر رہی ہے۔ بائیبل میں حضرت ہاجرہ یا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف میں کسی ایک جملے کا بھی مل جانا، ان کی عظمت کا ناقابل تردید ثبوت ہے کیونکہ حاملان بائیبل نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کے مقام کو گھٹانے کے لئے اپنی الہامی کتابوں پر بھی کتمان و تحریف کے بے شمار حربے آزمائے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی ان گنت تحریفات کے باوجود بائیبل میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی روحانی عظمتوں کا اشارہ مل جانا، اس ذات کی قدرت کا کرشمہ ہے جس نے سبط اسماعیل علیہ السلام کے سر پر "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" (1) کا تاج سجایا ہے اور جو یہ گوارا نہیں کرتا کہ پھونکیں مارنے والے شمع حق کو بجھانے میں کامیاب ہو جائیں۔

خاندان بنو ہاشم کا مقام گھٹانے اور مسلمانوں کو حقیر ثابت کرنے کی کوششیں

یورپ کے لوگ ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اب ان ممالک نے اپنے شہریوں کی شخصی دستاویزات سے ولدیت کا خانہ ہی ختم کر دیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک نہ خاندانی نظام کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی کسی نسل سے ہونے کو وہ کسی انسان کے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ خاندان کا اس طرح حلیہ بگاڑنے کے باوجود بنو اسرائیل اپنے نسبی تفوق پر اتراتے ہیں، گوری چمڑے والے اپنے آپ کو رنگدار لوگوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور جب کسی مسلمان ہستی کے بارے میں لکھنے پر آتے ہیں تو اس کے نسب نامے میں

1۔ سورۃ الم نشرح 4، ترجمہ اور ہم نے بلند کر دیا آپ کی خاطر آپ کے ذکر کو۔

خامیاں تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

جس شخص کی ولدیت کا ہی کوئی مستند ریکارڈ نہیں، اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اس کے نسب نامے کی وجہ سے حقیر سمجھے؟ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا ہو رہا ہے۔ خصوصاً حضور علیہ السلام کے متعلق لکھتے وقت اہل مغرب نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

انہوں نے پہلے تو حضور علیہ السلام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رشتہ منقطع کرنے کی کوشش کی۔ اس میں کامیاب نہ ہوئے تو آپ کو حضرت ہاجرہ کے حوالے سے لونڈی کی اولاد ثابت کرنے کی سعی نامسعود کی۔ جب یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی تو آپ کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے یہ اسلوب اپنایا کہ قبیلہ قریش کی مختلف شاخوں کو اپنے تخیل کے زور پر دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک طرف قبیلہ کی وہ شاخیں تھیں جن کے ہاتھوں میں مکہ کا اقتدار تھا۔ مکہ اور طائف کی تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ اپنی دولت اور طاقت کے بل بوتے پر وہ جو چاہتے، کرتے تھے۔ دوسری طرف اس قبیلے کی کچھ شاخیں وہ تھیں جو کمزور تھیں۔ یہ قبیلے اس قابل نہ تھے کہ وہ شام یا یمن کی طرف تجارتی قافلے بھیج سکتے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قبیلہ بنو ہاشم کا شمار انہی کمزور قبائل میں ہوتا تھا اور مکہ کے طاقت ور اور دولت مند قبائل کے مقابلے میں قبیلہ بنو ہاشم کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

ہم مستشرقین کی تحریروں سے چند اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ خاندان بنو ہاشم کی اہمیت کو کم ثابت کرنے کے لئے، مستشرقین کس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ ولیم میور اپنی کتاب "محمد اینڈ اسلام" میں لکھتا ہے:

"The bereavement told the more, because the sons of Abd al Muttalib, unable to maintain his dignity, had to relinquish some of the offices of state which had been held by him, and descend to a lower condition of life". (1)

"اس صدمے نے آپ پر اور بھی سخت اثر ڈالا کیونکہ عبدالمطلب کے بیٹے، اپنے باپ کے وقار کو برقرار نہ رکھ سکے تھے اور انہوں نے بعض ان عہدوں سے دست برداری اختیار کر لی تھی جن پر ان کے والد فائز تھے۔ اس طرح وہ نسبتاً

1۔ سر ولیم میور، "محمد اینڈ اسلام"، (لندن۔ س ن)، صفحہ 5

پست معیار زندگی پر قانع ہو گئے تھے۔"

ولیم میور نے یہ نہیں بتایا کہ حضرت عبدالمطلب کے بیٹے کن کن عہدوں سے دستبردار ہوئے تھے اور نہ اس نے یہ بتایا ہے کہ اس نے یہ بات کس حوالے سے لکھی ہے۔ ولیم میور کو یہ بات لکھنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے تھا کہ قریش کے جن قبائل نے حجر اسود کو اپنے مقام پر رکھنے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے تلواریں نکال لی تھیں، ان میں سے کسی قبیلے کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس اعزاز سے رضاکارانہ طور پر دست بردار ہو جاتا جو اسے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا تھا۔ اگر بنو ہاشم نے اس قسم کی کسی کمزوری کا مظاہرہ کیا ہوتا تو مکہ میں سر اٹھا کر چلنا ان کے لئے ممکن ہی نہ رہتا۔

"منٹگمری واٹ" نے حضور ﷺ کے بچپن میں قبیلہ بنو ہاشم کی حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

'Muhammad's guardians saw that he did not starve to death, but it was difficult for them to do more for him, especially as the fortunes of the clan of Hashim seem to have been declining at this time. An orphan, with no able bodied man to give special attention to his interests, had a poor start in commercial career; and that was really the only career open to him'. (1)

"محمد (ﷺ) کے سرپرست صرف یہ احتیاط کرتے کہ وہ بھوک سے مر نہ جائیں۔ اس سے زیادہ وہ ان کے لئے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ خصوصاً جب کہ اس زمانے میں بنو ہاشم کی مالی حالت گرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایک یتیم، جس کے مفادات کی دیکھ بھال کے لئے، جسمانی طور پر اہل، کوئی آدمی موجود نہ تھا اس نے اپنی کاروباری زندگی کا آغاز انتہائی کمزور طریقے سے کیا اور یقیناً اس کے علاوہ ان کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا۔

"منٹگمری واٹ" قبیلہ بنو ہاشم کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے یہ شوشہ بھی چھوڑتا ہے کہ قبیلہ بنو ہاشم نے حلف الفضول میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ تنظیم ان قبائل نے بنائی تھی

1۔ منٹگمری واٹ، "محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین"، (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن۔ 1961ء)، صفحہ 8

جو مکہ کے اجارہ دار قبائل کے خلاف تھے اور خود وہ قبائل بہت کمزور تھے۔ ان قبائل کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

"The clans which formed it seem to have been those which were themselves incapable of sending caravans to yemen, or which had specialized in trade between Mecca and Syria". (1)

"جن قبائل نے حلف الفضول کا معاہدہ کیا تھا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ قبائل تھے جو یمن کی طرف تجارتی قافلے بھیجنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے یا وہ قبیلے تھے جو شام اور مکہ کے درمیان ہونے والی تجارت میں ہی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔"

"منگمری واٹ" بنو ہاشم قبیلہ کے تمام افراد کو غریب اور دوسرے درجے کا شہری ثابت کرنے کیلئے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یوں رقمطراز ہے:

"As a banker and financier, doubtless in a small way, and purveyor of water for the pilgrims, he had little importance in the affair of Mecca, and life there cannot have been very comfortable for him". (2)

"ایک چھوٹے پیانے کا بنکار ہونے اور حاجیوں کو پانی پلانے کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس میں شک نہیں کہ مکہ کے معاملات میں عباس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ وہاں پر سکون زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔"

مستشرقین نے ایک طرف تو قبیلہ بنو ہاشم کے مقام کو گھٹانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور دوسری طرف انہوں نے قریش کے دیگر قبائل کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ساتویں صدی عیسوی کے مکہ کی بات نہ کر رہے ہوں بلکہ بیسویں صدی عیسوی کے یورپ یا امریکہ کی بات کر رہے ہوں۔ مستشرقین ان عربوں

1۔ منگمری واٹ، "محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین"، (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن۔ 1961ء)، صفحہ 9

2۔ ایضاً، صفحہ 1-200

کے حالات لکھتے ہوئے ایسے ایسے الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جن کا نام عربوں نے صدیوں تک نہ سنا ہوگا۔ "منٹگمری واٹ" ان مستشرقین میں سرفہرست ہے جو قبیلہ بنو ہاشم کے مقام کو گھٹا کر اور ان کے مقابلے میں دیگر قبائل کو بااثر اور طاقت ور ثابت کر کے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مکہ کئی طبقوں میں تقسیم تھا۔ ایک طرف وہ دولت مند تاجر تھے جن کا مکہ کی مارکیٹ پر اجارہ دارانہ کنٹرول تھا اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو غریب اور کمزور ہونے کی وجہ سے کاروباری میدان میں اجارہ داروں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور اس طرح احساس محرومی کا شکار تھے۔ "منٹگمری واٹ" اپنے تخیل کے زور پر ساتویں صدی عیسوی کے مکہ کی معاشی حالت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے:

> "By the time Muhammad had begun to preach, the growing commercial prosperity of Mecca may be said to have produced a new topmost stratum of society, namely, the leading, richest and most powerful merchants. These were at the same time the heads of the strongest clans or had great influence within them, and they also seem to have been securing a monopolistic grip on the most lucrative forms of trade.... This stratum was almost solidly opposed to Muhammad". (1)

> "جس زمانے میں محمد (ﷺ) نے اپنے دین کی تبلیغ شروع کی، اس زمانے کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مکہ کی بڑھتی ہوئی تجارتی خوش حالی نے ایک نیا اعلیٰ طبقہ ملکی سوسائٹی میں پیدا کر دیا تھا۔ یعنی انتہائی امیر اور انتہائی طاقت ور تاجروں کا طبقہ۔ یہ لوگ اپنی اس حیثیت کے ساتھ ساتھ انتہائی طاقت ور قبائل کے سردار بھی تھے یا ان قبائل میں ان کا زبردست اثر تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مکہ کی تجارت کے انتہائی منافع بخش شعبوں پر ان لوگوں کو اجارہ دارانہ کنٹرول حاصل تھا۔ یہ طبقہ تقریباً سارے کا سارا محمد (ﷺ) کا مخالف تھا۔"

"منٹگمری واٹ" نے قبیلہ قریش کی مختلف شاخوں کی عسکری اور سماجی حیثیت متعین کرنے کے لئے ایک عجیب و غریب فارمولا وضع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنگ احد کے لئے

1۔ منٹگمری واٹ، "محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین"، (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن۔ 1961ء)، صفحہ 38

جو عورتیں لشکر کفار کے ساتھ گئی تھیں، ہم ان سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قریش کا کون سا قبیلہ زیادہ طاقت ور تھا اور اس قبیلے کا سردار کون تھا۔ مستشرق موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

"Alwaqidi's list of women taken with them by the Meccans on the expedition of Uhud appears to give an indication of the leading men and tribes. These women, with two exceptions, were wives of chiefs of clans, and the fact that Abu sufyan and Safwan b. Umayyah took two each suggests that these were now the leaders of the rival factions. Abu Jahl's son, Ikrimah was apparently not yet on a level with safwan". (1)

"الواقدی نے ان عورتوں کی جو فہرست دی ہے جن کو قریش مکہ احد کی مہم پر لشکر کے ساتھ لے گئے تھے، اس فہرست سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اس وقت قریش کے سربر آوردہ افراد اور قبیلے کون سے تھے۔ دو کے علاوہ یہ سب عورتیں قبائل کے سرداروں کی بیویاں تھیں۔ یہ حقیقت کہ ابوسفیان اور صفوان بن امیہ دونوں دو دو بیویاں ساتھ لے گئے تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دونوں اپنے اپنے دھڑوں کے سردار تھے۔ بظاہر اس وقت عکرمہ بن ابی جہل ابھی صفوان کا ہم پلہ نہ تھا۔"

مستشرقین کی کتابوں میں اس قسم کی تحریریں جا بجا ملتی ہیں۔ اس قسم کی تاریخ نویسی سے مستشرقین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تحریک اسلامی کو طبقاتی کشمکش سے جنم لینے والی ایک تحریک قرار دے سکیں اور یہ ثابت کر سکیں کہ مکہ والوں نے حضور ﷺ کی جو مخالفت کی تھی، اس کی وجہ مذہبی اور نظریاتی اختلاف نہ تھا بلکہ مکہ کے امیر اور غریب طبقے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے۔ بااثر تاجروں کا طاقت ور طبقہ کسی کمزور کو تجارت کے میدان میں آگے بڑھتے نہ دیکھنا چاہتا تھا اور غریب طبقہ سرمایہ داروں کی پالیسیوں سے تنگ تھا اور ان کے خلاف کارروائی کے لئے موقعہ کی تلاش میں تھا۔

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 57

مستشرقین ان خیالی افسانوں کے ذریعے اسلام پر دو طریقوں سے حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام جو اس سرعت سے پھیلا کہ چند سالوں میں پورے جزیرہ عرب کو اپنے کنٹرول میں لے لیا، اس کی وجہ اسلام کی تعلیمات کی کشش اور پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے کردار کی پختگی نہ تھی بلکہ یہ تو ایک ایسا انقلاب تھا جس کے لئے حالات انتہائی سازگار تھے۔ معاشرہ طبقوں میں بٹ چکا تھا۔ امیر، امیر تر ہو رہے تھے اور غریبوں کی حالت دن بدن ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ طاقت ور طاقت کے نشے میں مست تھے اور کمزور ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ ان حالات میں کمزور طبقے میں ایک باصلاحیت آدمی اٹھا۔ طاقت ور لوگوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے سب لوگ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور اس نے ان مغلوب طبقوں کی مدد سے پورے جزیرہ عرب میں انقلاب برپا کر دیا۔ دوسری طرف وہ اس قسم کی تحریروں کے ذریعے حضور ﷺ کا سماجی مقام گھٹانے کے لئے، آپ کو ایک کمزور قبیلے کا فرد ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ پر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جس شخص کے آباؤاجداد میں قصی، عبد مناف، ہاشم اور عبد المطلب جیسے تاریخ ساز سرداروں کے نام آتے ہوں، اسے اس کی اپنی قوم میں ایک معمولی خاندان کا فرد ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس خیالی تاریخ نویسی کے خلاف مغرب کے مستند اور مشہور مورخ "گبن" کی شہادت ملاحظہ فرمائیے، وہ لکھتا ہے:

"His descent from Ismael was a national privilege or fable, but if the first steps of the pedigree are dark and doubtful, he could produce many generations of pure and genuine nobility, he sprung from the tribe of koreish and the family of Hashism, the most illustrious of the Arabs, the princes of Mecca, and the hereditary guardians of the Caaba. The grandfather of Mohammad was Abdol Motalleb, the son of Hashem, a wealthy and generous citizen, who relieved the distress of famine with the supplies of commerce. Mecca which had been fed by the liberality of the father, was saved by the courage of the son." (1)

1۔ دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر، صفحہ 229

"آپ کا اسماعیلی النسل ہونا قومی اعزاز تھا یا افسانہ، لیکن اگر ان کے نسب نامے کی ابتدائی کڑیاں تاریک اور مشکوک ہوں تو بھی وہ اپنے نسب نامے کی کئی نسلوں میں ایسے عظیم لوگ پیش کر سکتے ہیں جو حقیقی معنوں میں شریف اور عظیم تھے۔ انہوں نے قریش کے قبیلے اور ہاشم کے خاندان میں جنم لیا تھا جو معزز ترین عرب تھے، مکہ کے بادشاہ تھے اور خانہ کعبہ کے موروثی پاسبان تھے۔ محمد (ﷺ) کے دادا عبدالمطلب تھے جو ہاشم کے بیٹے تھے۔ وہ ہاشم جو مالدار اور سخی شہری تھے۔ انہوں نے قحط کی سختیوں کو اپنے مال تجارت کے ذریعے کم کیا تھا۔ مکہ، جسے باپ کی کشادہ دلی نے (حالت قحط) میں کھانا کھلایا تھا، اس مکہ کو اسی باپ کے بیٹے کی بہادری نے بچایا تھا۔" (1)

کیا کوئی ذی ہوش شخص ولیم میور اور منٹگمری واٹ کے ان مفروضوں کو تسلیم کر سکتا ہے کہ وہ بنوہاشم جو عربوں کے لئے مایہ ناز بھی تھے، مکہ کے سردار بھی تھے اور خانہ کعبہ کے خادم بھی تھے، وہ حضرت عبدالمطلب تک تو اس حیثیت پر برقرار رہے اور آپ کے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی بنوہاشم کی عظمتوں کا محل زمین بوس ہو گیا۔ اور بنوہاشم کے مقام میں یہ انقلاب اس وقت آیا جب حضرت عبدالمطلب کے دس سے زیادہ بیٹے زندہ تھے جن میں ابوطالب، حمزہ، عباس اور زبیر جیسی ہستیاں موجود تھیں۔

اگر قبیلہ بنوہاشم اتنا ہی کمزور ہوتا جتنا مستشرقین کو نظر آتا ہے اور دیگر قبائل قریش اتنے ہی طاقت ور ہوتے جتنا طاقت ور مستشرقین انہیں دکھانا چاہتے ہیں تو وہ حضور ﷺ کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو سلوک وہ کمزور مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔

جو چیزیں عربوں کے نزدیک قابل فخر تھیں، ان میں بنوہاشم کسی سے کم نہ تھے۔ ان کے ہاں بنک بیلنس مایہ افتخار نہ تھا بلکہ ان کے ہاں عظیم وہ تھا جو دوسروں کی نسبت زیادہ سخاوت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ان کے وقار کا امتحان ان کی جرات اور بہادری سے ہوتا تھا۔ مستشرقین ابوجہل کو قریش کے طاقت ور اور مضبوط ترین قبیلے کا سردار مانتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہے کہ ایک مرتبہ جب ابوجہل نے حضور ﷺ کی توہین کی تھی اور آپ کے چچا حمزہ کو، جو ابھی حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے، ابوجہل کی اس جسارت کا علم ہوا تھا تو

1۔ مکہ مکرمہ کو ابرہہ کے لشکر کی تباہی سے بچانے کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عبدالمطلب کا عظیم کارنامہ ہے۔

انہوں نے سب کے سامنے ابو جہل کی مرمت کی تھی اور مکہ کے امیر ترین، بہت ہی طاقت ور اور بہت ہی بااثر لوگوں میں سے کسی کو جرات نہیں ہوئی تھی کہ وہ حمزہ کے ہاتھ کو روک سکے۔ منٹگمری واٹ نے خود اس واقعہ کو اپنی کتاب "محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین" کے صفحہ نمبر 57 پر لکھا ہے۔

عربوں کا دستور تھا کہ وہ اپنی بہادری، جرات اور عظمت کا فیصلہ میدان جنگ میں کرتے تھے۔ وہ جنگ کا بازار گرم ہونے سے پہلے مبارزت طلبی کرتے تھے اور اپنے مقابلے میں اسی کو آنے کی اجازت دیتے تھے جسے وہ اپنا ہم پلہ سمجھتے تھے۔ جنگ بدر میں بھی عام لڑائی سے پہلے یہ انفرادی معرکہ آرائی ہوئی تھی جس کی تفصیل خود ولیم میور نے ان الفاظ میں لکھی ہے:

"Sheyba and otba two leaders of the Coreish, and welid son of otba, still smarting under the taunts of Abu Jahl, advanced into the open field and defied three champions from the Medina force to meet them singly. Many upstarted at the call, but Mahomet checked them, and turning to his kinsmen said: "Ye sons of Hashim! arise and fight, according to your right." Obeida, Hamza, and Aly, the uncle and cousins of Mahomet, stepped forth. Their features being concealed by their helmets, Otba asked their names. "Speak", he said "and if ye be our equals we shall fight with you." Hamza answered, with a play on his name" :I am the lion of God and of his prophet; I am the son of Abdal Mottalib." "Worthy foe," replied otba; "but who are these?" Hamza gave their names. "Meet foes every one", replied otba. and then they arose to fight". (1)

"شیبہ اور عتبہ، دو قریشی سردار اور ولید بن عتبہ جو ابھی تک ابو جہل کے طعنوں کی ٹیسیں محسوس کر رہے تھے، وہ میدان میں آئے اور لشکر مدینہ سے تین مبارز طلب کیے۔ کئی لوگ آگے بڑھے لیکن محمد (ﷺ) نے انہیں روک دیا اور اپنے

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 90-89

اہل خاندان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: بنو ہاشم! اٹھو اور مقابلہ کرو کیونکہ یہ تمہارا ہی حق ہے۔ عبیدہ، حمزہ اور علی، ایک محمد (ﷺ) کے چچا اور دو چچیرے بھائی، آگے بڑھے۔ ان کے چہرے خودوں میں چھپے ہوئے تھے اس لئے عتبہ نے ان سے ان کے نام پوچھے۔ اس نے کہا: تم بولو، اگر تم ہمارے مقابلے کے ہوئے تو ہم تم سے لڑیں گے۔ حمزہ نے رزمیہ انداز میں اپنا نام بتایا۔ میں خدا اور خدا کے رسول کا شیر ہوں، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔ عتبہ نے جواب دیا: تم واقعی ہمارے مد مقابل آنے کے قابل ہو۔ لیکن یہ تمہارے ساتھ کون ہیں؟ حمزہ نے ان کے نام بتائے۔ عتبہ نے کہا: اٹھو اور اپنے اپنے غنیم کا مقابلہ کرو۔ اس طرح وہ مقابلے کے لئے آگے بڑھے۔" یہ واقعہ بتاتا ہے کہ شیبہ وغیرہ ان ہاشمیوں کو اپنا ہم پلہ سمجھتے تھے۔

قریش مکہ نے ہجرت کے وقت حضور ﷺ کی شمع حیات کو گل کرنے کے لئے تمام قبائل سے ایک ایک جوان اس لئے چنا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان میں سے کسی ایک قبیلے میں یہ جرات نہ تھی کہ وہ یہ حرکت کرے اور پھر انتقام میں کھولتے ہوئے ہاشمی خون کا مقابلہ کر سکے۔

حضرت ابو طالب کے پاس قریش کے وفود جاتے تھے اور آپ سے کہتے تھے کہ آپ اپنے بھتیجے کو ہمارے خداؤں کی توہین سے باز رکھیں یا راستے سے ہٹ جائیں، لیکن جب حضرت ابو طالب نے انہیں دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے بھتیجے کا دفاع کریں گے تو کسی مائی کے لعل میں یہ جرات نہ تھی کہ ان کی زندگی میں حضور ﷺ پر دست درازی کر سکے۔

ابو سفیان نے ہرقل کے دربار میں حضور ﷺ کی خاندانی عظمت کی شہادت دی تھی۔ ابو جہل جیسا دشمن بنو ہاشم کو اپنے پلے کا قبیلہ قرار دیتا ہے۔ ابو جہل، ابو سفیان اور اخنس بن شریق تینوں اسلام کے کٹر دشمن تھے اور اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ لیکن اس دشمنی کے باوجود قرآن حکیم کی کشش انہیں مجبور کر دیتی تھی کہ وہ راتوں کو چھپ چھپ کر حضور ﷺ کی زبان پاک سے قرآن حکیم کی تلاوت سنیں۔ وہ ایک دوسرے کو قرآن سننے سے منع کرتے، ایک دوسرے سے وعدہ کرتے کہ وہ آئندہ قرآن سننے کی کوشش نہیں کریں گے، لیکن اگلی رات پھر لوگوں کی نظروں سے بچ کر تلاوت قرآن سنتے

پہنچ جاتے۔ تیسری صبح اخنس بن شریق نے پہلے قرآن حکیم کے متعلق ابو سفیان سے اس کے تاثرات پوچھے اور پھر ابو جہل کے پاس پہنچا۔ اس نے ابو جہل سے کہا؟

يَا اَبَا الْحَكَمِ! مَارَأْيُكَ فِيْمَا سَمِعْتَ مِنْ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

"اے ابوالحکم: تم نے (محمد ﷺ) کی زبان سے جو کچھ سنا ہے اس کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے؟ ابو جہل نے کہا:

مَاذَا سَمِعْتُ؟ تَنَازَعْنَا نَحْنُ وَبَنُوْ عَبْدِ مَنَافِ الشَّرَفَ اَطْعَمُوْا فَاَطْعَمْنَا وَحَمَلُوْا فَحَمَلْنَا وَاَعْطَوْا فَاَعْطَيْنَا حَتّٰى اِذَا تَجَاذَيْنَا عَلَى الرُّكَبِ وَكُنَّا كَفَرَسَيْ رِهَانٍ قَالُوْا مِنَّا نَبِيٌّ يَاْتِيْهِ الْوَحْيُ مِنَ السَّمَآءِ فَمَتٰى نُدْرِكُ مِثْلَ هٰذِهٖ وَاللهِ لَا نُؤْمِنُ بِهٖ اَبَدًا وَلَا نُصَدِّقُهٗ (1)

"میں نے کیا خاک سنا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اور بنو عبد مناف کا جھگڑا اس بات پر تھا کہ قوم کا سردار کون ہے۔ اس شرف کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے بھی اپنے دستر خوان کو وسیع کیا اور ہر غریب و مسکین کو کھانا کھلایا اور ہم نے بھی ان سے بازی لے جانے کے لئے دستر خوان کو وسعت دی اور ہر غریب و مسکین کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ انہوں نے بھی لوگوں کے بوجھ اٹھائے اور ہم نے بھی بوجھ اٹھائے۔ انہوں نے بھی اپنی فیاضی سے مانگنے والوں کی جھولیاں بھریں اور ہم نے بھی اس بات میں ان سے سبقت لے جانے کی کوشش میں اپنی سخاوت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور جب ہم مقابلے کے دو گھوڑوں کی مانند ہو گئے تو انہوں نے اچانک اعلان کر دیا کہ ہم میں سے ایک شخص کو نبوت ملی ہے اور اس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ ہم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں؟ بخدا ہم تو اس پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے۔"

1۔ ضیاء النبی، جلد 2، صفحہ 300-299 بحوالہ "السیرۃ النبویہ"، لابن ہشام، جلد 1، صفحہ 38-337

ابو جہل کی یہ تقریر دو چیزوں کی وضاحت کر رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ ساتویں صدی عیسوی کے مکہ میں شرف و عزت کی نشانیاں کون کون سی تھیں اور دوسری یہ کہ وہ بنو ہاشم کو شرف و سیادت کے میدان میں اپنے قبیلے کا ہم پلہ قرار دیتا ہے۔ ابو جہل نے شرف و افتخار کے کسی میدان میں اپنے قبیلے کو بنو ہاشم سے برتر قرار نہیں دیا۔ نہ جانے مستشرقین نے یہ تصور کیسے کر لیا کہ بنو ہاشم ایک کمزور قبیلہ تھا اور اس کے مقابلے میں بنو مخزوم وغیرہ قبائل بہت طاقت ور اور با اثر تھے۔

"منگمری واٹ" نے اپنے اس مفروضے کی تردید خود ہی ایک دوسرے مقام پر کر دی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"The distinction between Patricians and plebeians does not fit Meccan society, or at least that section of it with which we are chiefly concerned. There is a distinction between Quraysh of the centre, and 'quraysh of the outskirts. but nearly all the people who are mentioned in the sources belong to 'Quraysh of centre", whether they are friends or enemies of Muhammad. There were no clear distinctions between noble and ignoble ancestry that could be regarded as parallel to the distinction between Muslim and pagan. All the clans reckoned as 'Quraysh of the centre, had a common ancestry'. (1)

"اعلیٰ طبقہ اور پست طبقہ کی اصطلاحیں مکی معاشرہ پر منطبق نہیں ہو سکتیں یا کم از کم اس معاشرے کے ان عناصر کے لئے موزوں نہیں جو زیادہ تر ہمارا موضوع بحث ہیں۔ مرکز کے قریش اور مضافات کے قریش میں امتیاز موجود تھا لیکن وہ تمام لوگ جن کا مصادر میں ذکر ہے، تقریباً وہ تمام مرکز کے قریش سے تعلق رکھتے تھے، خواہ ان کا تعلق محمد (ﷺ) کے دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے۔ وہاں اعلیٰ اور ادنیٰ نسل کا کوئی امتیاز نہ تھا، جس کو اس امتیاز کے برابر قرار دیا جا سکے جو

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 38-37

ایک مسلم اور ایک کافر میں تھا۔ مرکز کے قریش کے تمام قبائل ایک ہی نسل سے تھے۔"

وہ باتیں جن میں عرب قبائل باہم مفاخرت کیا کرتے تھے، ان میں قریش کے تمام قبائل ہم پلہ تھے اور ان میں اگر کوئی قبیلہ دوسروں پر فوقیت رکھتا تھا تو وہ قبیلہ بنو ہاشم ہی تھا کیونکہ قصی کے بعد قریش میں کوئی سردار ایسا نہیں جسے ہاشم اور عبدالمطلب کا ہم پلہ قرار دیا جا سکے۔

سونے اور چاندی کی قلت و کثرت کے ذریعے انسان کی قیمت متعین کرنے کی قارونی سوچ سے عرب آشنا نہ تھے اور نہ ہی وہاں قبائل کی مالی حالت میں اتنا فرق تھا جتنا "منٹگمری واٹ" وغیرہ نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ "ٹار انڈرائے" نے مکہ کی معاشی اور سماجی حالت کے بارے میں یہ فیصلہ دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"The little town in the lava mountains was no Arabian Babylon, and the rich merchants were certainly not completely divorced in their habits and the circumstances of their life from the remaining populace." (1)

"لاوہ کی پہاڑیوں کا یہ چھوٹا سا قصبہ عرب کا بابل نہ تھا اور نہ ہی امیر تاجر اپنی عادات اور زندگی کے دیگر حالات میں دوسری آبادی سے کلیۃً مختلف تھے۔"

"منٹگمری واٹ" وغیرہ نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلامی تحریک مکہ اور عرب کی معاشی ناہمواریوں کا ناگزیر نتیجہ تھی، مکہ کو طبقات میں تقسیم کیا ہے اور اسلامی مسئلے کو قبائلی مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے حالانکہ حضور ﷺ کی تحریک خاندانی تحریک نہ تھی۔ آپ کا اپنا چچا "ابولہب" آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ لوگ جو خون کے رشتے کی وجہ سے آپ کا تحفظ کر رہے تھے ان کی اکثریت نے بھی ابتدا میں اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف آپ کے پیروکاروں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ ان میں غلام بھی تھے، غریب اور کمزور بھی اور آپ کے پیروکاروں میں ان قبائل کے چشم و چراغ بھی تھے جن کے ہاتھوں میں، بقول مستشرقین، مکہ کی زمام اقتدار تھی، اور جو ان کی نظروں میں بڑے طاقتور اور بااثر تھے۔ "منٹگمری واٹ" نے خود اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو ان کی معاشی اور سماجی حیثیت سے تین طبقوں میں تقسیم کرتا ہے اور ان میں سے پہلے طبقے کے متعلق لکھتا ہے:

1۔ محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 75

"Firstly there were a number of young men from the most influential families of the most influential clans. These were closely related to the men who actually wielded power in Mecca and were foremost in opposing Muhammad. At the battle of Badr in 624between Muslims and the pagan Meccans there were instances of brothers, or father and son, or uncle and nephew, being on opposite sides. The most notable representative of this class was Khalid ibn said of the clan of Umayyah (or Abd-Shams); his father said also known as Abu-Uhayhah, was in his later years one of the two or three strongest and richest men in Mecca." (1)

"اولاً کچھ ایسے نوجوان تھے جن کا تعلق بہت ہی بااثر قبیلوں کے بہت ہی بااثر خاندانوں سے تھا۔ یہ ان لوگوں کے قریبی رشتہ دار تھے جن کے ہاتھوں میں مکہ کا اقتدار تھا اور جو محمد (ﷺ) کے سخت مخالف تھے۔ جنگ بدر میں ایسے واقعات پیش آئے جب بھائی بھائی کے، باپ بیٹے کے، چچا بھتیجے کے اور ماموں بھانجے کے مخالف تھا۔ اس طبقے کا سب سے زیادہ اہم نمائندہ خالد بن سعید تھا جس کا تعلق بنو امیہ (یا عبد شمس) سے تھا۔ اس کا باپ اپنی آخری عمر میں مکہ کے دو یا تین طاقت ور ترین اور امیر ترین آدمیوں میں سے تھا۔"

یہی مستشرق ایک اور مقام پر حضرت ارقم کے متعلق لکھتا ہے:

"He belonged to the clan of Makhzum, the clan of some of the wealthiest and most powerful men in Mecca. He must have been wealthy himself, since he owned a large house near the centre of Mecca". (2)

"اس کا تعلق قبیلہ بنو مخزوم سے تھا جو مکہ کے انتہائی دولت مند اور انتہائی طاقت ور لوگوں کا قبیلہ تھا۔ وہ خود بھی امیر ہو گا کیونکہ مرکز مکہ میں اس کا ایک بہت بڑا مکان تھا۔"

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 36

2۔ ایضاً، صفحہ 56

یہ گتھی صرف مستشرقین ہی سلجھا سکتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ ایک کمزور قبیلے کا ایک کمزور فرد ہونے کی وجہ سے غریبوں اور کمزوروں کو ساتھ لے کر امیروں اور طاقت وروں کے خلاف اٹھے تھے تو پھر خالد بن سعید اور ارقم جیسے لوگوں کا طبقہ آپ کے ساتھ کیسے شامل ہو گیا تھا اور وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے جنگ بدر میں بھائی کو بھائی، باپ کو بیٹے، چچا کو بھتیجے اور ماموں کو بھانجے کے مدمقابل لا کھڑا کیا تھا۔

مستشرقین جس زاویے سے اسلام کے آغاز اور ارتقاء کی تاریخ کو دیکھتے ہیں اس زاویے سے دیکھنے والے کو کسی باحیثیت آدمی کا مسلمانوں کی صفوں میں موجود ہونا کھٹکتا ہے کیونکہ اس طرح ان کے قصر استدلال کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے ایک معزز، متمول اور قابل احترام تاجر تھے۔ ان کے پائے کے جو لوگ کافروں کی صفوں میں تھے، وہ مستشرقین کو انتہائی طاقت ور اور انتہائی مالدار نظر آتے ہیں لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دولت منٹگمری واٹ کو معمولی نظر آتی ہے۔ وہ ان کے متعلق لکھتا ہے:

"Like most of the leading Meccans he made a living by commerce, but the fact that his frotune, even before he began to spend it in ransoming Muslim slaves, was only 40,000 dirhams shows that his business was on a small scale." (1)

"مکہ کے اکثر سر برآوردہ لوگوں کی طرح ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا، لیکن یہ حقیقت، کہ مسلمان غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے پر اپنی دولت خرچ کرنے کا آغاز کرنے سے پہلے ان کی کل دولت چالیس ہزار درھم تھی، اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان کا کاروبار چھوٹی سطح پر تھا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چالیس ہزار درہم کی رقم اس مستشرق کو تھوڑی نظر آتی ہے لیکن اسے ابوسفیان کے تجارتی قافلے کا سرمایہ بہت زیادہ نظر آتا ہے، جس میں مکہ کے تمام لوگ حصہ دار تھے اور جس کی کل مالیت پچاس ہزار دینار تھی۔

مستشرق موصوف اس قافلے کے متعلق لکھتا ہے:

1۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 35

"The merchandise was later said to be worth 50,000 dinars. All the leading Meccan merchants and financiers had an interest in it; indeed, nearly everyone in Mecca was concerned for its safe return, perhaps several smaller caravans- some of them having been the object of Muslim attentions on their way north had joined together for greater safety". (1)

"بعد میں اس قافلے کے مال تجارت کی مالیت پچاس ہزار دینار بتائی گئی۔ مکہ کے تمام سر برآوردہ تاجروں اور سرمایہ کاروں کا اس میں مفاد تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے چھوٹے کاروان جو شمال کی جانب سفر کرتے ہوئے مسلمانوں کی توجہات کا مرکز تھے، وہ بہتر حفاظتی اقدامات کے لئے اکٹھے ہو گئے تھے۔"

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دولت 40 ہزار درہم بتائی گئی ہے اور اس تجارتی قافلے کی کل مالیت پچاس ہزار دینار بتائی جارہی ہے جس میں تمام اہل مکہ حصہ دار ہیں۔ منٹگمری واٹ کے اپنے الفاظ میں ایک دینار دس درہم کے برابر تھا۔ گویا تجارتی قافلے کے مال تجارت کی کل مالیت پانچ لاکھ درہم تھی۔ مکہ کے امیر ترین تاجروں اور شہر کے ہر طبقے کے لوگوں نے مل کر جو سرمایہ کاری مجموعی طور پر کی تھی وہ اکیلے ابو بکر کے سرمائے سے صرف بارہ گنا زیادہ تھی۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھنے کے باوجود مستشرقین کے نزدیک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کاروبار معمولی اور نچلی سطح کا تھا اور ان کے مقابلے میں وہ تاجر بہت ہی امیر اور بااثر تھے جنہوں نے سارے اہل شہر کے ساتھ مل کر صرف پچاس ہزار دینار کی سرمایہ کاری کی تھی۔

منٹگمری واٹ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے چالیس ہزار درہم کا مقابلہ بیسویں صدی عیسوی کے ارب پتیوں سے کرتا ہے اور اس طرح ان کی دولت کو معمولی قرار دیتا ہے اور قریش کے پچاس ہزار دینار کا مقابلہ ساتویں صدی عیسوی کے عام عربوں سے کرتا ہے اور اس طرح اسے بہت بڑی دولت قرار دیتا ہے۔

مستشرقین کو اپنے مفروضے ثابت کرنے کے لئے اسی قسم کے اعداد و شمار اور موازنوں

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 10

کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ حق یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کے کامیاب ترین اور مقبول ترین تاجروں میں سے ایک تھے اور مکی سوسائٹی میں ان کو ایک بلند مقام حاصل تھا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اہمیت کو کم کرنے کیلئے منٹگمری واٹ نے ایک اور شوشہ یہ بھی چھوڑا ہے کہ ان کا تعلق ایک کمزور قبیلے سے تھا اور وہ مسلمان جو طاقت ور قبائل سے تعلق رکھتے تھے وہ اپنی جماعت میں ان کی کلیدی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مستشرق مذکور نے اپنے اس مفروضے کو تقویت دینے کے لئے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہما کے درمیان مخاصمت کا افسانہ بھی تراشا ہے۔ لیکن مستشرق موصوف کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ابو بکر صدیق جن کو وہ بے اثر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے یہ وہی ہیں جن کی دعوت پر ان لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا جن کے نام تاریخ اسلام میں ہمیشہ جلی حروف سے لکھے جاتے رہے ہیں۔

مستشرقین نے اسلامی تحریک کو ایک طبقاتی تحریک ثابت کرنے کے لئے خاندان بنو ہاشم کا مقام گھٹانے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دولت مندوں کے مظالم سے تنگ آیا ہوا طبقہ سرمایہ داروں کے خلاف محمد ﷺ کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اس مفروضہ کو کیسے ثابت کر سکتے ہیں جبکہ یہ دعوت وہ تھی جس پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے خدیجۃ الکبریٰ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما تھے جن کا معاشی مقام مکہ کے کسی سردار سے کم نہ تھا۔ اس دعوت کو قبول کرنے والوں میں غلام بھی تھے، کمزور بھی تھے اور وہ بھی تھے جنہوں نے ان گھرانوں میں جنم لیا تھا جنہیں مستشرقین بہت ہی دولت مند اور بہت ہی طاقت ور قرار دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ کی ولادت سے پہلے ہی آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ والد نے آپ کے لئے ورثے میں کوئی بڑی جائداد نہیں چھوڑی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت ابو طالب کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود حضرت ابو طالب مکہ کے معزز ترین انسان تھے اور قریش نے ان کے اثر کی وجہ سے ہی حضور ﷺ کے خلاف راست اقدام کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔

مستشرقین کی خاندان بنو ہاشم کے مقام کو گھٹانے کی کوششیں اسی نوعیت کی ہیں جس

نوعیت کی کوششیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چھوٹے پیمانے کا تاجر ثابت کرنے کی ہیں۔ یہ تمام تردد کرنے کی ضرورت انہیں اس لئے پیش آئی ہے کہ وہ تحریک اسلامی کے آغاز و ارتقاء کو جس انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں، اسے اسی انداز میں دیکھ سکیں۔ تاریخ، دعوت اسلامی کے متعلق ان کے اس نظریے کی بھی تکذیب کرتی ہے اور اس نظریے کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے بنو ہاشم کے سماجی مقام کو گھٹانے، ان کی سیاسی حیثیت کو کم کرنے اور تمام مسلمانوں کو بے اثر اور بے بس ظاہر کرنے کی جو کوششیں کی ہیں، اس کو بھی جھٹلاتی ہے۔ حق وہی ہے جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِھِمْ فِرْقَۃً ثُمَّ جَعَلَھُمْ فِرْقَتَیْنِ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِھِمْ فِرْقَۃً ثُمَّ جَعَلَھُمْ قَبَائِلَ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِ ھِمْ قَبِیْلَۃً ثُمَّ جَعَلَھُمْ بُیُوْتًا فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِھِمْ بَیْتًا وَخَیْرِھِمْ نَفْسًا (1)

"میں محمد بن عبداللہ بن عبد المطلب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مجھے مخلوق کے بہترین طبقے میں رکھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے دو گروہ بنائے اور مجھے بہترین گروہ میں رکھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو قبائل میں تقسیم کیا اور مجھے بہترین قبیلے میں رکھا، پھر ان کو خاندانوں میں تقسیم کیا تو مجھے بہترین خاندان میں رکھا۔ میں اپنے خاندان اور اپنی ذات دونوں لحاظ سے مخلوقات میں افضل ہوں۔"

1۔ سنن الترمذی، جلد 5، صفحہ 545۔ کتاب المناقب

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سماجی مقام کو کم کرنے کی کوششیں

حضور ﷺ کے سماجی مقام کو کم کرنے کی کوششیں

مستشرقین حضور ﷺ کی شخصیت کی جو تصویر اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، اس تصویر میں کوئی ایسی چیز موزوں نہیں ہوتی، جس سے حضور ﷺ کے کسی کمال کی عکاسی ہوتی ہو۔ مستشرقین کا چونکہ مقصد ہی ذات پاک نبوت کے متعلق مسلمانوں کے ایمان کو کمزور کرنا اور غیر مسلموں کو اسلام کی طرف متوجہ ہونے سے روکنا ہے، اس لئے وہ حضور ﷺ کے متعلق کچھ لکھتے وقت اپنے قارئین کے ذہنی رجحانات اور دور حاضر کی مادی اقدار کو بھی مد نظر رکھتے ہیں۔

اسلام نے نسلی تفاخر کی جڑیں اکھیڑ دی تھیں اور انسانی عظمت کا معیار تقویٰ کو قرار دیا تھا۔ ابولہب قریش کے معزز ترین خاندان کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود مردود ٹھہرا تھا اور بلال کے سر پر، ایک حبشی غلام ہونے کے باوجود، عظمت و عزت کا تاج سجا تھا۔ لیکن مستشرقین کو معلوم ہے کہ آج مسلم معاشروں میں معیار عزت و عظمت یا تو نسل ہے اور یا پھر دولت و قوت۔ اہل مغرب کے ہاں دولت ہی سب کچھ ہے۔ اس ذہنی ماحول میں مستشرقین انہی خیالات کی تخم ریزی کرنا چاہتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

مستشرقین سوچتے ہیں کہ اگر وہ حضور ﷺ کی خاندانی عظمت کو گھٹا کر پیش کریں گے تو ان لوگوں کی نظروں میں آپ کا مقام گھٹے گا جن کے نزدیک صرف اور صرف نسل ہی معیار عظمت ہے۔ اور اگر وہ آپ کو مادی طور پر کمزور، بے آسرا اور احساس محرومی کا شکار ثابت کریں گے تو قارونی سوچ رکھنے والے ان لوگوں کی نظروں میں آپ کا مقام گھٹے گا جو انسان کی قیمت اس کا بنک بیلنس دیکھ کر لگاتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ نسلی لحاظ سے دنیا کا کوئی انسان حضور ﷺ کا مد مقابل نہ تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے نسل کو کبھی انسانوں کے لئے وجہ عظمت قرار نہیں دیا۔

حضور ﷺ نے ایک یتیم کی حیثیت سے جنم لیا تھا، عیالدار چچا کے گھر میں غربت کی زندگی کا تجربہ بھی کیا تھا لیکن حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد غریبی آپ کی مجبوری نہ رہی تھی بلکہ آپ نے اپنی مرضی سے فقر کی زندگی کو اپنے لئے منتخب فرمایا تھا۔ آپ کی حیات طیبہ کا وہ دور جب مسجد نبوی میں آپ کے دست اقدس سے، دولت کے انبار تقسیم ہوتے تھے، اس وقت بھی آپ نے اپنے کاشانہ اقدس کے لئے فقر اور قناعت کی دولت کو ہی منتخب فرمایا تھا۔ نہ نسل آپ کی کمزوری تھی اور نہ غربت آپ کی مجبوری تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے نسل اور دولت کی بنیاد پر قائم ہونے والے امتیازات کے خلاف نعرہ بلند کیا۔ آپ نے اعلان کیا کہ انسانی معاشرے میں نہ نسل وجہ امتیاز قرار پا سکتی ہے اور نہ دولت بلکہ انسانی معاشرے میں زیادہ باعزت وہی ہے جس میں انسانی خوبیاں دوسرے انسانوں کی نسبت زیادہ ہوں۔ ابو جہل اور ابو لہب جیسے لوگ جن وجوہات کی بنا پر حضور ﷺ کے مخالف ہوئے تھے، ان میں ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یہ بات گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ایک قریشی کو ایک حبشی کے برابر قرار دیا جائے یا ایک متمول سردار کو ایک غلام کے برابر بٹھا دیا جائے۔

تارا اندرائے نے حضور ﷺ کے سماجی مقام کے متعلق حقیقت شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

'Only this is certain that he belonged to a respected but not wealthy family, that he lost his father early in life and grew up in poor home, but that he later gained economic independence through his marriage'. (1)

"(حضور ﷺ کی زندگی کے متعلق) صرف اتنی بات یقینی ہے کہ آپ ایک معزز مگر غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آغاز حیات ہی میں شفقت پدری سے محروم تھے اور آپ کی پرورش ایک غریب گھر میں ہوئی تھی لیکن بعد میں رشتہ ازدواج کے ذریعے آپ نے معاشی خوش حالی حاصل کر لی تھی۔"

1۔ محمد، دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ

مستشرقین نے ان سادہ حقائق کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے کہ حقیقت آنکھوں سے بالکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ خاندان بنو ہاشم کو ایک معمولی خاندان ثابت کرنے کے لئے انہوں نے جو کوششیں کی ہیں، ان کا ذکر گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔ بالکل اسی قسم کی کوششیں مستشرقین نے حضور ﷺ کو ایک بے بس اور معاشرے کا ٹھکرایا ہوا انسان ثابت کرنے کے لئے بھی کی ہیں۔ ان کوششوں سے ان کا مقصد ایک تو وہ ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور ان کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کو ایک ایسا شخص قرار دے سکیں جو احساس محرومی کا شکار ہو اور اسلام کو آپ کے احساس محرومی سے جنم لینے والی ایک تحریک قرار دے سکیں۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے صرف ابتدائی سالوں کے متعلق ہی اس قسم کا پروپیگنڈہ نہیں کیا بلکہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں بھی آپ کو عام قبائلی سرداروں میں سے صرف ایک سردار قرار دینے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی تاثر دیا ہے کہ مدنی قبائل کے کچھ دوسرے سردار آپ سے زیادہ بااثر تھے اور آپ مدینہ طیبہ میں بھی اپنی مرضی سے فیصلے نہیں کر سکتے تھے۔ ہم یہاں پہلے مستشرقین کے اس قسم کے پروپیگنڈے کے چند نمونے نذر قارئین کرتے ہیں اور پھر اس پروپیگنڈے کی حقیقت سے پردہ اٹھائیں گے۔

مستشرقین حضور ﷺ کے بچپن کے حالات کو قرآن حکیم میں تلاش کرتے ہیں۔ جو تفصیلات انہیں قرآن حکیم میں نہیں ملتیں ان کے متعلق اپنے تخیل کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں اور جو جی میں آتا ہے لکھ دیتے ہیں۔ وہ قرآن حکیم کی بعض آیات کی من مانی تفسیر بھی کرتے ہیں اور قرآن حکیم کی مدد سے حضور ﷺ کی زندگی کے حالات کا جائزہ لینے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

منٹگمری واٹ حضور ﷺ کو رضاعی ماں کے سپرد کرنے کا سبب آپ کی یتیمی کو قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "The fact that Muhammad was a posthumous child may, of course, have been part of the reason for sending him to a wet-nurse." (1)

1۔ منٹگمری واٹ، "محمد ایٹ مکہ"، (ایڈنبرا یونیورسٹی پریس برطانیہ۔ 1988)، صفحہ 47

"یہ حقیقت کہ محمد (ﷺ) یتیم پیدا ہوئے تھے، آپ کو مرضعہ کے سپرد کرنے کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب ہو سکتا ہے۔

مستشرقین کی یہ منطق بڑی عجیب ہے کہ وہ کسی بچے کو مرضعہ کے سپرد کرنے کو اس بچے کی غربت، بے بسی اور بے کسی کی دلیل قرار دے رہے ہیں، حالانکہ بچوں کو رضاعی ماؤں کے حوالے وہی لوگ کرتے ہیں جو رضاعت کے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور مرضعات بھی انہی بچوں کو رضاعت کے لئے قبول کرتی ہیں جن کے سرپرستوں سے انہیں بہتر اجرت ملنے کی امید ہوتی ہے۔

منٹگمری واٹ نے اپنے ذہن کی زرخیزی سے اس بات کو جو حضور ﷺ کے معزز خاندان کا چشم و چراغ ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے، آپ کی سماجی کمزوری بنا کر پیش کیا ہے۔ مسٹر واٹ یہ بھی تاثر دینا چاہتا ہے کہ بچوں کو مرضعات کے حوالے کرنے کے عمل پر معاشرے کے بعض حلقوں کی طرف سے تنقید بھی کی جاتی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

'A part of the verse mentioned (2-233) asserts that, if you want to give your children out to nurse, (La junah, alay-kum); and this suggests that the practice may have been criticized in some quarters and that Muhammad may have been sensitive about it'. (1)

"مذکورہ آیت کا ایک حصہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر تم اپنے بچوں کو مرضعہ کے حوالے کرنا چاہتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں، لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ بعض حلقوں کی طرف سے رضاعت کے اس عمل پر تنقید کی جاتی تھی اور محمد (ﷺ) کو اس بات کا احساس تھا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اپنے بچوں کو رضاعت کے لئے دیہاتی علاقوں کی عورتوں کے سپرد کرنا مکہ کے معزز گھرانوں کا معمول تھا اور یہ عمل باعث عزت سمجھا جاتا تھا۔ طلوع اسلام کے بعد مسلمانوں کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ آیا اسلام نے بھی زمانہ جاہلیت کی اس معروف رسم کو جائز قرار دیا ہے یا نہیں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ کے الفاظ کے ذریعے اس بات کی وضاحت فرما دی کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

1۔ منٹگمری واٹ، "محمد ایٹ مکہ"، (ایڈنبرا یونیورسٹی پریس برطانیہ۔ 1988)، صفحہ 47

منٹگمری واٹ کے زرخیز ذہن نے ان الفاظ کو عرب معاشرہ کی سماجی تاریخ کی اصلاح کے لئے استعمال کیا اور عربوں کو یہ بتایا کہ بچوں کو رضاعت کے لئے مرضعات کے سپرد کرنا عربوں کے نزدیک پسندیدہ اور مقبول فعل نہ تھا بلکہ یہ ایک مجبوری تھی اور جو لوگ ایسا کرتے تھے ان کو اچھی نگاہوں سے نہ دیکھا جاتا تھا۔

ایک عام عقل و فہم کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایک بچہ جو غریب ہو اور اس کی ماں زندہ ہو اسے غربت کسی مرضعہ کے حوالے کرنے پر مجبور نہیں کرتی کیونکہ اس بچے کی والدہ خود یہ کام بغیر کسی تکلیف کے کر سکتی ہے۔ حضور ﷺ کو مرضعہ کے حوالے اس لئے کیا گیا تھا کہ گو آپ کے والد آپ کے جنم لینے سے پہلے انتقال کر چکے تھے اور انہوں نے کوئی بہت بڑا ورثہ بھی نہیں چھوڑا تھا، لیکن آپ سردار مکہ عبدالمطلب کے پوتے تھے جو آپ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ عظیم دادا کی خواہش یہی تھی کہ ان کے عظیم اور لاڈلے پوتے کی پرورش اسی انداز میں ہو جس انداز میں مکہ کے متمول اور سربرآوردہ لوگ اپنے بچوں کی کرتے ہیں۔

منٹگمری واٹ نے حضور ﷺ کے بچپن کی مشہور تاریخ کو جھٹلانے اور ددھیال میں آپ کے مقام کو گھٹانے کے لئے یہ غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی بھی کی ہے کہ آپ کا بچپن، والدہ کی وفات تک، اپنے ننھیال میں گزرا تھا۔ وہ کہتا ہے:

> "There was doubtless a strong bond of attachment between him and his mother, with whose family he is said to have lived until her death when he was six." (1)

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی والدہ اور آپ کے درمیان محبت کا مضبوط رشتہ موجود تھا، جن کے خاندان میں آپ ان کی وفات تک رہے تھے، جب آپ کی عمر چھ سال تھی۔"

مستشرق مذکور کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ چار سال کی عمر تک اپنی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہے تھے۔ (2) آپ کی عمر کے چھٹے سال آپ کی والدہ آپ کو آپ کے ننھیالی رشتہ داروں سے ملانے یثرب لے گئی تھیں اور اسی سال

1۔ منٹگمری واٹ، "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 47

2۔ تاریخ الحوادث والاحوال النبویہ، (دار الشروق جدہ۔ 1987)، صفحہ 9

یثرب سے واپسی پر آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ لیکن یہ تفصیلات چونکہ قرآن حکیم میں بیان نہیں ہوئیں اس لئے مستشرق مذکور کو اپنے تخیل کے زور پر تاریخ سازی کا موقعہ ہاتھ آگیا کیونکہ سیرت اور تاریخ اسلام کی کتابیں ان کے نزدیک قابل اعتبار نہیں اور مستشرقین مسلمانوں کے ہاں مروج تاریخی واقعات کو تسلیم کرنے کے بجائے اپنے تخیل کے زور پر تاریخ نویسی کو ہی غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی قرار دیتے ہیں۔

یہ مفروضہ ثابت کرنے کے لئے، کہ حضور ﷺ احساس محرومی کا شکار تھے، منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

> "Psychology teaches us the importance of painful experiences in the first two or three years of life. The absence of a father must have produced a sense of deprivation in Muhammad, and the real experience of poverty as a young man may well have nourished the sense of deprivation". (1)

> "علم نفسیات ہمیں زندگی کے ابتدائی دو یا تین سالوں کے دردناک تجربات کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے۔ باپ کے نہ ہونے سے محمد (ﷺ) کے دل میں احساس محرومی نے جنم لیا ہو گا اور بچپن اور لڑکپن کی غربت کے تجربات نے اس احساس کو تقویت دی ہو گی۔"

مستشرق مذکور کے یہ تمام مفروضے باطل اور بے بنیاد ہیں۔ جس بچے کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ ہو وہ تو احساس محرومی کا شکار ہوتا ہو گا لیکن جس بچے کو اس کا عظیم دادا جان سے عزیز سمجھتا ہو، جس کے کئی چچے، اس کو اپنے مرحوم بھائی کی نشانی سمجھتے ہوں اور اس پر جان چھڑکتے ہوں، جس کو حلیمہ اور اس کے شوہر نے اپنے حقیقی بچوں سے زیادہ شفقت دی ہو، اس بچے کے دل میں احساس محرومی پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی حضور ﷺ کو اپنی زندگی میں غربت کے کسی ایسے تجربے سے گزرنا پڑا تھا جس سے احساس محرومی پروان چڑھتا۔ آپ نے اس گھر میں لڑکپن کا زمانہ گزارا تھا جہاں زیادہ خوش حالی تو نہ تھی لیکن اس گھر میں وقار تھا، تمکنت تھی اور قناعت تھی۔ ایسے گھروں میں عرب

1۔ محمد ایٹ مکہ، صفحہ 1-50

نوجوانوں کے اندر محرومیت کے احساسات نہیں بلکہ خودداری، حریت، شجاعت اور مردانگی کے اوصاف جنم لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب کے ان بادیہ نشینوں کو اپنی رعایا میں شامل کرنے کی جرات نہ قیصر میں تھی اور نہ کسریٰ میں۔ ان کے نزدیک قیمت دولت کی نہیں بلکہ حریت کی تھی اور محمد ﷺ نے جس گھر میں لڑکپن کے دن گزارے تھے، وہاں عربوں کے یہ اوصاف اپنے پورے عروج پر تھے۔

کفار مکہ کا حضور ﷺ پر ایک اعتراض یہ تھا کہ آپ خدا کی طرف سے اپنے اوپر وحی نازل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اگر وحی کو نازل ہونا ہی تھا تو کسی دولت منداور امیر آدمی پر نازل ہوتی، یتیم عبداللہ پر وحی نازل ہونے کا کیا مطلب ہے؟ قرآن حکیم نے مشرکین مکہ کے اس اعتراض کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (1)

"اور کہنے لگے: کیوں نہ اتارا گیا یہ قرآن کسی ایسے آدمی پر جو دو شہروں میں بڑا ہے۔"

اس آیت میں اس قارونی ذہنیت کو بیان کیا گیا ہے جو دولت کو ہی سب کچھ سمجھتی ہے۔ "منٹگمری واٹ" نے حضور ﷺ پر یہ اعتراض کرنے والے کفار مکہ کو ان اسرائیلیوں سے تشبیہ دی ہے جنہوں نے طالوت کے بادشاہ مقرر کئے جانے پر اعتراض کیا تھا۔ (2) ان اسرائیلیوں کا اعتراض بھی یہ تھا کہ طالوت اس لئے بادشاہ نہیں بن سکتا کیونکہ اس کے پاس دولت کے انبار نہیں۔ اسی طرح مشرکین مکہ نے بھی حضور ﷺ کی نبوت ورسالت کو اسی لئے مسترد کر دیا تھا کہ آپ زیادہ مالدار نہیں تھے۔

اس آیت کریمہ میں ایک مریض ذہن کی سوچ کو بیان کیا گیا ہے لیکن مارگولیس نے اس آیت میں مذکور "عظیم" کے لفظ کو شریف کا ہم معنی قرار دیا ہے اور اس طرح حضور ﷺ کی خاندانی شرافت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔ (3)

1۔ سورۃ الزخرف: 31

2۔ محمد ایٹ مکہ، صفحہ 42

3۔ رسول مبین، صفحہ 101، بحوالہ محمد، از "مارگولیس"

کاش مارگولیس نے قریش مکہ کے اس اعتراض کے اس پر جلال جواب پر بھی نظر کی ہوتی جو انہیں پروردگار عالم نے خود دیا تھا۔ یقیناً "مارگولیس" میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ اس پر جلال جواب کا ذکر کر سکے۔ مشرکین کے اس اعتراض پر اللہ تعالیٰ نے خود اپنے حبیب ﷺ کی طرف سے یہ جواب دیا تھا:

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِــــُٔوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (1)

"کیا وہ بانٹتے ہیں آپ کے رب کی رحمت کو؟ ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو اس دنیوی زندگی میں اور ہم نے ہی بلند کیا ہے بعض کو بعض پر مراتب میں تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور آپ کے رب کی رحمت (خاص) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک امت بن جائیں گے تو ہم بنا دیتے ان کے لئے جو انکار کرتے ہیں رحمٰن کا، ان کے مکانوں کے لئے چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں (وہ بھی چاندی کی) اور ان کے گھروں کے دروازے بھی چاندی کے اور وہ تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں وہ بھی چاندی اور سونے کے۔ اور یہ سب (سنہری روپہلی) چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہے اور آخرت (کی عزت و کامیابی) آپ کے رب کے نزدیک پرہیزگاروں کے لئے ہے۔"

1۔ سورۃ زخرف 35-32

انسانی عظمت کا معیار وہ نہیں جو قارون اور اس کی ذریت کے ذہنوں نے تراشا ہے بلکہ انسانی عظمت کا معیار وہ ہے جو خداوند کریم نے مقرر کیا ہے اور جس پر خدا کے تمام عظیم بندوں کو پرکھا جا سکتا ہے۔ جس معیار عظمت کے مطابق حضرت خلیل علیہ السلام کا مقام نمرود سے بلند ہے، جو معیار عظمت فرعون پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فوقیت ثابت کرتا ہے اور جس معیار عظمت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام رومی حکمرانوں سے بہتر قرار پاتے ہیں، اس معیار عظمت کے مطابق حضور ﷺ مکہ کے سرداروں پر تو کیا قیصر و کسریٰ بلکہ تاریخ انسانی کے تمام عظیم کرداروں سے افضل قرار پاتے ہیں۔ اسی معیار عظمت کے مطابق مائیکل ایچ۔ ہارٹ (Michael H.Hart) نے تاریخ انسانی کے سو عظیم ترین انسانوں کا انتخاب کیا اور مدینہ کے بے تاج بادشاہ حضرت محمد ﷺ کو ان میں سرفہرست رکھا۔ (1)

مشرکین مکہ کی نظر میں حضور ﷺ معاشی طور پر کمزور ہونے کے باوجود ایک شریف اور معزز شہری تھے۔ وہ آپ کو صادق اور امین کہہ کر پکارتے تھے۔ حجر اسود کو اپنے مقام پر رکھنے کا شرف حاصل کرنے کے لئے ان کے درمیان جو تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اس تنازعہ کے تصفیے کے لئے انہوں نے جس اطمینان کے ساتھ حضور ﷺ کو حکم تسلیم کیا تھا، شاید کسی دوسرے کو وہ اس اطمینان کے ساتھ حکم تسلیم نہ کر سکتے۔ ابولہب آپ کو اپنے پائے کا انسان سمجھتا تھا اسی لئے اس نے اپنے دو بیٹوں کے نکاح آپ کی دو صاحبزادیوں سے کئے تھے۔ ابوسفیان اہل مکہ کا سردار تھا، حضور ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا لیکن اس کے باوجود اس کو اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ اس کی بیٹی حضور ﷺ کے نکاح میں آگئی ہے۔ جب حضور ﷺ کے لئے حضرت خدیجہ کے چچا سے ان کا رشتہ مانگا گیا تھا تو ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا تھا:

ذَالِكَ الْفَحْلُ لَا يُجْدَعُ اَنْفُهٗ (2)

"یہ ایسا نوجوان ہے کہ اس کی پیشکش کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔"

حالانکہ اس سے پہلے حضرت خدیجہ نے مکہ کے کئی بڑے بڑے سرداروں کی طرف

1۔ مائیکل ایچ۔ ہارٹ، "دی ہنڈرڈ"، اے رینکنگ آف دی موسٹ انفلوئنشل پرسنز ان ہسٹری"، (اے اینڈ ڈبلیو وڑویل لائبریری نیویارک۔ 1978ء)، صفحہ 4

2۔ دکتور عبدالجلیل شلبی، "مفتریات المبشر بن علی الاسلام" (دار النصر للطباعۃ الاسلامیہ قاہرہ۔ س ن)، صفحہ 203

سے دعوت نکاح مسترد کر دی تھی۔

حضور ﷺ کی شرافت کے اتنے ناقابل تردید دلائل موجود ہونے کے باوجود، جو لوگ آپ کے سماجی مقام کو کم دکھانے کی کوشش کرتے ہیں ان کے دل مریض ہیں اور ان کے دلوں کا مرض، بغض رسول کی شکل میں ان کی زبان اور نوک قلم سے ٹپک پڑتا ہے، لیکن جسے عظمتیں عطا کرنے والا خداوند قدوس خود ہے، اس کے مقام کو کون کم کر سکتا ہے؟

مستشرقین نے صرف حضور ﷺ کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں ہی آپ کو معاشی اور سماجی طور پر کمزور ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہجرت کے بعد جب اوس اور خزرج کے قبائل کی اکثریت حلقہ اسلام میں داخل ہو چکی تھی، جب وادی مکہ نے اپنے کئی قابل فخر جگر گوشے آپ کی گود میں ڈال دیئے تھے، جب آپ کے غلام آپ کے اشارۂ ابرو پر اپنی جانیں قربان کرنے کو سعادت سمجھتے تھے، مستشرقین نے اس دور میں بھی آپ کی حیثیت کو کم ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مدینہ طیبہ کے ابتدائی سالوں میں آپ صرف مہاجرین کے سردار تھے۔ دیگر قبائل کے اپنے اپنے سردار تھے جن میں سے بعض حضور ﷺ سے زیادہ باا ثر تھے اور حضور ﷺ اپنی مرضی سے فیصلے نہیں کر سکتے تھے بلکہ فیصلہ کرنے کے لئے آپ کو دوسرے سرداروں سے منظوری لینی پڑتی تھی۔ منٹگمری واٹ کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

"His powers under the constitution are so slight that they cannot have been much less at the beginning of his residence in Medina". (1)

"میثاق مدینہ کے تحت آپ کے اختیارات اتنے معمولی تھی کہ آپ کی مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں اس سے کم اختیارات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"Appearance of the Muhajirun or Emigrants on the same level as one of the Medinan clans implies that Muhammad as chief of the Emigrants was on a level with the chiefs of the various clans". (2)

"(میثاق مدینہ میں) مہاجرین کو مدینہ کے قبائل کے برابر کا ایک قبیلہ ظاہر کیا

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 228

2۔ ایضاً

گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد (ﷺ) مدنی قبائل کے سرداروں کے برابر کے ایک سردار تھے۔"

"He is very far, however, from being autocratic ruler of Medina. He is merely one among a number of important men. During his first year in Medina several others were probably more influential than Muhammad. The provision that disputes were to be referred to him would not in itself increase his power, unless he had sufficient tact and diplomacy to find a settlement that would command general agreement." (1)

"البتہ آپ مدینہ کے خود مختار حکمران ہونے سے کوسوں دور تھے۔ آپ متعدد اہم آدمیوں میں سے ایک تھے۔ مدنی زندگی کے پہلے سال میں غالباً کئی دوسرے آدمی آپ سے زیادہ بااثر تھے۔ میثاق مدینہ کی یہ شق کہ، تنازعات کی شکل میں آپ کی طرف رجوع کیا جائے گا، بذات خود آپ کے زیادہ بااختیار ہونے کا ثبوت نہیں جب تک کہ آپ تنازعات کا فیصلہ اپنی بصیرت اور عقلمندی سے اس طرح نہ کرتے کہ وہ عام لوگوں میں مقبولیت حاصل کر لیتا۔"

حضور ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ تمام اہم معاملات کے فیصلے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشورے سے کرتے تھے۔ واقعہ افک کے ذمہ دار افراد کے خلاف کاروائی کے لئے بھی آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا تھا اور بنو قریظہ کی قسمت کا فیصلہ بھی آپ نے خود نہیں کیا تھا بلکہ ان کے حلیف قبیلہ کے سردار سے کرایا تھا۔ حکمت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ حضور ﷺ کوئی اہم فیصلہ کرتے وقت اپنے پیروکاروں کے جذبات کو مد نظر رکھتے۔ آپ ایک ڈکٹیٹر یا مستبد حکمران نہ تھے بلکہ آپ خدا کے نبی تھے جن کے سر پر رحمۃ للعالمین کا تاج سجا ہوا تھا۔ آپ کو یہی زیب دیتا تھا جو آپ نے کیا۔ لیکن منٹگمری واٹ کو آپ کے رویے میں جابر حکمرانوں والی سختی نظر نہیں آتی تو وہ اس کو آپ کی کمزوری قرار دیتا ہے اور کہتا ہے:

"These are clear examples of how the Medinan

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 9-228

clan-Chiefs retained much of their power and thereby limited Muhammad's authority. They are not isolated examples, however. The whole story of his physical attacks on Jews presupposes that old background of clan-relationships, and shows how these had always to be considered in choosing agents. Muhammad is seen to be the chief of one of several co-operating groups, with little to mark him out from the others'. (1)

"یہ اس حقیقت کی واضح مثالیں ہیں کہ کس طرح مدینہ کے قبائل کے سرداروں نے اپنے اکثر اختیارات اپنے پاس رکھے تھے اور اس طرح محمد (ﷺ) کے اختیارات کو محدود کر دیا تھا۔ اس حقیقت کی مثالیں صرف یہی نہیں ہیں بلکہ یہودیوں پر آپ کے جسمانی حملوں کی ساری کہانی قبائل کے باہمی تعلقات کے پس منظر کا پتہ دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ کس طرح نمائندے چننے سے پہلے ان تعلقات کو پیش نظر رکھنا پڑتا تھا۔ محمد (ﷺ)، بہت سارے اتحادی گروہوں میں سے ایک گروہ کے سردار نظر آتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو انہیں دوسرے سرداروں سے ممتاز کرے۔"

حضور ﷺ کے مقام کو گھٹانے کے لئے منٹگمری واٹ نے ایک اور شدید وار کیا ہے، وہ کہتا ہے:

'To begin with, however, the message was more important than the messenger. The essential thing was the relation of the community or the individual to God. This implied some one to convey the message to the person or persons involved, but the messenger had no function beyond that of conveying the message. Later, however, the function of the messenger was seen to be more than this.' (2)

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 229

2۔ محمد دی پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 33

"ابتدا میں پیغام، پیغمبر سے زیادہ اہم تھا۔ اصل چیز فرد یا جماعت کا خدا کے ساتھ تعلق تھا۔ اس کے لئے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو متعلقہ شخص یا اشخاص تک پیغام کو پہنچا دے۔ لیکن پیغام پہنچا دینے سے آگے پیغمبر کا کوئی کام نہ تھا۔ تاہم بعد میں پیغمبر کا کام اس سے زیادہ قرار دے دیا گیا۔"

مدینہ طیبہ میں حضور علیہ السلام کی حیثیت کے متعلق اس قسم کی بے سر و پا باتیں صرف وہی بدنصیب کر سکتا ہے جو بڑی ڈھٹائی سے تاریخ کے روشن حقائق سے نظر چرا سکے۔ جن لوگوں نے اپنے دینی بھائیوں کے لئے اپنی نصف جائدادوں سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا تھا، انہوں نے اپنے آقا و مولیٰ کی خاطر کون سی قربانی نہ دی ہو گی؟

حقیقت یہ ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ کے قبائل بھی قائم رہے تھے، ان قبائل کے سردار بھی اپنی اپنی مسندوں پر برقرار تھے اور حضور علیہ السلام قومی امور میں ان سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ یہ سب باتیں سچ ہیں۔ مستشرقین نے ان باتوں پر تو غور کیا ہے کیونکہ ان سے وہ، اپنے تخیل کے زور پر، حضور علیہ السلام کی کمزوری کا کوئی پہلو نکال سکتے ہیں لیکن انہوں نے اس حقیقت کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ جب حضور علیہ السلام مدنی قبائل کے سرداروں سے مشورہ طلب کرتے تھے تو وہ جواب کیا دیتے تھے۔

بیعت عقبہ میں حضور علیہ السلام نے انصار سے یہ معاہدہ نہیں کیا تھا کہ وہ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کا ساتھ دیں گے۔ اس لئے آپ نے جنگ بدر سے پہلے مسلمانوں کی رائے طلب کی۔ ابتدا میں کئی مہاجرین نے اپنی اپنی آرا پیش کیں لیکن حضور علیہ السلام نے پھر لوگوں کی رائے پوچھی۔ حضرت سعد بن معاذ سمجھ گئے کہ حضور علیہ السلام انصار کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس موقعہ پر حبیب خدا کے اس جاں نثار اور مدینہ کے ایک طاقتور قبیلہ کے سردار کی زبان سے جو تاریخی کلمات نکلے وہ مستشرقین کی اطلاع کے لئے حاضر ہیں۔ انہوں نے عرض کیا۔

فَوَالَّذِیْ اَکْرَمَكَ وَاَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتَابَ مَا سَلَكْتُهَا قَطُّ وَلَا لِیْ بِهَا عِلْمٌ وَلَئِنْ سِرْتَ حَتّٰی تَاْتِیَ بَرْكَ الْغِمَادِ مِنْ ذِیْ یَمَنٍ لَنَسِیْرَنَّ مَعَكَ وَلَا نَكُوْنُ كَالَّذِیْنَ قَالُوْا لِمُوْسٰی: "اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا

قَاعِدُوْنَ" وَلٰكِنْ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ اِنَّا مَعَكُمْ مُتَّبِعُوْنَ وَلَعَلَّ اَنْ تَكُوْنَ خَرَجْتَ لِاَمْرٍ وَ اَحْدَثَ اللهُ اِلَيْكَ غَيْرَهُ فَانْظُرِ الَّذِیْ اَحْدَثَ اللهُ اِلَيْكَ فَامْضِ فَصِلْ حِبَالَ مَنْ شِئْتَ وَاقْطَعْ حِبَالَ مَنْ شِئْتَ وَعَادِ مَنْ شِئْتَ وَسَالِمْ مَنْ شِئْتَ وَخُذْ مِنْ اَمْوَالِنَا مَا شِئْتَ وَاَعْطِنَا مَا شِئْتَ وَمَا اَخَذْتَ مِنَّا كَانَ اَحَبَّ اِلَيْنَا مِمَّا تَرَكْتَ وَمَا اُمِرْتَ بِهٖ مِنْ اَمْرٍ فَاَمْرُنَا تَابِعٌ لِاَمْرِكَ فَوَاللهِ لَئِنْ سِرْتَ حَتّٰى تَبْلُغَ الْبَرْكَ مِنْ غُمْدَانَ لَنَسِيْرَنَّ مَعَكَ (1)

"اس ذات کی قسم جس نے آپ کے سر پر کرامت کا تاج سجایا ہے اور آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے۔ گو میں نہ کبھی اس راستے پر گیا ہوں اور نہ مجھے اس کا علم ہے لیکن اگر آپ برک الغماد تک بھی چلیں گے تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے اور ہم ان لوگوں کی طرح نہیں ہوں گے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: "تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔" بلکہ خدا اور خدا کا رسول چلیں اور ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ ممکن ہے آپ کسی کام کے لئے نکلے ہوں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو کسی دوسرے کام کا حکم دے دیا ہو۔ آپ کو جس کام کا حکم ملا ہے، آپ اس پر عمل کریں۔ آپ جس تعلق کو چاہیں قائم رکھیں اور جسے چاہیں توڑ دیں، جس سے چاہیں دشمنی کریں اور جس سے چاہیں دوستی کریں۔ ہمارے اموال سے آپ جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں ہمیں دے دیں۔ آپ ہمارا جو مال قبول فرمائیں گے، وہ ہمیں اس مال سے زیادہ محبوب ہوگا جو آپ ہمارے لئے چھوڑ دیں گے۔ آپ کو جو حکم بھی ملا ہے ہماری بات آپ کے تابع ہوگی۔ خدا کی قسم اگر آپ برک غمدان تک چلیں گے تو بھی ہم آپ کے ساتھ ہوں گے۔

1۔ محمد الصادق ابراہیم عرجون، "محمد رسول اللہ ﷺ"، (دار القلم دمشق۔ 1985)، جلد 3، صفحہ 308

اس موقعہ پر حضرت مقداد اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق منٹگمری واٹ کہتا ہے کہ انہوں نے اپنے اختیارات اپنے پاس رکھے تھے اور حضور ﷺ کے اختیارات ایک عام قبائلی سردار سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ ہم مستشرقین کو چیلنج کرتے ہیں کہ، کسی مقابلے کے سردار کے لئے کسی دوسرے سردار کی زبان سے تو کیا، وہ تاریخ انسانی سے کوئی ایک مثال پیش کریں جب کسی عظیم راہنما کے لئے اس کے کسی پیروکار کی زبان سے ایسے فداکارانہ جذبات کا اظہار ہوا ہو جس قسم کے جذبات کا اظہار اوس اور خزرج کے سرداروں کی زبانوں سے اپنے محبوب آقا ﷺ کے لئے ہوا تھا۔

مقداد، سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم جیسے سرداران مدینہ تو حب رسول کا جام پی کر مست ہو چکے تھے، انہیں تو اپنا سب کچھ اپنے محبوب کے اشارۂ ابرو پر قربان کرنے میں فرحت محسوس ہوتی تھی، ان کے جذبات جاں نثاری کی تہ تک پہنچنا تو کسی مادہ پرست کے تخیل کی پہنچ سے بھی ماوراء ہے، مستشرقین ذرا ایک پکے کافر کے تاثرات سنیں جو شمع نبوت کو پروانوں کے جھرمٹ میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔

صلح حدیبیہ کے موقعہ پر مکہ بھر کا ایک جہاندیدہ انسان عروہ بن مسعود ثقفی، بات چیت کے لئے حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ اس نے محمدی خیمہ گاہ کے حالات کا جائزہ لیا تھا اور پھر کفار مکہ کے پاس واپس جا کر جو رپورٹ پیش کی تھی، اس کے الفاظ یہ تھے۔

اَیْ قَوْمِ وَاللّٰهِ لَقَدْ وَفَدْتُ عَلَی الْمُلُوْكِ وَ وَفَدْتُ عَلٰی قَیْصَرَ وَکِسْرٰی وَالنَّجَاشِیِّ وَاللّٰهِ اِنْ رَأَیْتُ مَلِکًا قَطُّ یُعَظِّمُهٗ اَصْحَابُهٗ مَا یُعَظِّمُ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ مُحَمَّدًا وَاللّٰهِ اِنْ تَنَخَّمَ نُخَامَةً اِلاَّ وَقَعَتْ فِیْ کَفِّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهٗ وَجِلْدَهٗ وَاِذَا اَمَرَهُمْ اِبْتَدَرُوْا اَمْرَهٗ وَاِذَا تَوَضَّأَ کَادُوْا یَقْتَتِلُوْنَ عَلٰی وَضُوْئِهٖ وَاِذَا تَکَلَّمَ خَفَضُوْا اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَهٗ وَمَا یُحِدُّوْنَ اِلَیْهِ النَّظَرَ تَعْظِیْمًا لَهٗ (1)

1۔ محمد الصادق ابراہیم عرجون، "محمد رسول اللہ ﷺ"، (دار القلم دمشق۔ 1985)، جلد 4، صفحہ 256

"اے میری قوم! خدا کی قسم میں بادشاہوں کے درباروں میں گیا ہوں۔ میں قیصر، کسریٰ اور نجاشی کے پاس بھی گیا ہوں۔ خدا کی قسم میں نے کبھی کوئی بادشاہ ایسا نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کا اس طرح احترام کرتے ہوں جس طرح محمد (ﷺ) کے صحابہ ان کا احترام کرتے ہیں۔ وہ جب تھوکتے ہیں تو ان کا تھوک ان کے صحابہ میں سے کسی کی ہتھیلی پر گرتا ہے اور وہ اسے اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا ہے۔ جب وہ حکم دیتے ہیں تو وہ تعمیل ارشاد کی طرف لپکتے ہیں جب وہ وضو کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے صحابہ ان کے وضو کے پانی کو حاصل کرنے کے لئے آپس میں لڑ پڑیں گے۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو وہ اپنی آوازوں کو دھیما کر لیتے ہیں اور ان کے احترام کی وجہ سے ان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھتے۔

عروہ بن مسعود ثقفی بھی دولت ایمان سے محروم تھا لیکن اسے حضور ﷺ کا اپنے صحابہ کرام کے درمیان وہ مقام نظر آیا، جس کا خواب نہ کبھی قیصر نے دیکھا تھا اور نہ کسریٰ نے۔ منٹگمری واٹ بھی عروہ بن مسعود ثقفی کی طرح ایک غیر مسلم ہے لیکن اسے صحابہ کرام کے درمیان حضور ﷺ کا مقام ایک عام قبائلی سردار سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی مسلمان وہ باتیں کہتا جو عروہ بن مسعود ثقفی نے کہی تھیں تو مستشرقین اور ان کے ہمنوا آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ یہ باتیں محض جوش عقیدت کا اظہار ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن جب اس قسم کی باتیں ایک کافر کی زبان سے نکلیں تو مستشرقین اس کی کیا توجیہہ کریں گے؟

یہاں دو غیر مسلموں کے تاثرات میں اتنا واضح فرق اس لئے ہے کہ عروہ بن مسعود ثقفی گو غیر مسلم تھا لیکن وہ حالات کو اس شکل میں دیکھنے کا عادی تھا، جیسے کہ وہ ایک عام آنکھ کو نظر آتے ہیں لیکن منٹگمری واٹ ایسا تربیت یافتہ غیر مسلم ہے جو حالات کو اپنے نظریات کے مطابق دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

منٹگمری واٹ نے یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کی ہے کہ حضور ﷺ کو مدینہ میں مضبوط سیاسی حیثیت بیعت رضوان یا فتح مکہ کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ یہ بھی ایک بہت بڑا جھوٹ

ہے۔ حضرت سعد بن معاذ نے مذکورہ بالا جذبات جاں نثاری کا اظہار بیعت رضوان اور فتح مکہ سے بہت پہلے کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی آدمی کلمہ پڑھ کر حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کی نظر میں خدا کے پیارے اور محبوب رسول حضرت محمد ﷺ کی ذات ہی ہر چیز سے زیادہ محترم اور واجب الاتباع قرار پاتی ہے۔ صحابہ کرام کے لئے حضور ﷺ کا قول ہی شریعت تھا اور آپ کا فرمان ہی ان کے لئے قانون تھا۔ مدنی تاجدار کے غلاموں کو آپ کا مدمقابل قرار دینا کسی ایسے ذہن کا کارنامہ ہی ہو سکتا ہے جو محبت کے رشتوں کو کاٹنے اور دلوں میں نفرتوں کے بیج بونے کے منصوبے بنانے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہ سکتا ہو۔

مستشرق مذکور نے پیغام اور پیغمبر کو ایک دوسرے کے مدمقابل قرار دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کے نزدیک پیغام کی حیثیت زیادہ تھی اور پیغام بر کی حیثیت کم تھی۔ پیغام بر کا کام پیغام پہنچا دینا تھا اور بس۔ یہ بھی منٹگمری واٹ کی اسلام کے خلاف معاندانہ سوچ کا ثمر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک پیغام اور پیغامبر مختلف چیزیں نہ تھیں۔ جو پیغام کتاب کی شکل میں اترا تھا اس کی عملی تفسیر پیغمبر کی ذات تھی۔ پیغمبر جسے پیغام قرار دے دیتا، وہ پیغام تھا اور جسے وہ اس پیغام کی تفسیر قرار دیتا، وہ ان کے نزدیک پیغام کی تفسیر تھی۔ مستشرقین نے حضور ﷺ کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے یہ جو شوشہ گھڑا ہے بدقسمتی سے اسے بے شمار ان لوگوں نے اپنا لیا جو کلمہ توحید پڑھتے ہیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ پیغام کی عظمت کو تو اجاگر کرتے ہیں لیکن پیغمبر کی عظمت کے تذکرے کو سننے سے بھی ان کے دل تنگی محسوس کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس جب پیغام بھی تھا اور پیغام بر بھی۔ جب وہ اس آسمانی پیغام کو بھی شب دیجور کی ظلمتوں میں نور سحر سمجھتے تھے اور پیغام بر کو بھی سسکتی ہوئی انسانیت کا چارہ گر یقین کرتے تھے، اس وقت انہوں نے جس طرف رخ کیا نصرت، عزت اور وقار نے ان کے قدم چومے۔

پیغام تو آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ ہر قسم کی ملاوٹ سے اس پیغام کے پاک ہونے پر اغیار بھی گواہ ہیں لیکن اس کے باوجود آج دنیا کے کونے کونے میں مسلمان ذلیل ہو رہے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ آج پیغمبر کی ذات بھی ان کے درمیان جلوہ گر نہیں اور اس ذات کے تذکروں کی افادیت کو بھی وہ مشکوک سمجھنے لگے ہیں۔ اس مقام تک

پہنچنے کے لئے خود فریب مسلمانوں کی راہنمائی مستشرقین نے ہی کی ہے۔ ملت اسلامیہ مستشرقین کی راہنمائی میں اپنی زندگی کی راہیں متعین کرنے کے رویے سے جتنی جلدی باز آجائے گی اتنا ہی ان کے لئے مفید رہے گا کیونکہ مستشرقین تو اس ملت کو اسی طرف لے جانا چاہتے ہیں جہاں تباہیاں اور بربادیاں ان کی منتظر ہیں۔

منٹگمری واٹ نے مدینہ طیبہ میں حضور ﷺ کو ایک عام درجے کا آدمی ثابت کرنے کے لئے کئی پینترے بدلے ہیں لیکن آخر کار وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ:

"So long as Muhammad lived, his personal influence must have seemed to contemporaries to be the cement which held the structure together". (1)

"محمد (ﷺ) جب تک زندہ رہے، یقیناً آپ کے ہم عصر یہی سمجھتے ہوں گے کہ محمد (ﷺ) کی ذات قصر اسلام کو قائم رکھنے کے لئے سیمنٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔"

یقیناً مسلمان اس وقت بھی یہی سمجھتے تھے اور آج بھی وہ مسلمان جنہوں نے مستشرقین سے ذہنی غذا حاصل نہیں کی، وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ قصر اسلام کی بقا اور استحکام کا دارومدار خدا کے کلام اور خدا کے حبیب ﷺ کی سنت پر ہے۔ خدا نے اپنے حبیب ﷺ کو جو عظمتیں اور رفعتیں عطا کی ہیں، وہ ان سے نہ کوئی ابو جہل اور ابو لہب چھین سکا تھا اور نہ ہی آپ سے ان عظمتوں کو کوئی ولیم میور، کوئی مارگولیس، کوئی منٹگمری واٹ اور کوئی جارج سیل چھین سکتا ہے۔ محمد ﷺ کی ذات بابرکات ایک آفتاب ہے، جس کی کوئی کرن جس کسی پر پڑتی ہے وہی عظیم ہو جاتا ہے۔ اس آفتاب کی کرن ابو بکر پر پڑتی ہے تو وہ صدیق اکبر بن جاتا ہے، عمر بن خطاب پر پڑتی ہے تو وہ فاروق اعظم بن جاتا ہے اور بلال حبشی جیسے غلام پر پڑتی ہے تو وہ سیدنا بلال بن جاتا ہے۔

جسے خدا نے عظمتیں تقسیم کرنے کے لئے پیدا فرمایا ہے، کس کی مجال ہے کہ خود اس کو عظمتوں سے محروم کردے۔ ڈانٹے اور والٹیئر سے لے کر ولیم میور اور سلمان رشدی تک

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 238

مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے اس آفتاب عظمت سے اس کی کرنیں چھیننے کی کتنی کوششیں کی ہیں، لیکن ان کوششوں کے باوجود آج بھی عظمت مصطفوی کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہے اور کیوں نہ چمکے خود خالق کائنات نے فرمادیا ہے:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (1)

"اور ہم نے آپ کے لئے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا۔"

اور اس آفتاب کی تنویرات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ وعدہ خداوندی ہے:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (2)

"اور یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپ کے لئے پہلی سے (بدرجہا) بہتر ہے۔"

1۔ سورۃ الانشراح: 4
2۔ سورۃ الضحیٰ: 4

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو
مرگی کا مریض نعوذ باللہ
قرار دینے کی سازش

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرگی کا مریض قرار دینے کی سازش

اللہ تعالی نے ہر انسان کو غور و فکر کی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ضروری نہیں کہ تمام انسانوں کی سوچ کا نتیجہ ایک ہو۔ انسانوں کی فکر میں اختلاف ہوتا ہے۔ اچھے انسانی معاشرے کی نشانی یہی ہے کہ اس میں ہر انسان کو اپنی سوچ اور فکر کے اظہار کی آزادی ہو۔ اگر کوئی انسان غلط راستے پر چل رہا ہو، اس کا کردار مشکوک ہو، اس کے اخلاق اچھے نہ ہوں، اس کا رویہ دوسرے انسانوں کے لئے باعث تکلیف ہو، اس کے دامن حیات پر ایسے داغ ہوں جو ہر انسان کو نمایاں نظر آتے ہوں، یا اس کا سراپا ایسی کوتاہیوں سے عبارت ہو جن تک صرف مخصوص لوگوں کی نگاہیں پہنچ سکتی ہوں، تو ایسے شخص کی خامیوں پر تنقید کو کسی اخلاقی ضابطے کے تحت معیوب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرے انسانوں کے افکار سے اختلاف کرنا اور ان کے مقابلے میں اپنے افکار کی صحت کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا بھی ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور کسی مہذب انسانی معاشرے میں، اس حق کے استعمال پر اسے موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

زندہ قومیں اپنی تاریخ پر فخر کرتی ہیں اور اپنی قومی تاریخ کو اپنی حریف اقوام کی تاریخ سے بہتر قرار دینے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ انسانی معاشرے میں ان باتوں کو بھی معیوب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اگر کوئی بدبخت اٹھ کر حاتم طائی کو کنجوس، صلاح الدین ایوبی کو بزدل اور خالد بن ولید کو فن حرب سے بے بہرہ ثابت کرنے کی کوشش کرے تو ایسا شخص نہ صرف جھوٹ بولتا ہے بلکہ انسانی معاشرے کو اس کی اساسی اقدار سے محروم کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ یہ اظہار رائے کی ایک شکل نہیں بلکہ بہتان بازی اور الزام تراشی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیغام انسانیت کے سامنے پیش کیا تھا، وہ اس دور کے ہر مذہبی، سیاسی

اور اخلاقی گروہ کی سوچ سے متصادم تھا۔ مکہ کے بت پرست ہوں یا یثرب کے یہودی، روم اور نجران کے عیسائی ہوں یا ایران کے آتش پرست، یہ نیا پیغام ان کے مذہب، ان کے طرز حیات اور ان کی سماجی اور معاشی قدروں سے متصادم تھا۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ وہ لوگ اس نئے پیغام کو اپنے معاشرے کیلئے خطرہ سمجھتے اور اس کے مقابلے کے لئے اپنی پوری صلاحیتیں صرف کرتے۔

تاریخ اس انتہائی تلخ حقیقت کی گواہ ہے کہ جن افراد یا جماعتوں نے دین اسلام کی مخالفت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا، انہیں بہت جلد اس حقیقت کا علم ہو گیا تھا کہ وہ نہ تو دین اسلام کی تعلیمات کو انسانی معاشرے کے لئے مضر بلکہ غیر مفید ثابت کر سکتے ہیں اور نہ ہی پیغمبر اسلام ﷺ کے دامن پر کسی داغ کی نشاندہی کر سکتے ہیں، لیکن اس حقیقت کے منکشف ہونے کے باوجود انہوں نے اسلام کی مخالفت میں کمی نہ کی بلکہ اسلام کی تعلیمات میں خیالی خامیاں فرض کر کے اور پیغمبر اسلام ﷺ کے دامن پر فرضی دھبے لگا کر ان کی تشہیر شروع کر دی۔

اس قسم کی کوششیں صرف اسلام، ملت مسلمہ اور پیغمبر اسلام ﷺ پر ہی ظلم نہ تھیں بلکہ یہ سازشیں پوری انسانیت پر ایک بہت بڑا ظلم تھیں کیونکہ ان کوششوں کے ذریعے نسل انسانی کو حق کی روشنی سے محروم رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

دشمنان اسلام حضور ﷺ کی شخصیت کے وقار کو مجروح کرنے اور دنیا کی نظروں میں آپ کو بدنام کرنے کے لئے ہر دور میں سازشیں کرتے رہے ہیں۔ حضور ﷺ کا سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ آپ کا دامن ہر قسم کے اخلاقی دھبوں سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر وہ خوبی عطا فرمائی ہے جو کسی انسان کو مخلوق خدا کی نظروں میں محبوب بنا دیتی ہے اور آپ کو ہر اس عیب سے پاک رکھا ہے جس سے انسانی معاشرے میں کسی انسان کا مقام گھٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو عظیم ترین نسب عطا کیا۔ آپ کو قابل رشک جسمانی صحت اور حیران کن ذہنی اور فکری صلاحیتیں عطا کیں۔ بلندی اخلاق کا یہ عالم کہ سارا مکہ صادق اور امین کہہ کر پکارتا۔ معاملہ فہمی اس بلا کی کہ حجر اسود کی تنصیب کے جھگڑے کا دانشمندانہ فیصلہ کر کے کھچی ہوئی تلواریں نیاموں میں لوٹا دیں اور مکہ کے بڑے بڑے حکیموں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ صبر واستقامت کا یہ عالم کہ جہاں بھر کی مخالفت

کے باوجود کبھی پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور بہادری کا یہ عالم کہ جنگ احد کی سختیاں، غزوہ خندق کی ہولناکیاں اور جنگ حنین کی تباہ کاریاں بھی آپ کو خوف زدہ نہ کر سکیں۔

وہ ہستی جس میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام انسانی خوبیوں کو جمع کر دیا تھا، اس نے مکہ والوں سے فرمایا:

مکہ والو! عقل کے ناخن لو۔ تم اپنے ہاتھوں سے پتھروں کو تراشتے ہو اور پھر اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے ان پتھروں کے سامنے سجدہ ریز ہو کر، ان سے حاجتیں پوری کرنے کی التجائیں کرتے ہو۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟ تم ان پتھروں کے سامنے جبین فرسائی کی ذلت سے باز آجاؤ اور اپنی جبین نیاز کو اس ہستی کے حضور جھکاؤ جس نے زمین و آسمان پیدا کئے ہیں۔ جس کے حکم سے دن راتوں میں اور راتیں دنوں میں بدلتی ہیں۔ جس نے تمہیں نعمت وجود سے نوازا ہے۔ جس کے سہارے تمہاری حیات مستعار قائم ہے اور جو تمہیں جوانی، صحت اور عزت عطا کرنے والا ہے۔ اسی کی عبادت کرو اور اسی کا حکم مانو۔ اپنی بچیوں کو زندہ درگور مت کرو، یہ انسانیت کی تذلیل ہے۔ حرام مت کھاؤ، اس طرح انسان کی روح مر جاتی ہے۔ جوا کھیلنا اور سود کھانا چھوڑ دو، یہ تمہاری معیشت کا ستیاناس کر دیں گے۔ بدکاری سے باز رہو، یہ نسوانیت کی تذلیل ہے اور خاندانی نظام کی تباہی کا باعث ہے۔ سچ بولو، جھوٹ سے باز رہو۔ وعدہ پورا کرو، وعدہ خلافی سے باز رہو۔ والدین کا احترام کرو۔ چھوٹوں پر شفقت کرو۔ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور ایک دوسرے کو بدی کے کاموں سے روکنے کی کوشش کرو۔ مجھے خدا نے تمہاری راہنمائی کے لئے بھیجا ہے۔ میں تمہارے پاس خدا کی طرف سے ایک ایسا پیغام لے کر آیا ہوں جو تمہاری دنیوی اور اخروی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔ مجھے خدا کا نبی تسلیم کرو اور میرے بتائے ہوئے راستے پر چلو تاکہ تم فلاح پا سکو۔ قیامت کا دن آنے والا ہے، جس دن نیک لوگ جزا اور بدلوگ عذاب پائیں گے، اس دن کی سختیوں سے ڈرو۔ اس دن کے امتحان کے لئے تیاری کرو۔

ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہ تھی جس کا عقل سلیم انکار کر سکے۔ ان باتوں میں سے ہر بات ہر اس شخص کے دل میں فوراً گھر کر جانے والی تھی جو تعصب سے آزاد ہو کر اس کو سنتا۔

سعید روحیں اس پیغام کو تسلیم کرنے لگیں۔ حضور ﷺ کے گھر والوں کو نہ آپ کی

ذات میں کوئی خامی نظر آئی اور نہ آپ کے پیغام میں کوئی سقم نظر آیا، اس لئے انہوں نے فوراً اس نئے دین کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔ لیکن ایک طبقہ وہ تھا جو تعصب کی عینک اتارنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسے اپنی چودھراہٹ خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ نیا دین ایک قریشی سردار اور ایک حبشی غلام کو ایک ہی صف میں کھڑا کرے گا۔ انہیں اپنے آباؤ اجداد کا پسندیدہ اور محبوب دین خطرے میں نظر آ رہا تھا۔

اپنے آباؤ اجداد کے دین کی حمایت کے لئے ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی دلیل نہ تھی کہ یہ دین ان کو اپنے آباء سے ورثے میں ملا ہے۔ دین آباء کی حفاظت کے لئے ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اس نئے دین میں خامیاں تلاش کریں اور اس دین کے داعی اول کے دامن حیات پر کسی دھبے کا سراغ لگائیں۔ لیکن عقیدہ توحید کے مقابلے میں خود تراشیدہ پتھروں کی عبادت کا عقیدہ کیسے ٹھہرتا؟ جس شخص کے کلام کے بارے میں وہ یہ کہنے پر مجبور تھے کہ "یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا" اس کی رسالت کا وہ انکار کیسے کرتے؟ عقیدۂ آخرت کے بارے میں قرآن حکیم جو ناقابل تردید دلائل بیان کر رہا تھا، ان کی موجودگی میں وہ عقیدہ آخرت کو کیسے جھٹلاتے؟ وہ سچ بولنے، وعدہ پورا کرنے، شراب نوشی، بدکاری، سود اور جوئے سے بچنے، بچیوں کو زندہ درگور کرنے سے باز آنے اور اسی قسم کی دیگر حیات بخش تعلیمات کو کیسے غلط قرار دیتے؟

لیکن اگر وہ کچھ نہیں کرتے تو پانی سر سے گزر جائے گا۔ نہ ان کا مذہب بچے گا، نہ ان کا معاشرتی ڈھانچا سلامت رہے گا اور نہ ان کی چودھراہٹ سلامت رہ سکے گی۔ یہ تھے وہ تفکرات جو انہیں اسلام کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔

تعلیمات اسلام کو جھٹلانا اور ان کی افادیت کا انکار کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اس ہستی کے دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کریں، جو ان نورانی تعلیمات کو لے کر آئی تھی۔ انہوں نے حضور ﷺ کی کردار کشی کے منصوبے بنائے لیکن یہ کام بھی آسان نہ تھا۔ وہ آپ کو جھوٹا کہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ کل تک آپ کو صادق کہہ کر پکارتے آئے تھے۔ وہ آپ کو فریبی اور بددیانت کیسے کہتے جب کہ کل تک انہوں نے خود آپ کو امین کا لقب دے رکھا تھا۔ وہ سوچتے یہ جادوگر نہیں لیکن اس کی باتوں میں جادو سے بھی زیادہ اثر ہے۔ یہ باپ کو بیٹے اور بہن کو بھائی سے جدا کر دیتا ہے اس

لئے اس کو جادوگر ہی کہہ دو۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے: یہ مجنون نہیں، سارے عرب کی عقلیں مل کر بھی اس کی عقلمندی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں لیکن اس نے وہ نعرہ لگایا ہے جو دنیا کے تمام مذاہب کے خلاف ہے۔ اسے خاندان بنو ہاشم کے سماجی مقام کا احساس نہیں۔ یہ ایسی باتیں کہتا ہے جو پہلے کسی نے نہ سنی ہوں، اس لئے اس کو مجنون کہہ دو۔ ان کے جہاندیدہ سرداروں نے انہیں واضح الفاظ میں بتادیا کہ یہ نہ شاعر ہے، نہ کاہن ہے، نہ جادوگر ہے اور نہ ہی مجنون ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں لیکن ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم اہل عرب کو اس کا حلقہ بگوش ہونے سے روکنے اور اپنے معاشرتی ڈھانچے کی حفاظت کے لئے اسے ساحر اور مجنون کہیں۔ انہوں نے یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ یہ الزام غلط ہیں حضور ﷺ پر ساحر اور مجنون ہونے کے الزام لگائے۔

انہوں نے خدا کے حبیب کے پاکیزہ دامن پر جو الزام لگایا تھا، اس کا جواب رب قدوس نے خود دیا اور فرمایا:

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (1)

"کیا اب تک نہیں غور و فکر کیا انہوں نے۔ ان کے صاحب پر جنوں کا ذرا اثر نہیں۔ نہیں ہے وہ مگر کھلا کھلا ڈرانے والا۔"

قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ وضاحت کر رہی ہے کہ کفار کا حضور ﷺ پر جنون کا الزام حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ آپ پر یہ الزام اس لئے لگ رہا ہے کہ یہ الزام لگانے والے اپنی غور و فکر کی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتے۔ وہ جس پر یہ بے سر وپا الزام لگا رہے ہیں وہ اجنبی نہیں بلکہ ان کا "صاحب" ہے۔ اس نے ان کے شہر میں جنم لیا ہے اور ان کے سامنے بچپن اور لڑکپن کی منزلیں طے کی ہیں۔ وہ اس کی نشست و برخاست، گفت و شنید، لین دین اور اخلاق و کردار کی تفصیلات سے آگاہ ہیں۔ لیکن انہوں نے اس شخص کے شب و روز پر غور نہیں کیا۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ جس شخص نے کبھی کسی انسان کے متعلق جھوٹ نہیں بولا، وہ خدا کے متعلق جھوٹ کیسے بولے گا۔ جس کے دامن پر چالیس سال کی عمر تک کسی کو کوئی داغ نظر نہ آیا، وہ شخص اچانک حامیوں کا مرقع کیسے بن گیا؟ وہ جو معجزانہ کلام پیش کرتا

1۔ سورۃ الاعراف: 184

ہے انہوں نے اس پر بھی غور نہیں کیا۔ وہ کلام کی عظمت کو پرکھنے کے ماہر ہیں، اس کے باوجود اس معجزانہ کلام کی عظمتیں ان کی آنکھوں سے کیوں اوجھل رہیں؟ حقیقت، حبیب خدا ﷺ کی زندگی کی شکل میں، قرآن حکیم کے معجزانہ کلام کی شکل میں اور اسلام کے عادلانہ اور حکیمانہ نظام کی شکل میں ان کے سامنے ہے اور انہیں دعوت فکر دے رہی ہے لیکن وہ اس میں غور و فکر نہیں کرتے اور آنکھیں بند کر کے ہدایت کے اس ماہ منیر کو کبھی ساحر اور کبھی مجنوں کہہ دیتے ہیں اور اپنے اس الزام کے عواقب پر بھی غور نہیں کرتے۔

قرآن حکیم نے جہاں کفار مکہ پر حضور ﷺ کے معاملے میں غور و فکر نہ کرنے کا الزام لگایا ہے، وہاں اس نے ان کے دلوں کے اندر چھپی ہوئی بیماری کو بھی ظاہر فرمادیا ہے، فرمایا:

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌۚ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (1)

"پس جب آئیں ان کے پاس ہماری نشانیاں بصیرت افروز بن کر تو انہوں نے کہا: یہ تو جادو ہے کھلا ہوا۔ اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے (ان کا انکار) محض ظلم اور تکبر کے باعث تھا۔ پس آپ ملاحظہ فرمائیے، کیا ہولناک انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا۔"

قرآن حکیم ان کے دلوں میں چھپے ہوئے مرض کو بھی ظاہر کر رہا ہے اور انہیں اس بات پر بھی تنبیہ کر رہا ہے کہ تم نے غور و فکر کی خداداد صلاحیتوں کو صحیح استعمال نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی پروردگار عالم اپنی شان رحمانیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے حکیمانہ انداز میں انہیں راہ حق کی طرف بلاتا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (2)

1۔ سورۃ النمل 14-13

2۔ سورۃ سبا 46

"(اے حبیب!) آپ (انہیں) فرمائیے: میں تمہیں صرف ایک نصیحت کرتا ہوں۔ (یہ تو مان لو) تم اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ دو دو یا اکیلے اکیلے، پھر خوب سوچو۔ (تمہیں ماننا پڑے گا) تمہارے اس رفیق میں جنوں کا شائبہ تک نہیں ہے۔ نہیں ہے وہ مگر بروقت خبر دار کرنے والا تمہیں سخت عذاب کے آنے سے پہلے۔"

جو لوگ حضور ﷺ کے خلاف طوفان بد تمیزی برپا کیا کرتے تھے اور آپ پر ناروا الزامات لگا کر سادہ لوح لوگوں کو آپ سے متنفر کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، ان سے کہا جا رہا ہے کہ ہم اس تنازعہ کا فیصلہ تم پر چھوڑتے ہیں، کسی غیر کو یہاں حکم بنانے کی ضرورت نہیں۔ تم میری صرف ایک نصیحت مان لو۔ وہ یہ ہے کہ تم دو دو مل کر یا اکیلے تنہائی میں بیٹھ کر اس امر پر غور کرو کہ تم جو اپنے رفیق اور بچپن کے ساتھی کو مجنون کہتے ہو، اس کی تمہارے پاس کوئی معقول وجہ بھی ہے؟ کیا تم نے انہیں مجنونوں کی طرح بے سرو پا باتیں کرتے کبھی سنا ہے؟ دیوانوں کی طرح شور مچاتے، ہنگامہ آرائی کرتے کبھی دیکھا ہے؟ تم انہیں کتنا دق کرتے ہو، کتنی اذیت پہنچاتے ہو، اس کے باوجود یہ آپے سے باہر ہو کر کبھی تم سے دو بدو ہوئے ہیں؟ کبھی انہوں نے ناشائستہ بات کی ہے؟ ان کا ہر کام مقصدیت کا لاجواب نمونہ ہوتا ہے۔ ان کا ہر فعل اتنا دلربا اور روح افزا ہوتا ہے کہ قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ گفتگو کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکمت کے موتی بکھر رہے ہیں۔ متانت، وقار، سچائی اور بردباری میں ان کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ کل تک تم انہیں صادق اور امین کہہ کر پکارتے تھے، اب تم ہی بتاؤ کہ ان میں یکایک کون سی تبدیلی آگئی ہے کہ تم نے ان کے بارے میں اپنی رائے بدل لی ہے۔ ان امور میں اکیلے بیٹھ کر غور کرو یا اپنوں میں سے تم جن کو باشعور اور زیرک سمجھتے ہو، انہیں بلا کر ان سے تبادلہ خیال کرو لیکن خدارا تعصب اور ضد کو ایک طرف رکھ دو۔ محض حق کو سمجھنے کے لئے اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً تم اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ اللہ کا محبوب نہ مجنون ہے، نہ اس پر آسیب کا اثر ہے، نہ یہ مفتری ہے اور نہ ہی اس کے پیش نظر کوئی سیاسی یا معاشی مفاد ہے۔ یہ جو کچھ کر رہا ہے، محض تمہاری خیر خواہی کے لئے کر رہا ہے۔ وہ تمہیں عذاب الٰہی سے بچانا چاہتا ہے۔ وہ تمہیں بروقت خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتا ہے۔ دل کی آنکھوں سے انہیں دیکھو۔ انہیں پہچانو۔ ان کی قدر

کرو۔ ان کے بروقت انتباہ سے فائدہ اٹھاؤ۔ تم بڑے دور اندیش اور معاملہ فہم لوگ ہو، ایسی ناشائستہ حرکتیں تمھیں زیب نہیں دیتیں۔(1)

جن لوگوں نے حضور ﷺ پر ساحر یا مجنون ہونے کا الزام لگایا تھا، ان کے پیش نظر حضور ﷺ کی اہمیت کو کم کرنے اور لوگوں کو آپ سے دور رکھنے کے مقاصد تھے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے بھرپور کوششیں کیں۔ جو ازلی بدبخت تھے وہ تو اپنی اس قسم کی کوششوں کے دوران ہی واصل جہنم ہو گئے لیکن ان کی اکثریت نے پروردگار عالم کے ارشاد کے مطابق حق و باطل کی آویزش کا بغور جائزہ لیا۔ دین آباء کا دین مصطفوی سے موازنہ کیا۔ انہوں نے پیغمبر خدا ﷺ کے کردار کو ہر پہلو سے پرکھا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ حق وہی ہے جو محمد عربی ﷺ کی زبان سے نکلتا ہے اور اس کے مقابلے میں ان کا اپنا موقف باطل ہے۔ اس کے بعد وہ پورے اطمینان قلب کے ساتھ اس دین کے حلقے میں داخل ہو گئے اور اپنی باقیماندہ زندگیاں اس دین کے جھنڈے کو آفاق عالم میں لہرانے کے لئے وقف کر دیں۔

یہود و نصاریٰ کو اپنے اہل کتاب ہونے پر ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو عالم اور عربوں کو جاہل سمجھتے تھے۔ حضور ﷺ کی نشانیاں ان کے الہامی صحیفوں میں موجود تھیں اور انہیں حضور ﷺ کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی۔ وفد نجران کا حضور ﷺ کے ساتھ مباہلہ کرنے سے انکار اور حضرت عبداللہ بن سلام جیسے عالم تورات کا حضور ﷺ پر فوراً ایمان لے آنا اس بات کی دلیل ہے، لیکن تعصب نے یہاں بھی اپنا رنگ دکھایا اور یہود و نصاریٰ نے بھی اس نبی برحق ﷺ کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔

کفر کسی رنگ میں بھی ہو وہ اسلام کا دشمن ہے لیکن تاریخ اسلام ہمیں بتاتی ہے کہ فتح مکہ اور عساکر ایران کی شکستوں کے بعد مسلسل کئی صدیوں تک مسلمانوں کے اصل مدمقابل یہودی اور عیسائی ہی رہے ہیں۔ ان لوگوں نے دلیل اور تلوار کے ذریعے اسلام کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں میں ناکام ہو کر انہوں نے بھی وہی طریقہ اپنایا جو کفار مکہ نے اپنایا تھا۔ انہوں نے بھی حضور ﷺ کے کردار کو مشکوک بنانے کے لئے الزام تراشیوں کا سہارا لیا۔ کفار مکہ کو حضور ﷺ پر الزام لگانے سے پہلے سوچنا پڑتا تھا کیونکہ حضور ﷺ ان

1۔ پیر محمد کرم شاہ، "ضیاء القرآن"، (ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور۔)، جلد 4، صفحہ 33-132

کے درمیان موجود تھے۔ اگر وہ حضور علیہ السلام پر کسی جسمانی، ذہنی یا اخلاقی مرض میں مبتلا ہونے کا الزام لگاتے تو ان کا جھوٹ فوراً ظاہر ہو جاتا اور لوگ آپ کے بجائے ان الزام لگانے والوں سے نفرت کرنے لگتے۔ انہوں نے آپ پر ساحر ہونے کا الزام ایک اخلاقی کمزوری کے طور پر نہیں لگایا تھا بلکہ اس معاشرے میں ساحر کو ایک باکمال شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ حضور علیہ السلام کے کلام میں جو بے پناہ تاثیر تھی اس کی توجیہ وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ یا تو آپ کے دعوئ رسالت کو تسلیم کرلیں اور یا آپ کو ساحر قرار دیں۔

آپ کو مجنون کہتے ہوئے بھی انہیں یہ اطمینان ہوتا تھا کہ اگر کوئی اعتراض کرے گا کہ تم کس نشانی کی بنا پر آپ کو مجنون کہتے ہو تو یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ مجنون سے مراد یہ ہے کہ آپ پر جنوں کا سایہ ہے۔ انہوں نے اس الزام کی یہ تاویل کی بھی تھی اور حضور علیہ السلام کو پیشکش کی تھی کہ اگر آپ کسی جن وغیرہ کے زیر اثر ہیں تو ہم آپ کا علاج کرا سکتے ہیں۔ اپنی توھم پرستیوں کی وجہ سے وہ ان لوگوں سے بھی حیرت انگیز افعال کے ظہور کی توقع رکھتے تھے جو جنوں وغیرہ کے زیر اثر ہوتے۔ اس لئے ساحر اور مجنون ہونے کے الزامات تو ایسے تھے جن کے ذریعے وہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام اور آپ کے اخلاق و کردار کی حیرت انگیز تاثیر کی توجیہ کرتے تھے۔ ان کے لئے یہ کہنا ممکن نہ تھا کہ حضور علیہ السلام چلتے چلتے گر پڑتے ہیں، آپ کے منہ سے جھاگ بہنے لگتی ہے اور آپ کا جسم اکڑ جاتا ہے کیونکہ اگر وہ اس قسم کی بات کرتے تو جو لوگ صبح و شام حضور علیہ السلام کو قابل رشک صحت اور دلربا سراپے کے ساتھ اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھتے تھے، وہ اس الزام کی تردید کر دیتے۔

قریش مکہ کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ لوگوں کو محمد (علیہ السلام) سے دور رکھنے کے لئے آپ کے بارے میں جو باتیں کرتے ہیں ان کے بے بنیاد ہونے کی وجہ سے کئی لوگ ان کی صفوں کو چھوڑ کر اس نئے دین کے حلقے میں شامل ہو رہے ہیں، اس لئے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ حضور علیہ السلام کے بارے میں کوئی بات کہنے سے پہلے سوچ لیں کہ اس بات کا رد عمل کیا ہو گا۔

کفار مکہ کو حضور علیہ السلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے وقت جو مسائل درپیش تھے، مستشرقین کو ان میں سے کوئی مسئلہ بھی درپیش نہ تھا۔ حضور علیہ السلام کو اس دنیا سے پردہ فرمائے ہوئے عرصہ بیت چکا تھا اور آپ کی جو تاریخ مسلمانوں کے پاس محفوظ تھی، اس کو مستشرقین مسلمانوں کی عقیدت کی تاریخ اور جھوٹ کا پلندہ کہہ کر آسانی سے مسترد کر سکتے

تھے۔ وہ آیات قرآنی کو من گھڑت بھی کہہ سکتے تھے اور ان کی من مانی تاویل بھی کر سکتے تھے۔ وہ اسلامی تاریخ سے اپنے مطلب کی باتوں کو چن کر تاریخی معلومات کے باقی ذخیرے کو مسترد کر سکتے تھے۔ ان حالات میں مستشرقین نے حضور ﷺ پر ایسے الزامات لگائے جو الزام لگانے کی ابوجہل، ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط وغیرہ کو جرات نہ ہوئی تھی۔

واقعات جن کو مرگی کے الزام کی بنیاد بنایا گیا

مستشرقین کے اس قسم کے بے بنیاد الزامات میں سے ایک الزام یہ ہے کہ حضور ﷺ (نعوذ باللہ) مرگی کے مریض تھے۔ قرون وسطیٰ کے مستشرقین آپ کی ذات کے متعلق کوئی الزام تراشنے کے لئے کسی بنیاد کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے لیکن عصر تہذیب کے مہذب مستشرقین نے اس رویے میں تبدیلی کی ہے۔ وہ حضور ﷺ پر کوئی الزام لگانے کے لئے اس کی بنیاد قرآن، حدیث، سیرت یا تاریخ کی کتابوں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں صرف معمولی سا اشارہ درکار ہوتا ہے، رائی کو پہاڑ بنانا وہ خوب جانتے ہیں۔

ایک مسلمان حیران ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حضور ﷺ پر مرگی زدہ ہونے کا الزام لگانے کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا ہے۔ مستشرقین نے جن واقعات سے حضور ﷺ کے مرگی کے مرض میں مبتلا ہونے کا سراغ لگایا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ حضور ﷺ کی ولادت سے پہلے آپ کی والدہ کا فرشتوں کو دیکھنا۔

2۔ حضرت حلیمہ سعدیہ کی روایت کے مطابق فرشتوں کا آپ (ﷺ) کے سینے کو چاک کرنا۔

3۔ حالت وحی میں رسول خدا علیہ التحیۃ والثنا کی حالت کا متغیر ہونا۔

4۔ کفار مکہ کا آپ کو مجنون کہنا۔

5۔ حضرت حلیمہ کا حضور ﷺ کے سر پر بادل کو سایہ کناں دیکھنا۔

مذکورہ بالا واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ حضور ﷺ مرگی کے مریض تھے۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مستشرقین نے عملاً ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ "سپرنگر" نے حضرت آمنہ کے فرشتوں کو دیکھنے کو مرگی کا مرض سمجھا اور اس کو حضور ﷺ کا موروثی مرض قرار دیا۔ علامہ محمد احسان الحق سلیمانی

لکھتے ہیں:

"حضرت آمنہ، آنحضور ﷺ کی والدہ ماجدہ نے اپنے رویا میں فرشتوں کو دیکھا جو انہیں احمد ﷺ کی خوش خبری دینے اور آپ کا نام مبارک تجویز کرنے آئے تھے۔ "سپرنگر" جو عقل خام کا غلام اور حسد کا مارا تھا، یہ کہ اٹھا کہ فرشتوں نے بشارت کیا دینی تھی، حقیقت میں حضرت آمنہ کو ضعف دماغ اور صرع (مرگی) کی بیماری تھی۔"(1)

مستشرقین کو حضور ﷺ پر مرگی زدہ ہونے کا الزام لگانے کے لئے دوسرا موقعہ اس واقعے کے ذریعے ملا کہ آپ اپنے بچپن میں جب حضرت حلیمہ سعدیہ کے گھر تھے تو ایک دن، جب آپ گھر سے باہر مویشیوں کے ساتھ تھے، آپ کا رضاعی بھائی دوڑتا دوڑتا آپ کے رضاعی ماں باپ کے پاس آیا اور کہا کہ دو سفید پوش مردوں نے میرے قریشی بھائی کو لٹا کر اس کا سینہ چاک کر دیا ہے۔ یہ سن کر وہ دونوں دوڑتے دوڑتے حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچے۔ دیکھا تو آپ کھڑے تھے اور آپ کا رنگ متغیر تھا۔ پوچھنے پر حضور ﷺ نے جواب دیا کہ میرے پاس دو آدمی آئے تھے جنہوں نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ انہوں نے مجھے لٹایا۔ میرا پیٹ چاک کیا اور اس میں کسی چیز کو تلاش کیا جو مجھے خبر نہیں کہ کیا تھی۔(2)

حضور ﷺ کے شق صدر کا یہ واقعہ سیرت اور حدیث کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ اسی طرح واقعہ معراج والی احادیث میں بھی شق صدر کا ذکر ملتا ہے۔ مستشرقین نے اس واقعے کو سچ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی توجیہ یہ کی حضور ﷺ کا سینہ وغیرہ چاک نہیں ہوا تھا بلکہ آپ کو مرگی کا دورہ پڑا تھا، جس سے آپ نے یہ سمجھا تھا کہ آپ کا سینہ چاک ہوا ہے۔ نکلسن نے اپنی کتاب "تاریخ ادب عربی" اور ولیم میور نے اپنی کتاب "حیات محمد" میں شق صدر کے واقعہ کو مرگی کا دورہ قرار دیا ہے۔

شق صدر کا واقعہ ایک عجیب و غریب واقعہ تھا۔ مستشرقین بذات خود اس واقعے کی مدد سے حضور ﷺ کو مرگی کا مریض ثابت کر سکتے تھے اور انہوں نے ایسے کیا بھی لیکن انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی دعویٰ کیا کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تھا، اس وقت حضرت حلیمہ اور ان

1۔ رسول مبین، صفحہ 603

2۔ عرجون، "محمد رسول اللہ"، صفحہ 143

ے شوہر نے بھی یہی سمجھا تھا کہ ان کے رضاعی بیٹے پر مرگی کا حملہ ہوا ہے۔ حضرت حلیمہ اور ان کے شوہر کی طرف اس بات کو منسوب کرنے کے لئے انہوں نے ایک حدیث کے اس حصے کو استعمال کیا ہے:

قَالَتْ وَقَالَ لِیْ اَبُوْهُ یَا حَلِیْمَةُ لَقَدْ خَشِیْتُ اَنْ یَکُوْنَ هٰذَا الْغُلَامُ قَدْ اُصِیْبَ فَاَلْحِقِیْهِ بِاَهْلِهٖ (1)

"(حضرت حلیمہ) کہتی ہیں: اس کے باپ نے مجھ سے کہا: اے حلیمہ! مجھے خطرہ ہے کہ اس بچے کو کچھ ہو گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس لو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دو۔"

مستشرقین کی عربی دانی کا ایک نمونہ

حضرت حلیمہ کے شوہر کے ان الفاظ سے عام آدمی تو یہ نہیں سمجھ سکتا کہ حضرت حلیمہ اور ان کے شوہر کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ حضور ﷺ پر مرگی کا دورہ پڑا ہے، لیکن مستشرقین کے تخیل کی قوت پرواز چونکہ لاجواب ہوتی ہے اس لئے وہ اس قسم کے جملوں سے آسانی کے ساتھ مطلوبہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ حضرت حلیمہ کے شوہر کے مذکورہ بالا الفاظ سے حضور ﷺ کے مرگی زدہ ہونے کا نتیجہ سب سے پہلے "ڈاکٹر پوکاک" نے نکالا۔ اس نے تاریخ ابو الفداء کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور جب زیر بحث حدیث کا اس نے ترجمہ کیا تو نہ صرف ترجمہ غلط کیا بلکہ اصل عربی عبارت کا بھی حلیہ بگاڑ دیا۔

سر سید احمد خان نے، 1722ء میں آکسفورڈ میں چھپنے والے، تاریخ ابو الفداء کے اس ترجمے کو دیکھا ہے اور اس میں مذکورہ بالا عربی عبارت جس طرح درج ہے، اسکو بھی انہوں نے اپنی کتاب "سیرت محمدی" میں درج کیا ہے اور اس کے لاطینی ترجمے کا جو مفہوم بنتا ہے، اس کو بھی انہوں نے اردو زبان میں درج کر دیا ہے۔ ہم "سیرت محمدی" کے حوالے سے مذکورہ عربی عبارت اور اس کا جو ترجمہ پوکاک نے کیا وہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں:

اس چھاپہ میں عبارت مذکورہ اس طرح لکھی ہے:

1۔ محمد رضا، "محمد رسول اللہ"، (دار الکتب العلمیہ بیروت، 1975ء)، صفحہ 25

فَقَالَ زَوْجُ حَلِيْمَةَ لَهَا قَدْ خَشِيْتُ اَنْ هٰذَا الْغُلَامَ قَدْ اُصِيْبَ بِالْحَقِيَّةِ بِاَهْلِهٖ فَاحْتَمَلَتْهُ حَلِيْمَةُ وَقَدِمَتْ بِهٖ اِلٰى اُمِّهٖ

"اس عبارت کا جو لیٹن میں ترجمہ کیا ہے، اس کا ترجمہ اردو میں اس طرح پر ہوتا ہے: تب حلیمہ کے شوہر نے کہا کہ مجھ کو بہت خوف ہے کہ اس لڑکے نے کسی اپنے ساتھی سے دماغی بیماری کو اخذ کر لیا ہے، اس واسطے اس کو حلیمہ سے لے کر اس کی ماں آمنہ کے پاس لے گیا۔"(1)

جو آدمی پوکاک کی نقل کردہ عربی عبارت کو دیکھتا ہے، وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جس آدمی نے عربی مصادر سے یہ عبارت نقل کی ہے وہ عربی زبان سے کلیۃً نابلد ہے۔ "قد اصیب بالحقیہ باھلہ" ایسی ترکیب ہے جو کسی ایسے شخص کے قلم سے نہیں نکل سکتی جو عربی زبان کو سمجھتا ہو۔ عربی مصادر مثلاً "السیرۃ النبویہ لابن ھشام" میں یہ عبارت واضح ہے وہاں الفاظ یہ ہیں:

قَدْ اُصِيْبَ فَالْحِقِيْهِ بِاَهْلِهٖ

اس بالکل واضح اور آسان عبارت کو وہی شخص قَدْ اُصِيْبَ بِالْحَقِيَّةِ بِاَهْلِه لکھ سکتا ہے جو عربی عبارت کو صحیح نقل کرنے کی صلاحیت بھی نہ رکھتا ہو۔

جس شخص نے اصل عربی عبارت ہی غلط نقل کی تھی، اس شخص سے اس غلط عبارت کے صحیح ترجمے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ پوکاک کے ترجمے کے کئی الفاظ ایسے ہیں جو عربی متن کے کسی لفظ کا ترجمہ نہیں۔ اس نے ترجمہ کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا ہے: "اس لڑکے نے اپنے کسی ساتھی سے دماغی بیماری اخذ کر لی ہے۔" یہ پورا جملہ مذکورہ عربی عبارت کے کسی جملے کا ترجمہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ عربی عبارت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا ترجمہ "اخذ کرنا" کیا جا سکے۔ عربی عبارت میں جو فعل استعمال ہوا ہے وہ "اصیب" ہے۔ یہ فعل مجہول ہے اور اس کا معنی کسی صورت میں یہ نہیں کیا جا سکتا کہ "اس نے بیماری اخذ کر لی ہے۔" عربی عبارت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا ترجمہ "اپنے ساتھی سے" کیا جا سکے۔ عربی عبارت کے کسی جملے کا معنی یہ نہیں بنتا کہ حلیمہ کا شوہر بچے کو حلیمہ سے لے کر اس کی

1۔ سیرت محمدی، صفحہ 230

ماں آمنہ کے پاس لے گیا، بلکہ پوکاک نے جو عربی عبارت لکھی ہے اس کا معنی تو یہ بنتا ہے کہ حلیمہ نے بچے کو اٹھایا اور اسے اس کی ماں کے پاس لے گئی۔ پوکاک نے عربی عبارت میں جو لفظ بالحقیة نقل کیا ہے، وہ ترجمہ کرتے وقت اس لفظ کو گول کر گیا ہے۔

قارئین کرام نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مستشرقین جو السنہ شرقیہ کا ماہر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کی لسانی مہارت کا رنگ کیا ہوتا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ایسا ترجمہ جس کے مترجم کو عربی عبارت کو صحیح نقل کرنے کا سلیقہ بھی نہ تھا، اسے درخور اعتناء نہ سمجھا جاتا لیکن تاریخ ابو الفداء کا مذکورہ ترجمہ، بعد کے مستشرقین کے لئے مرجع قرار پایا اور انہوں نے اس ترجمے کو اسلام کے متعلق اپنی تحقیقی کاوشوں میں استعمال کیا۔

ولیم میور، پوکاک سے بھی دو قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب "لائف آف محمد" کے صفحہ نمبر 21 کے حاشیہ پر بجائے لفظ اُصیب کے اُمیب لکھا ہے۔ یعنی صاد کی جگہ "میم" لکھا ہے اور اس کے معنی "Fit" یعنی عارضہ ہونے کے لکھے ہیں۔(1)

ولیم میور نے "امیب" کا جو لفظ اختراع کیا ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے پوکاک نے "بالحقیہ" کا لفظ گھڑا ہے۔ یہ دونوں الفاظ ایسے ہیں جن کا عربی ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنے کا شرف ان دو لائق مستشرقین کو حاصل ہے۔ انہوں نے اس قسم کے الفاظ گھڑے، پھر ان الفاظ کی مدد سے حضور ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دیا اور ان کی یہ تحقیق تمام مستشرقین کے لئے علمی سرمایہ قرار پائی۔

ایک اور واقعہ جس سے مستشرقین نے حضور ﷺ پر مرگی کے حملوں کا سراغ لگایا ہے، وہ یہ روایت ہے کہ حضرت حلیمہ سعدیہ نے دیکھا کہ بادل حضور ﷺ پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ وہ اس صورت حال سے خوف زدہ ہوئیں۔ ولیم میور نے اس روایت سے یہ نتیجہ اخذ کیا:

"اگر اس روایت میں کچھ صدق ہو تو غالباً عارضہ سابق کے یعنی صرع کے آثار کے عود سے مراد ہوگی۔"(2)

تیسری بات جس سے مستشرقین نے حضور ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دینے کی

1۔ سیرت محمدی، صفحہ 230

2۔ ایضاً، صفحہ 232

کوشش کی، وہ آپ کی وہ حالت تھی جو آپ پر نزول وحی کے وقت طاری ہوتی تھی۔ یعنی جس حالت میں آپ کی زبان سے وہ الفاظ نکلتے تھے جن کی تاثیر سے بچنے کے لئے کافر کانوں میں روئی ٹھونستے تھے اور جن کے اثر سے اپنے ہم مذہب لوگوں کو بچانے کے لئے عالم یہودیت و نصرانیت، مسلسل چودہ صدیوں سے پریشان چلا آرہا ہے، مستشرقین کی نظر میں وہ حالت مرگی کے دورے کی تھی۔

اور ان کے پاس خدا کے حبیب ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دینے کی آخری دلیل یہ ہے کہ کفار مکہ نے آپ پر مجنون ہونے کا الزام لگایا تھا۔ مستشرقین کو یہ بات کہنے سے پہلے اس حقیقت پر غور کر لینا چاہئے تھا کہ آپ پر یہ الزام لگانے والوں نے خود اپنے عمل سے اپنے اس الزام کی تردید کر دی تھی اور جس ہستی کو انہوں نے کبھی ساحر اور کبھی مجنون کہا تھا، آخر انہوں نے اسی ہستی کے دامن سے وابستہ ہو کر اپنی زندگی کے لئے نئی راہیں متعین کی تھیں۔ انہوں نے حالت کفر میں اسلام کے خلاف جو کارروائیاں کی تھیں، ان کا ازالہ کرنے کے لئے انہوں نے اسلام کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اگر ضرورت پڑی تو مسکراتے ہوئے اس دین متین پر اپنی جان بھی قربان کر دی۔

قارئین کرام نے ان دلائل کو دیکھ لیا جن سے مستشرقین، حضور ﷺ کو مرگی کا مریض ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی دلیل کی کوئی بنیاد نہیں۔ اگر فرشتے کو دیکھنے سے حضرت آمنہ مرگی کی مریض قرار پاتی ہیں تو کیا مستشرقین ان تمام لوگوں کو مرگی کا مریض ماننے کے لئے تیار ہوں گے جن کے متعلق بائیبل بتاتی ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو دیکھا اور فرشتوں نے ان سے کلام کیا۔

یہ کتنا عجیب فلسفہ ہے کہ حضور ﷺ کے سر پر بادل کو سایہ کناں تو حضرت حلیمہ سعدیہ دیکھیں اور اس کی وجہ سے مستشرقین مرگی کا مریض حضور ﷺ کو قرار دیں۔

حالت وحی میں حضور ﷺ پر ہیبت اور رعب کا طاری ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ خدا کا کلام کوئی معمولی چیز نہیں۔ قرین قیاس بھی یہی بات تھی کہ بندے کے دل پر جب خدا کا کلام نازل ہوتا، تو وہ جلال خداوندی کے رعب سے کانپنے لگتا۔ حیرت کی بات تو یہ ہوتی کہ حضور ﷺ پر کلام خداوندی نازل ہوتا اور آپ کی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی کے آثار نظر نہ آتے۔ لیکن مستشرقین نے یہ کمال دکھایا کہ حالت وحی میں کلام خداوندی کے اثر

سے حضور ﷺ کی کیفیت میں جو تبدیلی رونما ہوتی تھی، انہوں نے اس کیفیت کو مرگی کا دورہ قرار دے دیا۔

ہم مستشرقین کی خدمت میں صرف اتنی سی گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی کوہ طور پر پڑی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور کی طرف دیکھ کر بیہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ مستشرقین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس حالت کو تو کبھی مرگی کا دورہ قرار دینے کی کوشش نہیں کی۔ حضور ﷺ تو حالت وحی میں نہ گرتے تھے اور نہ کبھی بے ہوش ہوتے تھے۔ آپ پر وحی مختلف شکلوں میں نازل ہوتی تھی۔ ان میں سے وحی کی جو شکل آپ کے لئے سب سے زیادہ مشکل ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ آپ کو گھنٹی کی آواز کی طرح آواز سنائی دیتی تھی۔ وحی کی اس حالت میں حضور ﷺ کو جس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑتا تھا وہ یہ تھی کہ سخت سردی کے موسم میں بھی آپ کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرے نکلنے لگتے، اگر آپ کسی اونٹنی پر سوار ہوتے تو وہ اونٹنی بھی وحی کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی بلکہ گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی تھی۔ ایک دفعہ حضور ﷺ کی ران مبارک حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ران پر تھی کہ آپ پر وحی کی یہ کیفیت طاری ہوئی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یوں محسوس ہونے لگا گویا ان کی ران ٹوٹ رہی ہے۔(1)

مستشرقین چونکہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ پر مرگی کے دورے پڑتے تھے اور ان دوروں کو آپ کے پیروکار کبھی آپ کے معجزات اور کبھی نزول وحی کی کیفیت سمجھتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنی خود ساختہ کہانی کو اس انداز سے آگے بڑھایا ہے کہ وہ اس سے مطلوبہ مقاصد حاصل کر سکیں۔ انہوں نے ایام حمل میں حضرت آمنہ کے تجربات کو مرگی کے دورے قرار دیا۔ پھر اس مرض کو حضور ﷺ کی طرف وراثۃً منتقل کیا اور شق صدر اور دیگر معجزات رسول کو مرگی کے دورے قرار دیا اور اس افسانے سے نتیجہ یہ نکالا کہ جس مرض میں آپ بچپن سے مبتلا تھے اس نے کبھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ چالیس سال کی عمر کے بعد بھی آپ کو اس قسم کے دورے پڑتے اور آپ ان دوروں کو نزول وحی کی کیفیت قرار دیتے اور آپ کے متبعین بھی یہی سمجھتے کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

1۔ ضیاء النبی، جلد 2، صفحہ 199

مرگی کا مفروضہ ثابت کرنے کے لئے مستشرقین کی چالیں

مستشرقین نے اپنے ان مزعومات کو ثابت کرنے کے لئے نزول وحی کی حالت کے ایسے نقشے کھینچے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جسم کا سردی کے موسم میں پسینے سے شرابور ہونا، اس کے لئے کافی نہ تھا کہ اس کی بنا پر آپ کو مرگی کا مریض قرار دیا جاسکے، اس لئے انہوں نے حالت وحی میں آپ پر طاری ہونے والی کیفیات میں ایسی چیزوں کا اضافہ کر دیا جن کو مرگی کی نشانیاں قرار دیا جاسکے۔

ولیم میور حضور ﷺ کے بچپن کے حیران کن واقعات کے بارے میں تو یقین رکھتے ہیں کہ وہ مرگی کے دورے تھے، پھر ان دوروں کا تعلق نزول وحی سے جوڑتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ان دوروں کو جن کو حلیمہ صرع کی قسم کے حملے سمجھ کر ڈر گئی تھی، محمد (ﷺ) کے مزاج میں ان مضطر حالتوں اور بیہوش کنندہ غشوں کے صریح آثار نمودار تھے جو نزول وحی کے ہوتے تھے اور شاید جن کے سبب ان کے دل میں نزول وحی کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اور ان کے متبعین نے ان اضطرابوں اور غشوں کو نزول وحی کا شاہد قرار دیا تھا۔" (1)

گویا مستشرق موصوف فرمارہے ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ دعویٰ کرنا کہ آپ پر وحی نازل ہوتی ہے، کوئی عجیب بات نہ تھی۔ آپ جس حالت کو نزول وحی کی حالت قرار دیتے تھے، اس قسم کی کیفیات سے آپ بچپن میں بھی گزرے تھے۔ یعنی بچپن میں بھی آپ پر مرگی کے دورے پڑتے تھے اور انہی دوروں نے آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی کہ آپ دعویٰ کریں کہ آپ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اور آپ کے متبعین نے بھی آپ کی ان کیفیات کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

ولیم میور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"There were periods at which the excitement took the shape of a trance or vision. Of these we know but little. Some christian writers have connected them with

---

1۔ سیرت محمدی، صفحہ 232

the symptoms noticed in his childhood. Such swoons or reveries are said sometimes to have preceded "The descent of inspiration," even in later life." (1)

"کچھ مواقع ایسے آتے جب بے قراری وجد یا کشف کی شکل اختیار کر لیتی۔ ہم ان کی تفصیلات سے بہت کم آگاہ ہیں۔ بعض عیسائی مصنفین نے ان کیفیات کو مرگی کے دورے قرار دیا ہے اور ان کا تعلق ان علامات سے جوڑا ہے جو آپ کے بچپن میں نظر آتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی زندگی کے آخری حصے میں بھی نزول وحی سے پہلے آپ پر اس قسم کی غشی اور بیداری کے سپنے کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔"

"ولیم میور" "نزول وحی کو مرگی کے دورے قرار دینے کے کام کو کچھ عیسائی مصنفین کی طرف منسوب کرتا ہے حالانکہ وہ خود ان عیسائی مصنفین میں سر فہرست ہے۔ اپنی اس کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"At the moment of inspiration....... anxiety pressed upon the prophet, and his countenance became troubled. Sweat dropped from his forehead, and he would fall to the ground as in a trance". (2)

"نزول وحی کے وقت بے چینی پیغمبر (ﷺ) کو گھیر لیتی۔ آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو جاتے، آپ کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے اور آپ اس طرح زمین پر گر پڑتے جس طرح انسان حالت وجد میں زمین پر گر پڑتا ہے۔"

نزول وحی کے وقت چہرے کے آثار میں تبدیلی اور پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے کا ذکر احادیث طیبہ میں موجود ہے۔ "ولیم میور" نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضور ﷺ حالت وحی میں اس طرح زمین پر گر پڑتے تھے جس طرح کوئی شخص حالت وجد میں زمین پر گر پڑتا ہے۔ اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ زمین پر گر جانے والی بات بھی حدیث

1۔ ولیم میور، "محمد اینڈ اسلام"، (ریلیجن ٹریکٹ سوسائٹی لندن۔ س ن)، صفحہ 22

2۔ ایضاً، صفحہ 24

کا حصہ ہے لیکن اس نے خود ابتدائی سیرت نگاروں کے حوالے سے نزول وحی کی تفصیلات کا جو طویل اقتباس دیا ہے، یہ الفاظ اس اقتباس کا حصہ نہیں۔(1) نزول وحی کا جو طریق حضور ﷺ کے لئے سب سے مشکل ہوتا تھا، وہ گھنٹی کی آواز کی طرح مسلسل آواز آنے کا تھا۔ اس طریق وحی کو بھی ولیم میور نے لکھا ہے لیکن اس میں بھی گر پڑنے کا ذکر نہیں۔ غالباً ولیم میور نے مرگی کے الزام کو ثابت کرنے کے لئے حالت وحی میں حضور ﷺ کے زمین پر گر پڑنے کا افسانہ اپنے تخیل کے زور پر تراشا ہے۔

مستشرقین اسلام کے خلاف جو مفروضہ پیش کرتے ہیں، اس میں رنگ آمیزی کرنے اور اس کی تشہیر کرنے میں ان کے مشرقی شاگردان رشید بہت ماہر ہوتے ہیں۔ وہ مستشرقین کے مشن کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور بعض ایسی باتیں بھی کہہ دیتے ہیں، جو باتیں کہنے کی جرات مستشرقین کو بھی نہیں ہوتی۔ مستشرقین نے تو نزول وحی یا حضور ﷺ کے معجزات کی جو کیفیت بھی تھی، اسے ہی مرگی کا دورہ قرار دیا اور ولیم میور نے اس میں صرف یہ اضافہ کیا کہ حضور ﷺ حالت وحی میں زمین پر گر بھی پڑتے تھے، لیکن ایک مصری مسلمان عالم جو مستشرقین کی تمام تحقیقات پر ایمان کامل رکھتا ہے، اس کو حالت وحی میں حضور ﷺ کی ذات میں وہ تمام نشانیاں نظر آگئیں جو ایک مرگی کے مریض میں نظر آتی ہیں۔ علامہ محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب "حیات محمد" میں ایک مسلمان مصری عالم کا نام بتائے بغیر اس کے یہ خیالات رقم کئے ہیں:

اِنَّ مَبَاحِثَ الْمُسْتَشْرِقِیْنَ دَلَّتْهُمْ عَلٰی اَنَّ النَّبِیَّ کَانَ یُصَابُ بِالصَّرْعِ وَاَنَّ اَعْرَاضَهٗ کَانَتْ تَبْدُوْ عَلَیْهِ اِذْ کَانَ یَغِیْبُ عَنْ صَوَابِهٖ وَیَسِیْلُ مِنْهُ الْعَرَقُ وَتَعْتَرِیْهِ التَّشَنُّجَاتُ وَتَخْرُجُ مِنْ فَمِهِ الرَّغْوَةُ حَتّٰی اِذَا اَفَاقَ تَلَا عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ بِهٖ مَایَقُوْلُ اِنَّهٗ وَحْیُ اللّٰهِ اِلَیْهِ فِیْ حِیْنِ لَمْ یَکُنْ هٰذَا الْوَحْیُ اِلَّا اَثَرًا مِّنْ نَوْبَاتِ الصَّرْعِ (2)

"مستشرقین تحقیقات سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پیغمبر ﷺ مرگی کے

1۔ ولیم میور، "محمد اینڈ اسلام"، (ریلیجس ٹریکٹ سوسائٹی لندن۔ س ن)، صفحہ 23

2۔ محمد حسین ہیکل، "حیات محمد"، (مطبعہ دار الکتب المصریہ قاہرہ 1358ھ)، صفحہ 40

مریض تھے اور مرگی کی علامات آپ پر ظاہر ہوتی تھیں۔ کیونکہ آپ بے ہوش ہو جاتے تھے، آپ کا پسینہ بہنے لگتا تھا، آپ کا جسم اکڑ جاتا تھا اور آپ کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی تھی حتی کہ جب دورہ ختم ہوتا تو آپ لوگوں کو وہ پڑھ کر سناتے جس کے بارے میں آپ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے حالانکہ یہ وحی مرگی کے دوروں کے اثر کے سوا کچھ نہ تھی۔"

مصری عالم صاحب اگر مستشرقین کی تمام تحقیقات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لانے کے قائل نہ ہوتے تو وہ آسانی سے یہ کہہ سکتے تھے کہ حضور ﷺ عرب تھے، آپ نے عربوں میں اپنی حیات طیبہ کے چونسٹھ سال گزارے تھے۔ آپ کی حیات طیبہ کے ایک ایک واقعہ کو مسلمانوں نے محفوظ کیا ہے۔ جو تحقیق مسلمانوں نے حضور ﷺ کے افعال و اقوال اور آپ کے حالات زندگی کے سلسلے میں کی ہے، اس قسم کی تحقیق مستشرقین نے اپنے کسی "بڑے" کے سلسلے میں نہیں کی ہوگی۔ حضور ﷺ کی زندگی کے جو راز ان لوگوں پر منکشف نہ ہو سکے تھے جنہوں نے آپ کے ساتھ زندگیاں گزاری تھیں، وہ راز مستشرقین پر کیسے منکشف ہو گئے؟ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ یہ مصری عالم صاحب اور ان کے ہم نوا مستشرقین سے جو کچھ سنتے ہیں اسے حرف آخر یقین کر لیتے ہیں۔ انہیں اس کے صحیح یا غلط ہونے میں بحث کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

کیا حضور ﷺ نے معجزے عطا ہونے کا انکار کیا تھا؟

مستشرقین نے حضور ﷺ کو مرگی کا مریض ثابت کرنے کے لئے آپ کے معجزات کی تاویلوں کا سہارا لیا ہے۔

مستشرقین حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے غیر عادی واقعات کی تاویلیں کرتے ہیں۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ آپ کوئی معجزہ بھی دکھا سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں حضور ﷺ نے عام انسانوں کی طرح کا ہی ایک انسان ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے وہ ان آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہیں جن میں کفار نے حضور ﷺ سے کوئی معجزہ دکھانے

کا مطالبہ کیا اور آپ نے ان کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا اور انہیں کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ اس قسم کی آیات سے مستشرقین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب محمد (ﷺ) نے معجزہ دکھانے کا دعویٰ ہی نہیں کیا تو پھر وہ تمام معجزات جو آپ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہو سکتے۔

مستشرقین کا ان آیات قرآنی سے یہ نتیجہ نکالنا کلیۃً غلط ہے کیونکہ قرآن حکیم نے خود صراحت کے ساتھ حضور ﷺ کے معجزہ اسراء و معراج کو بیان کیا ہے۔ مستند اور معتبر احادیث طیبہ میں حضور ﷺ کے معجزات درج ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہجرت کی رات کفار کے محاصرے سے حضور ﷺ معجزانہ طور پر نکل گئے تھے۔ سراقہ بن مالک حملہ کرنے آیا تھا تو اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے۔ ام معبد کی بے شیر بکری نے آپ کے دست اقدس کے لگنے سے دودھ دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیمار آنکھ آپ کا لعاب دہن لگانے سے ایسی صحت یاب ہوئی تھی کہ پھر کبھی اسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ حضرت قتادہ کی نکلی ہوئی آنکھ کو آپ نے اپنی جگہ واپس رکھا تھا تو وہ صحیح و سلامت ہو گئی تھی۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی تھوڑی سی کھجوروں سے قرض خواہوں کا قرض بھی ادا ہو گیا تھا اور کھجوریں بھی بچ گئی تھیں۔ یوم بدر جنگ سے پہلے آپ نے مشرکین کے گرنے کی جگہوں کی نشاندہی کی تھی اور ہر کافر اسی جگہ گرا تھا، جو جگہ اس کے گرنے کی حضور ﷺ نے بتائی تھی۔ اصنام کعبہ فتح مکہ کے دن آپ کا اشارہ کرتے ہی گر جاتے تھے۔ جنگ خندق کے موقعہ پر ایک صاع جو سے پورے لشکر نے پیٹ بھرا تھا۔ حضور ﷺ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹے تھے اور ان سے مسلمانوں کی کثیر تعداد نے پانی پیا بھی تھا اور وضو بھی کیا تھا۔ حضور ﷺ نے پانی کے پیالے میں اپنا دست مبارک رکھا تھا جس کی برکت سے وہ پیالہ بھر پانی ستر یا اسی صحابہ کرام کو سیراب کرنے کے لئے کافی ہو گیا تھا۔ عکاشہ کو حضور ﷺ نے ایک لکڑی عطا کی تھی جو ان کے ہاتھ میں تلوار بن گئی تھی اور خندق کھودتے وقت جو چٹان کسی سے نہ ٹوٹتی تھی وہ حبیب خدا علیہ التحیہ والثناء کی ایک ہی ضرب سے ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ (1)

ہم نے سطور بالا میں حضور ﷺ کے صرف چند معجزات کی طرف اشارہ کیا ہے ورنہ حضور ﷺ کی ذات پاک سے بے شمار معجزات کا ظہور ہوا۔ مستشرقین کا یہ کہنا کہ آپ نے

1۔ تاریخ الحوادث والاحوال النبویہ، صفحہ 47-43

معجزات دکھانے کا دعویٰ نہیں کیا، باطل ہے کیونکہ حضور ﷺ نے نبوت و رسالت کا دعویٰ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو نبی یا رسول بنا کر بھیجتا ہے تو اس کی صداقت کی نشانی کے طور پر اسے معجزات عطا فرماتا ہے۔ کوئی حکومت جب کسی کو کسی دوسرے ملک میں اپنا سفیر بنا کر بھیجتی ہے تو اسے سفارت کی دستاویزات دے کر بھیجتی ہے تاکہ متعلقہ ملک کی حکومت اس شخص کو اس حکومت کا نمائندہ تسلیم کر لے جس نے اسے بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی جب اپنے رسولوں کو اپنے بندوں کے پاس بھیجتا ہے تو انہیں معجزات اس لئے عطا فرماتا ہے تاکہ وہ معجزات اس رسول کی حیثیت اور اس کی صداقت کا ناقابل تردید ثبوت قرار پائیں۔

اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن حکیم ہے اور اکثر لوگ اسی کلام کی تاثیر سے حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے شمار لوگ وہ بھی تھے جو آپ کی ذات سے معجزات کا ظہور دیکھ کر آپ کا انکار نہ کر سکے تھے۔
مستشرقین یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کی کئی آیات وضاحت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ نے معجزات دکھانے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مستشرقین جن آیات کا حوالہ دیتے ہیں ان میں سے کسی آیت میں یہ وضاحت نہیں کہ آپ نے فرمایا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے معجزات عطا نہیں فرمائے بلکہ قرآن حکیم کی ان آیات میں اس بات کا ذکر ہے کہ جب کفار حضور ﷺ سے معجزات دکھانے کا مطالبہ کرتے یا یہ کہتے کہ اگر آپ خدا کے سچے پیغمبر ہیں تو پھر آپ ہمیں کوئی معجزہ دکھائیں۔ اس کے جواب میں آپ ان سے فرماتے کہ میرا کام تمہیں عذاب آخرت سے ڈرانا اور صراط مستقیم کی طرف تمہاری راہنمائی کرنا ہے، جو میں کر رہا ہوں۔ معجزات اور نشانیاں دکھانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور یہ اسی کی قدرت میں ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کسی نبی یا رسول کے ہاتھ پر کسی معجزے کا اظہار فرما دیتا ہے۔ قرآن حکیم کی اس مفہوم کی چند آیات کریمہ پیش خدمت ہیں جن سے مستشرقین استدلال کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کو معجزات عطا نہیں ہوئے تھے۔ سورۂ رعد کی آیت نمبر 7 میں ہے:

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ
إِنَّمَآ أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ

"اور کافر کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئی ان کی طرف کوئی نشانی ان کے

رب کی طرف سے۔ آپ تو (کجروی کے انجام بد سے) ڈرانے والے
ہیں اور ہر قوم کے لئے آپ ہادی ہیں۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کافروں کی حجت بازیوں کا ذکر فرما رہا ہے کہ وہ حضور ﷺ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں تو آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوتی؟ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی طرف سے کفار مکہ کے اس اعتراض کا جواب خود دے رہا ہے اور حضور ﷺ کو فرما رہا ہے کہ آپ کو ان کی حجت بازیوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کا مقصد تحقیق حق نہیں ہے بلکہ یہ محض اعتراض برائے اعتراض کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا کام ان کی ان بے بنیاد حجت بازیوں کا جواب دینا نہیں بلکہ آپ کا فریضہ تو انسانیت کو اعمال بد کے انجام بد سے ڈرانا ہے اور ساری نسل انسانی کو راہ راست دکھانا ہے۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں اور ان کی حجت بازیوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ اس آیت کریمہ میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو کوئی معجزہ عطا نہیں فرمایا۔

سورہ انعام کی آیت نمبر 37 میں ہے:

وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ
عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰـكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

"اور بولے کیوں نہیں اتاری گئی ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف
سے۔ آپ فرمایئے بے شک اللہ تعالیٰ قادر ہے اس بات پر کہ اتارے
کوئی نشانی لیکن اکثر ان میں سے کچھ نہیں جانتے۔"

اس آیت کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ کفار مکہ کے اعتراض کے جواب میں فرما رہا ہے کہ معجزات اور نشانیاں دکھانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے کوئی مشکل نہیں کہ وہ اپنے حبیب کے ہاتھ پر جب چاہے کسی معجزے کو ظاہر فرما دے لیکن کافروں کی اکثریت اس واضح حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے یہ واضح اصول بیان فرما دیا ہے کہ کوئی رسول اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (1)

1۔ سورۃ المومن، صفحہ 78

"اور کسی رسول کی مجال نہ تھی کہ وہ لے آتا کوئی نشانی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر۔"

معجزہ، کوئی رسول بھی اپنی مرضی سے نہیں دکھاتا بلکہ جس نبی کے ہاتھ پر بھی معجزہ ظاہر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ مردے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے "قم" کہنے پر اٹھ کھڑے ہوتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن پر اٹھتے تھے۔ لادوا مریض، جو دم عیسیٰ سے شفایاب ہوتے تھے انہیں شفا اللہ تعالیٰ خود عطا فرماتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نار، اللہ تعالیٰ کے حکم سے گلزار بنی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے پانی کی تند و تیز موجیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھمی تھیں۔ اسی طرح حضور ﷺ کے سر پر بادل خدا کے حکم سے سایہ کرتے تھے۔ چاند آپ کے اشارے پر خدا کے حکم سے دو ٹکڑے ہوا تھا۔ آپ کا شق صدر آپ کی مرضی سے نہیں بلکہ پروردگار عالم کے حکم سے ہوا تھا۔

جو اصول تمام انبیاء و رسل پر لاگو ہوتا ہے وہی اصول حضور ﷺ پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ ہاں البتہ ایک فرق ضرور ہے کہ باقی انبیائے کرام کے جن معجزات کو شہرت دوام حاصل ہوئی وہ ان کے حسی معجزات تھے اور حضور ﷺ کا جو معجزہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا وہ آپ کا معنوی معجزہ قرآن حکیم ہے۔ معجزات مسیحا و کلیم کا اب صرف ذکر ہی باقی ہے، اب ان کے جلوؤں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا کسی کے لئے ممکن نہیں لیکن قرآن کا معجزہ آج بھی زندہ ہے اور اپنی قوت و تاثیر دکھا رہا ہے۔

ملت اسلامیہ کی بدقسمتی ہے کہ اس میں بھی ایک خاصا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جن کے اذہان و قلوب میں وہی عقیدہ راسخ ہو چکا ہے جس کا بیج مستشرقین نے بویا ہے۔ وہ بھی حضور ﷺ کو ایک عظیم مدبر، بے مثال واضع قانون، لاجواب منتظم اور اعلیٰ اخلاق کا نمونہ قرار دیتے ہوئے تو اپنے قلم کی جولانیاں خوب دکھاتے ہیں لیکن جب بات حضور ﷺ کی معجزانہ شان کی آتی ہے تو ان کے قلم کی سیاہی بھی خشک ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسا واقعہ جس سے حضور ﷺ کی کسی معجزانہ شان کا اظہار ہو، وہ ان کے نزدیک پایہ اعتبار سے ساقط ہوتا ہے۔

اس سوچ والے نام نہاد مسلمان حضور ﷺ کو اپنے جیسا بشر ثابت کرنے کیلئے یہاں تک پہنچ جاتے ہیں کہ آپ کو ایک بڑے بھائی سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

جس نبی کی حیثیت ایک بڑے بھائی سے زیادہ نہ ہو اس کے متعلق یہ کیسے تسلیم کر لیا

جائے کہ وہ رات کے ایک معمولی حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک گیا اور پھر عالم بالا کی سیر کر کے واپس تشریف لے آیا؟ ایسے نبی کے متعلق یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ اس کے اشارے سے سورج پلٹ آیا؟ ایسے نبی کے متعلق یہ کیسے مان لیا جائے کہ اس نے درخت کی ایک ٹہنی اپنے ایک غلام کے ہاتھ میں پکڑائی تھی تو وہ ٹہنی تلوار بن گئی تھی ؟ اور اس حیثیت کے رسول کے بارے میں یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا لعاب دہن لگنے سے حیدر کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھ کی تکلیف فوراً دور ہو گئی تھی ؟

مقام رسول کو وہ بد نصیب نہیں سمجھ سکتے جو اسے بڑے بھائی کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ بلکہ مقام رسول کی رفعتوں کی نورانی جھلک انہی خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو صدیق اکبر کی آنکھ سے خدا کے حبیب کو دیکھتے ہیں اور اس کی ذات میں انہیں ہر وہ کمال نظر آجاتا ہے جو کسی بھی دوسرے نبی یا رسول کو عطا ہوا تھا۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے جن واقعات اور کیفیات کی تعبیر مرگی کے مرض سے کی ہے، کوئی زندہ ضمیر اور عقل سلیم رکھنے والا انسان ان واقعات و کیفیات کو مرگی کے دورے قرار نہیں دے سکتا۔ مرگی کوئی ایسا مرض نہیں ہے جو پوشیدہ رہے۔ مصروع شخص جہاں بیٹھا ہو دیکھنے والے فوراً پہچان لیتے ہیں کہ یہ شخص مرگی کا مریض ہے۔ کسی غیر متعصب انسان کی عقل یہ تسلیم نہیں کر سکتی کہ کوئی مرگی زدہ شخص چونسٹھ سال زندہ رہا ہو، اس نے عمل اور ہنگاموں سے بھرپور زندگی گزاری ہو، اس کے ارد گرد انسانوں کا ہجوم رہا ہو، اور کسی دیکھنے والے کو یہ محسوس نہ ہوا ہو کہ یہ شخص مرگی کا مریض ہے۔ اس کے برعکس وہ اسے خدا کا رسول سمجھیں، وہ مرگی کے اثر سے جو کچھ کہے اسے کلام خداوندی قرار دیں اور اس کے اشارہ ابرو پر جانیں نچھاور کرنے کے لئے بے قرار رہیں۔ اور جو حقیقت ایسے شخص کے لاکھوں ہم عصروں کی نظروں سے پوشیدہ رہی ہو اسے کئی صدیاں بعد یورپ کے محققین اپنی غیر جانبدارانہ معروضی تحقیق کے بل بوتے پر تلاش کر لیں۔

طبی سائنس نے اب بہت ترقی کر لی ہے اور اس فن کے ماہرین نے مرگی کے مرض کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ حضور ﷺ کی شخصیت نے نسل انسانی کے افکار، اعمال، عادات اور کردار میں جو انقلاب برپا کیا ہے، اس کی تفصیلات بھی سامنے ہیں۔ جن باتوں کو مستشرقین مرگی کے دوروں کے دوران حضور ﷺ کی زبان پر جاری ہونے والی باتیں قرار

دیتے ہیں، ان کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف بلکہ ایک ایک حرکت محفوظ ہے۔ ایک غیر جانبدار آدمی کے لئے یہ کام بالکل آسان ہے کہ وہ حضور ﷺ کے سیاسی، معاشی، اخلاقی، روحانی، آئینی اور تنظیمی کارناموں کو پیش نظر رکھے اور پھر اپنے دماغ، دل اور ضمیر سے یہ سوال کرے کہ کیا یہ کارنامے سرانجام دینے والا شخص مرگی کا مریض ہو سکتا ہے؟

مرگی کا مرض طب جدید کی روشنی میں

ہم جدید تحقیقات کے حوالے سے مرگی کے مرض کی حقیقت، اس کی نشانیاں اور اس کے اثرات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں وہ خود یہ فیصلہ کر سکیں کہ کیا حضور ﷺ کی زندگی میں ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی نظر آتی ہے؟

چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں Epilepsy (مرگی) کے متعلق یہ تفصیلات درج ہیں:

"مرگی (Epilepsy) اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں دفعۃً بیہوشی طاری ہو اور اعصاب تنفس کے تشنج اور سانس لینے کے منفذ کے بند ہونے سے اعصاب اختیاری، بے اختیار، شدت سے پھڑکنے لگیں اور کبھی کبھی سانس بالکل بند ہو جائے۔ اس بیماری کا مریض اکثر پاگل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اس کا حافظہ جاتا رہتا ہے اور اس میں تیزی اور چستی نہیں رہتی۔ اور ایسی مردہ دلی اس پر چھا جاتی ہے جو اس کو زندگی کے معمول کے کاروبار سے معذور کر دیتی ہے۔ بد ہضمی بھی اکثر ہوتی ہے اور تمام قوائے جسمانی میں ضعف اور ناطاقتی گھر کر جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے مصروع کے چہرے سے دائمی نقاہت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ اس کے ساتھ مصروع کے ذہن میں اپنے ضعف و نقاہت کا یقین بخوبی جم جاتا ہے اور مشقت طلب اشغال سے نفرت ہو جاتی ہے۔ بالخصوص ایسے اشغال سے جن میں اس پر زیادہ لوگوں کی نظریں پڑیں۔" (1)

علامہ محمد فرید وجدی لکھتے ہیں:

اَلصَّرْعُ هُوَ دَاءٌ عَصَبِیٌّ یَعْتَرِی الْمُصَابِیْنَ بِهٖ فَیُفْقِدُهُمْ حِسَّهُمْ وَشُعُوْرَهُمْ وَیُصْرِعُهُمْ اِلَی الْاَرْضِ وَیَجْعَلُهُمْ

1۔ رسول مبین، صفحہ 7-606

يَتَخَبَّطُوْنَ– فِيْ بَدْءِ حُصُوْلِهٖ يَكُوْنُ الْجِسْمُ مُتَوَتِّرًا وَالْوَجْهُ شَاحِبًا ثُمَّ تَحْدُثُ اِرْتِجَافَاتٌ شَدِيْدَةٌ وَانْطِبَاقٌ فِي الْفَكَّيْنِ وَخُرُوْجُ زَبَدٍ مَمْزُوْجٍ بِدَمٍ مِنَ الْفَمِ وَتَنْضَمُّ الْيَدَانِ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى وَبَعْدَ مُضِيِّ بِضْعِ دَقَائِقَ يَعُوْدُ الْمَرِيْضُ اِلٰى حَالَتِهِ الْاُوْلٰى فَيَمِيْلُ لِلنَّوْمِ فَيَنَامُ ثُمَّ يَسْتَيْقِظُ كَاَنَّهٗ لَمْ يَطْرَءْ عَلَيْهِ شَيْءٌ (1)

"مرگی، اعصابی بیماری ہے جو مریضوں کے حس اور شعور کو زائل کر دیتی ہے۔ انہیں زمین پر گرا دیتی ہے اور وہ بلا مقصد ادھر ادھر پھرنے لگتے ہیں۔ بیماری کے آغاز میں جسم اکڑ جاتا ہے، چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور پھر جسم شدت سے کانپنے لگتا ہے۔ جبڑے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ منہ سے خون ملی جھاگ نکلنے لگتی ہے اور ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ چند منٹوں کے بعد مریض کی سابقہ حالت لوٹ آتی ہے۔ وہ نیند محسوس کرتا ہے اور سو جاتا ہے۔ پھر وہ جاگتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اسے کوئی عارضہ پیش نہیں آیا۔"

گرولیر انسائیکلوپیڈیا (Grolier Encyclopaedia) میں مرگی کے مرض کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

"Grandmal is characterized by the occurrence of convulsive fits. In many cases the subject has a preliminary sensation or aura, which warns him of what is going to happen. This may take the form of tingling or sensation of heat or cold in the limbs or face, flashes of light before the eyes, noises or voices in the ears, or uneasy sensations in the stomach. After an interval of varying duration the patient suddenly loses consciousness, and may fall to the ground without making any effort to save himself. Sometimes the beginning of the fit is marked by a loud cry. At first the

---

1۔ محمد فرید وجدی، "دائرہ معارف القرن العشرون"، (المکتبۃ العلمیۃ الجدیدہ بیروت)، جلد 5، صفحہ 468

muscles are rigid, the Jaws are clenched, the limbs extended, and suspension of respiration causes blueness of the face. After a few seconds, violent convulsions occur; the limbs are jerked about, muscles of the face twitch and the tongue may be severely bitten. After one or two minutes the patient passes into a state of somnolence which may be succeeded by prolonged sleep. In severe cases fits may rapidly follow each other, and consciousness may not be regained in the intervals.

Masked epilepsy is a form in which the fits are replaced by attacks of delirium or outburst of maniacal fury, during which the sufferer may commit crimes of brutal violence or destroy himself." (1)

"گرینڈ مل (مرگی کی قسم) کی خصوصیت تشنج کے دورے ہیں۔ بعض کیسوں میں مریض کو پہلے احساس ہو جاتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً اعضا یا چہرے پر گرمی یا سردی کا محسوس ہونا، آنکھوں کے سامنے روشنی کا چمکنا، کانوں میں آوازیں سنائی دینا یا پیٹ میں بے چینی محسوس کرنا۔ وقفے کے بعد (جس کی مدت مختلف ہو سکتی ہے) مریض اچانک بے ہوش ہو جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زمین پر گر پڑے لیکن وہ اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کی کوشش نہیں کرتا۔ بعض اوقات دورے سے پہلے مریض بلند آواز سے چیختا ہے۔ ابتدا میں پٹھے سخت ہو جاتے ہیں، جبڑے بھنچ جاتے ہیں، اعضا پھیل جاتے ہیں اور نظام تنفس کے معطل ہونے سے چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد تشنج کے شدید دورے پڑتے ہیں، اعضا کو جھٹکے لگتے ہیں، چہرے کے پٹھوں میں اضطراری حرکت پیدا ہوتی ہے اور زبان کے شدید طور پر زخمی ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ایک یا دو منٹ کے بعد مریض غنودگی کے عالم میں چلا جاتا ہے جس کے بعد وہ دیر تک سویا رہتا ہے۔ شدید بیماری کی شکل میں تھوڑے وقفے کے بعد دوبارہ دورے پڑ سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن

1۔ گرولیر انسائیکلوپیڈیا، (دی گرولیر سوسائٹی پبلشرز ٹورنٹو)، جلد 8، صفحہ 86

ہے کہ وقفے کے دوران بھی مریض کو ہوش نہ آئے۔ خفیہ مرگی، اس بیماری کی ایک ایسی قسم ہے جس میں دورے کے بعد مریض ہذیان یا جنون آمیز غصے کی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کے دوران وہ تشدد آمیز جرائم کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔"

فنک اینڈ ویگنلز نیو انسائیکلوپیڈیا (Funk an Wagnalls new Encyclopaedia) میں مرگی کی علامتیں یہ بتائی گئی ہیں:

"Epilepsy, chronic brain disorder characterized by repeated convulsions or seizures. The seizures are a result of underlying brain damage....... Epileptic seizures differ with the type of condition and may consist of loss of consciousness, convulsive jerking of parts of the body, emotional explosions, or periods of mental confusion". (1)

"مرگی، شدید ذہنی بیماری ہے، جس کی خصوصیت بار بار پڑنے والے دورے ہیں۔ یہ دورے ذہنی خرابی کا نتیجہ ہوتے ہیں...... مریض کی حالت کے مختلف ہونے سے دوروں کی کیفیت بدلتی رہتی ہے اور یہ دورے بے ہوشی، جسم کے مختلف اعضاء کے جھٹکوں، جذباتی غل غپاڑے یا ذہنی خلل کے وقفوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔"

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا (Encyclopaedia Britanica) میں مرگی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

"Epilepsy and epileptic fit= These terms denote a chronic clinical disorder or syndrome characterized by recurring paraxymal attacks or fits in which consciousness is lost or impaired in varying degrees with or without a succession of tonic or clonic muscular spasms........

The most common and most terrifying motor seizures

1۔ فنک اینڈ ویگنلز نیو انسائیکلوپیڈیا، (فنک اینڈ ویگنلز پبلشرز امریکہ)، جلد 9، صفحہ 320

are the generalized convulsions (grandmal epilepsy). In a typical attack, the afflicted person suddenly loses consciousness with or without a brief preliminary warning of sensory or motor character. Simultaneously with the loss of consciousness there may be sharp loud cry when the muscles of the larynx, like those of the trunk, head and extremities, suddenly go into a state of tonic or stiff contraction. The victim, if standing at the time, may fall to the ground forcibly; as the tongue is protruded between the gnashing teeth, it may be bitten. The limbs stiffen and the head is turned. The pupils dilate and the eyeballs roll upward or to one side. the face first becomes pale, but when breathing is suspended by closing of the glottis and spastic fixation of the respiratory muscles, it becomes livid or purplish in colour. After 20 to 30 seconds this phaze of seizure ends more or less abruptly, and the second or clonic phase immediately supervenes. The later is characterized by violent thoug rhythmic jerking spasms which involve the entire muscular system, usually lasting from 30 seconds to more than 100 seconds. During this period the breathing becomes deep and stertorous and foamy saliva (often blood stained) issues from the mouth. In unusually severe attacks, control of the rectum and bladder may be lsot, resulting in faecal and urinary incontinence. Following this phaze, the patient regains consciousness for a short time, but because of sheer exhaustion is prone to lapse into a deep sleep which may last for one hour or more." (1)

"مرگی یا مرگی کے دورے ایسی اصطلاحیں ہیں جو سخت طبی عدم توازن یا اس کی

1۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد 8، صفحہ 654

علامات پر دلالت کرتی ہیں۔ جن کی خصوصیت تشنج کے بار بار پڑنے والے دورے ہیں۔ جن میں ہوش یا تو بالکل جاتی رہتی ہے یا کسی حد تک کم ہو جاتی ہے۔اس میں جسم کے پٹھے کبھی پھڑ پھڑاتے ہیں اور کبھی نہیں...... عام اور سب سے زیادہ ہولناک دورے وہ ہوتے ہیں جو گرینڈ مل اپی لیپسی (Grand Mal Epilepsy) کہلاتے ہیں۔ ایک مثالی حملے میں مریض فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے۔ بے ہوش ہوتے ہی مریض بعض اوقات بلند آواز سے چیختا ہے، جب کہ نرخرے، دھڑ، سر اور ہاتھ پاؤں کے پٹھوں میں سخت اینٹھن پیدا ہو جاتی ہے۔ مریض اگر اس وقت کھڑا ہو تو زور سے زمین پر گر سکتا ہے۔ زبان جو پستے ہوئے دانتوں کے درمیان سے باہر نکلی ہوتی ہے وہ شدید زخمی ہو سکتی ہے۔ اعضا سخت ہو جاتے ہیں اور سر ایک طرف کو مڑ جاتا ہے۔ چہرہ پہلے زرد ہوتا ہے لیکن جب سانس رکتا ہے اور نظام تنفس کے عضلات میں تشنج رونما ہوتا ہے تو چہرہ پہلے نیلا اور پھر ارغوانی رنگ کا ہو جاتا ہے۔ بیس یا تیس سیکنڈ کے بعد دورے کا پہلا مرحلہ تقریباً یک لخت ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ شدید مگر متوازن جھٹکوں سے عبارت ہوتا ہے جو سارے عضلاتی نظام کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ مرحلہ عموماً تیس سیکنڈ سے لے کر سو سیکنڈ تک رہتا ہے۔ اس مرحلے میں سانس گہری ہو جاتی ہے جو خراٹوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور منہ سے جھاگ دار تھوک نکلتا ہے جس میں اکثر خون کی آمیزش ہوتی ہے۔ زیادہ سخت دوروں کی شکل میں امعائے مستقیم اور مثانے کا کنٹرول ختم ہو جاتا ہے اور مریض پیشاب اور پاخانے کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ اس مرحلے کے بعد مریض سونے کی طرف مائل ہوتا ہے اور گھنٹہ بھر یا اس سے زیادہ وقت سویا رہتا ہے۔"

ہم نے گزشتہ صفحات میں طبی ماہرین کے حوالے سے، جن میں سے اکثر کا تعلق مغرب سے ہے، مرگی کی نشانیاں تفصیل سے بیان کر دی ہیں۔ مرگی کے مریض تقریباً تمام علاقوں میں موجود ہوتے ہیں اور ہر انسان کو اس قسم کے کسی مریض پر مرگی کے دورے کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کا موقعہ بھی ملتا رہتا ہے۔ ایک عام انسان جس نے مرگی

کے کسی مریض کو دیکھا ہو، خصوصاً اس حالت میں جب اس پر مرگی کا دورہ پڑ رہا ہو، یا اس نے ماہرین طب کی بیان کردہ مرگی کی نشانیوں کا مطالعہ کیا ہو، وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ مرگی ایک ایسی بیماری ہے جو مریض کے ذہن، جسم، عضلاتی نظام اور نظام تنفس کو بیک وقت متاثر کرتی ہے۔ اکثر بیماریاں یا تو انسان کے صرف جسم کو متاثر کرتی ہیں اور یا صرف ذہن کو۔ لیکن مرگی ایسی بیماری ہے جس کا مریض کے جسم کے ہر حصے پر شدید ترین اثر پڑتا ہے۔ جب عام بیماری کی حالت میں بھی انسان کی قوت کار شدت سے متاثر ہوتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مرگی جیسی موذی بیماری کا مریض نہ صرف معمول کا کام کرتا رہے بلکہ ایسے کارنامے سرانجام دے جن کی تاریخ انسانی میں مثال ہی نہ ملتی ہو؟

مرگی کا الزام حضور ﷺ کی حیات طیبہ کی روشنی میں

مستشرقین حضور ﷺ پر مرگی کا مریض ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرگی کے دوروں کے بعد حضور ﷺ کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا، آپ اسے قرآن اور خدا کی طرف سے نازل شدہ کلام قرار دیتے تھے اور آپ کے پیروکار آپ کے اس دعوے کو تسلیم کر لیتے تھے۔

مرگی کی مذکورہ بالا نشانیوں کے مطالعہ سے انسان پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مرگی کے دورے کے بعد اول تو انسان کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہتا اور اگر اس کی زبان سے کوئی بات نکلے بھی تو وہ چند پریشان اور بے ربط جملوں کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی، لیکن مستشرقین جس کتاب کو حضور ﷺ کے مرگی کے دوروں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، یہ وہ کتاب ہے جس کے سینکڑوں ترجمے خود مستشرقین نے مغربی زبانوں میں کئے ہیں۔ اگر (نعوذ باللہ) قرآن مرگی کے دوروں کا نتیجہ تھا، تو جو مستشرقین اس کے تراجم اور تحقیق و تفحص کے کام میں صدیوں سے مصروف ہیں، وہ مرگی سے بھی بڑی کسی بیماری کے مریض قرار پائیں گے۔ کیا ان لوگوں کو اپنا نشتر تحقیق آزمانے کے لئے کسی صحیح العقل اور صحیح الجسم انسان کی تصنیف نہیں ملی کہ وہ ایک ایسی کتاب کی تحقیق میں اپنی زندگیاں صرف کر رہے ہیں جس کے مصنف کو وہ مرگی جیسے موذی اور تباہ کن مرض کا مریض قرار دیتے ہیں؟

گوئٹے اور قرآن حکیم

مستشرقین کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جس کلام کو مرگی کے دوروں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، اس کلام نے ان کے عظیم شاعر "گوئٹے" کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس نے قرآن حکیم کے مختلف جرمن اور لاطینی ترجمے پڑھے۔ بار بار پڑھے اور پھر ان قرآنی آیات کا انتخاب کیا جنہوں نے اپنی علمی اور ادبی رفعتوں کی وجہ سے اسے ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ (1) گوئٹے نے جن قرآنی آیات کو اپنے خصوصی مطالعہ کے لئے منتخب کیا تھا، ان کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ یہ کسی مرگی زدہ شخص کی زبان سے نکلنے والے بے ربط جملے نہیں بلکہ خدائے قادر و قہار کا وہ کلام ہے جس نے فصحائے عرب کو بھی ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا تھا اور جس کی بلاغت کے سامنے "گوئٹے" جیسے مغربی شاعر نے بھی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

"گوئٹے" نے آیات قرآنی کے وہ تراجم ہی پڑھے تھے جو غیر مسلموں کے قلم سے نکلے تھے، اس کے باوجود وہ ان سے اتنا متاثر ہوا تھا، اگر وہ قرآن عربی کو خود براہ راست سمجھنے کے قابل ہوتا تو نتیجہ یقیناً مختلف ہوتا۔ گوئٹے نے جن آیات قرآنی کا انتخاب کیا تھا ہم ان میں سے صرف چند آیات یہاں درج کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2)

"ہاں! جس نے جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لئے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اپنے رب کے پاس۔ نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔"

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (3)

"اور مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی۔ سو جدھر بھی تم رخ کرو

1۔ زکریا ہاشم زکریا، "المستشرقون والاسلام"، (المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ۔ 1965)، صفحہ 82-181

2۔ سورۃ البقرہ: 112

3۔ سورۃ البقرہ: 115

وہیں ذات خداوندی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ فراخ رحمت والا خوب جاننے والا ہے۔"

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (1)

"بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی گردش میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں، وہ چیزیں اٹھائے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو اور جو اتارا اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا دیے اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں اور بادل میں جو حکم کا پابند ہو کر آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکتا رہتا) ہے (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔"

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (2)

"اور مثال ان کی جنہوں نے کفر (اختیار) کیا ہے ایسی ہے جیسے کوئی چلا رہا ہو ایسے (جانوروں) کے پیچھے جو کچھ نہیں سنتے سوائے خالی پکار اور آواز کے۔ یہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔"

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (3)

1۔ سورۃ البقرہ 164

2۔ سورۃ البقرہ 171

3۔ سورۃ آل عمران 144

"اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (اللہ کے) رسول۔ گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول۔ تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیئے جائیں، پھر جاؤ گے تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے) اور جو پھرتا ہے الٹے پاؤں تو نہیں بگاڑ سکے گا اللہ کا کچھ بھی۔ اور جلدی اجر دے گا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو۔"

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (1)

"اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر۔ البتہ اللہ (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے۔ سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور اگر تم ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔"

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا (2)

"ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں کفر و ایمان کے درمیان۔ نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔ اور جس کو گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لئے ہدایت کا راستہ۔"

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ (3)

1۔ سورۃ آل عمران: 179

2۔ سورۃ النساء: 143

3۔ سورۃ المائدہ: 65-66

"اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیز گار بنتے تو ہم ضرور دور کر دیتے ان سے ان کی برائیاں اور ہم ضرور داخل کرتے انہیں نعمت کے باغوں میں۔ اور اگر وہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو (اپنے عمل سے) اور جو نازل کیا گیا ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے (تو فراخ رزق دیا جاتا انہیں حتی کہ) وہ کھاتے اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی۔ ان میں سے ایک جماعت اعتدال پسند بھی ہے اور اکثر ان میں سے، بہت برا ہے جو کر رہے ہیں۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَ اِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَلَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ

"اے ایمان والو! مت پوچھا کرو ایسی باتیں کہ اگر ظاہر کی جائیں تمہارے لئے تو بری لگیں تمہیں اور اگر پوچھو گے ان کے متعلق جب کہ اتر رہا ہے قرآن تو ظاہر کر دی جائیں گی تمہارے لئے۔ معاف کر دیا ہے اللہ نے ان کو۔ اور اللہ بہت بخشنے والا بڑے علم والا ہے۔ تحقیق پوچھا تھا ان کے متعلق ایک قوم نے تم سے پہلے، پھر وہ ہو گئے ان احکام کا انکار کرنے والے۔"

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (1)

"اور اسی طرح ہم نے دکھا دی ابراہیم کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں۔"

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (2)

1۔ سورۃ الانعام 75

2۔ سورۃ یونس 10

"(بہار جنت کو دیکھ کر) ان کی صدا وہاں یہ ہو گی: پاک ہے تو اے اللہ! اور ان کی دعا یہ ہو گی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی آخری پکار یہ ہو گی کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کو۔"

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ (1)

"آپ نے دعا مانگی: اے میرے پروردگار! کشادہ فرمادے میرے لئے میرا سینہ۔"

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (2)

"پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔ بے شک اس میں (اس کی قدرت کی) نشانی ہے ایمان والوں کے لئے۔"

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (3)

"اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے اپنے دائیں ہاتھ سے (اگر آپ لکھ پڑھ سکتے) تو ضرور شک کرتے اہل باطل۔"

وَقَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (4)

"اور انہوں نے کہا: کیوں نہ اتاری گئیں ان پر نشانیاں ان کے رب کی طرف سے۔ آپ فرمائیے: نشانیاں تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔"

قرآن حکیم کی جن آیات کریمہ نے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے دامن دل کو کھینچ لیا

1۔ سورۂ طٰہٰ: 25
2۔ سورۂ عنکبوت: 44
3۔ سورۂ عنکبوت: 48
4۔ سورۂ عنکبوت: 50

تھا اور اس نے ان آیات کریمہ کو اپنے پاس علیحدہ لکھ رکھا تھا، ہم نے ان میں سے چند آیات کریمہ یہاں درج کر دی ہیں۔ ایک منصف مزاج اور بے تعصب قاری خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جس زبان سے معارف کے یہ موتی جھڑے ہوں، وہ زبان کسی مرگی زدہ انسان کی ہو۔

ہم مستشرقین کی خدمت میں گزارش کرتے ہیں کہ وہ ان آیات کریمہ پر ایک مسلمان کی نظر سے غور کرنے کے لئے تیار نہیں تو نہ سہی، لیکن وہ ان آیات کو کم از کم اس نظر سے تو دیکھ لیں جس نظر سے ان آیات کو ان کے مشہور غیر مسلم شاعر گوئٹے نے دیکھا تھا۔

آیات قرآنی کی یہ فصاحت، یہ بلاغت، یہ حسن، یہ گہرائی، یہ رعب، یہ وقار، یہ جمال اور یہ جلال، ان ہی آیات کریمہ تک محدود نہیں جو گوئٹے نے منتخب کی تھیں بلکہ قرآن حکیم کی ہر آیت کریمہ کی شان یہی ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب کسی ایک آیت کریمہ نے کسی انسان کی زندگی بدل دی۔

قرآن حکیم کے متعلق مستشرقین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کا اصل مقصد تو قرآن حکیم کی تاثیر کو کم کرنا تھا لیکن اس مقصد کے باوجود کئی مستشرقین کے قلم سے قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کے متعلق سچی باتیں نکل گئی ہیں۔ مستشرق "طیبون" قرآن حکیم کے متعلق لکھتا ہے:

اس کتاب کی عظمت و بزرگی کے لئے یہی ایک حقیقت کافی ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس کے اسلوب کی تازگی میں ذرا فرق نہیں آیا اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کتاب کل ہی منظر وجود پر آئی ہو۔ (یہ قرآن لانے والا) نبی صرف آخرت کو سنوارنے کی ہی دعوت نہیں دیتا بلکہ اس نے اپنے پیروکاروں کو یہ بھی حکم دیا ہے کہ وہ اس دنیا میں سے اپنے حصے کی نعمتوں سے مستفید ہوں۔ (1)

فرانسیسی مستشرق "بلانشر" کہتا ہے:

محمد (ﷺ) کا شمار تاریخ کی مشہور ترین شخصیات میں ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے بیک وقت تین عظیم کارنامے سرانجام دیئے:

1۔ ایک مردہ قوم کو حیات نو عطا کی۔

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 165

2۔ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی۔
3۔ایک عظیم دین کی بنیاد رکھی۔(1)

ڈاکٹر مورس بکائلے قرآن حکیم کے متعلق کہتا ہے:

"قرآن وہ افضل ترین کتاب ہے جو عنایت الٰہیہ نے بنی نوع انسان کے لئے ظاہر فرمائی۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔"

"ھنری۔ دی کاستری" کہتا ہے: "قرآن حکیم افکار پر غلبہ پالیتا ہے اور دلوں کو قابو کر لیتا ہے۔ یہ کتاب محمد (ﷺ) پر ان کی صداقت کی دلیل بن کر نازل ہوئی۔"(2)

الکس لوازون اس کتاب مقدس کے بارے میں کہتا ہے:

"محمد (ﷺ) نے اپنے پیچھے ایک ایسی کتاب چھوڑی ہے جو بلاغت کی نشانی اور اخلاق کا نمونہ ہے۔ یہ ایک مقدس کتاب ہے۔ جدید سائنسی انکشافات کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو اسلام کی بنیادوں سے متعارض ہو۔ قرآن حکیم کی تعلیمات اور طبعی قوانین میں مکمل ہم آہنگی موجود ہے۔"(3)

"واشنگٹن اروِنج" کی رائے قرآن حکیم کے بارے میں یہ ہے:

"قرآن حکیم ایسی تعلیمات پر مشتمل ہے جو خالص ہیں اور فوائد سے پر ہیں۔"(4)

مغربی علماء کے مندرجہ بالا تاثرات اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ قرآن حکیم ایک ایسی کتاب ہے جو انسان کے دل ودماغ پر چھا جاتی ہے۔ اگر قرآن حکیم (نعوذ باللہ) ایک مرگی زدہ شخص پر پڑنے والے مرگی کے دوروں کا نتیجہ ہوتا تو لیبون، بلانشر، مورس بکائلے، ھنری دی کاستری، الکس لوازون، واشنگٹن اروِنج اور گوئٹے جیسے لوگ اس کی عظمتوں کو سلام نہ کرتے اور اس کا ذکر ہی کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔

ایک ایسی کتاب جس کو دنیا کے ایک ارب سے زیادہ انسان اپنا دستور حیات یقین کرتے ہیں، جس کے مخالفین، صدیوں سے اس کی تنویرات کو مدھم کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور

1۔المستشرقون والاسلام، صفحہ 65
2۔ایضاً
3۔ایضاً
4۔ایضاً

جس کی تلاوت کی صدائیں روزانہ دنیا کے کونے کونے سے اٹھ رہی ہیں، اس بے مثال کتاب کو مرگی کے دوروں کا نتیجہ قرار دینا اور جس شخص نے وہ کتاب بنی نوع انسان کے سامنے پیش کی، اسے مرگی کا مریض کہنا، خصوصاً ان لوگوں کی طرف سے جو علماء اور محققین کہلاتے ہیں، عقل کا بھی قتل ہے اور انصاف کا بھی، تاریخ کا بھی قتل ہے اور انسانیت کا بھی۔

آپ قرآن حکیم کی آیات طیبہ کو دیکھ لیں یا حضور ﷺ کی پاکیزہ زندگی کے کارناموں کو دیکھ لیں، اور پھر فیصلہ کریں کہ کیا اس قسم کی زندگی وہ شخص گزار سکتا ہے جو مرگی کا مریض ہو؟ اور کیا اس مریض کی زبان سے وہ کلام نکل سکتا ہے جو فصاحت و بلاغت کا نادر نمونہ اور علوم و معارف کا بحر ناپید اکنار ہو۔

حضور ﷺ نے مکہ میں بتوں کے خلاف اس وقت آواز اٹھائی جب سارا مکہ بت پرست تھا اور انہوں نے خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت سجا رکھے تھے۔ وہ ان بتوں کی عبادت کو ہی کمال انسانیت سمجھتے تھے۔ یہ نعرہ لگا کر آپ نے ساری قوم کی مخالفت مول لی۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے ساری قوم کا مقابلہ کیا۔ آپ نے صرف اہل مکہ ہی کا نہیں سارے جزیرہ عرب کا مقابلہ کیا۔ آپ نے ان سب کا اس کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا کہ دنیا نے ان لوگوں کو آپ کے جھنڈے تلے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے دیکھا، جو برسوں آپ کی شمع حیات کو گل کرنے کے درپے رہے تھے۔ آپ نے جزیرہ عرب سے بت پرستی کو ختم کیا، بت پرستوں کو بت شکن بنایا، ہبل کی عظمت کے نعرے بلند کرنے والوں کے اپنے ہاتھوں سے ہبل کو ریزہ ریزہ کرایا، خون کے پیاسوں کو آپس میں بھائی بھائی بنایا، جنسی بے راہ روی کو ختم کیا، شراب جن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی ان کے دلوں میں شراب کی نفرت پیدا کی، نسلی افتخار کے ماحول میں آنکھ کھولنے والوں کی زبان سے ایک حبشی غلام کے لئے "سیدنا" کے کلمات نکلوائے، نظم وضبط سے عاری عربوں کو نظم وضبط کے میدان میں دنیا کا معلم بنایا، آپ نے توحید کی شمع کو اس ماحول میں روشن کیا جہاں شرک اور جہالت کی شب دیجور میں فسق وفجور کی آندھیاں زور شور سے چل رہی تھیں، آپ نے اس شمع کو نہ صرف روشن رکھا بلکہ اس کی تنویرات سے شرک و جہالت کی شب دیجور سحر آشنا ہو گئی، فسق و فجور کی آندھیاں تھم گئیں اور ہر طرف سے صدا آنے لگی:

"حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل کا مقدر ہی مٹ جانا ہے۔"

آپ نے صدیوں سے باہم برسرپیکار اوس اور خزرج کے قبائل کو بھائی بھائی بنایا، آپ نے مکہ سے ہجرت کر کے آنے والوں اور مدینہ کے مقامی باشندوں کے درمیان اخوت کا وہ رشتہ قائم کیا جو صرف آپ ہی کا حصہ ہے، آپ نے ایک بھرپور خانگی زندگی گزاری، مسلمانوں کے لئے، آپ بیک وقت، ایک رسول بھی تھے، امام اور خطیب بھی تھے، قانون ساز بھی تھے، منصف اعلیٰ بھی تھے، منتظم اعلیٰ بھی تھے اور فوجوں کے کمانڈر انچیف بھی، آپ نے اہل کتاب، یہود و نصاریٰ کو دلیل کے میدان میں لاجواب کیا تھا، رکانہ کو کشتی کے مقابلے میں پچھاڑا تھا، ابو جہل اور ابو سفیان جیسے سرداروں کو جنگ کے میدان میں پے در پے شکستیں دی تھیں، جنگ احد اور جنگ خندق کے نازک ترین حالات میں نہ صرف اپنا بلکہ اپنی فوج کا بھی مورال بلند رکھا تھا اور آپ نے عرب کی معاشی، معاشرتی اور مذہبی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا، کیا مستشرقین کے نزدیک یہ کارنامے ایک مرگی کا مریض سرانجام دے سکتا ہے جسے تشنج کے دورے ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیتے ہیں، جسے اپنی بے کسی اور بے بسی کا شدید احساس ہوتا ہے، جو ایسے کاموں سے دور بھاگتا ہے جن میں لوگوں کی نظریں اس پر پڑنے کا امکان ہو، جو سستی اور کاہلی کی طرف مائل ہو اور جسے کسی بھی وقت مرگی کا دورہ پڑ سکتا ہو؟

حضور ﷺ نے ہجرت کے بعد اپنی ساری زندگی مسجد نبوی میں نمازوں کی امامت کی اور خطبے دیئے، کیا مستشرقین بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ان فرائض میں مرگی کی وجہ سے کبھی خلل پڑا؟

حضور ﷺ نے بے شمار جنگوں میں فوجوں کی قیادت خود کی، کیا اپنے سے کئی گنا زیادہ فوجوں کے مقابلے میں لشکر کی قیادت ایک مرگی زدہ شخص کو سونپنا کسی جنگی ضابطے کی رو سے ممکن تھا؟

مرگی زدہ شخص تو دیکھنے والوں کے لئے سامان عبرت ہوتا ہے۔ نقاہت اور بیماری اس کے انگ انگ سے ٹپک رہی ہوتی ہے اور دیکھنے والے اس کے لئے ہمدردی کے دو بول بولنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن مستشرقین جس ہستی کو مرگی کا مریض قرار دینے کی جسارت کر رہے ہیں، اس کے رخ انور کو جو دیکھتا ہے سو جان سے نثار ہوتا ہے۔ مستشرقین

حضور ﷺ کے سراپے کی اس تصویر کشی پر ایک نظر ڈالیں جو ایک بدو عورت کے ذہن کی سادگی اور زبان کی بلاغت کا عکس ہے۔ ام معبد نے اپنے خیمے میں چند گھڑیاں گزارنے والے مہمان گرامی کے رخ انور کا مشاہدہ کیا اور پھر اس کے سراپے کو ان الفاظ میں بیان کیا:

"میں نے ایک ایسا مرد دیکھا ہے جس کا حسن نمایاں تھا۔ جس کی ساخت بڑی خوبصورت اور چہرہ ملیح تھا۔ نہ بڑھی ہوئی توند اسے معیوب بنا رہی تھی اور نہ پتلی گردن اور چھوٹا سر اس میں نقص پیدا کر رہا تھا۔ بڑا حسین بہت خوب رو، آنکھیں اور پلکیں لانبی۔ اس کی آواز گونج دار تھی۔ سیاہ چشم، سرگیں۔ دونوں ابرو باریک اور ملے ہوئے۔ گردن چمکدار تھی۔ ریش مبارک گھنی تھی۔ جب وہ خاموش ہوتے تو پر وقار ہوتے۔ جب گفتگو فرماتے تو چہرہ پر نور اور بارونق ہوتا۔ شیریں گفتار۔ گفتگو واضح ہوتی، نہ بے فائدہ ہوتی اور نہ بیہودہ۔ گفتگو موتیوں کی لڑی ہوتی جس سے موتی جھڑ رہے ہوتے۔ دور سے دیکھنے پر سب سے زیادہ بارعب اور جمیل نظر آتے اور قریب سے دیکھا جاتا تو سب سے زیادہ خوب رو اور حسین دکھائی دیتے۔ قد درمیانہ تھا، نہ اتنا طویل کہ آنکھوں کو برا لگے، نہ اتنا پست کہ آنکھیں حقیر سمجھنے لگیں۔ آپ دو شاخوں کے درمیان ایک شاخ کی مانند تھے جو سب سے زیادہ سر سبز و شاداب اور قد آور ہو۔ ان کے ساتھی تھے جو ان کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ اگر آپ انہیں کچھ کہتے تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتے۔ اگر آپ ان کو حکم دیتے تو وہ فوراً اس کو بجا لاتے۔ سب کے مخدوم۔ سب کے محترم۔ نہ وہ ترش رو تھے اور نہ ان کے فرمان کی مخالفت کی جاتی تھی۔" (1)

ہم مستشرقین سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ حسن و جمال کا وہ سراپا جس کی تصویر کشی ام معبد نے مندرجہ بالا الفاظ میں کی ہے، کیا کوئی صاحب ذوق سلیم، اسے مرگی کا مریض قرار دے سکتا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ حسن و جمال کے اس پیکر کو مرگی کا مریض وہی شخص قرار دے سکتا ہے جو پرلے درجے کا بدذوق ہو اور حسد و تعصب نے اسے عقل سلیم کی دولت سے محروم کر دیا ہو۔

1۔ ضیاء النبی، جلد 3، صفحہ 90-88

مستشرقین حضور ﷺ کے مردانہ حسن و جمال سے بھی واقف ہیں اور آپ نے جو کامیاب ترین زندگی گزاری اور اس میں جو محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے انہیں بھی وہ بخوبی جانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ حضور ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دینے میں خجالت محسوس نہیں کرتے۔ مستشرقین کے اس حیران کن رویے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آج کل عالم عیسائیت میں جو مذہب عیسائیت کے نام سے مروج ہے، اس کا بانی سینٹ پال مرگی کا مریض تھا۔ ممکن ہے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اگر سینٹ پال جیسا بڑا آدمی مرگی کا مریض ہو سکتا ہے تو پھر کوئی دوسرا عظیم انسان مرگی کا مریض کیوں نہیں ہو سکتا۔

یاد رہے کہ سینٹ پال پر مرگی کا مریض ہونے کا الزام ہم نہیں لگا رہے بلکہ ان کے سر پر یہ تاج ان کے اپنے پیروکاروں نے رکھا ہے۔ کولیر انسائیکلوپیڈیا (Collier Encyclopaedia) میں ان مشہور لوگوں کی فہرست دی گئی ہے جو مرگی کے مریض تھے۔ ان میں سینٹ پال کا نام بھی شامل ہے۔(1)

سینٹ پال کو، اس کے پیروکار اگر مرگی کا مریض تسلیم کرتے ہیں تو وہ یقیناً ایسا ہوگا لیکن اس پر قیاس کر کے حضور ﷺ کو مرگی کا مریض قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ دونوں کے کاموں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حضور ﷺ نے دین متین کا قصر رفیع ہدایات ربانی کی روشنی میں اپنی خداداد حکمت اور ان تھک جدوجہد سے تعمیر کیا تھا اور سینٹ پال نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعمیر کردہ دین کے محل کو زمین بوس کیا تھا۔ کوئی عظیم الشان عمارت تعمیر کرنے کے لئے صحت مند ذہن اور طاقت ور جسم کی ضرورت ہوتی ہے اور بنی ہوئی عمارت کو گرانے کا کام ایک مریض ذہن زیادہ کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔

سینٹ پال نے خالص توحید کے عقیدے کو تثلیث کے شرکیہ عقیدے میں بدلا، تورات و انجیل کے احکام کو کالعدم قرار دیا، جو دین صرف بنو اسرائیل کی راہنمائی کے لئے نازل ہوا تھا اسے عالمی دین بنانے کی کوشش کی۔ اس نے صلب مسیح کو تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ قرار دے کر دنیائے عیسائیت کو احساس ذمہ داری اور اعمال کی جوابدہی کے احساس سے محروم کیا۔ اس نے خدا کے ایک مقدس رسول کو، جو ساری زندگی توحید کا اعلان اور پرچار کرتے رہے، خدا اور خدا کا بیٹا قرار دیا۔ وہ کبھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو،

1۔ رسول مبین، صفحہ 616، بحوالہ کولیئر انسائیکلوپیڈیا، جلد 9

دوبارہ جی اٹھنے کے بعد، دیکھنے کا دعوی کرتا ہے اور کبھی دعوئی کرتا ہے کہ خدا نے اپنے بیٹے کو اس میں ظاہر کیا ہے۔(1)

ایسے منفی کاموں کے لئے ایک بیمار ذہن واقعی بڑا تیز ہوتا ہے۔ سینٹ پال نے جو دین ایجاد کیا تھا اس کے پیروکار علماء کو آگ میں جلانے کی سزائیں دیتے رہے اور روزانہ غسل کرنے والوں پر مخالفت دین کی فرد جرم عائد کرتے رہے۔ آج بھی اس دین کے پیروکار لاکھوں انسانوں کا خون کر کے قہقہے لگاتے ہیں اور چند پرندوں کے مرنے پر آنسو بہاتے ہیں۔ جس شخص نے ایسا دین ایجاد کیا تھا وہ یقیناً مرگی کا مریض ہوگا۔ وہ مرگی کا مریض ہی تھا اسی لئے اس نے ان تمام انجیلوں کو طاقت کے زور پر تلف کر دیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر مشتمل تھیں اور ان کے بدلے میں ایسی خود ساختہ انجیلوں کو رواج دیا تھا جن میں اس کے مرگی زدہ ذہن کے تخلیق کردہ عقائد اور خیالات تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری برناباس جنہوں نے سینٹ پال کی معیت میں رہ کر اس کی عادات و خیالات کو انتہائی قریب سے دیکھا تھا، وہ عیسائیوں کو سینٹ پال کے شر سے محفوظ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب کا آغاز ہی مندرجہ ذیل عبارت سے کرتے ہیں:

"Dearly beloved, the great and wonderful God hath during these past days visited us by his prophet Jesus christ in great mercy of teaching and miracles, by reason whereof many, being deceived of satan, under pretence of piety, are preaching most impious doctrine, calling Jesus son of God, repudiating the circumcision ordained of God for ever and permitting every unclean meat = among whom also paul hath been deceived, whereof I speak not without grief; for which cause I am writing that truth which I have seen and heard, in the intercourse that I have had with Jesus, in order that ye may be saved, and not be deceived. Therefore beware of everyone that preacheth unto you new doctrine contrary to that which

---

1۔ رسول مبین، صفحہ 617، بحوالہ کولیئر انسائیکلوپیڈیا، جلد 9

I write, that ye may be saved eternally'. (1)

"عزیزو! گزشتہ عرصہ میں عظیم و برتر خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ہمیں اپنے جلوے دکھائے ہیں اور تعلیمات اور معجزات کی شکل میں ہم پر اپنی بے پناہ رحمت نازل فرمائی ہے۔ اس وجہ سے بہت سے لوگوں کو شیطان نے گمراہ کر دیا ہے اور وہ نیکی اور تقویٰ کے نام پر انتہائی برے عقیدے کا پرچار کر رہے ہیں۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ ختنے کا انکار کرتے ہیں، جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے حکم دے رکھا ہے اور ہر نجس گوشت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ پال بھی ان لوگوں میں سے ہے جو شیطان کے دھوکے میں آگئے ہیں اور یہ بات میں بڑے دکھ کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ ان وجوہات کی بنا پر میں وہ حقائق قلمبند کر رہا ہوں، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے سنے یا دیکھے ہیں تاکہ تم محفوظ رہو اور شیطان کے دھوکے میں آکر اپنی آخرت تباہ نہ کر بیٹھو۔ لہٰذا میری اس تحریر کے خلاف جو بھی تمہارے سامنے کسی دوسرے عقیدے کا پرچار کرے، اس سے ہوشیار رہو تاکہ تم ابدی نجات پاؤ۔"

برنباس کا یہ اقتباس بتا رہا ہے کہ پال نے لوگوں کو دین عیسوی کی نہیں بلکہ گمراہی کی دعوت دی اور وہ حق کا داعی نہیں بلکہ جھوٹ کا پرچارک تھا۔ "سپرنگر" نے ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ "صرع کا مریض جھوٹ اور فریب کا رجحان رکھتا ہے۔" (2) سپرنگر نے اپنا یہ قاعدہ حضور ﷺ پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سپرنگر کا یہ قاعدہ حضور ﷺ پر تو لاگو نہیں ہو سکتا کیونکہ چالیس سال کی عمر تک، جب تک کہ آپ کے اہالیان شہر آپ کو حسد اور تعصب کی عینکوں کے بغیر دیکھتے رہے، وہ آپ کو صادق اور امین کہتے رہے اور آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ آپ کی صداقت اور خلوص کی دلیل ہے، لیکن سپرنگر کا یہ قاعدہ سینٹ پال پر ضرور لاگو ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا ساتھی جو اس کے ساتھ تبلیغ کی مہم پر نکلا تھا اور اس نے اس کے شب و روز کو قریب سے دیکھا تھا، وہ اس کے کذب و افتراء سے آگاہ ہو

1۔ برنباس، "دی گاسپل آف برنباس"، (بیگم عائشہ باوانی وقف کراچی۔ 1975ء)، صفحہ 2

2۔ رسول مبین، صفحہ 613

کر اس سے علیحدہ ہوا اور وہ اپنی کتاب کا آغاز لوگوں کو سینٹ پال سے محفوظ رہنے کی نصیحت کے ساتھ کر رہا ہے۔

علامہ احسان الحق سلیمانی نے ڈاکٹر فریڈرک سٹراس (Friedrich Strauss) کا ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے جس میں "سٹراس" نے پال کی تحریروں کا تجزیہ کر کے اس کی شخصیت کا بھرم کھولا ہے۔ سٹراس کی اس تحقیق کے مطالعہ کے بعد آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ واقعی "پال" نے جس قسم کی زندگی گزاری اور اس نے جس قسم کے افکار کا پرچار کیا، ان سے اس کے دماغ کے مرگی زدہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر سٹراس کا یہ طویل اقتباس "رسول مبین" کے صفحات 616 تا 624 پر درج ہے۔ قارئین کے لئے اس اقتباس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

علامہ زکریا ہاشم زکریا نے اپنی کتاب "المستشرقون والاسلام" میں حضور ﷺ پر لگائے جانے والے مرگی کے الزام کی خوب تردید کی ہے۔ وہ اس الزام کی تردید میں لکھتے ہیں کہ عصبی امراض کے ماہرین نے حضور ﷺ پر لگائے جانے والے اس الزام کی شدت سے تردید کی ہے کیونکہ مرگی ایک نفسیاتی مرض نہیں جیسا کہ کچھ لوگ گمان کرتے ہیں بلکہ یہ مرض دماغ میں طبی تغیرات رونما ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ ماہرین نے علمی طور پر ثابت کیا ہے کہ مرگی کے متعدد کیسوں میں مریض کا شعور مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے اور عقلی خلل ہی مرگی کے مرض کی بنیادی نشانی ہوتی ہے۔ مریض کسی حد تک ان نفسیاتی تجربات کو دورے کے بعد بھی یاد رکھ سکتا ہے، جن سے وہ دورے کے درمیان گزرا ہوتا ہے۔ یہ تجربات انفعالات کی شکل میں ہوتے ہیں۔ مثلاً مریض دورے کے دوران سیاہ رنگ کی کسی چیز کو دیکھتا ہے جو اسے ڈراتی ہے لیکن وہ اس چیز کی شکل و صورت بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اور مریض اپنے تمام دوروں میں اس تجربے سے گزرتا ہے۔ کوئی مریض آوازیں سنتا ہے یا یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے کانوں میں موسیقی کی آواز آرہی ہے لیکن وہ موسیقی کے کلمات کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مریض کوئی مخصوص گانا گانے لگتا ہے، یہ گانا عموماً ایسا ہوتا ہے جو مریض نے بچپن میں اپنی ماں کی گود میں سنا تھا اور مریض کو ہر دورے میں وہی گانا گاتے ہوئے سنا جاتا ہے۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دورے کی حالت میں مریض جو کچھ سنتا، دیکھتا یا بولتا ہے، وہ وہی چیزیں ہوتی ہیں

جو اس کی زندگی میں پہلے پیش آچکی ہوتی ہیں اور وہ اس کے تحت الشعور میں محفوظ ہوتی ہیں۔ ماہرین نے یہ تجربہ بھی کیا ہے کہ انہوں نے مرگی کے مریض کے دماغ کو برقی لہروں کے ذریعے حرکت دی تو مریض کی زبان سے وہی کلمات نکلے جو وہ مرگی کی حالت میں دوہراتا ہے۔

جب ہم مرگی کی مذکورہ بالا نشانیوں کو حضور ﷺ پر منطبق کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مرگی کا مریض دورے کی حالت میں اپنی قدیم یادداشتوں ہی میں سے کسی کو دوہراتا ہے، اس کے لئے یہ قطعاً ممکن نہیں ہوتا کہ وہ دورے کے دوران کوئی چیز تالیف کر سکے۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ مرگی کے دورے کی حالت میں انسان ان قوانین، آداب، قصص اور علوم وغیرہ کی تخلیق کر سکے جن پر قرآن حکیم مشتمل ہے۔ مرگی کی حالت میں یہ ممکن نہیں کہ انسان کی زبان فصیح و بلیغ ہو جائے کیونکہ فصاحت و بلاغت تو تعلیم کی محتاج ہوتی ہے اور مرگی کا دورہ تو دماغی خلل کا نام ہے۔ قرآن حکیم فصیح و بلیغ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مرگی کے دوروں کا نتیجہ نہیں بلکہ علیم و خبیر خدا کا کلام ہے جس نے اسے اپنے حبیب پر نازل فرمایا۔ مریض دورے کے دوران ایک ہی قسم کے خیالات کو دوہراتا ہے اور ان کو بھی وضاحت سے بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتا، جب کہ قرآن حکیم کی آیات بالکل واضح ہیں اور ایک دوسری کی تکمیل اور وضاحت کرتی ہیں۔ یہ آیات ان تمام امور کو محیط ہیں جن کا تعلق انسان کی دینی یا دنیوی زندگی سے ہو۔ کیا ان حقائق کے بعد کسی کے لئے یہ کہنا ممکن ہے کہ قرآن حکیم حضور ﷺ کے مرگی کے دوروں کا نتیجہ ہے؟ مرگی کا دورہ تو مریض کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ دورہ اس کے پورے جسم کو بری طرح جھنجھوڑتا ہے اور وہ دورہ ختم ہونے کے بعد بھی انتہائی نقاہت محسوس کرتا ہے۔ ایک مریض جو اس تکلیف دہ تجربے سے گزرا ہو یقیناً وہ اس دورے کے ختم ہونے کے بعد سکون اور راحت محسوس کرتا ہوگا۔ کوئی صاحب عقل سلیم انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب مرگی کے مریض کا دورہ ختم ہو تو وہ اس دورے کے ختم ہو جانے پر اور دوبارہ دورہ نہ پڑنے کی وجہ سے پریشان ہوتا ہو، حالانکہ حضور ﷺ پر کچھ عرصہ نزول وحی میں وقفہ ہوا تو یہ عرصہ حضور ﷺ کے لئے انتہائی حزن و ملال کا باعث بنا اور اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی اس پریشانی کو کم کرنے کیلئے آپ کو تسلی دی اور پیار بھرے

الفاظ میں فرمایا:

وَالضُّحٰیۙ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰیۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰیؕ

"قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جب وہ سکون کے ساتھ چھا جائے۔
نہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ ہی وہ ناراض ہوا۔" (1)

حضور ﷺ پر قرآن حکیم تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً تئیس سال کے عرصہ میں نازل ہوا۔ آپ پر گھر میں بھی وحی کا نزول ہوتا، مسجد میں بھی اور سفر میں بھی۔ جو لوگ حضور ﷺ کو نزول وحی کی حالت میں دیکھنے کا شرف حاصل کرتے تھے ان میں صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما جیسے راست باز، بے باک اور مدبر لوگ بھی تھے، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے مردان پاکباز بھی اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما جیسی ذہین و فطین خواتین بھی۔

یہ لوگ مرگی کے مریضوں کی کیفیات سے بھی واقف تھے لیکن ان میں سے کسی کو، نزول وحی کی حالت میں حضور ﷺ پر مرگی کے دورے کے آثار نظر نہ آئے۔ سورۂ فتح کا نزول بیعت رضوان کے سینکڑوں شرکاء کی موجودگی میں ہوا اور سورہ نجم کا نزول حرم پاک میں اس وقت ہوا جب مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کفر کے سرغنے اور ان کے چیلے بھی حرم پاک میں جمع تھے۔ ان دونوں موقعوں پر، جب بے شمار انسان نزول وحی کی حالت میں حضور ﷺ کے ارد گرد موجود تھے، نہ کسی کو حضور ﷺ کے منہ سے رال ٹپکتی نظر آئی، نہ جسم پر کپکپی طاری ہوئی، نہ کسی کو آپ کی چیخ سنائی دی، نہ آپ زمین پر گرے، نہ آپ پر غنودگی طاری ہوئی اور نہ ہی آپ کا شعور منقطع ہوا۔ ان دونوں سورتوں کے نزول کے موقعہ پر حضور ﷺ کے مریض ہونے کا نہیں بلکہ آپ کی شخصیت کی قوت اور اثر انداز ہونے کی زبردست صلاحیت کا مظاہرہ ہوا۔ سورہ فتح کے نزول کے موقعہ پر مسلمان عمرہ ادا نہ کر سکنے اور شرائط صلح کے بظاہر اطمینان بخش نہ ہونے کی وجہ سے انتہائی پریشانی کے عالم میں تھے۔ آپ نے ان نازک حالات میں ان کے مورال کو بلند رکھنے کا حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا۔ مرگی کا مریض ایسے کاموں سے گھبراتا ہے جن میں لوگوں کی نظروں میں آنے کا امکان ہو لیکن حضور ﷺ پر مسجد حرام میں مسلمانوں اور کفار کے مشترکہ اجتماع کے

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 16-313 سے ماخوذ

سامنے سورہ نجم نازل ہوئی اور اس کی شدت تاثیر میں کفار، اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دشمنی کو بھول گئے اور انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ سر سجدے میں رکھ دیئے۔ کیا مرگی کا مریض وہی ہوتا ہے جس کی شخصیت اور گفتار و کردار سے دشمن یوں متاثر ہوں؟

خود مستشرقین کی طرف سے مرگی کے الزام کی تردید

حضور ﷺ پر مرگی کے دوروں کا الزام اتنا لغو ہے اور آپ کی حیات طیبہ کے محیر العقول کارناموں کے تناظر میں اتنا ناقابل یقین ہے کہ خود متعدد مستشرقین نے زور شور سے اس الزام کی تردید کی ہے۔ منٹگمری واٹ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف اعتراضات اور الزام تراشیوں کے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن حضور ﷺ پر لگائے جانے والے مرگی کے الزام کی وہ بھی پر زور الفاظ میں تردید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"On some occasions at least there were physical accompaniments. He would be gripped by a feeling of pain, and in his ear's there would be a noise like the reverberation of a bell. Even on a very cold day the bystanders would see great pearls of sweat on his forehead as the revelation descended upon him. Such accounts led some western critics to suggest that he had epilepsy, but there are no real grounds for such a view. Epilepsy leads to physical and mental degeneration, and there are no sighns of that in Muhammad; on the contrary he was clearly in full possession of his faculties to the very end of his life." (1)

"(نزول وحی کے وقت) کبھی کبھی کچھ جسمانی عوارض بھی پیش آتے تھے۔ آپ کو شدید درد کا احساس ہوتا، کانوں میں گھنٹی کی گونج کی سی آواز سنائی دیتی، جب وحی کا نزول ہوتا تو پاس کھڑے ہوئے لوگ شدید سردی کے عالم میں بھی آپ کے چہرے پر پسینے کے موتی دیکھتے۔ اس قسم کی چیزوں سے بعض مغربی نقادوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ مرگی کے مریض تھے لیکن اس خیال کی

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 19

کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔ مرگی انسان کو ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور کر دیتی ہے لیکن محمد (ﷺ) میں اس قسم کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس کے برعکس آخر تک آپ کے تمام ذہنی اور جسمانی قویٰ واضح طور پر صحیح اور سلامت تھے۔"

ولیم میور حضور ﷺ پر مرگی کا مریض ہونے کا الزام لگانے والوں میں پیش پیش ہے، لیکن وہ بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ آپ ساری زندگی صحت مند رہے۔ وہ خود لکھتا ہے:

"Halima weaned the infant, and brought him back to Amina. Delighted with his healthy look, she said", take the child with thee back again, for much do I fear for him the unholesome air of Mecca." (1)

"حلیمہ نے بچے کا دودھ چھڑایا اور اسے واپس آمنہ کے پاس لے گئی۔ بچے کو صحت مند دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں اور حلیمہ سے کہا: تم بچے کو واپس اپنے ساتھ لے جاؤ کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ مکہ کی غیر صحت بخش فضا میں بچے کی صحت پر اثر نہ پڑے۔"

ولیم میور ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

"He never but once had suffered from any serious illness". (2)

"حضرت محمد (ﷺ) سوائے ایک بار کے اپنی زندگی میں کبھی کسی سخت بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے۔"

ولیم میور کی منطق ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اسے حضور ﷺ میں بچپن ہی سے مرگی کے آثار بھی نظر آتے ہیں اور تیئس سال کے عرصہ پر محیط نزول وحی کی کیفیات کو بھی وہ مرگی کے دورے قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود کہتا ہے کہ حضور ﷺ بچپن سے آخر تک صحت مند رہے۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں ماہرین طب کے حوالے سے مرگی کی تکلیف دہ بیماری کی جو نشانیاں بیان کی ہیں، قارئین کرام ان کی روشنی میں ولیم میور کے اس بیان کو

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 2

2۔ ایضاً، صفحہ 224

دیکھیں۔ کیا اس سے بڑی تضاد بیانی کا تصور ممکن ہے؟

مغرب کا مشہور مورخ گبن (Gibbon) اس الزام کے متعلق لکھتا ہے:

"Till the age of sixty-three years the strength of Muhammad was equal to the temporal and spiritual fatigues of his mission. His epileptic fits, an absurd clumny of the Greeks, would be an object of pity rather than abhorrence." (1)

"تریسٹھ سال کی عمر تک محمد (ﷺ) کی قوت ان کے فریضہ حیات کی جسمانی اور روحانی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے قابل تھی۔ آپ کی مرگی کے دورے، جو یونانیوں کی ایک غیر معقول تہمت ہے وہ ان کے لئے نفرت کے جذبات پیدا کرنے کی بجائے ترحم کے جذبات پیدا کرے گی۔"

یہی گبن ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"Till the third day before his death he regularly performed the function of public prayer." (2)

"انتقال سے تین دن پہلے تک آپ باقاعدگی سے نمازوں کی امامت فرماتے رہے۔"

حضور ﷺ پر لگائے جانے والے مرگی کے الزام کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے "گبن" لکھتا ہے:

"The epilepsy, or the falling sickness of Muhammad, is asserted by Theophanes, Zonaras, and the rest of the Greeks; and is greedily swallowed by the gross bigotry of Hottinger,.... Prideaux... and Maracci... The titles (the wrapped up, the covered) of two chapters of the Koran(73,74)can hardly be strained to such an interpretation: the silence, the ignorance of the Mohammadan commentators, is more conclusive than

---

1۔ دی ڈیکلائین اینڈ فال آف دی رومن امپائر، جلد 5، صفحہ 270

2۔ ایضاً، صفحہ 271

the most peremptory denial'. (1)

"محمد (ﷺ) کی مرگی کا ذکر تھیوفینز، زونارس اور دوسرے یونانیوں نے کیا جسے ہو نگر، پریڈو اور مراتی کے شدید تعصب نے انتہائی شوق سے نگل لیا۔ قرآن کی دو سورتوں "المزمل" اور "المدثر" کے عنوانات میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی تفسیر مرگی سے کی جا سکے۔ مسلمان مفسرین کی اس مسئلے سے ناواقفیت اور ان کی خاموشی، اس الزام کے قطعی انکار سے بھی زیادہ فیصلہ کن تردید ہے۔"

جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن (Apology for Muhammad and the Quran) میں لکھا ہے:

"یہ متواتر بیان کہ محمد (ﷺ) کو عارضہ صرع لاحق تھا، یونانیوں کی ایک ذلیل اختراع ہے جنہوں نے اس عارضہ کے لحوق کو ایک نئے مذہب کے بانی کی طرف اس غرض سے منسوب کیا ہو گا کہ ان کے اخلاقی چال چلن پر ایک دھبہ ہو جو عیسائیوں کی طعنہ زنی اور تنفر کا مستوجب ہو۔" (2)

ر۔ ف۔ بودلے، اپنی کتاب "حیات محمد" میں اس الزام کے متعلق لکھتا ہے:

"اطباء کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے کہ مرگی کے مریض کا دورہ ختم ہو اور اس کی عقل روشن افکار سے چمک رہی ہو۔ طب یہ بھی بتاتی ہے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے انتقال سے ایک ہفتہ قبل تک، اپنی زندگی جس قابل رشک صحت مندی سے گزاری، ایسی اچھی صحت والے آدمی پر مرگی کا حملہ نہیں ہوتا۔ یہ ناممکن ہے کہ مرگی کا مرض کسی شخص کو نبی یا واضع قانون بنا دے۔ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مرگی کا مریض کسی ایسے بلند مقام پر فائز ہوا ہو۔ پہلے زمانے میں مرگی زدہ شخص کو پاگل یا آسیب زدہ قرار دیا جاتا تھا اور دنیا میں اگر کسی شخص کو صحیح معنوں میں عقل سلیم کا مالک کہا جا سکتا ہے تو وہ محمد (ﷺ) ہیں۔ یہ حقیقت محمد (ﷺ) پر لگانے جانے والے اس

1۔ دی ڈیکلائین اینڈ فال آف دی رومن امپائر، جلد 5، صفحہ 270 (حاشیہ)

2۔ رسول مبین، صفحہ 605

الزام کی تردید کرتی ہے۔"(1)

اے ڈر منگھم نے بڑے پر زور الفاظ میں مستشرقین کی طرف سے حضور ﷺ پر لگانے جانے والے اس الزام کی تردید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"محمد (ﷺ) اس اعتبار سے دنیا کے واحد پیغمبر ہیں جن کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہیں بلکہ منور اور روشن ہے۔ عقل سلیم سے عاری انسان ہی محمد (ﷺ) پر کسی بھی ذہنی بیماری کا الزام عائد کر سکتا ہے۔ یہاں موازنہ نہیں بلکہ واقعہ اور حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ عہد نامہ قدیم کے پیغمبر کتنے جلالی تھے اور مغلوب الغضب۔ اور تو اور عہد جدید میں حضرت مسیح علیہ السلام جیسے حلیم اور نرم دل کو بھی ہم غصے اور طیش سے مغلوب ہوتے دیکھتے ہیں، اور ایسی زبان بھی بولتے ہیں جو شائستہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ کیا محمد (ﷺ) کا بڑے سے بڑا معترض کوئی ایسا واقعہ بتا سکتا ہے، جب آپ نے اپنے پر غصے اور طیش کو غالب کر لیا ہو؟ کیا کسی ایسے واقعے کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، جب آپ نے غیر شائستہ زبان استعمال کی ہو؟ کوئی معترض اور نقاد بھی محمد (ﷺ) کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ بیان نہیں کر سکتا جب کسی مرض یا تکلیف کی وجہ سے آپ کسی میدان جنگ یا زمانہ امن میں کسی بیماری کے دورے کے زیر اثر آئے ہوں۔ کوئی ایسا واقعہ ان کی زندگی میں نہیں ملتا جس سے ان کی جسمانی یا ذہنی صحت کے علیل ہونے کا سراغ ملتا ہو۔ ان کی جسمانی اور ذہنی صحت قابل رشک تھی۔ آپ (ﷺ) نے اپنی زندگی میں چالیس فوجی مہمیں روانہ کیں جن میں سے ایک (محتاط) اندازے کے مطابق تیس جنگوں میں آپ نے خود حصہ لیا۔ ہر جنگ میں جس فراست، جس شجاعت، جنگی حکمت عملی اور مہارت کا ثبوت آپ نے فراہم کیا، کیا وہ کسی ایسے شخص کے لئے ممکن ہو سکتا ہے، جو کسی بھی نوع کی بیماری میں مبتلا ہو؟ محمد (ﷺ) کی پاک، صحت مند اور توانا شخصیت کو بیمار کہنے والے در حقیقت خود ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں۔ آنکھیں رکھنے والے ایسے لوگ ہیں جو سب کچھ دیکھتے

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 316

ہوئے بھی نہیں دیکھتے۔ جان بوجھ کر اندھے بن جاتے ہیں۔"(1)

مختصر یہ کہ کوئی تاریخی ثبوت ایسا نہیں جس کے تحت حضور ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دیا جاسکے۔ آپ کی قابل رشک صحت، زندگی کے مختلف شعبوں میں آپ کی حکیمانہ تدبیریں، مشکل ترین حالات میں آپ کا صبر و ثبات اور آپ کی حیات طیبہ کے محیر العقول کارنامے، آپ کو مرگی کا مریض کہنے والوں کی عقلوں پر مسکرا رہے ہیں۔ بیشمار مستشرقین آپ کے کٹر مخالف ہونے کے باوجود آپ پر لگائے جانے والے اس الزام کی تردید کرتے ہیں۔ سائنس بتارہی ہے کہ مرگی کا مرض ایسا موذی مرض ہے کہ اس کا مریض کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دینا تو درکنار، اپنے ذاتی معاملات کو سلجھانے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ اتنے واضح حقائق کے باوجود جو لوگ حضور ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دیتے ہیں، یقینی طور پر ان کی عقلوں کو حسد اور تعصب کا گھن کھا گیا ہے اور وہ نصف النہار پر پوری آب و تاب سے چمکتے ہوئے آفتاب کو بھی بے نور کہنے پر مصر ہیں۔

1۔ رسول مبین، صفحہ 27-626، بحوالہ ای۔ ڈرمنگھم، "حیات محمد"

اپنی رسالت پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کو مشکوک ثابت کرنے کی کوششیں

اپنی رسالت پر حضور ﷺ کے ایمان کو مشکوک ثابت کرنے کی کوششیں

کسی انسان کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ حضور ﷺ کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو سچ یقین کرے۔ زبان سے بھی اس کے حق ہونے کا اقرار کرے اور دل سے بھی اس کی تصدیق کرے۔ اس یقین کے بغیر کوئی شخص مسلمان کہلوانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ جب ایک عام مسلمان کے لئے پیغام رسالت میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تو یہ تصور کرنا بھی عقل کے خلاف ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو کسی بھی لمحے میں اپنے منصب رسالت کے بارے میں شک لاحق ہوا ہو۔ اگر رسول خود اپنے منصب کے متعلق شک میں مبتلا ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دوسرے انسان اس رسول پر ایمان لائیں اور ان کا ایمان ہر قسم کے شک سے پاک ہو۔

مستشرقین کا چونکہ مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام پر کوئی ایسا مہلک وار کریں کہ اس وار سے دین کے اس قصر رفیع کی بنیادیں ہل جائیں اور اسلام کو ایک سچا دین یقین کرنے والوں کے پاس اپنے عقیدہ کی صداقت کا کوئی ثبوت باقی نہ رہے، اس لئے انہوں نے جہاں عام اسلامی عقائد واعمال کو ارتقائی عمل کا نتیجہ قرار دیا ہے، وہاں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ ابتداء میں حضور ﷺ کو نہ تو یہ یقین تھا کہ آپ کے پاس جو کلام آتا ہے وہ خدا کا کلام ہے اور نہ ہی آپ کو یہ پتہ تھا کہ یہ کلام لانے والا خدا کا فرشتہ جبریل امین ہے اور نہ ہی آپ کو یہ علم تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں بلکہ ابتدا میں آپ اللہ کے تصور سے بھی ناآشنا تھے اور یہ چیزیں آپ پر وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ منکشف ہوئیں۔

مستشرقین اسلامی ادب کا مطالعہ انتہائی دقت نظر سے کرتے ہیں اور ایسی چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کو بنیاد بنا کر وہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کر سکیں۔ بد قسمتی سے

ان کو اپنے مذکورہ بالا مفروضے کے لئے بھی مواد مسلمانوں کی تحریروں میں میسر آ گیا ہے۔
آغاز وحی کے متعلق کتب احادیث میں جو روایات مذکور ہیں، ان میں سے جو جملے مستشرقین نے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کئے ہیں، ان میں سے ایک تو حضور ﷺ کی طرف منسوب یہ جملہ ہے:

فقال: اىْ خديجةُ مالىْ؟ لقدْ خشيتُ على نفسىْ (1)

"اے خدیجہ! مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے اپنی جان کا خوف لاحق ہو گیا ہے۔"

اور دوسرا جملہ وہ ہے جو امام زہری نے "فیما بلغنا" (2) کے الفاظ کہہ کر آغاز وحی کی ایک روایت کے ساتھ شامل کیا ہے۔ وہ جملہ یہ ہے:

حُزْنًا غدًا مِنْهُ مرارًا كَىْ يتردّٰى مِنْ رُؤُوْسِ شواهقِ الْجبالِ فكُلّما اوْفى بذرْوةِ جبلٍ لكىْ يُلْقى مِنْهُ نفْسَهٗ تبدّٰى لهٗ جبْرِيْلُ فقال: يا مُحمّدُ انّكَ رسُوْلُ اللهِ حقًّا فيسْكُنُ لِذٰلِكَ جاشُهٗ وتقرُّ نفْسُهٗ فيرْجِعُ فاذا طالتْ عليْهِ فتْرةُ الْوحْىِ غدا لِمِثْلِ ذٰلِكَ فاذا اوْفى بذرْوةِ جبلٍ تبدّٰى لهٗ جبْرِيْلُ فقال لهٗ مِثْلَ ذٰلِكَ (3)

"حضور ﷺ سلسلہ وحی کے منقطع ہونے سے غمگین ہوئے۔ اتنے غمگین کہ کئی بار آپ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر گئے تاکہ اپنے آپ کو وہاں سے گرا دیں۔ جب بھی آپ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تاکہ وہاں سے اپنے آپ کو نیچے پھینک دیں، جبریل امین ظاہر ہوتے اور کہتے: "اے محمد! (ﷺ) آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔" اس جملے سے آپ کا اضطراب ختم ہو جاتا، آپ کے دل کو ٹھنڈک پہنچتی اور آپ واپس تشریف لے آتے۔ جب فترت وحی کا سلسلہ طول کھینچتا تو آپ پہلے کی طرح پہاڑی کی چوٹی کا قصد کرتے۔ جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تو جبریل حاضر ہوتے

1۔ مرجون، "محمد رسول اللہ"، جلد 1، صفحہ 245

2۔ ترجمہ: جیسے ہم تک روایت پہنچی ہے۔

3۔ ایضاً، صفحہ 250

اور وہی بات کہتے جو پہلے کہی تھی۔"

مستشرقین کے ہاں روایات کو پرکھنے کا جو اسلوب ہے، اس میں کسی روایت کی سند کو پرکھنے کا کوئی تصور نہیں۔ وہ تو روایت کے متن کو پرکھنے کے قائل ہیں اور جو روایات انہیں اپنی عقل کے خلاف نظر آتی ہیں، ان کو وہ مسترد کر دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ روایات کس قسم کے لوگوں سے مروی ہیں۔ اپنے اس اسلوب کے مطابق مستشرقین کو چاہئے تھا کہ وہ ان روایات کا حضور ﷺ کی حیات طیبہ، آپ کی تعلیمات، آپ کے دین کے مسلمات اور آپ کی زندگی کے محیر العقول کارناموں سے موازنہ کرتے اور پھر یہ فیصلہ کرتے کہ آیا حضور ﷺ کی حیات طیبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس قسم کی روایات کو تسلیم کرنا ممکن ہے یا نہیں۔

جس ہستی نے اپنے پیروکاروں کے دلوں میں ایمان کا وہ پودا لگایا، جس نے حوادث دہر کے ہر طوفان کا رخ موڑ دیا، کیا وہ ہستی خود ایمان اور ایقان کی دولت سے محروم تھی؟ کیا وہ ہستی جس نے بت پرستی کے ماحول میں توحید کا نعرہ بلند کیا تھا اور اس کی وجہ سے اسے سارے جزیرہ عرب کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا، کیا اس ہستی کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ خود اس کو اپنی صداقت کا یقین نہ تھا؟

حضور ﷺ نے ساری دنیا کے بت پرستوں، یہودیوں، عیسائیوں، آتش پرستوں اور ستارہ پرستوں کے ادیان کو غلط قرار دے کر دین توحید کی شمع روشن کرنے کا قصد کیا۔ اس مقصد کے لئے آپ کو اپنے ہم قوم لوگوں کا مقابلہ کرنا پڑا، سارے جزیرہ عرب بلکہ روم اور ایران کی سلطنتوں کی مخالفت برداشت کرنی پڑی، اس مقصد کے لئے آپ کو اپنا پیارا شہر چھوڑنا پڑا، آپ کے دین کی شمع کو گل کرنے کیلئے کفر کی آندھیاں ہر طرف سے اٹھیں اور ان طوفانوں میں آپ نے کامیابی کے ساتھ شمع توحید کی ضو کی حفاظت کی، آپ ساری زندگی عیش و عشرت سے کنارہ کش رہے اور وسائل موجود ہونے کے باوجود سادگی اور قناعت کی زندگی اختیار کی بلکہ آخرت کی ابدی نعمتوں کی امید پر دنیوی نعمتوں کی طرف توجہ ہی نہ دی، کیا ایک ایسا شخص جس کو اپنے مشن کی صداقت کا یقین ہی نہ ہو اور جو اتنا کمزور دل ہو کہ مشکلات سے گھبرا کر بار بار خودکشی کی کوشش کرتا ہو، اس شخص سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس قسم کے محیر العقول کارنامے سرانجام دے؟

حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام روایات جن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حضور ﷺ کو اپنے منصب رسالت کے متعلق شک تھا یا جو آپ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتی ہیں جو آپ کو کمزور یا کم ہمت ثابت کریں، مستشرقین کے اپنے اصول کے مطابق وہ روایات ناقابل قبول ہونی چاہئیں، کیونکہ وہ تاریخ انسانی کے عظیم ترین اور کامیاب ترین انسان کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتی ہیں جو ایک عام انسان کے دامن پر بھی انتہائی بدنما نظر آتی ہیں۔ لیکن مستشرقین نے ایسی روایات کے متعلق اپنے معروف اصولوں کو استعمال نہیں کیا اور انہوں نے ان روایات کو خندہ پیشانی سے تسلیم کر لیا ہے اور ان روایات کی بنیاد پر حضور ﷺ کے کردار کی تصویر کشی کی کوشش کی ہے۔

قارئین کرام اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ اکثر مستشرقین نے اسلامی روایات کو پرکھنے کے لئے یہ اصول اپنا رکھا ہے کہ ایسی روایات جو حضور ﷺ کی روحانی عظمتوں کو بیان کرتی ہوں، ان کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں کہ یہ روایات مسلمانوں کے جوش عقیدت کی پیداوار ہیں۔ اور جو روایات حضور ﷺ کی طرف کسی قسم کی کمزوری کو منسوب کرتی ہیں، انہیں یہ کہہ کر بخوشی قبول کر لیتے ہیں کہ اسلامی روایات میں حضور ﷺ کی طرف کسی کمزوری کا منسوب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی وہ کمزوری آپ میں موجود تھی کیونکہ مسلمانوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ خود غلط طور پر حضور ﷺ کی طرف کسی کمزوری کو منسوب کریں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس شخص میں اس قسم کی کمزوریاں موجود ہوں، کیا اس شخص سے ان محیر العقول کارناموں کی توقع کی جاسکتی ہے جو حضور ﷺ نے سرانجام دیئے تھے؟

مستشرقین جو حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے ان گنت کارناموں کو دیکھتے ہوئے بھی آپ پر مرگی زدہ ہونے کا الزام لگا سکتے ہیں، ان کے لئے یہ مشکل نہیں کہ وہ آپ پر یہ الزام لگائیں کہ ابتدا میں آپ کو اپنے مشن کی صداقت کا یقین نہ تھا، یا یہ کہ آپ نے بارہا حالات کی سختی سے تنگ آکر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔

مستشرقین کو سیرت اور احادیث کی کتابوں میں مندرجہ ذیل چیزیں نظر آئیں:

1۔ حضور ﷺ کے پاس جب جبریل امین غار حرا میں تشریف لائے اور آپ پر قرآن حکیم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، تو اس نئے تجربے سے آپ پر خوف کے آثار طاری

ہوئے اور آپ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے یہ جملہ کہا: "مجھے اپنی جان کا خوف لاحق ہو گیا ہے۔"

2۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے حضور ﷺ غمگین ہوئے اور اس غم کی وجہ سے بارہا آپ نے پہاڑی کی چوٹی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار جبریل امین حاضر ہو کر آپ کو بتاتے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، جس سے آپ کا غم کم ہو جاتا اور آپ اپنے ارادے سے باز رہتے۔

3۔ حضور ﷺ جن عجیب و غریب روحانی تجربات سے گزرتے، آپ ان کا تذکرہ اپنی مونس و وفادار رفیقہ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے کرتے اور وہ آپ کو تسلی دیتیں۔

4۔ قرآن حکیم کی ابتدائی آیات نازل ہونے پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو تورات و انجیل کے عالم تھے اور انہوں نے حضور ﷺ کی باتیں سن کر آپ کو یقین دہانی کرائی کہ آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔

سیرت اور احادیث کی کتابوں میں موجود ان روایات سے مستشرقین نے جو نتائج اخذ کیے وہ اس قسم کے تھے۔ ولیم میور لکھتا ہے:

> "The conviction, however, of being inspired of God was not reached by Mahomet till after a protracted trial of mental throes." (1)

> "حضرت محمد (ﷺ) کو خدا کی طرف سے اپنے اوپر وحی نازل ہونے کا یقین ذہنی کشمکش کی طویل آزمائش کے بعد حاصل ہوا۔"

یہی مستشرق ایک اور مقام پر فترت وحی کی وجہ سے حضور ﷺ پر طاری ہونے والی پریشانی کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے:

> "He grew downcast, and fearing possession of devils, had thoughts of destroying himself". (2)

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 22

2۔ ایضاً، صفحہ 24

"آپ (اس صورت حال سے) مایوس ہو گئے اور شیاطین کے زیر اثر ہونے کے خوف سے آپ نے اپنے آپ کو ختم کرنے کی کوشش کی۔"

منٹگمری واٹ تفسیر و احادیث کی کتابوں میں موجود مذکورہ بالا باتوں سے یہ نتیجہ نکالتا ہے:

"There is no reason for supposing that Muhammmad did not try to learn as much as possible from conversation with christians such as warqah". (1)

"یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ محمد (ﷺ) نے ورقہ بن نوفل جیسے عیسائیوں کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

یہی مستشرق ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

"But the marriage also played a part in his spiritual development. Khadijah had a cousin, Warqah, who had become a christian, and who is said to have supported Muhammad in his belief that he was receiving revelations similar to those of the Jews and the Christians. It was to Khadijah too that Muhammad turned when in moments of desolation he doubted his commission to be a prophet." (2)

"حضرت خدیجہ کے ساتھ شادی نے محمد (ﷺ) کے روحانی ارتقاء میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کا ایک چچازاد بھائی، ورقہ تھا، جو عیسائی ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے محمد (ﷺ) کے اس یقین میں ان کی مدد کی تھی کہ ان پر اسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے جس قسم کی وحی کی تعلیمات یہود و نصاریٰ کے پاس ہیں۔ وہ بھی خدیجہ (رضی اللہ عنہا) ہی تھیں کہ محمد (ﷺ) عالم افسردگی میں جب اپنے منصب نبوت کے متعلق شکوک و شبہات کا شکار ہوتے، تو انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 316

2۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 12

منٹگمری واٹ ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

"It is not surprising that Muhammad is reported to have been assailed by fears and doubts. There is evidence for this in the Quran as well as in the narratives of his life, though it is not certain that at what period he received the Quranic assurance that God had not forsaken him". (1)

"اس بیان میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں کہ محمد (ﷺ) خوف اور شکوک میں مبتلا ہوئے۔ اس بات کا ثبوت قرآن میں بھی موجود ہے اور سیرت کی کتابوں میں بھی، اگرچہ یقین کے ساتھ یہ کہنا ممکن نہیں کہ قرآن کے ذریعے آپ کو یہ یقین دہانی کس موقعہ پر کرائی گئی، کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چھوڑا نہیں ہے۔"

یہی مستشرق نزول وحی کے ابتدائی دور میں حضور ﷺ کی بے یقینی کو ان الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے:

"In the early days, soon after the first revelation, he is said to have been encouraged to believe in his vocation by his wife Khadijah and, more particularly, by her cousin Waraqah... Nevertheless, the testimony of a christian that the revelations to Muhammad were similar to those formerly received by Moses must have greatly strengthened his belief in his vocation". (2)

"بتایا گیا ہے کہ محمد (ﷺ) کو ابتدائی وحی نازل ہونے کے بعد خدیجہ (رضی اللہ عنہا) نے یقین دلایا کہ آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ اور خدیجہ (رضی اللہ عنہا) سے بھی زیادہ یہ یقین دہانی آپ کو ورقہ بن نوفل نے کرائی۔ ایک عیسائی کی اس یقین دہانی نے، کہ آپ پر جو وحی نازل ہوتی ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی کے مشابہ ہے، اپنے منصب نبوت پر آپ کے یقین کو پختہ کیا ہوگا۔"

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 21

2۔ ایضاً، صفحہ 22

جب یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ حضور ﷺ کو ابتداء میں اپنے نبی ہونے کا یقین نہ تھا اور نہ ہی آپ کو یہ یقین تھا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، تو مستشرقین کا کام مکمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اسلام کو الہامی دین ماننے اور حضور ﷺ کو خدا کا سچا نبی ماننے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ جب ایک نبی کو اپنے نبی ہونے کا یقین دوسروں کے بتانے سے آئے تو اس کی صداقت کو دوسرے لوگ کیسے تسلیم کر لیں۔

مستشرقین حضور ﷺ کی طرف ایسی باتیں بھی منسوب کرتے رہتے ہیں جن کا اسلامی ادب میں نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ نبوت کے متعلق آپ کے شکوک و شبہات کے مفروضے میں بھی رنگ آمیزی تو مستشرقین نے خود کی ہے لیکن اس مفروضے کا بنیادی ڈھانچہ انہیں مسلمانوں کی تحریروں میں سے مل گیا ہے اور انہوں نے اسے مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کرنے کے لئے دل کھول کر استعمال کیا ہے۔

بد قسمتی سے مستشرقین کو، عصمت نبوت کے عقیدے کو تباہ کرنے والا یہ مواد، ان لوگوں کے ذریعے حاصل ہوا ہے جنہوں نے سنت رسول اور احادیث طیبہ کے ذخیرے کو ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک رکھنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کیں اور ملت ان کی بے بہا مساعی کے لئے ان کی ممنون احسان ہے۔

مستشرقین نے جن روایات کی بنیاد پر اس مفروضے کا محل تعمیر کیا ہے، وہ روایات احادیث طیبہ کی صحیح ترین کتاب صحیح بخاری میں موجود ہیں اور جن لوگوں نے ان کو روایت کیا ہے ان میں معمر اور امام زھری جیسے بزرگوں کے نام شامل ہیں جن کی ثقاہت امت کے نزدیک مسلم ہے۔

ایک بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ائمہ حدیث نے امت مسلمہ پر صرف یہ احسان نہیں کیا کہ انہوں نے احادیث کی جانچ پڑتال اور حفاظت کے لئے بے مثال کوششیں کی ہیں بلکہ ان کا اس سے بھی بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے روایات کی جانچ پڑتال کے لئے ایسے اصول وضع کیے ہیں کہ جو روایت ان اصولوں پر پوری اترے اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ انہوں نے ایک طرف تو یہ اہتمام کیا ہے کہ کوئی حدیث جن لوگوں کی وساطت سے روایت ہوئی ہے، ان کی عدالت اور ضبط کی جانچ پڑتال کریں اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھیں کہ روایت کی سند متصل ہے یا نہیں اور ساتھ ہی انہوں

نے یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ روایت کے متن میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو بداہت عقل اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو۔

اسلام اصول پسندی کی تعلیم دیتا ہے، شخصیت پرستی کی نہیں۔ حضرت امام بخاری جیسی شخصیات ملت اسلامیہ کی نظروں میں اسی لئے انتہائی قابل احترام ہیں کہ انہوں نے اپنی کتابیں تالیف کرتے وقت روایت اور درایت کے اصولوں کی پابندی دوسرے تمام جامعین حدیث کی نسبت زیادہ کی ہے۔ اسی وجہ سے امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری کو کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن امام بخاری اپنی تمام احتیاط اور اصول پسندی کے باوجود ایک انسان ہیں اور انسان سے کسی بھی وقت کسی غلطی کا صدور ممکن ہوتا ہے۔ صحابہ کرام ملت اسلامیہ کا معزز ترین طبقہ ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض صحابہ کرام نے دوسرے صحابہ کرام کی آرا بلکہ ان کی مرویات سے بھی شدید اختلاف کیا ہے۔ اس لئے ہم نہایت ادب سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ روایات جن میں یہ ذکر ہے کہ حضور ﷺ نے سلسلہ وحی منقطع ہونے کے غم میں بارہا پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا، وہ روایات درایت کے اصولوں پر پوری نہیں اترتیں۔ کیونکہ عصمت نبوت امت مسلمہ کے مسلمہ عقائد میں سے ہے اور اس قسم کی روایات ملت کے اس مسلمہ عقیدہ سے متصادم ہیں۔

امام زہری نے حضور ﷺ کے پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے، والے فقرے کو روایت کیا اور امام بخاری نے ان کی اس روایت کو اپنی کتاب میں درج کر دیا۔ ان دونوں حضرات کے اس عمل کی وجہ غالبًا یہ تھی، کہ ان کو یہ جملے جن لوگوں کی وساطت سے پہنچے، وہ ان کی نظروں میں ثقہ تھے اور ان کے نزدیک ان فقروں کی ایسی تاویل ممکن تھی، جس کے مطابق وہ عصمت نبوت کے مسلمہ عقیدے سے متصادم نہ ہوں۔ ان بزرگوں کو اگر یہ اندازہ ہوتا کہ دشمنان اسلام ان کی مرویات کو کس طرح عصمت نبوت کے عقیدے کے خلاف استعمال کریں گے اور کس طرح ان روایات کی تاویل کی بجائے، ان کے ظاہری مفہوم پر اعتماد کریں گے تو یقیناً وہ ان روایات کو عصمت نبوت کے عقیدے کے خلاف سمجھتے ہوئے مسترد کر دیتے۔

اگر متاخرین امام بخاری یا کسی دوسرے عظیم محدث کی روایت کو اس بنا پر مسترد کر دیں کہ انہیں اس روایت میں کوئی ایسی بات نظر آگئی، جو ان متقدمین کی نظر سے بچ گئی تھی، تو

اس سے نہ تو امام بخاری جیسے عظیم لوگوں کی عظمت پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ ہی ان کی تصنیفات پایہ اعتبار سے ساقط ہوتی ہیں، بلکہ اس قسم کے اختلافات انہی اصولوں کی فتح ہے جو امام بخاری وغیرہ کے پیش نظر تھے۔ اس لئے قرین قیاس بات یہی ہے کہ امام بخاری نے ان جملوں کو اس لئے اپنی کتاب میں درج کیا کہ ان کے نزدیک ان کی تاویل ممکن تھی۔

زیر بحث جملے ان احادیث کا حصہ ہیں جو آغاز وحی یا فترت وحی کے متعلق ہیں۔ آغاز وحی اور فترت وحی کی احادیث کو متعدد محدثین کرام نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے لیکن مختلف کتابوں میں جو احادیث درج ہیں ان میں باہم کافی اختلاف ہے۔ خود امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو اپنی صحیح میں تین مقامات پر روایت کیا ہے۔ تینوں مقامات پر غار حرا میں حضور ﷺ کے پاس جبریل امین کے آنے اور سورہ اقراء کی ابتدائی آیتیں نازل ہونے کا ذکر بھی ہے اور فترت وحی کا ذکر بھی لیکن ان تینوں مقامات میں سے صرف ایک مقام پر وہ جملے مروی ہیں جن میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے آپ کو پہاڑوں سے گرانے کا ارادہ کیا۔

حضرت امام بخاری نے جب باب التعبیر میں اس حدیث کو درج کیا تو اس کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا:

> وَفَتَرَ الْوَحْيُ فَتْرَةً حَتّٰى حَزِنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا بَلَغَنَا حُزْنًا غَدَا مِنْهُ مِرَارًا كَيْ يَتَرَدّٰى مِنْ رُؤُوْسِ شَوَاهِقِ الْجِبَالِ فَكُلَّمَا اَوْفٰى بِذِرْوَةِ جَبَلٍ لِكَيْ يُلْقِيَ مِنْهُ نَفْسَهٗ تَبَدّٰى لَهٗ جِبْرِيْلُ فَقَالَ يَامُحَمَّدُ اِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا فَيَسْكُنُ لِذٰلِكَ جَاشُهٗ وَتَقِرُّ نَفْسُهٗ فَيَرْجِعُ فَاِذَا طَالَتْ عَلَيْهِ فَتْرَةُ الْوَحْيِ غَدَا لِمِثْلِ ذٰلِكَ فَاِذَا اَوْفٰى بِذِرْوَةِ جَبَلٍ تَبَدّٰى لَهٗ جِبْرِيْلُ فَقَالَ لَهٗ مِثْلَ ذٰلِكَ (1)

"وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا حتی کہ حضور ﷺ غمگین ہو گئے۔ ہم تک جو روایت پہنچی ہے اس میں یہ جملہ بھی ہے، کہ آپ اتنے غمگین ہوئے کہ اس غم کی وجہ سے آپ کئی بار گئے تا کہ اپنے آپ کو کسی پہاڑ کی چوٹی

1۔ ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، "صحیح البخاری"، (دار المعرفہ بیروت۔ 1978ء)، جلد 4، صفحہ 208

سے نیچے گرادیں۔ جب بھی آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تاکہ اپنے آپ کو نیچے گرادیں تو جبریل امین ظاہر ہوتے اور کہتے: اے محمد! (ﷺ) آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، اس سے آپ کا غم کم ہو جاتا، آپ کے دل کو ٹھنڈک پہنچتی اور آپ واپس لوٹ جاتے۔ جب انقطاع وحی کا سلسلہ طول کھینچتا تو آپ اسی طرح اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی سے گرانے کے ارادے سے جاتے اور جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تو جبریل امین ظاہر ہوتے اور وہی کہتے جو پہلے کہا تھا۔"

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس حدیث کو کتاب التفسیر میں سورۃ علق کی تفسیر میں بھی درج کیا ہے لیکن اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے آپ کو پہاڑوں سے گرانے کا ارادہ کیا بلکہ اس مقام پر یہ حدیث ان الفاظ پر ختم ہو جاتی ہے:

وَفَتَرَ الْوَحْیُ حَتّٰی حَزِنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (1)

"اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا حتی کہ حضور ﷺ غمگین ہو گئے۔"

اس مقام پر ان الفاظ کے بعد امام بخاری نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث درج کی ہے جس میں حضرت جبریل امین کے دوبارہ نظر آنے اور سورہ مدثر نازل ہونے کا ذکر ہے۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا سے مروی اس حدیث کو "باب کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ میں بھی درج کیا ہے۔ اس مقام پر یہ حدیث وَفَتَرَ الْوَحْیُ (2) "اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا" کے الفاظ پر ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد امام بخاری نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی مذکورہ حدیث درج کی ہے۔ اس حدیث میں نہ تو حضور ﷺ کے غمگین ہونے کا ذکر ہے اور نہ ہی اس غم کی وجہ سے آپ کے پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کا ذکر ہے بلکہ

1۔ ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، "صحیح البخاری"، (دار المعرفہ بیروت۔ 1978ء)، جلد 3، صفحہ 218

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 7

فترت وحی کے ذکر کے معا بعد اس حدیث کو درج کیا گیا ہے، جس میں وحی کا سلسلہ از سر نو شروع ہونے کا ذکر ہے۔(1)

امام مسلم نے بھی اپنی صحیح کی "کتاب الایمان" میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو درج کیا ہے لیکن اس حدیث میں فترت وحی کا بھی ذکر نہیں۔ امام مسلم نے بھی اس حدیث کے بعد حضرت جابر بن عبد اللہ کی حدیث درج کی ہے، جس میں وحی کا سلسلہ منقطع ہونے اور دوبارہ شروع ہونے کا ذکر ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث صحیحین کے چار مقامات پر درج ہے اور ان میں سے صرف ایک مقام پر وہ فقرہ ہے جس میں حضور ﷺ کے پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کا ذکر ہے۔

زیر بحث جملہ روایت کرنے سے پہلے امام زہری نے فِيمَا بَلَغَنَا کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے یعنی اس سلسلے میں ہمیں جو اطلاعات پہنچی ہیں ان میں یہ جملہ بھی ہے۔ امام زہری نے یہ نہیں بتایا کہ انہیں یہ جملہ یا جملے کس حوالے سے پہنچے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام زہری سے اس حدیث کو کئی راویوں نے روایت کیا ہے لیکن ان متعدد رواتیوں میں سے صرف اسی روایت کے ساتھ یہ جملے منسلک ہیں جو حضرت معمر نے حضرت زہری سے روایت کی ہے۔

"باب، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ" میں یہ حدیث امام زہری سے عقیل نے روایت کی ہے۔ ان کی روایت میں نہ تو حضور ﷺ کے غمگین ہونے کا ذکر ہے اور نہ ہی پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کا۔ "کتاب التفسیر" میں اس حدیث کو امام زہری سے عقیل کے علاوہ یونس بن یزید نے بھی روایت کیا ہے۔ مذکورہ جملہ اس روایت میں بھی موجود نہیں۔

"کتاب التعبیر" میں جو روایت درج ہے اس کو امام زہری سے روایت کرنے والے عقیل کے علاوہ معمر بھی ہیں، اور صرف یہی وہ روایت ہے جس میں مذکورہ جملہ موجود ہے۔

اسی بنا پر علامہ ابن حجر نے فرمایا ہے: "میرے نزدیک یہ زیادتی معمر کی روایت کے ساتھ خاص ہے۔"(2)

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ فترت وحی سے متعلقہ متعدد روایات میں

1۔ امام مسلم بن حجاج بن مسلم القشیری، "الصحیح لمسلم"، (اصح المطابع کراچی۔1956ء)، صفحہ 88

2۔ عرجون، "محمد رسول اللہ"، صفحہ 252

سے صرف اس روایت میں حضور ﷺ کے پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے ارادے کا ذکر ہے جو معمر نے حضرت امام زہری سے روایت کی ہے۔ معمر کے علاوہ باقی جن لوگوں نے اس حدیث کو امام زہری سے روایت کیا ہے انہوں نے اس جملے کے بغیر یہ حدیث روایت کی ہے۔

امام زہری نے بھی اس جملے کو حدیث مرفوع کے جزو کے طور پر روایت نہیں کیا بلکہ حدیث ختم کرنے کے بعد یہ کہہ کر اس جملے کو روایت کیا ہے کہ اس سلسلے میں ہم تک جو معلومات پہنچی ہیں ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ جملہ ان تک کس حوالے سے پہنچا ہے۔ اس لئے یہ جملہ نہ تو حضور ﷺ کی زبان پاک سے نکلا ہے اور نہ ہی اس جملے کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان سے مروی حدیث صحاح کے کئی مقامات پر درج ہے جن میں سے صرف ایک روایت کے ساتھ اس جملے کا اضافہ ہے۔

علامہ محمد صادق عرجون نے اپنی کتاب "محمد رسول اللہ" میں اس روایت پر تفصیلاً بحث کی ہے اور مذکورہ جملے کے الحاقی اور ناقابل اعتماد ہونے کی کئی وجوہات لکھی ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ جو علوم حدیث کے ماہر اور سنت نبویہ مطہرہ کے ائمہ کے سردار ہیں، انہوں نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس بلاغ کی نسبت معمر کی طرف ہو یا زہری کی طرف، یہ مرفوع نہیں ہے۔ درمیان میں دو یا تین واسطوں کا ذکر تک نہیں۔ معلوم نہیں یہ کس قسم کے لوگ تھے۔ یہ تسلیم کہ معمر اور زہری خود ثقہ ہیں، ان کا شمار ائمہ حدیث میں ہوتا ہے لیکن جن لوگوں سے انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے، ان کا نام تک بھی نہیں لیا گیا تاکہ ہم تحقیق کر کے ان کے بارے میں فیصلہ کر سکیں کہ یہ ثقہ تھے یا غیر ثقہ۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر ثقہ راوی ہمیشہ ثقہ راوی سے ہی روایت کرتا ہے۔ کبھی غیر ثقہ راویوں سے بھی ثقہ راوی روایت کرتے ہیں۔ اس احتمال نے روایت کو پایہ اعتبار سے ساقط کر دیا ہے، اس لئے یہ حدیث ضعیف ہو گی۔ وہ لکھتے ہیں:

فَقَدْ يَرْوِي الثِّقَةُ عَنْ غَيْرِ الثِّقَةِ لِاَنَّهُ فِيْ نَظْرِهٖ وَتَقْدِيْرِهٖ ثِقَةٌ وَهُوَ عِنْدَ غَيْرِهٖ ضَعِيْفٌ لَا تُقْبَلُ رِوَايَتُهٗ (1)

"کبھی ثقہ راوی غیر ثقہ سے روایت کرتا ہے کیونکہ وہ اس کی نظر میں

1۔ عرجون، "محمد رسول اللہ"، جلد 1، صفحہ 386

ثقہ ہوتا ہے لیکن دوسرے علماء کے نزدیک وہ ضعیف ہوتا ہے اور اس کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔"

یہ روایت زیادہ سے زیادہ امام زہری کی مرسلات میں سے ہوگی اور ان کی مرسلات کے بارے میں علماء جرح و تعدیل نے طویل گفتگو کی ہے۔ ان کی مرسلات پر تنقید کرنے والوں میں یحییٰ بن سعید قطان پیش پیش ہیں اور یہ یحییٰ علمائے ناقدین کے امام ہیں۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ امام زہری کی قوت حافظہ بے نظیر تھی، اس کے باوجود وہ معصوم نہ تھے۔

شیخ عرجون فرماتے ہیں کہ سند کے لحاظ سے اس بلاغ کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی حدیث کی صحت کے لئے اتنا ہی کافی نہیں بلکہ سند کی صحت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا متن بھی صحیح ہو اور متن کے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین کے اصولوں میں سے کسی اصول کے ساتھ ٹکراتا نہ ہو۔ چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں:

فَصِحَّةُ الْمَتْنِ شَرْطٌ مَعَ صِحَّةِ السَّنَدِ فِيْ قُبُوْلِ النَّصِّ الْمَسْمُوْعِ بِمَعْنٰی اَنَّ الْحَدِيْثَ يَجِبُ اَنْ يَكُوْنَ صَحِيْحَ السَّنَدِ مَرْوِيًّا عَنِ الثِّقَاتِ الضَّابِطِيْنَ وَيَجِبُ مَعَ ذٰلِكَ اَنْ يَكُوْنَ صَحِيْحَ الْمَتْنِ فَلَا يَتَعَارَضُ مَعَ اَصْلٍ مِّنْ اُصُوْلِ الدِّيْنِ الْمُتَّفَقِ عَلَيْهَا بَيْنَ اَئِمَّةِ الدِّيْنِ وَالْعِلْمِ وَلَا يَتَعَارَضُ مَعَ الدَّلَائِلِ الظَّاهِرَةِ الَّتِيْ تُخَالِفُ مَدْلُوْلَ النَّصِّ الْمَرْوِيِّ بِالسَّنَدِ الصَّحِيْحِ (1)

"روایت کو قبول کرنے کے لئے سند کے صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ متن کا صحیح ہونا بھی شرط ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ وہ حدیث ایسے راویوں سے مروی ہو جو ثقہ اور ضابط ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ متن بھی صحیح ہو یعنی ایمان کے وہ اصول جو ائمہ دین کے نزدیک متفق علیہ ہیں، ان اصولوں میں سے کسی اصول کے ساتھ اس کا متن ٹکراتا نہ ہو اور قوی دلائل کے مخالف نہ ہو۔"

جب علماء کے نزدیک صحت حدیث کے لئے یہ تسلیم شدہ اصول ہے تو پھر یہ روایت

1۔ عرجون، "محمد رسول اللہ"، جلد 1، صفحہ 387

صحیح نہیں ہو گی کیونکہ یہ اس معیار پر پوری نہیں اترتی، اس سے عصمت انبیاء کا عقیدہ مجروح ہوتا ہے اور یہ عقیدہ دین کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ حضور ﷺ کا بار بار، حالت یاس میں، پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اس ارادے سے جانا کہ اپنے آپ کو گرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ "العیاذ باللہ" حضور ﷺ کو اپنی نبوت پر ایمان راسخ نہ تھا۔ حضور ﷺ کے کردار کی اجلی چادر پر، اس سے زیادہ بد نما داغ اور کیا لگایا جا سکتا ہے؟

اس روایت کے ضعیف ہونے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ فترت وحی کے بارے میں جو روایت مرفوعاً حضور ﷺ سے مروی ہے اس میں ان باتوں کا ذکر نہیں ہے۔ اس حدیث کو صحیحین کے علاوہ کئی ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث بھی حضرت امام زہری سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن کو یہ کہتے سنا کہ مجھے حضرت جابر بن عبد اللہ نے خبر دی کہ انہوں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

> ثُمَّ فَتَرَ الْوَحْیُ عَنِّیْ فَتْرَةً فَبَیْنَا اَنَا اَمْشِیْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَآءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِیْ قِبَلَ السَّمَآءِ فَاِذَا الْمَلَكُ الَّذِیْ جَآءَنِیْ بِحِرَاءَ قَاعِدٌ عَلٰی کُرْسِیٍّ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ فَجُئِثْتُ مِنْهُ حَتّٰی هَوَیْتُ اِلَی الْاَرْضِ فَجِئْتُ اَهْلِیْ فَقُلْتُ لَهُمْ (زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ فَزَمَّلُوْنِیْ) فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی: "یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ" اِلٰی قَوْلِهٖ "وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" ثُمَّ تَتَابَعَ الْوَحْیُ (1)

"پھر وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک روز، جب میں چل رہا تھا، میں نے آسمان سے آواز سنی۔ میں نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا، وہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں خوف زدہ ہو کر گر گیا پھر اہل خانہ کے پاس آیا اور کہا مجھے کمبل اوڑھا دو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ سے لے کر وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ تک۔ اس کے بعد وحی

1۔ عرجون، "محمد رسول اللہ"، جلد 1، صفحہ 398

مسلسل نازل ہونے لگی۔

یہ حدیث پاک مرفوع ہے۔ اس کے راوی بھی امام زہری ہیں۔ اس میں حضور ﷺ خود فترت وحی کا بیان فرما رہے ہیں لیکن اس حدیث میں ان جملوں کا ذکر نہیں جو امام زہری کی مرسل میں ہیں۔ اس لئے لازماً مرفوع حدیث مرسل پر مقدم ہوگی۔

اس بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حدیث مذکورہ کے ساتھ اس جملے کو بعد میں شامل کیا گیا ہے۔ جب اس جملے کا الحاقی ہونا بھی ظاہر ہے اور یہ جملہ عصمت نبوت جیسے متفق علیہ اسلامی عقیدے سے بھی متصادم ہے تو پھر اس کو مسترد کرنا ضروری ہے خواہ اس کو روایت کرنے والوں میں کتنے ہی بزرگوں کے نام آتے ہوں۔ کیونکہ روایت اور درایت کے اصول اس قسم کے جملوں کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

مذکورہ حدیث کا دوسرا جملہ جس کو مستشرقین نے حضور ﷺ کی، اپنے منصب کے متعلق بے یقینی ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا ہے وہ ہے: لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ یعنی مجھے اپنی جان کا خوف لاحق ہو گیا ہے۔

امام بخاری نے جن مقامات پر یہ حدیث درج کی ہے، ان تمام مقامات پر یہ جملہ موجود ہے اور امام مسلم نے بھی اس حدیث کو اس جملے کے ساتھ ہی روایت کیا ہے۔ اگرچہ امام بخاری نے لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ کے جملے کو تمام مقامات پر حدیث مذکور کے ساتھ شامل کیا ہے لیکن دیگر کئی ائمہ حدیث نے، اس حدیث کو اس جملے کے بغیر بھی روایت کیا ہے۔ ابن سید الناس نے ابو بشر الدولابی کی روایت سے حضرت عبد اللہ بن ابی بکر بن حزم کی حدیث روایت کی ہے، جس میں نہ تو حضور ﷺ کے خوفزدہ ہونے کا ذکر ہے اور نہ غم و حزن کا بلکہ اس حدیث میں حضور ﷺ کے اطمینان کا ذکر ہے۔ ہم یہاں اس حدیث پاک کو درج کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ بِشْرِ الدُّوْلَابِیْ بِسَنَدِہٖ اِلٰی عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ: اَنَّہٗ کَانَ مِنْ بَدْءِ اَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ رَاٰی فِی الْمَنَامِ رُؤْیَا فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَیْہِ فَذَکَرَ ذٰلِكَ لِصَاحِبَتِہٖ خَدِیْجَۃَ بِنْتِ خُوَیْلِدٍ فَقَالَتْ: اَبْشِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَصْنَعُ بِكَ اِلَّا خَیْرًا فَذَکَرَ

لَهَا اَنَّهٗ رَاٰیْ اَنْ بَطْنَهٗ اُخْرِجَ فَطُهِّرَ وَغُسِلَ ثُمَّ اُعِیْدَ كَمَا كَانَ قَالَتْ هٰذَا خَیْرٌ فَاَبْشِرْ ثُمَّ اسْتَعْلَنَ بِهٖ جِبْرِیْلُ فَاَجْلَسَهٗ عَلٰی مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ یُجْلِسَهٗ عَلَیْهِ وَفِیْ بَعْضِ الرِّوَایَاتِ: فَاَجْلَسَنِیْ عَلٰی دُرْنُوْكٍ اَیْ بِسَاطٍ لَهٗ خَمْلٌ فِیْهِ الْیَاقُوْتُ وَاللُّؤْلُؤُ وَفِیْ مُرْسَلِ الزُّهْرِیْ: فَاَجْلَسَنِیْ عَلٰی مَجْلِسٍ كَرِیْمٍ مُعْجِبٍ وَبَشَّرَهٗ بِرِسَالَةِ رَبِّهٖ حَتّٰی اِطْمَاَنَّ ثُمَّ قَالَ: اِقْرَءْ قَالَ: (كَیْفَ اَقْرَءُ؟) قَالَ: "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" فَقَبِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رِسَالَةَ رَبِّهٖ وَاتَّبَعَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ جِبْرِیْلُ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ وَانْصَرَفَ اِلٰی اَهْلِهٖ فَلَمَّا دَخَلَ عَلٰی خَدِیْجَةَ قَالَ: "اَرَءَیْتِكِ الَّذِیْ كُنْتُ اُحَدِّثُكِ وَرَاَیْتُهٗ فِی الْمَنَامِ فَاِنَّهٗ جِبْرِیْلُ اِسْتَعْلَنَ" اَخْبَرَهَا بِالَّذِیْ جَآءَهٗ مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَسَمِعَ فَقَالَتْ: اَبْشِرْ فَوَاللّٰهِ لَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِكَ اِلَّا خَیْرًا فَاقْبَلِ الَّذِیْ اَتَاكَ اللّٰهُ وَاَبْشِرْ فَاِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقًّا (1)

"ابو بشر الدولابی اپنی سند سے حضرت عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی نبوت کا آغاز اس طرح ہوا کہ آپ نے خواب میں کچھ مناظر دیکھے جو آپ پر شاق گزرے۔ آپ نے اس کا ذکر اپنی رفیقہ حیات حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے کیا تو انہوں نے عرض کیا: آپ کو مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ سے وہی معاملہ فرمائے گا جو آپ کے لئے بہتر ہوگا۔ حضور ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے جسم سے آپ کے دل کو نکالا گیا، اسے پاک کیا

1۔ عرجون، "محمد رسول اللہ"، جلد 1، صفحہ 358

گیا اور دھویا گیا اور پھر اسے اپنی جگہ پر لوٹا دیا گیا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یہ خواب آپ کے لئے بہتر ہے، آپ کو مبارک ہو۔ پھر حضرت جبریل امین اعلانیہ ظاہر ہوئے او حضور ﷺ کو اس چیز پر بٹھایا، جس پر آپ کو بٹھانا خدا کو منظور تھا۔ بعض روایات میں ہے: مجھے درنوک یعنی ایسے بچھونے پر بٹھایا جس پر بُر بھی تھی اور یاقوت و جواہر بھی۔ زہری کی مرسل میں ہے: مجھے ایک دلکش اور قابل احترام مسند پر بٹھایا۔ پھر جبریل امین نے حضور ﷺ کو رسالت کی بشارت دی حتی کہ آپ مطمئن ہو گئے۔ پھر حضرت جبریل امین نے فرمایا: پڑھو۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیسے پڑھوں؟ فرمایا: پڑھئے اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے (سب کو) پیدا فرمایا۔ پیدا کیا انسانوں کو جمے ہوئے خون سے۔ پڑھیے، آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم کے واسطہ سے۔ حضور ﷺ نے اپنے رب کا رسول ہونے کی ذمہ داری کو قبول کر لیا اور جبریل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام لے کر آئے تھے اس کی پیروی کی۔ پھر آپ اپنے اہل خانہ کے پاس تشریف لے گئے۔ جب آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے، تو ان سے فرمایا: جس ہستی کو میں نے خواب میں دیکھا تھا اور اس کا ذکر تم سے کیا تھا، وہ جبریل امین ہیں جو اب حالت بیداری میں اعلانیہ ظاہر ہو گئے ہیں۔ آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اس پیغام کے متعلق بھی بتایا جو جبریل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے تھے اور جو آپ نے ان سے سنا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا: آپ کو مبارک ہو۔ قسم بخدا! اللہ تعالیٰ آپ سے وہی معاملہ فرمائے گا جو آپ کے لئے بہتر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس نعمت سے نوازا ہے آپ اسے قبول فرمائیں اور اس پر اظہار مسرت فرمائیں۔ بے شک آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔"

یہ حدیث پاک نزول وحی کے آغاز کے وقت حضور ﷺ کے کسی خوف و حزن یا قلق و

اضطراب کا ذکر نہیں کر رہی بلکہ آپ کے اطمینان کا ذکر کر رہی ہے۔ حضرت جبریل امین علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لاتے ہیں، پہلے آپ کو پورے احترام اور وقار سے بٹھاتے ہیں پھر آپ کو منصب رسالت کی عظیم نعمت کی بشارت دیتے ہیں حتی کہ اس نعمت کے ملنے پر آپ کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اطمینان کا درجہ ایمان سے بھی بلند ہے۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام کو پختہ یقین اور ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: پروردگار عالم! مجھے مشاہدہ کرا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ پرورگار عالم نے فرمایا: ابراہیم! کیا تمہیں میری اس قدرت پر ایمان نہیں؟ عرض کیا: پروردگار عالم! ایمان تو ہے لیکن سوال اس لئے کر رہا ہوں کہ اطمینان قلب کی دولت عطا ہو جائے۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اطمینان کی جس دولت کے حصول کے لئے احیائے موتی کے عمل کا مشاہدہ کرنے کا سوال کیا تھا، حضور ﷺ کو وہ دولت قرآن حکیم کی پہلی آیت نازل ہونے سے پہلے ہی عطا کر دی گئی تھی اور اس دولت کے عطا ہونے کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا تھا: "پڑھو اپنے رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا۔"

نبوت و رسالت کے مناصب کسبی نہیں بلکہ وھبی ہیں اور یہ انہی لوگوں کو عطا ہوتے ہیں جنہیں پروردگار عالم ان عظیم ذمہ داریوں کا اہل بناتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (1)

"اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے (اس دل کو) جہاں وہ رکھتا ہے اپنی رسالت کو۔"

جب اللہ تعالیٰ کسی کو یہ منصب سونپنے کے لئے چن لیتا ہے تو پھر اس ذمہ داری سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے اپنے اس بندے کی تربیت اپنی نگاہ قدرت کے سامنے فرماتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کا منصب عطا کیا تھا اور ان کو یہ منصب عطا کرنے سے پہلے ان کی تربیت اپنی خصوصی نظر کرم کے سامنے کرائی تھی اور فرمایا تھا: وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ (2) یعنی ہم نے تمہاری تربیت کے لئے جو تدابیر کیں، ان

1۔ سورۃ الانعام: 124

2۔ سورۂ طٰہٰ: 39

کا منشا یہ تھا کہ تمہاری پرورش میری چشم (کرم) کے سامنے ہو۔ اور جب ان کی تربیت ان کے منصب کے تقاضوں کے مطابق ہو گئی تو انہیں یہ بشارت دی گئی: وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (1) اور میں نے مخصوص کر لیا تمہیں اپنی ذات کے لئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داریاں واقعی بڑی کٹھن تھیں۔ انہیں، خدائی کے نشے میں مخمور فرعون، کے دربار میں نعرہ توحید بلند کرنا تھا۔ انہیں فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ اعلان کرنا تھا کہ خدا تم نہیں بلکہ وہ ہے جس نے زمین و آسمان پیدا کئے ہیں اور جس کی تدبیر سے نظام عالم چل رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فریضہ، صدیوں سے قوم فرعون کے چنگل میں پھنسی ہوئی قوم بنو اسرائیل کو غلامی کے چنگل سے نکال کر آزاد فضاؤں میں بسانا اور اس بگڑی ہوئی قوم کو راہ راست پر لانا تھا۔ ان عظیم اور کٹھن ذمہ داریوں کو کماحقہ نباہنے کے لئے، واقعی ان کی خصوصی تربیت کی ضرورت تھی، جو پروردگار عالم نے کی۔ حضور ﷺ کی ذمہ داریاں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داریوں سے بھی کئی گنا زیادہ کٹھن تھیں۔ آپ کو نہ صرف خانہ کعبہ کو تین سو ساٹھ بتوں سے پاک کرنا تھا بلکہ خدا کی ساری زمین کو تمام جھوٹے خداؤں کی پرستش سے صاف کرنا تھا۔ آپ کے مقابلے میں ایک فرعون نہیں بلکہ ہزاروں فرعون تھے۔ مکی سرداروں کی اکڑی ہوئی گردنیں آپ کے سامنے تھیں۔ آپ کا مقابلہ قیصر و کسریٰ کی شان و شوکت سے تھا۔ آپ نے ساری دنیا سے ظلم کی تاریکیوں کو ختم کر کے عدل کا چراغ روشن کرنا تھا۔ آپ صرف عربوں کو ظلم کے چنگل سے نکالنے کے لئے تشریف نہیں لائے تھے بلکہ آپ نے ساری نسل انسانی کو ظلم، جہالت، کفر، شرک اور لاقانونیت کے چنگل سے آزاد کر کے ایک عادلانہ انسانی معاشرے میں بسانا تھا۔

ان عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوئی ایسا انسان آپ کی تربیت نہیں کر سکتا تھا جس نے خود ظلم اور جہالت کے ماحول میں آنکھ کھولی ہو، بلکہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ کی تربیت صرف وہی ہستی کر سکتی تھی، جس نے آپ کو یہ ذمہ داریاں سونپی تھیں۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی تربیت کا حق ادا کر دیا۔ نگاہ قدرت نے آپ کے بچپن کو بچگانہ لھو و لعب سے پاک رکھا، آپ کی جوانی کو، جوانی

1۔ سورہ طہٰ 41

کے بے لگام جذبات کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھا اور بت پرستی کے ماحول میں جنم لینے اور پروان چڑھنے کے باوجود، بچپن ہی سے آپ کے دل کو بتوں کی نفرت سے بھر دیا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تربیت ہی کا اثر تھا کہ حضور ﷺ جس ماحول میں پروان چڑھے تھے، آپ کا دامن اس ماحول کی تمام آلودگیوں سے پاک تھا۔ اور اپنے دور بلکہ ہر دور کی تمام انسانی خوبیاں، آپ کے کردار میں، بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا: مجھے میرے رب نے ادب سکھایا ہے اور اس نے مجھے خوب ادب سکھایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح بچپن سے حضور ﷺ کی تربیت اپنی خصوصی نگاہ کرم کے سامنے کی تھی، اسی طرح رسالت کا بار گراں آپ کے کندھوں پر ڈالنے سے پہلے خصوصی طور پر آپ کو یہ بار گراں اٹھانے کے لئے تیار فرمایا تھا۔ قرآن حکیم کا نزول تو غار حرا میں حضور ﷺ کے پاس، حضرت جبریل امین کے حالت بیداری میں تشریف لانے سے شروع ہوا تھا لیکن نزول وحی کا آغاز اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ امت اس بات پر متفق ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے اور حضور ﷺ پر بھی نزول وحی کا آغاز رویائے صادقہ سے ہوا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی جس حدیث میں ابتدائے وحی کا ذکر ہے اس حدیث کی ابتدا ان کلمات سے ہوتی ہے:

> اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءَ يَتَحَنَّثُ فِيْهِ (1)

> "حضور ﷺ پر نزول وحی کی ابتداء حالت خواب میں سچے خوابوں سے ہوئی۔ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح بالکل واضح طور پر آپ کے سامنے آجاتا۔ پھر آپ کے دل میں تنہائی کی محبت پیدا ہو گئی۔ آپ غار حراء کی خلوتوں میں تشریف لے جاتے اور وہاں عبادت کرتے۔"

یہ حدیث پاک واضح طور پر بتا رہی ہے کہ سچے خوابوں نے حضور ﷺ کے دل میں

1۔ صحیح البخاری، جلد 1، صفحہ 6

تنہائی کی محبت پیدا کی۔ تنہائی کی اس محبت ہی کی وجہ سے آپ غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے۔ احادیث اور سیرت کی کتابوں میں یہ حقیقت بار بار بیان ہوئی ہے کہ حضور ﷺ نزول قرآن کے آغاز سے کافی عرصہ پہلے، غار حرا کی خلوتوں میں عبادت کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ گویا سچے خواب جو وحی کا حصہ تھے وہ حضور ﷺ کو اس وقت آنا شروع ہوئے تھے جب آپ نے ابھی غار حراء میں جانا شروع بھی نہیں کیا تھا۔ امام شعبی نے غار حرا میں حضور ﷺ کے پاس جبریل امین کے تشریف لانے اور قرآن حکیم کی ابتدائی آیات نازل ہونے سے تین سال پہلے رویائے صادقہ کے ذریعے حضور ﷺ کے لئے نبوت کو ثابت کیا ہے اور امام بیہقی نے یہ مدت چھ مہینے بتائی ہے۔ (1)

علامہ محمد صادق عرجون نے اپنی کتاب "محمد رسول اللہ" کی پہلی جلد کے صفحہ 271 پر قاضی مدینہ حضرت عبید بن عمیر سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے۔ اس روایت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ غار حرا میں، پہلی وحی کے نازل ہونے کے وقت، جن تجربات سے گزرے تھے، وہ پہلے آپ کو خواب میں دکھا دیئے گئے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا کی حدیث میں جن واقعات کے حالت بیداری میں پیش آنے کا ذکر ہے، حضرت عبید بن عمیر کی حدیث میں انہی واقعات کے حالت خواب میں پیش آنے کا ذکر ہے، دونوں احادیث کے درمیان تطبیق کی بہترین صورت یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ غار حراء میں حضور ﷺ کو قرآن حکیم کی ابتدائی آیات نازل ہونے کے وقت جو حالات پیش آئے تھے، ان کا مشاہدہ پہلے آپ کو حالت خواب میں کرا دیا گیا تھا۔ جس طرح آپ کے باقی خواب دن کی روشنی کی طرح واضح طور پر آپ کے سامنے آجاتے تھے، اسی طرح اس خواب کی تعبیر بھی آپ کو ہو بہو اسی شکل میں نظر آگئی جیسے آپ نے خواب دیکھا تھا۔

جب حضور ﷺ پر سچے خوابوں کے ذریعے نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا تھا، آپ اسی وقت سے نبی تھے۔ آپ کو اپنی نبوت کا یقین بھی تھا اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ آپ پر خدا کی طرف سے خدا کا مقرب فرشتہ وحی لے کر آتا ہے۔ آپ آغاز نبوت ہی سے معصوم تھے اور کوئی ایسا فعل، قول یا سوچ جو عصمت نبوت سے متصادم تھی، اس کا آپ کی ذات سے صدور ممکن نہ تھا۔ کیونکہ اللہ تعالی اس قسم کی چیزوں سے اپنے نبیوں اور رسولوں کی خود

1۔ عرجون، "محمد رسول اللہ"، جلد 1، صفحہ 49-348

حفاظت فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بچپن سے ہی حضور ﷺ کی تربیت اپنی خصوصی نظر کرم سے کی تھی۔ اس نے آپ کو ساری کائنات کی راہنمائی کے لئے چنا تھا اور پھر اس عظیم ذمہ داری کے لئے آپ کو خصوصی طور پر تیار کیا تھا۔ منصب رسالت کے باقاعدہ آغاز سے مدتوں پہلے وحی منامی کے ذریعے آپ کے دل کو حقائق و معارف کی تنویرات سے منور کیا تھا اور جب قرآن حکیم کا پہلا جملہ آپ کے قلب انور پر نازل ہوا تھا، اس وقت آپ یقین کے اس بلند مقام پر فائز تھے جسے حدیث پاک نے اطمینان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

ان حقائق کے بعد بھی اگر یہ کہا جائے کہ حضور ﷺ نزول وحی کی وجہ سے بے یقینی اور شک کا شکار ہوئے تھے، تو یہ نہ صرف عصمت نبوت پر حملہ ہے بلکہ قدرت خداوندی کا بھی انکار ہے۔ کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ تربیت خداوندی کے اتنے زبردست اہتمام کے باوجود حضور ﷺ کو اپنی نبوت کا یقین نہیں آرہا تھا اور کبھی آپ کو یہ یقین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی باتوں سے آتا تھا، کبھی ورقہ بن نوفل کی باتوں سے اور کبھی بار بار جبریل امین کے آپ کو یاد دہانی کرانے سے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ خدا کی تدابیر (نعوذ باللہ) کارگر ثابت نہ ہوئیں۔

جو حقائق و معارف ایک نبی کے قلب انور پر منکشف ہوتے ہیں، ایک عام انسان تو ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ کتنی انہونی سی بات ہے کہ حضرت محمد ﷺ اپنے بچپن سے جن محیر العقول تجربات سے گزر رہے تھے اور سچے خوابوں کے ذریعے آپ کے قلب انور پر جن علوم و معارف کا القاء ہو رہا تھا، وہ ساری چیزیں تو آپ کو اپنی نبوت کا یقین نہ دلا سکیں اور یہ یقین حاصل کرنے کے لئے کبھی آپ کو اپنی رفیقہ حیات پر اور کبھی ایک عالم عیسائیت پر اعتماد کرنا پڑا۔

ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو آدمی کو یقین آجاتا ہے کہ حضور ﷺ پر جب حالت بیداری میں قرآن حکیم کی ابتدائی آیات کا نزول ہوا تو آپ نے اس نعمت خداوندی کو قلق و اضطراب سے نہیں بلکہ سکون و اطمینان سے قبول کیا۔ جب کچھ احادیث طیبہ بھی اس نظریے کی تائید کرتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِىْ

یعنی مجھے اپنی جان کا خوف لاحق ہو گیا ہے، کا جو جملہ روایت ہوا ہے، اس جملے سے کسی صورت میں یہ نتیجہ نکالنا ممکن نہیں کہ حضور ﷺ کو اپنے مجنون ہونے، جنوں کے زیر اثر ہونے یا کاہن ہونے کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ اس جملے کی یہ تمام تعبیریں بعید از قیاس ہیں۔ یہاں خوف آپ کی لاعلمی یا عدم یقین کی وجہ سے نہ تھا بلکہ یہ خوف اس بات کا ثبوت تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو ذمہ داری سونپی تھی، آپ کو اس ذمہ داری کے بوجھ اور مشکلات کا احساس تھا۔ آپ کو ساری کائنات کا رسول بنایا گیا تھا۔ آپ کو ساری دنیا کے عقائد کی اصلاح کرنا تھی۔ آپ نے ظلم کو عدل سے بدلنا تھا، جہالت کی تاریکیوں کو معرفت کی تنویرات سے دور کرنا تھا، کروڑوں خداؤں کے سامنے سجدہ کرنے والی نسل آدم کو خدائے واحد کی عبادت پر جمع کرنا تھا، خون کے پیاسوں کے دلوں میں ایک دوسرے کیلئے جذبات اخوت و مودت کی تخم ریزی کرنی تھی، طبقاتی امتیازات اور نسلی تفاخر کا قلع قمع کرنا تھا، غلاموں کو انسانی عظمتوں سے آشنا کرنا تھا اور صنف نازک کو معاشرے میں وہ مقام عطا کرنا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ یہ ذمہ داری اتنی کٹھن تھی کہ ایک عام انسان تو اس کو پورا کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ ساری انسانیت کی مخالفت برداشت کر کے خدا کے نام کا جھنڈا بلند کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا لیکن حضور ﷺ نے اطمینان قلب کے ساتھ اس ذمہ داری کو قبول کر لیا تھا۔ آپ کو نہ صرف یہ یقین تھا کہ آپ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ آپ کو اس بات پر بھی یقین کامل تھا کہ ذمہ داری سونپنے والا قدم قدم پر آپ کی دستگیری فرمائے گا اور آپ کو یہ بھی یقین تھا کہ جو مشن آپ کو سونپا گیا ہے، آپ اس کو پورا کرنے میں یقیناً کامیاب ہوں گے۔ اس یقین کا ثبوت حضور ﷺ کی کتاب حیات کے ایک ایک صفحے پر رقم ہے۔

حضور ﷺ کو غار حرا کے تجربے میں جس خوف سے واسطہ پڑا تھا، اس خوف کے دو سبب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ فطرت بشری کا فطرت ملکی سے ملاپ اور قلب بشر پر کلام خداوندی کا نزول ایسے واقعات نہ تھے جو فطرت بشریت پر اثر انداز نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو اس نازک ترین لمحے کے لئے مدت سے تیار فرما رہا تھا۔ خدا کا کلام تو تیئس سال تک آپ کے قلب انور پر نازل ہوتا رہا اور جب بھی وحی نازل ہوتی، آپ اس کے ثقل کو محسوس فرماتے۔ اس لئے جب پہلی بار آپ نزول وحی کے تجربے سے گزرے

تھے، اس وقت لازماً آپ کی طبیعت پر اس کا زبردست اثر ہوا ہو گا۔ لیکن یہ اثر نہ تو لاعلمی اور بے یقینی کی شکل میں تھا اور نہ ہی مجنون اور کاہن ہو جانے کے خوف کی شکل میں۔ بلکہ یہ اثر کلام خداوندی کی عظمتوں اور رفعتوں کے احساس کی وجہ سے تھا جس کی کیفیات کو صرف قلب مصطفیٰ علیہ التحیہ والثناء ہی سمجھ سکتا ہے۔ اگر یہ خوف اس قسم کا ہوتا جس سے حضور ﷺ دور بھاگتے تو اس تجربے کے بعد آپ غار حرا کا نام لینے سے بھی کانپتے۔ کیونکہ انسان جس مقام پر کسی ہیبت ناک تجربے سے گزرتا ہے، اس جگہ جانا تو کجا، انسان اس مقام کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ غار حرا جہاں حضور ﷺ پہلی وحی نازل ہونے کے صبر آزما تجربے سے گزرے تھے، اس غار کی تنہائیوں میں جانا آپ کا معمول بن گیا۔ غار حرا کی خلوتوں میں آپ کو وحشت محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ وہاں آپ کے دل مضطر کو وہ قرار ملتا تھا جو صرف خدا کے حبیب ہی کا حصہ ہے۔ اور جس تجربے سے حضور ﷺ خوف زدہ ہوئے تھے، اس کا سلسلہ منقطع ہو جانے پر آپ بے چین ہو جاتے تھے۔

اس تجربے کے بعد حضور ﷺ کا مسلسل غار حرا میں جانا اور وحی کا سلسلہ منقطع ہونے پر آپ کا بے چینی اور اضطراب محسوس کرنا، اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ حضور ﷺ کو یقین تھا کہ غار حرا کی خلوتوں میں آپ کو جو نعمت عطا ہوئی ہے، وہ حاصل حیات ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو کسی دوسرے انسان کو عطا نہیں ہوئی۔ آپ کا قلب انور، ایک بار جب کلام خداوندی کی لذتوں سے آشنا ہو گیا تو پھر ممکن نہ تھا کہ وہ دل انقطاع وحی کے وقفوں کو چین سے گزار سکتا۔ آپ کا قلب انور کلام خداوندی کی ناقابل بیان لذتوں کے لئے یقیناً تڑپتا ہو گا لیکن یہاں نہ تو شک وارتیاب کی کوئی گنجائش تھی اور نہ ہی انقطاع وحی کے وقفوں میں حضور ﷺ سے کسی ایسی حرکت کے ارتکاب کا امکان تھا، جس کا ارتکاب ایک کمزور دل اور پست ہمت شخص حالت مایوسی میں کرتا ہے۔

مستشرقین خود جب حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے محیر العقول کارناموں کو دیکھتے ہیں تو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ کو اپنے مشن کی صداقت پر کامل ایمان نہ ہوتا تو آپ قطعاً وہ حیران کن کارنامے سرانجام نہ دے سکتے جو آپ نے انجام دیئے۔ ولیم میور ان لوگوں میں سے ہے، جو حضور ﷺ پر خودکشی کا ارادہ کرنے کا الزام لگانے والوں میں پیش پیش ہیں، اور جو لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ابتدا میں حضور ﷺ کو اپنے مشن کا

یقین نہ تھا۔ اپنے اس انتہائی معاندانہ موقف کے باوجود ولیم میور، خدا پر حضور ﷺ کے یقین کے متعلق لکھتا ہے:

"Indeed nothing is so remarkable as the faith reposed by Mahomet in the deity as an ever present and all-controlling agency". (1)

"سب سے زیادہ نمایاں اور حیرت انگیز چیز وہ ایمان ہے، جو محمد (ﷺ) کو خدا پر تھا، جو ہر جگہ حاضر و ناظر اور ساری کائنات کا نظام چلانے والا ہے۔"

منٹگمری واٹ حضور ﷺ کے کٹھن مشن کے لئے یقین کامل کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"To carry on in the face of persecution and hostility would have been impossible for him unless he was fully persuaded that God had sent him, and the receiving of revelations was included in his divine mission". (2)

"اگر محمد (ﷺ) کو یہ یقین نہ ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ پر وحی نازل ہوتی ہے تو اذیتوں اور مخالفتوں کے طوفان میں آپ کے لئے اپنے مشن کو جاری رکھنا ممکن نہ رہتا۔"

تھامس کارلائل بھی ایک مستشرق ہے۔ اس نے بھی حضور ﷺ کے حالات زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس نے بھی ان روایات کو دیکھا ہے جن میں حضور ﷺ پر ابتدائی وحی کے نزول کا بیان ہے۔ وہ بھی کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے غار حرا میں جو کچھ دیکھا، اسے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے بیان کیا لیکن تھامس کارلائل کو آپ کے اس وقت کے رویے میں نہ تو قلق و اضطراب نظر آیا ہے اور نہ ہی شک و ارتیاب، بلکہ وہ کہتا ہے کہ حضور ﷺ غار حرا کے تجربے کے بعد اپنی رفیقہ حیات کے پاس تشریف لائے تو انہیں بتایا کہ آپ جن حقائق کی تلاش میں تھے، وہ حقائق آپ پر منکشف ہو چکے ہیں۔ تھامس کارلائل کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"Mahomet was in his fortieth year, when having

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 9-8

2۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 17

withdrawn to a cavern in Mount Hara, near Mecca, during this Ramadhan, to pass the month in prayer, and meditation on those great questions, he one day told his wife Khadijah, who with his household was with him or near him this year, that by the unspeakable special favour of Heaven he had now found it all out; was in doubt and darkness no longer, but saw it all". (1)

"محمد (ﷺ) کی عمر چالیس سال تھی۔ آپ اس سال کا ماہ رمضان غار حرا میں گزارنے کے لئے وہاں تشریف لے جاچکے تھے تاکہ وہاں اپنا وقت عبادت اور کائنات کے متعلق اہم سوالات پر غور و فکر کرنے میں بسر کریں۔ ایک روز آپ نے (حضرت) خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہا) کو جو اس سال آپ کی ضروریات زندگی کے ہمراہ آپ کے ساتھ یا آپ کے قریب ہی تھیں، بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے ناقابل بیان کرم سے تمام حقائق آپ پر منکشف ہو گئے ہیں، اب آپ کے دل میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ گیا اور حقیقت پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کے سامنے جلوہ گر ہے۔"

یہاں ہم منٹگمری واٹ کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں، جس کے بعد اس حقیقت میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ مخالفت کے باوجود مستشرقین کے پاس حضور ﷺ کے ایمان کی قوت کو تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ منٹگمری واٹ فترت وحی کے دوران، پہاڑوں سے چھلانگ لگانے کے حضور ﷺ کے ارادے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"Muhammad had his moments of gloom, as was not surprising in view of the apparently insuperable obstacles which confronted him. Yet he never altogether lost the conviction that he had been called by God and given a special work to do in his day and generation. This conviction sustained him in the face

---

1۔ تھامس کارلائل، "آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ"، (ایوری مین لائبریری نیویارک۔ 1973)، صفحہ 290

of opposition, mockery, calumny and persecution; and when success came to him, it did not turn his head, but only deepened his belief that God who had called him was also working for him in historical events". (1)

"محمد (ﷺ) کی زندگی میں افسردگی کے لمحات بھی آئے۔ آپ کو جن بظاہر ناقابل تسخیر مشکلات سے واسطہ تھا، ان کے پیش نظر افسردگی کے ان لمحات کا آنا کوئی حیرت کی بات بھی نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے اس ایمان میں کبھی کمی نہیں آئی کہ خدا نے آپ کو اپنا رسول بنایا ہے اور اپنے دور میں ایک اہم کام کی انجام دہی کا فریضہ آپ کو سونپا ہے۔ یہی وہ یقین تھا جس نے مخالفت، تضحیک، افترا پردازی اور اذیتوں کے دوران آپ کو ثابت قدم رکھا اور جب کامیابی نے آپ کے قدم چومے تو آپ کے یقین میں کمی نہ آئی بلکہ یہ یقین اور گہرا ہو گیا اور آپ یہ سمجھنے لگے کہ جس خدا نے آپ کو بھیجا ہے وہ خدا تاریخی واقعات میں بھی آپ کی دستگیری کر رہا ہے۔

حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے عظیم الشان رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذمے جو کام لگاتا ہے وہ کام مشکل ترین ہوتا ہے، اس لئے بارگاہ خداوندی سے جن نفوس قدسیہ کے سروں پر رسالت و نبوت کا تاج سجایا جاتا ہے، انہیں صبر، استقامت، عزیمت اور یقین کی وہ بے پناہ قوتیں عطا ہوتی ہیں جن کا دوسرے انسان تصور بھی نہیں کر سکتے۔

جو لوگ حضور ﷺ کو خدا کا سچا رسول یقین کرتے ہیں، انہیں آپ کی حیات طیبہ کے متعلق ہر بیان کی تشریح کرتے وقت اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اور جو لوگ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو خدا کا سچا رسول ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں، وہ بھی ان اثرات کا انکار نہیں کر سکتے جو حضور ﷺ کی مساعی سے انسانی معاشرے پر پڑے۔ کسی ایک شخص سے اپنا آبائی دین چھڑوانا انتہائی مشکل ہوتا ہے لیکن حضور ﷺ نے سارے جزیرہ عرب کے مکینوں کے دلوں سے آبائی دین کی محبت کو نکالا اور اس کی جگہ ایک نئے دین کی محبت کا بیج بویا۔ آپ نے بت پرستوں کو بت شکن بنایا، زندگی کے پورے معاشرتی ڈھانچے کو بدلا، شراب جیسی لعنت جو عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی اسے ختم کیا، پانی کی باری جیسے معمولی

1۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 16-15

تنازعات پر خون کی ندیاں بہانے والوں کے دلوں کی سنگینی کو ختم کر کے وہاں رافت ورحمت کے چمن آباد کیے، جن لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف انتقام کے جذبات ٹھاٹھیں مار رہے تھے، ان کو رشتہ اخوت میں پرو دیا، قانون سے ناآشنا عربوں کو قانون کی پابندی کا درس دیا، جن لوگوں کے ہاں تہذیب و ثقافت کا کوئی تصور نہ تھا، ان کو تہذیب و ثقافت کا امام بنایا اور اخلاقی غلاظتوں میں ڈوبے ہوئے انسانوں کو حسن اخلاق کا نمونہ بنایا۔

آپ نے انسانی زندگی میں جو انقلاب برپا کیا وہ جزیرہ عرب سے نکل کر دنیا کے کونے کونے میں پھیل گیا اور چودہ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی اس کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بج رہے ہیں۔ دنیا کے ایک ارب کے قریب انتہائی مہذب انسان آج بھی بقائمی ہوش و حواس آپ کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں لٹکانے پر فخر کرتے ہیں۔

کیا غیر جانبدارانہ تحقیق اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے متعلق کسی بیان کی تشریح کرتے وقت ان تمام حقائق کو نظرانداز کر دیا جائے؟

مستشرقین جب حضور ﷺ کے خلوص پر حملہ آور ہوتے ہیں، آپ کو مرگی کا مریض قرار دیتے ہیں یا آپ کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ کو کسی زمانے میں اپنے مشن کی صداقت پر پورا یقین نہ تھا تو وہ یہ کہتے ہوئے حضور ﷺ کے ان کارناموں سے نظریں پھیر لیتے ہیں جنہوں نے چودہ سو سال سے ایک دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔ جس شخص نے یہ کارنامے سرانجام دیئے ہیں، یقیناً وہ صبر، عزم، استقامت، یقین اور خلوص کی اس دولت سے بہرہ ور تھا جس کا عام انسان تصور بھی نہیں کر سکتے۔

جو شخص حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے کارناموں کو سامنے رکھ کر آپ کی زندگی کے مختلف واقعات کی تشریح کرتا ہے، اسے آغاز وحی کے بیانات کا وہی مفہوم نظر آتا ہے جو تھامس کارلائل کو نظر آیا ہے اور جو لوگ حضور ﷺ پر الزام لگانے کے شوق میں آپ کی پوری زندگی کو فراموش کر دیتے ہیں انہیں غیر جانبدار محقق ہونے کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ علامہ محمد بن علوی المالکی الحسنی حضور ﷺ کے ایمان اور یقین کے متعلق لکھتے ہیں:

تَعَاضَدَتِ الْاَخْبَارُ وَالْاٰثَارُ عَنْ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ بِتَنْزِيْهِهِ عَنْ كُلِّ نَقْصٍ مُنْذُ وُلِدَ وَنَشْأَتِهِ عَلٰى

التَّوْحِيْدِ وَالْاِيْمَانِ بَلْ عَلٰى اِشْرَاقِ اَنْوَارِ الْمَعَارِفِ وَنَفَحَاتِ اَلْطَافِ السَّعَادَةِ وَمِنْ هُنَا كَانَ تَوْحِيْدُهٗ وَعِلْمُهٗ بِاللّٰهِ وَصِفَاتِهٖ وَالْاِيْمَانُ بِهٖ وَبِمَا اُوْحِيَ اِلَيْهِ عَلٰى غَايَةِ الْمَعْرِفَةِ وَوُضُوْحِ الْعِلْمِ وَالْيَقِيْنِ وَالْاِنْتِفَاءِ عَنِ الْجَهْلِ بِشَيْئٍ مِنْ ذٰلِكَ اَوِالشَّكِّ اَوِالرَّيْبِ فِيْهِ وَالْعِصْمَةِ مِنْ كُلِّ مَا يُضَادُّ الْمَعْرِفَةَ بِذَالِكَ وَالْيَقِيْنِ (1)

"حضور علیہ السلام کی بے شمار احادیث اور آثار اس بات پر ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام پیدائش کے وقت سے ہی ہر (انسانی) نقص سے پاک تھے۔ آپ کی پرورش توحید اور ایمان کی حالت میں، بلکہ اس حالت میں ہوئی کہ آپ پر انوار معرفت و سعادت کی بارشیں ہوتی رہیں۔ اس لئے توحید خداوندی، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت اور کلام خداوندی پر آپ کا ایمان معرفت و یقین کے انتہائی درجے پر تھا۔ آپ ان چیزوں میں سے کسی چیز کے متعلق لاعلمی اور شک سے پاک تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر اس چیز سے محفوظ رکھا تھا جو اس معرفت اور یقین کے منافی ہو۔"

حق تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ السلام کے ایمان کی بار بار گواہی دے دی ہے تو پھر کسی کی سازشوں سے ایمان رسول مشکوک نہیں ہو سکتا۔ پروردگار عالم نے کبھی فرمایا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (2)

"ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف، اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن۔"

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ السلام کا تعارف ہی آپ کے ایمان کے حوالے سے کرایا ہے اور دوسرے لوگوں کو آپ کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

1۔ محمد بن علوی المالکی الحسنی، "محمد الانسان الکامل"، (دار الشروق جدہ۔ 1984ء)، صفحہ 85

2۔ سورۃ البقرہ 285

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ وَاتَّبِعُوْہُ لَعَلَّکُمْ تَہْتَدُوْنَ (1)

"پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہے۔ جو خود ایمان لایا ہے اللہ پر اور اس کے کلام پر اور تم پیروی کرو اس کی تا کہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔"

1۔ سورۃ الاعراف: 158

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

کے پیغام اور کامیابیوں کی

مادی توجیہات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور آپ کی کامیابیوں کی مادی توجیہات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایک دعوت پیش کی۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساری نسل انسانی کی راہنمائی کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔ آپ نے لوگوں کو ان کے عقائد، فکر، عمل اور رسم و رواج کی کوتاہیوں سے آگاہ کیا اور ان کے بدلے میں ان کے سامنے صحیح عقائد و اعمال کو پیش کیا۔ آپ نے اپنے دعوے اور دعوت کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے بے شمار ایسی دلیلیں پیش کیں، جن کی موجودگی میں کسی غیر متعصب انسان کے لئے آپ کا انکار ممکن نہ تھا۔ سعید روحیں اور سلیم عقلیں ان دلائل کو دیکھ کر دل کے کامل اطمینان کے ساتھ آپ پر ایمان لے آئیں۔

ایسے لوگوں کی بھی کسی دور میں کمی نہیں رہی جنہوں نے ناقابل انکار دلائل کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا۔ حق اور باطل کی اس طویل کشمکش کے مطالعے سے انسان ایک عجیب و غریب حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا، انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اس انکار کا کوئی جواز مہیا کریں، جیسے کہ ایک مجرم ارتکاب جرم کے بعد اپنے ضمیر کے احتجاج کو ٹھنڈا کرنے کے لئے مختلف تدبیریں کرتا ہے۔

منکرین رسالت کی یہ نفسیاتی کیفیت کوئی عجیب بات نہ تھی۔ دوپہر کے وقت، نصف النہار پر چمکتے ہوئے سورج کا انکار کرنے والا، اطمینان اور سکون کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتا ہے؟ اسے اس ہٹ دھرمی پر اپنا ضمیر بھی ملامت کرتا ہے، لاکھوں کروڑوں انسان جو ضیائے آفتاب کے عینی شاہد ہیں، وہ سوچتا ہے، کہ یہ ان گنت انسان اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار، ضیائے آفتاب سے بھی بڑی ایک حقیقت کا

انکار ہے۔ اس لئے منکرین نے اپنے انکار کو جواز مہیا کرنے کے لئے ہمیشہ بے بنیاد بہانے تراشے ہیں۔ حضور ﷺ کو ساحر یا مجنون کہنا اور آپ کے الہامات کو انسانی تعلیم کا اثر قرار دینا، اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔

مستشرقین انہی لوگوں کے فکری وارث ہیں جو ہر زمانے میں حضور ﷺ کی دعوت کا انکار کرتے آئے ہیں۔ حضور ﷺ نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا، مستشرقین اس دعویٰ کا انکار کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے علوم و معارف کا منبع وحی الٰہی کو قرار دیا، مستشرقین اس کو ماننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ حضور ﷺ نے بتایا کہ میں تو نوشت و خواند سے ناآشنا تھا، آغاز تخلیق، تاریخ آدم و بنی آدم، انبیاء و مرسلین کے واقعات اور فکری و عملی اصلاح کے متعلق میں جو کچھ کہتا ہوں، یہ نہ تو مجھ تک کسی انسان کے ذریعہ پہنچا ہے اور نہ ہی یہ باتیں میری اپنی فکر اور تخیل کا نتیجہ ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق، مجھے رسالت کی ذمہ داری سونپی ہے، اور جس طرح اس نے اپنے دیگر انبیاء و مرسلین کو حقائق و معارف سے آگاہ کیا تھا، اسی طرح اس نے بذریعہ وحی مجھے بھی ان علوم و معارف سے بہرہ ور فرمایا ہے، جن تک رسائی کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کی ان تمام وضاحتوں کا دوٹوک الفاظ میں انکار کر دیا۔ انہوں نے ان واضح حقیقتوں کا انکار تو کر دیا لیکن انہیں فوراً اس بات کا احساس ہوا کہ انہوں نے غیر جانبدار محقق ہونے کا نقاب بھی اوڑھ رکھا ہے۔ انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ رسالت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کا اس ڈھٹائی کے ساتھ انکار کرنے کی وجہ سے ان کے چہرے بے نقاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ لوگ سوچیں گے کہ اگر حضور ﷺ کا دعویٰ نبوت و رسالت سچا نہیں تھا، تو دس سال کے عرصہ میں وہ جزیرہ عرب مجموعی طور پر آپ کے قدموں میں کیوں گر گیا جس نے کسی کے سامنے جھکنا سیکھا ہی نہ تھا، شراب کے پجاریوں نے اسے ام الخبائث سمجھنا اور کہنا کیسے شروع کر دیا؟ خون کے پیاسے ایک دوسرے کے جاں نثار کیسے بن گئے؟ اگر آپ نے پرانے ادیان کا ملغوبہ تیار کر کے انسانیت کے سامنے پیش کیا تھا، تو ناکام ادیان کا یہ ملغوبہ جزیرہ عرب کی سرحدیں عبور کر کے مشرق و مغرب میں کیسے پھیل گیا؟ اور چودہ سو سال گزرنے کے باوجود ان کے اس خود ساختہ دین کے پروانوں میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟

مستشرقین کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی غیر جانبدارانہ تحقیق کا بھرم رکھنے کے لئے

ان سب سوالوں کا کوئی ایسا جواب تلاش کرتے، جو متجسس ذہنوں کو مطمئن کر سکتا۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ یہ کام نہ کر سکے تو ان کی غیر جانبدارانہ تحقیق کا بھانڈا بھی پھوٹ جائے گا اور جس مقصد کے لئے وہ صدیوں سے تحقیق کا ناٹک رچا رہے ہیں، وہ مقصد بھی فوت ہو جائے گا۔

یہاں ایک بات خصوصی طور پر ذہن نشین رہے کہ حضور ﷺ کی دعوت اور اس کی کامیابی کی مادی توجیہیں کرنے کی ضرورت وہی مستشرقین محسوس کرتے ہیں جنہوں نے موضوعیت کے ساتھ ساتھ انصاف پسندی کا لبادہ بھی اوڑھ رکھا ہے، وگرنہ قرون وسطیٰ کے مستشرقین حضور ﷺ کے متعلق جو کچھ لکھتے تھے، اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ جس مستشرق نے حضور ﷺ کے متعلق یہ مفروضہ تراشا تھا کہ ایک کبوتر آپ کے کان پر آکر بیٹھتا تھا اور آپ لوگوں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ فرشتہ وحی لے کر آیا ہے، اس مستشرق سے کسی نے پوچھا تھا کہ تمہاری اس کہانی کی صداقت کا ثبوت کیا ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ میرے پاس اس کہانی کے سچ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اور مجھے اس قسم کے کسی ثبوت کی ضرورت بھی نہیں۔ اس قسم کے مستشرقین تو یہ سمجھتے تھے کہ حضور ﷺ (نعوذ باللہ) سراپا برائی ہیں اور وہ آپ کے خلاف جو چاہیں لکھیں، انہیں اس کا حق پہنچتا ہے۔

متاخر مستشرقین اس قسم کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ سائنس کی ترقی نے فاصلے مٹا دیئے تھے۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات اور حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کے متعلق صحیح معلومات ہر طرف پھیل رہی تھیں۔ جو لوگ پہلے صرف مستشرقین کی تحریروں سے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرتے تھے، اب وہ دیگر ذرائع سے بھی اسلامی معلومات حاصل کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ متاخر مستشرقین نے پرانے رویوں کو بدلنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔ وہ یہ تو نہیں چاہتے تھے کہ وہ حضور ﷺ کی رسالت کا اقرار کریں لیکن آپ کی حیات طیبہ کے محیر العقول کارناموں کا انکار ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ تاریخ کا حصہ بن چکے تھے اور کئی صدیوں کی انسانی تاریخ کے صفحے صفحے پر جلی حروف میں رقم تھے۔ اس لئے اپنی معروضیت اور انصاف پسندی کا بھرم رکھنے کے لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ حضور ﷺ کے ان کارناموں کا انکار نہ

کیا جائے بلکہ لوگوں کو بتایا جائے کہ آپ کے یہ کارنامے تائید خداوندی کا نتیجہ نہ تھے بلکہ آپ نے جو حیرت انگیز انقلاب بپا کیا، ماحول اس قسم کے انقلاب کے لئے سازگار تھا، حضور ﷺ زبردست ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے، آپ نے حالات کی نبض پر ہاتھ رکھا اور دنیا جس قسم کی تبدیلی کی منتظر تھی، حضور ﷺ نے عملاً وہ تبدیلی لا کر دنیا کو حیران کر دیا اور لوگ جوق در جوق آپ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر اس قسم کے حملوں میں وہ مستشرقین پیش پیش ہیں جو انصاف پسندی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی انہیں اسلام اور ملت اسلامیہ کا محسن سمجھتا ہے۔ اس باب میں ہم جن باتوں کا ذکر کریں گے، وہ قطعاً علمی اعتراضات نہیں کہ ان کی تردید کے لئے علمی دلائل دیئے جائیں۔ حضور ﷺ کے زمانے کے عربوں کی تاریخ گواہ ہے کہ مستشرقین کے یہ شوشے باطل ہیں۔ آپ کی پوری حیات طیبہ عملاً ان الزامات کی تردید کر رہی ہے۔ ہم ان چیزوں کو صرف اس لئے یہاں درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو مسلمان سادہ لوحی یا خود فریبی کی وجہ سے مستشرقین کے اس طبقہ کو اپنا اور اپنے دین کا محسن سمجھتے ہیں، وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو سکیں کہ، بغل میں چھری اور منہ میں رام رام، کے مصداق یہ مستشرقین، اسلام کے خلاف کس قسم کی بھیانک سازشیں کرتے ہیں۔

مستشرقین پہلے تو حضور ﷺ کی حیرت انگیز فتوحات کی تابناکی کو کم کرنے کے لئے یہ تصور دیتے ہیں کہ یہ محض اتفاق تھا کہ حضور ﷺ اس دور میں پیدا ہوئے جب اہل عرب اپنی قدیم مذہبی اور سماجی قدروں سے بیزار ہو چکے تھے اور ان سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ حضور ﷺ نے عرب معاشرے کے اس اجتماعی رجحان کو محسوس کیا اور معاشرتی زندگی میں ایسی تبدیلیوں کا نعرہ لگایا جو عوام و خواص کے دل کی آواز تھیں۔ چونکہ ماحول اس قسم کی تبدیلیوں کے لئے پہلے ہی تیار تھا، اس لئے حضور ﷺ کا پیغام حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پھیلا۔ منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

"It is axiomatic that the new religious movement of Islam must somehow or other have risen out of the conditions in Mecca in Muhammad time. A new

religion cannot come into being without a sufficient motive. In the experience of Muhammad and his early followers there must have been some need which was satisfied by the practices and doctrines of the embryonic religion. (1)

"یہ بات واضح ہے کہ اسلام کی نئی مذہبی تحریک، حضرت محمد (ﷺ) کے زمانے کے مکہ کے حالات سے ابھری ہو گی۔ ایک نیا مذہب اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک کہ اس کے لئے کافی عوامل موجود نہ ہوں۔ حضرت محمد (ﷺ) اور ان کے ابتدائی پیروکاروں کی نظروں میں کچھ ضروریات آئی ہوں گی جن کو اس ناپختہ مذہب کے عقائد اور معمولات کے ذریعے پورا کیا گیا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی نیا الہامی پیغام اسی وقت بھیجتا ہے جب اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ نیا دین عامل کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مکی معاشرہ ظلم اور جہالت کی تاریکیوں میں اس حد تک ڈوبا ہوا تھا کہ انسانیت تڑپ رہی تھی اور صبح ہدایت کے لئے بے قرار تھی، لیکن مستشرق موصوف نے یہ تصور کیسے کر لیا کہ جب جہالت اپنے عروج پر پہنچتی ہے تو خود بخود معرفت کی طرف چل پڑتی ہے؟

جہالت، ظلم اور ناانصافی جب آخری حد تک پہنچتی ہیں تو اس سے آگے تباہی کا گڑھا آتا ہے، ہدایت کا گلشن نہیں۔ ظلم کی راہوں کے مسافر، ہدایت کی شاہراہ کی طرف اپنا رخ اسی وقت موڑتے ہیں جب اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل و کرم سے، ان میں کسی راہبر فرزانہ کو مبعوث فرما دیتا ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے کے حالات واقعی دگرگوں تھے لیکن یہ حالات کسی مصلح کے لئے سازگار نہ تھے، بلکہ حالات ایسے تھے جن میں کوئی عام قسم کا مصلح کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ حالات ایسے تھے کہ جو لوگ ان میں تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے، وہ اس راستے کی سختیوں کا تصور کر کے گوشہ نشین ہو جاتے تھے۔ تاریخ جن لوگوں کو حنفاء کے نام سے جانتی ہے، وہ واقعی ان حالات سے تنگ تھے۔ وہ ان حالات میں تبدیلی کے خواہاں بھی تھے، لیکن ان حالات کو تبدیل کرنے کیلئے جس عزم، جس

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 14

حوصلے اور جس بصیرت کی ضرورت تھی، وہ اس عزم، حوصلے اور بصیرت سے بہرہ ور نہ تھے اس لئے انہوں نے معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ اپنی اپنی ذات کو ماحول کی آلودگیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کوشاں رہے۔

یہ حالات وہ تھے جن کو بدلنے کے لئے عیسائیت اور یہودیت بھی کوشش کر چکی تھیں، لیکن انہیں ذرہ برابر کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جو لوگ مکہ کی بت پرستی سے تنگ آ کر حق کی تلاش میں نکلے تھے، انہیں یہودیت اور عیسائیت میں بھی اپنے دکھوں کا مداوا نظر نہ آیا تھا۔

یہ عجیب منطق ہے کہ مکی زندگی کی جن ضروریات کو یہودیت اور عیسائیت جیسے پختہ ادیان پورا نہ کر سکے تھے، ان ضرورتوں کو محمد ﷺ کے لائے ہوئے (بقول منٹگمری واٹ) ناپختہ دین نے پورا کر دیا۔ منٹگمری واٹ کی اس مشکل کو اس کے ایک دوسرے تحریکی بھائی ولیم میور نے حل کر دیا ہے۔ وہ مدینہ طیبہ میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کی کیفیت اور اس کے اسباب کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> "So good was the ground, and the propagation so zealous, that the faith spread from house to house and from tribe to tribe. The jews looked on in amazement. The people whom they had for ages sought in vain to convert from the errors of polytheism, were now casting their idols to the moles and bats, and professing belief in one only God. The secret lay in the aptness of the instsument. It was native and congenial. Judaism, foreign in its birth, touched no Arab sympathies. Islam, grafted on the faith and superstitions, the customs and nationality of the Arabs, found ready access to their hearts." (1)

"ماحول اتنا سازگار اور تبلیغ اتنی پرجوش تھی کہ مذہب اسلام ایک گھر سے دوسرے گھر اور ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے تک پھیلنے لگا۔ یہودی حیرت سے

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 47

سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ جن لوگوں کو بت پرستی کی قباحتوں سے دور رکھنے کے لئے، وہ کئی نسلوں سے ناکام کوششیں کر رہے تھے، وہ لوگ اب اپنے بتوں کو چھچھوندروں اور چمگادڑوں کے سامنے پھینک کر خدائے واحد پر ایمان لا رہے تھے۔ اس کامیابی کا راز وسیلے کی موزونیت میں پنہاں تھا۔ یہ مذہب مقامی اور طبیعتوں کے موافق تھا۔ یہودی مذہب جو اجنبی ممالک کی پیداوار تھا، وہ عربوں کی ہمدردیاں حاصل نہ کر سکا، اور اسلام جو عربی عقائد، توہمات، قومیت اور رسوم کی پیوندکاری سے بنا تھا، وہ سرعت کے ساتھ عربوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔"

مستشرقین کی تحقیق کا عام انداز یہی ہوتا ہے۔ جو حقائق ان کے موقف کے خلاف ہوتے ہیں، وہ ان حقائق کو اپنے موقف کی حمایت میں پیش کرنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ عرب سر سے پاؤں تک شرک اور بت پرستی کی لعنت میں غرق تھے۔ یہودیوں نے بھی ان کو اس غلاظت سے نکالنے کی کوشش کی اور بعد میں اسلام نے بھی۔ یہودیت اپنی ان کوششوں میں کلیۃً ناکام رہی اور اسلام کو عربوں کی اصلاح کی کوششوں میں اس سرعت سے کامیابی حاصل ہوئی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس تاریخی حقیقت سے منطقی نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ یہودی عقائد و عبادات اور قواعد و ضوابط میں وہ جان اور تاثیر نہیں تھی جو عربوں کو اپنی طرف مائل کر سکتی لیکن اسلام کی تاثیر نے عربوں کے دلوں کو فتح کر لیا۔ ولیم میور کے بقول، کوشش تو دونوں مذاہب نے نظام توحید قائم کرنے کے لئے کی تھی لیکن یہودیت ناکام رہی اور اسلام کامیاب ہو گیا۔

یہ حقیقت جو اسلام کی تاثیر اور قوت کی روشن دلیل ہے، ولیم میور اسے انتہائی بھونڈے انداز میں اسلام کے خلاف اور یہودیت کے حق میں استعمال کر رہا ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ مذہب تو یہودیت ہی اچھا تھا لیکن وہ چونکہ باہر سے درآمد شدہ تھا، اس لئے عربوں نے اسے مسترد کر دیا، جبکہ اسلام کا مزاج عربی تھا اور اس کے عقائد و افعال عربی تھے، اس لئے عربوں نے اس دین کو گھر کی چیز سمجھ کر فوراً قبول کر لیا۔

بڑی عجیب بات ہے۔ ولیم میور ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ اسلام نے عربوں کو بت پرستی سے توحید کی طرف لانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام کے

عقائد عربی الاصل تھے۔ عرب تو مشرک تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، انہوں نے خانہ خدا میں تین سو ساٹھ بت سجا رکھے تھے، توحید کا عقیدہ ان کے لئے مقامی عقیدہ کیسے بن گیا؟ کیا توحید اور بت پرستی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟ یقیناً ولیم میور کے نزدیک اس قسم کے اجتماع ضدین کی گنجائش ہو گی، کیونکہ وہ عیسائی ہیں اور عیسائیوں کو توحید اور تثلیث میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ان کے حساب میں ایک اور تین برابر ہوتے ہیں اور وہ تین خداؤں پر ایمان لا کر بھی توحید پرست رہ سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں کی سنگلاخ زمین میں یہودیت اور عیسائیت توحید کا بیج نہ بو سکی تھیں، دلوں کی ان زمینوں میں توحید کا بیج بونا اور اسے ایک قد آور درخت بنانا، اسلام کی قوت اور تاثیر کی ایک ناقابل تردید دلیل تھی لیکن ولیم میور نے اسے اسلام کے خلاف اور یہودیت اور عیسائیت کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اسلام کے عقائد اور احکام عربوں کے عقائد اور معمولات کے موافق نہ تھے بلکہ ان سے متصادم تھے۔ عرب بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے اور اسلام بت شکنی کی تعلیم لے کر آیا تھا۔ عرب دین آبا پر فخر کرتے تھے، اسلام نے ان کے اس فخر کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ عربوں کے ہاں خاندانی شرافت ہی سب کچھ تھی، اسلام نے آ کر نعرہ لگایا کہ شعوب و قبائل تو محض تعارف کے لئے ہیں، عزت و عظمت کا دارومدار تو تقویٰ پر ہے۔ بے ایمان اور بے عمل قریشی ایک ایماندار اور صاحب عمل حبشی کی خاک پا کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ عرب تو قانون کی پابندی کو غلامی کے مترادف سمجھتے تھے، اسلام نے قانون کی حکمرانی کا نعرہ لگایا۔ اسلام کے عقائد و احکام عربوں کے لئے مانوس نہ تھے بلکہ اسلام کا ہر عقیدہ ان کے لئے حیران کن تھا۔ یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو دوسرے انسانوں کی راہنمائی کے لئے بھیج سکتا ہے۔ وہ بار بار حیرت سے پوچھتے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان جب قبر میں گل سڑ کر مٹی ہو جائے گا تو اسے دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔ توحید، رسالت، آخرت اور جزاء و سزا کے عقائد جو اسلام کی دعوت کے بنیادی ستون تھے، وہ عربوں کے لئے نہ صرف اجنبی تھے بلکہ ناقابل فہم بھی تھے۔ اسی لئے انہوں نے ان عقائد کو ناقابل قبول سمجھ کر ابتدا میں مسترد کر دیا تھا، لیکن مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلام اس لئے کامیاب ہوا کہ اس کے عقائد و احکام عربوں کے لئے نئے نہ تھے۔

ولیم میور کی یہ کوشش اسلام کے اعزاز کو یہودیت کی جھولی میں ڈالنے کے لئے ہے کیونکہ مستشرقین کو اسلام کے دامن میں کوئی عمدہ چیز دیکھنا پسند نہیں ہے۔ یہودیت بھی ولیم میور کے لئے ایک اجنبی دین ہے لیکن وہ ان کی نظروں میں اسلام کی نسبت کم خطرناک ہے۔ مستشرق موصوف، مذکورہ بالا مفروضے کے ذریعے جس اعتراض کو یہودیت سے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہی اعتراض عیسائیت پر بھی وارد ہوتا تھا۔ اگر دین یہودیت اہل یثرب کو مائل بہ توحید کرنے کی کوششوں میں ناکام رہا تھا تو جزیرہ عرب کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے عیسائی مشن بھی عربوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہے تھے۔" ولیم میور نے جس چال کے ذریعے یہودیت کے سر سے ناکامی کا الزام اتارنے کی کوشش کی ہے، ان کی اس چال کے ذریعے وہ الزام ان کے اپنے پیارے دین کے سر سے بھی اتر جاتا ہے۔

مستشرقین عرب کی سنگلاخ زمین میں توحید کا بیج بونے پر اسلام کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام سے پہلے عربوں میں توحید کا بیج بویا جا چکا تھا۔ اسلام نے تو صرف اس کی آبیاری کی۔ عربوں میں توحید کا بیج بونے کا اعزاز بھی وہ یہودیت اور نصرانیت کے سر پر رکھنا چاہتے ہیں۔ منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

> "In other words, the Meccans, under Judaeochristian influence, must have been moving towards monotheism". (1)
>
> "دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مکہ والے یہودیت اور نصرانیت کے زیر اثر توحید کی طرف رواں دواں تھے۔"

مستشرقین کی یہ بات بھی بڑی حیران کن ہے۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری کے وقت خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ گردونواح کی بستیوں کے اپنے بت تھے۔ مکی معاشرے کی ساری قدریں بت پرستی کے گرد گھومتی تھیں۔ حضور ﷺ نے انہیں بت پرستی چھوڑ کر توحید کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی دعوت دی تھی، تو انہوں نے اس دعوت کی شدت سے مخالفت کی تھی، لیکن منٹگمری واٹ صاحب فرماتے ہیں کہ اہل مکہ

1۔ پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 26

یہود و نصاریٰ کے اثر سے توحید کی طرف مائل ہو چکے تھے۔

مستشرقین کی یہ تحقیق تاریخی حقائق کو مسخ کر رہی ہے۔ وہ لوگ تحقیق کرتے وقت، اگر اپنے تخیل کی قوت پرواز سے زیادہ تاریخ پر اعتماد کریں تو انہیں پتہ چلے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، وہ اور تو سب کچھ ہو سکتا ہے تحقیق نہیں ہو سکتی۔

ٹارانڈرائے اپنے دوسرے مستشرق بھائیوں سے بھی چند قدم آگے نکل گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی دعوت میں جو تصورات پیش کئے ان میں سے کئی تصور مانی مذہب سے ماخوذ تھے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تصور کہ ہر امت کے پاس الہامی ہدایت آتی ہے، یہ تصور سب سے پہلے مانی نے پیش کیا۔ اسی طرح یہ تصور بھی مانی ہی نے پیش کیا کہ دنیا میں جتنے رسول یا پیغمبر آئے، وہ ایک ہی پیغام لے کر تشریف لائے تھے۔

مستشرقین اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات عیسائیت اور یہودیت سے ماخوذ ہیں، لیکن مسٹر ٹارانڈرائے بڑا دور اندیش نکلا۔ اس نے اسلام کی تعلیمات میں وہ چیزیں دیکھ لیں جو عیسائیت اور یہودیت سے ماخوذ نہیں تھیں بلکہ ان سے متصادم تھیں۔ یہودی اور عیسائی تو نسل اسرائیل کو خدا کی لاڈلی قوم سمجھتے ہیں اور الہامی ہدایت کا مستحق صرف اپنے آپ کو ہی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو رسالت و نبوت کا اعزاز صرف ان کی قوم کے لئے خاص ہے لیکن اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں رسول بھیجا ہے۔ اسلام تو دعویٰ کرتا ہے کہ ہر زمانے میں جو انبیاء و رسل تشریف لائے، وہ ایک ہی دین کے علمبردار تھے، جبکہ یہودیت اور عیسائیت کے لئے یہ تصور بھی اجنبی ہے۔

جب اسلام کی تعلیمات میں بنیادی نوعیت کی یہ چیزیں عیسائیت اور یہودیت کی تعلیمات سے متصادم ہیں تو پھر اسلام کو یہودیت اور نصرانیت سے ماخوذ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

غالباً یہی وجہ تھی کہ ٹارانڈرائے نے اپنے تحریکی بھائیوں کے برعکس اسلام کی تعلیمات کا مصدر یہودیت اور عیسائیت کے علاوہ کوئی اور تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے معلوم کر لیا کہ اسلام کی یہ تعلیمات جو یہودیت اور عیسائیت سے متصادم ہیں، وہ مانی مذہب سے ماخوذ ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ مانی کی قوم یہودیت اور عیسائیت کے مذہبی تسلط سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ مانی نے اپنی قوم کو اس تسلط سے آزادی کے راستے پر لگایا اور وہ اپنی قوم میں مقبول ہو

گیا۔ محمد (ﷺ) نے بھی مانی کے تجربے سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے بھی اپنی قوم کو یہودیت اور عیسائیت کے تسلط سے نکالنے کی تحریک چلا کر اپنی قوم میں مقبول ہونے کی کوشش کی، جس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ لکھتا ہے:

"It is clear that Muhammad must have been influenced, even if he was not actually awakened, by the struggle for religious independence which had given Mani and the Gnostics such a strong position among the peoples of orient". (1)

"یہ بات واضح ہے کہ مذہبی آزادی کی کوششوں نے مانی اور باطنی فرقوں کو مشرقی اقوام میں جو بے پناہ مقبولیت عطا کی تھی، محمد (ﷺ) اس سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔

مستشرق مذکور کہنا یہ چاہتا ہے کہ دیگر مشرقی اقوام کی طرح عرب بھی یہودیت اور نصرانیت کے مذہبی تسلط میں تھے اور جس طرح مانی وغیرہ نے اپنی اقوام کو اس مذہبی تسلط سے آزاد کرانے کا بیڑا اٹھا کر مقبولیت حاصل کی تھی، حضور ﷺ نے بھی اسی ذریعے سے مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مستشرق موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ عرب ان مذاہب کے کس قسم کے تسلط میں تھے۔ جس قوم کو روم اور ایران کی سلطنتیں اپنے سیاسی تسلط میں نہ لے سکی تھیں، وہ کسی دوسری قوم کے مذہبی تسلط میں کیسے آ گئی؟ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ مانی کے خیالات اور نظریات حضور ﷺ تک کیسے پہنچے تھے۔ مستشرق موصوف کو معلوم ہے کہ اس مذہب کے لوگوں سے عربوں کا کوئی رابطہ نہ تھا، اسی لئے وہ اپنے دعویٰ کو گومگو کی کیفیت میں رکھ کر قارئین کو تذبذب میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے۔ وہ خود لکھتا ہے:

"Of their doctrinal system he knew little or nothing. He had merely got hold of the ideas which had immediate relevance for the religious position in which he found himself". (2)

1۔ محمد: دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 106

2۔ ایضاً، صفحہ 7-106

"محمد (ﷺ) مانی مذہب کے نظریاتی نظام کے متعلق یا تو بالکل کچھ نہ جانتے تھے اور یا بہت کم جانتے تھے۔ آپ نے ان کے صرف ان نظریات کو مضبوطی سے پکڑ لیا جن کا آپ کے ارد گرد کے مذہبی ماحول سے گہرا تعلق تھا۔"

ٹار انڈرائے کی مہارت دیکھئے کہ ایک طرف تو یہ تسلیم کر رہا ہے کہ حضور ﷺ کو مانی مذہب کے نظریات و عقائد کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہ تھیں لیکن ساتھ ہی اس مذہب کی معلومات جو آپ کو حاصل نہ تھیں، ان کو آپ کے عیسائیت قبول نہ کرنے اور رسالت کا دعوی کرنے کا سبب قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"So we now understand why he, as far as we can see, never even gave a thought to the possibility of becoming a christian. He already knew, from the echo of the Gnostic- Manichaean theory of revelation which had reached his ears, that christendom was only one among other similarly privileged communities which had experienced Divine guidance and revelation. Further, he knew -and this idea struck deeper root in his soul than any other that every people had its prophet. Where was the man who would bring revelation to his people? This thought, combined perhaps with what he had himself witnessed during a qeryana of the hermits in their devout recitation of psalms and otehr holy texts, was the creative idea which prepared the way for the revelation of the angel, and his dictation out of the holy book." (1)

"اس طرح ہمیں اس بات کی سمجھ آ جاتی ہے کہ کیوں محمد (ﷺ) نے عیسائی بننے کے متعلق کبھی سوچا تک نہ تھا۔ مانی مذہب کا وحی کے متعلق عقیدہ پہلے ہی ان کے کانوں تک پہنچ چکا تھا اور وہ عقیدہ یہ تھا کہ عالم عیسائیت وحی کے اعزاز کے لئے مختص نہیں بلکہ عیسائی بھی ان متعدد ملتوں میں سے ایک ملت ہیں جن

1۔ محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 107

کے پاس الہامی ہدایت آچکی تھی۔ اس کے علاوہ جس نظریے نے ان کے دل پر بہت گہرا اثر کیا، وہ یہ تھا کہ ہر امت کے پاس رسول آیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ وہ شخص کہاں ہے جو ان کی قوم کو الہامی روشنی سے مستفیض کرے گا۔ اس خیال کے علاوہ انہوں نے عیسائی راہبوں کو تلاوت صحف کی محفل میں زبور اور دیگر صحائف کی تلاوت کرتے دیکھا تھا۔ ان دونوں چیزوں نے مل کر وحی، اور کتاب سے تلاوت، کے خیال کے لئے راستہ ہموار کیا۔"

جو شخص ساتویں صدی عیسوی کے جزیرہ عرب کے ذہنی ماحول کو پیش نظر رکھ کر "تارانڈرائے" کے ان مفروضوں کا مطالعہ کرتا ہے، وہ بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ یہ مستشرق حضور ﷺ کو بیسویں صدی عیسوی کے کسی مہذب اور ترقی یافتہ ملک کا باشندہ سمجھتا ہے، جس کی نظر تمام اقوام عالم کی تاریخ پر ہے۔ وہ ان سب کے عقائد، نظریات، خیالات، خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہے۔ وہ علم نفسیات کا اتنا ماہر ہے کہ کسی دوسری قوم کے نظریات میں سے ان نظریات کو منتخب کر سکتا ہے، جو اس کی اپنی قوم کے ذہنی ماحول کے لئے موزوں ہیں۔

"تارانڈرائے" کو یقیناً اس حقیقت کا علم ہوگا کہ حضور ﷺ جس زمانے میں اس دنیا پر تشریف فرما تھے، اس زمانے میں ابھی انسائیکلوپیڈیا قسم کے علمی خزانے نہیں چھپے تھے، جن سے دنیا کی مختلف اقوام اور افراد کے متعلق ضروری معلومات حاصل کی جا سکتیں۔ مستشرقین غالباً یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب کے افراد مکہ میں حضور ﷺ کے پاس آتے اور آپ کو اپنے تمام عقائد و نظریات سے آگاہ کرتے تھے، جن کی بنیاد پر آپ نے ایک عالمی دین کی بنیاد رکھ دی۔ تاریخی واقعات کی تشریح کا یہ کتنا بھونڈا انداز ہے؟ تاریخ شاہد ہے کہ حضور ﷺ نے حصول علم کے لئے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مکہ میں ایسے لوگوں کی تعداد انتہائی کم تھی جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ خود مستشرقین حضور ﷺ کے سرپرستوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے آپ کی تعلیم پر مطلقاً توجہ نہ دی اور صرف یہ خیال رکھا کہ آپ کے جسم و جان کا رشتہ قائم رہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود مستشرقین یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ

کی نظران تمام نظریات اور فلسفوں پر تھی جو اس زمانے میں کسی علاقے میں متعارف تھے یا کبھی کسی علاقے میں متعارف رہ چکے تھے۔

ٹاراندرائے اپنی اسی قسم کی تحقیق کے جوہر ایک اور مقام پر دکھاتا ہے۔جب وہ کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے " قس بن ساعدہ" کا خطاب سنا۔اس خطاب نے آپ کے دل پر اثر کیا اور اس خطاب کے اثر ہی سے آخر کار آپ نے نبوت کا دعوی کر دیا۔سوق عکاظ میں قس بن ساعدہ کی تقریر نے حضور ﷺ کے دل پر (بقول ٹاراندرائے) جو زبردست اثر کیا،وہ اس کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے،وہ لکھتا ہے:

"The word falls by the wayside and upon stony ground But when it finds a receptive spirit its power is often greater than we are able to comprehend. The message which Muhammad heard concerning the one God, His goodness, and His judgement, took root in his soul. Many years passed :the outward conditions and the associations in which the message reached him faded from his memory; but the word lived. Unrealized by him, its innermost meaning, the creative energy of its ideas, became Mohammad's personal spiritual possession. It was intensified by what he heard from time to time concerning the Christian hermits and itinerant preachers, who also occasionally passed through Hejaz." (1)

"الفاظ کبھی سنگلاخ زمین پر گرتے ہیں لیکن جب الفاظ کو کوئی ایسی روح مل جاتی ہے جو ان کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو تو الفاظ کی تاثیر اتنی زبردست ہوتی ہے جس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ محمد (ﷺ) نے خدا کی وحدانیت، اس کی رحمانیت اور اس کے انصاف کا جو پیغام سنا تھا وہ ان کے دل میں گہری جڑیں پکڑ گیا۔ کئی سال گزر گئے۔ محمد (ﷺ) نے جن حالات میں یہ پیغام سنا تھا، ان کی یاد آپ کے ذہن سے محو ہو گئی لیکن الفاظ زندہ رہے۔ محمد (ﷺ) کو اس کا

1۔ محمد: دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 92

احساس تو نہ تھا لیکن ان الفاظ کی روح اور ان نظریات کی تخلیقی قوت، آپ کے روحانی وجود کا حصہ بن گئی۔ محمد (ﷺ) حجاز سے گزرنے والے سفری عیسائی راہبوں کے متعلق وقتاً فوقتاً جو کچھ سنتے رہتے تھے، اس سے ان الفاظ کی تاثیر میں مزید قوت پیدا ہوتی تھی۔"

"ٹار انڈرائے" یہاں یہ کہنا چاہتا ہے کہ قس بن ساعدہ نے سوق عکاظ میں جو کچھ کہا، اس کا بیج آپ کے دل میں جڑ پکڑ گیا۔ محمد (ﷺ) کو اس کا احساس تو نہ تھا لیکن نظریات و عقائد کے جس پودے کی تخم ریزی قس بن ساعدہ نے آپ کے دل میں کی تھی، وہ جب تناور درخت بنا تو اسلام کی شکل میں نمودار ہوا۔ مستشرق موصوف غالباً یہ بھول گیا ہے کہ اس نے ابھی ابھی حضور ﷺ کے نظریات کو مانی مذہب سے ماخوذ قرار دیا ہے، جس کے نظریات عیسائیت سے متصادم ہیں۔ لیکن مستشرقین دو متصادم چیزوں کو ایک ہی چیز قرار دینے کے فن کے ماہر ہوتے ہیں اور اسی قسم کی مہارت کا مظاہرہ ٹار انڈرائے نے یہاں بھی کیا ہے۔

ہم ٹار انڈرائے صاحب سے اس ضمن میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ قس بن ساعدہ نے اپنی تقریر سے حضور ﷺ کو اتنا متاثر کیا کہ آپ نے ایک مذہب کی بنیاد رکھی اور پھر پورے جزیرہ عرب کو اس دین کے رنگ میں رنگ دیا، اور بعد میں یہ دین عرب سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گیا۔ آپ کی یہ بات تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہو گا کہ حضور ﷺ کی تمام کامیابیوں کا سہرا قس بن ساعدہ اور اس کے مذہب عیسائیت کے سر بندھے گا۔ کیونکہ انہوں نے ہی حضور ﷺ کو اس راستے پر گامزن کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مذہب عیسائیت میں اور اس کے ایک پادری میں اتنی قوت تھی کہ وہ، صرف ایک تقریر کے ذریعے، ایک آدمی تیار کریں، جو ان کے بنیادی عقائد کا مخالف ہونے کے باوجود، ان کے زیر اثر ساری دنیا کی کایا پلٹ سکے، تو کیا وجہ ہے کہ ان دونوں قوتوں نے یہ کارنامہ بذات خود سر انجام نہ دیا کہ اس طرح ساری دنیا ان کے حلقہ اثر میں شامل ہو جاتی؟

مستشرقین کا انداز نرالا ہے۔ وہ ایک طرف تو حضور ﷺ کو دشمن مسیح و مسیحیت قرار دیتے ہیں اور پھر حضور ﷺ کی کامیابیوں کا سہرا عیسائیت کے سر باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو شخص عیسائیت کا دشمن تھا، اس کی کامیابیاں عیسائیت کی مرہون منت کیوں ہیں؟

اس سوال کا جواب کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ اس عیسوی مذہب کے واقعی مخالف تھے، جو سینٹ پال کی کاوشوں سے دنیا میں متعارف ہوا تھا اور یقیناً آپ کی کامیابی میں اس غیر معقول مذہب کی مخالفت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ حضور ﷺ نے عالم انسانیت کے سامنے عیسائیوں کی طرح چند پہیلیاں پیش نہیں کی تھیں بلکہ آپ نے ان کے سامنے ایک انتہائی واضح، قابل فہم اور قابل عمل دین پیش کیا تھا۔ اگر آپ بھی عیسائیوں کی طرح ایک کو تین کے برابر قرار دیتے اور ساری انسانیت کی بدکاریوں کا بوجھ کسی ایک متنفس پر ڈال کر اسے سولی پر لٹکا دیتے تو کوئی ذی ہوش شخص آپ کی دعوت کی طرف توجہ نہ دیتا۔

حضور ﷺ سینٹ پال کے مذہب کے یقیناً مخالف تھے، لیکن وہ دین جو خدائے رحمٰن و رحیم کے عظیم الشان رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انسانیت کے سامنے پیش کیا تھا، حضور ﷺ اس دین کے مخالف نہ تھے بلکہ آپ اس دین کو بھی ہدایت کا وہی نور قرار دیتے تھے جو نور آپ کے اپنے قلب انور پر جلوہ گر ہوا تھا۔ حضور ﷺ کے عقائد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عقائد میں مغائرت تلاش کرنے کی کوشش کرنا عبث ہے کیونکہ یہ دونوں ہستیاں حق کی علمبردار ہیں اور حق ہر زمانے میں ایک ہی ہوتا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضور ﷺ کے نظریات و عقائد، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نظریات و عقائد سے نہ صرف جزوی طور پر بلکہ کلیۃً مماثل تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے یہ عقائد اپنے دور کے عیسائیوں سے حاصل کئے تھے۔ اس دور کے عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عقائد کو پس پشت ڈال کر ایک دشمن مسیح یہودی کے عقائد و نظریات سے چمٹے ہوئے تھے۔ اگر خال خال عیسائی دنیا کے کسی گوشے میں سچے دین عیسائیت پر کاربند تھے تو وہ وقت کی گھڑیاں اس انتظار میں گزار رہے تھے کہ کب وہ سچائی کی روح آئے گی جو انہیں ہر سچائی کا راستہ بتائے گی۔

بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل وغیرہ جیسے عیسائی حضور ﷺ کے معلم نہ تھے بلکہ یہ تو وہ لوگ تھے جو حضور ﷺ کی بعثت کے انتظار میں زندگی کے لمحے گن رہے تھے۔ مستشرقین بحیری راہب اور ورقہ بن نوفل کے عیسائی ہونے سے اسلام کے نظریات و عقائد کا سہرا عیسائیت کے سرباندھتے ہیں لیکن ان دونوں نے تو حضور ﷺ کو، آپ کے

دعویٰ نبوت سے پہلے ہی، خدا کا سچا رسول تسلیم کر لیا تھا، جب کہ مستشرقین اور ان کے اسلاف نے زندگی بھر آپ کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا۔ اگر برطانیہ کا یوسف اسلام حضور ﷺ کو خدا کا نبی ماننے کے بعد عیسائی نہیں رہتا تو ورقہ بن نوفل اور بحیریٰ راہب، آپ کو خدا کا نبی ماننے کے بعد عیسائی کیسے رہ گئے تھے؟ اور جب ان لوگوں نے حضور ﷺ کو خدا کا نبی مان لیا تھا تو پھر انہیں یقین تھا کہ یہ ہستی ان کی تعلیم کی محتاج نہیں بلکہ یہ وہ ہستی ہے جسے علیم و خبیر خدا نے تمام انسانیت کو ساری سچائیاں بتانے کے لئے بھیجا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی، علم، معرفت یا سچائی ہے وہ اسی آفتاب علم و معرفت اور نیر ہدایت کی کرنیں ہیں جو ان کے سامنے جلوہ گر ہے۔

ہم نے دین اسلام کے عیسائیت یا یہودیت سے ماخوذ ہونے کے استشراقی الزام کا جواب "قرآن حکیم اور مستشرقین" کے باب میں دے دیا ہے۔ جس طرح قرآن حکیم کی ایک ایک آیت، اس بات کی شاہد ہے کہ وہ کسی انسان کا کلام نہیں، اسی طرح حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ آپ کا قلب انور جن علوم و معارف کا خزینہ تھا، وہ علوم و معارف آپ کو کسی سابقہ مذہبی تحریک سے ورثے میں نہیں ملے تھے بلکہ ان علوم و معارف کا آپ کے دل پر القاء ملا اعلیٰ سے ہوا تھا۔ اور جو لوگ اس واضح حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ حضور ﷺ نے دنیا کو جن علوم و معارف اور سچائیوں سے متمتع کیا تھا، ان کا مصدر و منبع کیا ہے۔

مستشرقین کی اکثریت یہودی اور عیسائی مذاہب سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ خدا کے تصور سے آشنا ہیں۔ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانیت کی راہنمائی کے لئے نبی اور رسول مبعوث فرماتا ہے۔ جنت، دوزخ، حساب، جزاو سزا جیسے تصورات بھی ان کیلئے اجنبی نہیں۔ جو شخص ان چیزوں پر ایمان رکھتا ہو، وہ ہر واقعے اور ہر عمل کی مادی توجیہ کرنے کا قائل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر واقعے کی مادی توجیہ کرنے کی ضرورت وہ لوگ محسوس کرتے ہیں جو نہ خدا کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی روحانی نظام کے کسی شعبے پر یقین رکھتے ہیں بلکہ وہ مادے کو ہی سب کچھ قرار دیتے ہیں اور کائنات کے ہر مظہر میں انہیں مادے ہی کی قوت کار فرما نظر آتی ہے۔

مستشرقین کی اکثریت مادہ پرست نہیں لیکن جب وہ اسلام کی دعوت اور اس کی تعلیمات کو یہودیت اور عیسائیت کا اثر قرار دینے میں ناکام ہوتے ہیں تو ان تعلیمات کے

منظر عام پر آنے کے اسباب مادی دنیا میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے دنیا کے سامنے جو حیرت انگیز فکری اور علمی نظام پیش کیا، اس کی ہر شق کی جڑیں آپ کے دور کی مادی زندگی میں تلاش کرتے ہیں اور اس طرح آپ کے دعویٰ نبوت و رسالت کے انکار کا جواز مہیا کرتے ہیں۔

جو شخص مادہ پرست ہے وہ تو کسی عمل یا واقعہ کی روحانی توجیہ قبول نہیں کرتا۔ ایسا شخص اگر حضور ﷺ کے روحانی تجربات کی مادی توجیہ کرنے کی کوشش کرے، تو اس کا رویہ قابل فہم ہے۔ لیکن جو لوگ روحانی نظام کے قائل ہیں اور کئی نبیوں اور رسولوں کی نبوت و رسالت کو تسلیم کرتے ہیں، ان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ حضور ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کریں اور پھر آپ کے ایسے کارناموں کی مادی توجیہ شروع کر دیں، جن کا صدور ایک نبی یا رسول کے علاوہ کسی سے ممکن نہیں۔ اگر انہیں حضور ﷺ کی رسالت کا انکار کرنے کا شوق ہے، تو ثابت کریں کہ انبیاء و رسل یہ کام کرتے آئے ہیں جو حضور ﷺ نے نہیں کیا، اس لئے ہم آپ کی نبوت و رسالت کو تسلیم نہیں کرتے۔

وہ حضور ﷺ کی حیرت انگیز کامیابیوں کو خدا کا کرم تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ان کی نظروں میں خدا صرف بنو اسرائیل کا ہے اور باقی نسل انسانی سے اس کا تعلق (نعوذ باللہ) برائے نام ہے، اس لئے کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کو حالات اتنے سازگار میسر آ گئے تھے کہ آپ نے جو کہا وہ ساری دنیا کے دل کی آواز بن گیا۔ ہم یہاں مستشرقین کے اس قسم کے چند شوشے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ خود فیصلہ کر لیں کہ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، کیا ان کا علم یا تحقیق سے کوئی تعلق ہے۔ منٹگمری واٹ نے اپنی مختلف کتابوں میں بار بار یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ عربوں کا معاشرہ جن سماجی، معاشی اور روحانی قدروں پر قائم تھا، وہ قدریں بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں، نئے حالات کے لئے نئی قدروں کی ضرورت تھی، حضور ﷺ نے حالات کی نبض پر ہاتھ رکھا، معاشرے کے حقیقی مرض کا سراغ لگایا اور معاشرہ جس قسم کی قدروں کے لئے تشنگی محسوس کر رہا تھا، آپ نے کچھ اپنے تخیل کے زور سے اور کچھ دیگر ادیان کی نقل کر کے، چند قدریں وضع کیں اور انہیں قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ عرب ایسی قدروں کے لئے پہلے ہی چشم براہ تھے، انہوں نے فوراً ان کو قبول کر لیا۔ منٹگمری واٹ اپنے اس مفروضے

کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"During the years jsut before he received the call to prophethood Muhammad must have been increasingly aware of the unsatisfactory social conditions in Mecca. This was something he could observe for himself and did not require to be shown by revelation. The fundamental source of the trouble was that the traditional values of nomadic society (which was that of the recent ancestors of the Meccans) were proving inadequate in the prosperous mercantile economy of Mecca, and were fading away. The wealthy merchants, who were also the leading men of the clans were neglecting the traditional duty of caring for the needy and unfortunate among their kinsmen...... Muhammad may well have come to see the root of the troubles as the secular, materialistic outlook of the very wealthy, and may even have decided that this could only be got rid of by some form of religious belief." (1)

"آغاز بعثت سے پہلے کی زندگی کے آخری سالوں میں محمد (ﷺ) مکہ کی مضطرب سماجی زندگی سے ضرور اچھی طرح آگاہ ہوئے ہوں گے۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جن کا محمد (ﷺ) خود مشاہدہ کر سکتے تھے اور ان سے آگاہ ہونے کے لئے آپ کو وحی کی ضرورت نہ تھی۔ ساری پریشانی کا راز اس حقیقت میں مضمر تھا کہ زندگی کی بدویانہ قدریں جو مکہ والوں کے آباؤ اجداد کی سماجی قدریں تھیں، وہ مکہ کی خوش حال تجارتی زندگی کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں اور اسی وجہ سے ماند پڑ رہی تھیں۔ امیر تاجر جو اپنے قبیلوں کے سردار بھی تھے، وہ اپنے قبیلوں کے کمزور اور غریب افراد کی کفالت کے روایتی فریضے کو نظر انداز کر رہے تھے...... محمد (ﷺ) نے اس بات کا اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تمام مسائل کا

1۔ منٹگمری واٹ، "محمد ایٹ مکہ"، (ایڈنبرا یونیورسٹی پریس)، صفحہ 51

اصل سبب امیر ترین افراد کا لادینی اور مادہ پرستانہ رویہ ہے اور آپ نے یہ بھی فیصلہ کر لیا ہو گا کہ ان مسائل کا حل صرف کسی مذہبی نظریے کے ذریعے ہی ممکن ہے۔"

منٹگمری واٹ نے مذکورہ بالا جملے لکھتے وقت قرآن وحدیث کے ان بیانات کو پیش نظر رکھا ہے، جن میں مکہ والوں کو دولت پر اترانے اور غریبوں کی مدد نہ کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اگر اسلام نے مکہ والوں کو صرف دولت کے بارے میں ہی ان کے رویے پر تنبیہ کی ہوتی تو منٹگمری واٹ کی بات میں کچھ وزن ہوتا لیکن اسلام نے تو سب سے پہلے ان کے مذہب پر حملہ کیا۔ ان کو بتایا کہ پتھر کے بت جنہیں تم خدا سمجھتے ہو، یہ تو اپنے چہرے سے مکھی اڑانے کے بھی قابل نہیں۔ اسلام نے انہیں پتھروں کی پوجا چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلایا، ان کو آخرت کی زندگی اور جزاوسزا کا تصور دیا، انہیں بتایا کہ ان کا رحمٰن ورحیم خدا جس طرح ہمیشہ انسانیت کی راہنمائی کے لئے رسول اور کتابیں بھیجتا رہا ہے، اسی طرح اس نے ان کی راہنمائی کے لئے اپنے حبیب کو اپنی آخری الہامی کتاب دے کر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ مذہبی نظریات جو حضور ﷺ نے ان کے سامنے پیش کئے تھے، یہ ان کے روایتی مذہبی نظریات سے ٹکراتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے حضور ﷺ کی مخالفت شروع کر دی۔

حضور ﷺ نے مذہب سے ناآشنا لوگوں کو مذہبی زندگی کا تصور نہیں دیا تھا بلکہ جو لوگ اپنے آباؤاجداد کے دین پر مضبوطی سے ڈٹے ہوئے تھے، ان کے دلوں سے اس قدیم دین کی محبت کو نکال کر اس کی جگہ ایک نئے دین کی تخم ریزی کی تھی۔ مستشرقین کبھی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ابتدا میں بتوں کی مخالفت نہیں کی تھی۔ کبھی کہتے ہیں کہ قریش مکہ نے آپ کی مخالفت اس وجہ سے نہیں کی تھی کہ آپ ان کے مذہبی عقائد کو تنقید کا نشانہ بناتے تھے بلکہ ان کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ نے ان کی معاشی قدروں پر حملہ کیا تھا۔ یہ تاثر مستشرقین اس لئے دینا چاہتے ہیں کہ حق وباطل کا وہ معرکہ جو مکہ کی سرزمین پر بت پرستوں اور توحید کے متوالوں کے درمیان برپا ہوا تھا، اسے ایک لادینی معرکہ قرار دے سکیں۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نہ تو کفار مکہ کو اپنے مذہب سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ مسلمانوں کے پیش نظر کوئی روحانی انقلاب تھا، بلکہ یہ معاشی مفادات کا

ٹکراؤ تھا جس میں مسلمان اور کفار مکہ آمنے سامنے تھے۔

اس قسم کی باتیں وہی شخص کر سکتا ہے جو تاریخ کے مسلمہ حقائق سے چشم پوشی کر سکتا ہو۔ کفار مکہ نے بارہا حضور ﷺ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ انہوں نے حضور ﷺ کے چچا ابو طالب کے ذریعے بھی، آپ سے اپنے رویے میں تبدیلی کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے آپ کو دنیا کی ہر نعمت کا لالچ دیا تھا۔ وہ آپ کے قدموں میں دولت کے ڈھیر جمع کرنے کے لئے تیار تھے۔ انہیں آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لینے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ آپ سے بار بار صرف ایک ہی مطالبہ کر رہے تھے کہ آپ ان کے بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیں، آپ ان کے آباؤ اجداد کو گمراہ کہنے سے باز آ جائیں۔ اگر یہ معرکہ معاشی ہوتا تو نہ کفار مکہ حضور ﷺ کو اپنا بادشاہ بنانے کی پیشکش کرتے اور نہ ہی حضور ﷺ اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے دیتے۔

جو لوگ مادی مفادات کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، وہ مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب کوئی موقع ہاتھ آ جاتا ہے تو کسی قیمت پر اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ حضور ﷺ دولت کے پیچھے نہیں بھاگ رہے تھے بلکہ آپ توحید کے اس پودے کو لہلہاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے، جس کی تخم ریزی اور آبیاری کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا تھا۔ ابو سفیان سارے مکہ کی دولت آپ کے قدموں میں ڈھیر کرتا تو آپ اسے کمال شان بے نیازی سے ٹھکرا دیتے لیکن جب اس نے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کا نعرہ لگایا، تو حضور ﷺ نے اس کو قبول کرنے کیلئے ایک لمحے کے لئے بھی توقف نہیں کیا۔ آپ نے ابو سفیان کو نہ صرف اپنے غلاموں میں شامل کیا بلکہ اس کے گھر کو دار الامن قرار دے دیا۔

اگر مسلمانوں اور کفار مکہ کی کشمکش مادی نوعیت کی ہوتی تو کوئی کافر چند جملے زبان سے ادا کرنے پر مسلمانوں کا بھائی بن جاتا اور اپنے آبائی دین پر رہتے ہوئے اپنا مقصد پورا کر لیتا۔ اگر یہ کشمکش مادی مفادات سے ابھری ہوتی تو فتح مکہ کے دن مکہ کی گلیوں میں کفار مکہ کے خون کی ندیاں بہتیں اور دنیا مادی مفادات کے تصادم کا وہی ہولناک انجام دیکھتی جو اس نے پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں دیکھا ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے غلاموں کے قاتلوں پر، ان کے قبول اسلام کے بعد، اپنا دست شفقت اس لئے رکھا تھا کہ آپ کا ان سے جھگڑا مادی نہ تھا۔ جب انہوں نے حضور ﷺ کے پیغام کو سمجھ کر تسلیم کر لیا تو ساری دشمنیاں، ساری

رنجشیں اور سارے تنازعے ختم ہو گئے۔ دو متصادم قوتوں کا یک جان بن جانا، اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ کفار مکہ اور مسلمانوں کا معرکہ مادی نہ تھا بلکہ دینی اور روحانی تھا، جس میں باطل کو شکست ہوئی اور باطل کے علمبرداروں نے حق کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ انہوں نے نہ صرف حق کی قوت کے سامنے سر تسلیم خم کیا بلکہ حق کے علمبردار بن کر دنیا میں اس کا نور بانٹنے کے لئے چل نکلے۔

"منٹگمری واٹ" حضور ﷺ کی رسالت کی ایک اور توجیہ یہ کرتا ہے کہ مکہ کی معاشی عدم مساوات نے حضور ﷺ کی نفسیاتی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ آپ نے محسوس کیا کہ آپ انتہائی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہونے کے باوجود معاشرے میں کوئی اہم مقام حاصل نہیں کر سکے۔ اسی طرح اور بھی بے شمار باصلاحیت لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اور چند نااہل لوگ، دولت کے زور پر، سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ ان جذبات نے حضور ﷺ کو بے چین کر دیا اور آخر کار آپ کے یہ جذبات دعویٰ رسالت و نبوت کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ منٹگمری واٹ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"Yet he felt that his gifts were not being used to the full. He had a talent for administration that would have enabled him to handle the biggest operations then carried out in Mecca, but the great merchants excluded him from their inner circle. His own dissatisfaction made him more aware of the unsatisfactory aspects of life in Mecca. In these, hidden years, he must have brooded over such matters. Eventually what had been maturing in the inner depths was brought to light". (1)

"تاہم ان (محمد ﷺ) کو احساس تھا کہ آپ کی صلاحیتیں مکمل طور پر استعمال نہیں ہو رہیں۔ آپ اپنی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے بل بوتے پر، اس وقت مکہ کے کسی بڑے سے بڑے کاروباری عمل کو کنٹرول کر سکتے تھے لیکن بڑے تاجروں نے آپ کو کاروباری مرکز سے دور رکھا۔ آپ کی ذاتی بے اطمینانی نے آپ کو مکی زندگی کے بے اطمینانی کے پہلوؤں کا احساس دلایا ہو گا۔ ان غیر

1۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 13

معروف سالوں میں آپ نے بارہا ان معاملات پر غور کیا ہوگا۔ آخرکار جو جذبات باطن کی گہرائیوں میں پک رہے تھے، وہ منظر عام پر آگئے۔"

"منٹگمری واٹ" کی اس تقریر کی بنیاد اسی مفروضے پر ہے کہ حضور علیہ السلام کو کاروباری میدان میں اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقعہ نہیں ملا، لیکن یہ مفروضہ تاریخ سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ حضور علیہ السلام کو کاروباری میدان میں اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقعہ بھی ملا تھا اور آپ نے اس میدان میں حیرت انگیز فتوحات بھی حاصل کی تھیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنھا، پہلی دفعہ، آپ کی انہی صلاحیتوں اور آپ کی کاروباری کامیابیوں کی وجہ سے ہی آپ کی طرف متوجہ ہوئی تھیں اور انہوں نے ان ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ جب آپ کی روحانی عظمتوں کا مشاہدہ کیا تھا تو اپنا سب کچھ آپ کے قدموں پر نثار کر دیا تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنھا کا سرمایہ آپ کے تصرف میں تھا۔ اگر آپ چاہتے تو اپنی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے بل بوتے پر مکہ یا جزیرہ عرب تو کیا، ساری دنیا کی تجارت پر چھا جاتے لیکن یہ آپ کا میدان نہ تھا۔ آپ کا میدان وہ تھا جس کے لئے آپ نے نہ صرف تجارت کو خیرباد کہا بلکہ ہر دنیوی لذت کو خیرباد کہہ دیا اور اس میدان میں وہ عظمتیں حاصل کیں جو مخلوق خدا میں سے کسی کا مقدر نہ بن سکیں۔

ٹارانڈرائے نے حضور علیہ السلام کے دعویٰ نبوت کے لئے ایک اور محرک تلاش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ یہودی ایک نبی کے منتظر تھے۔ محمد (علیہ السلام) کو اس چیز کا علم تھا۔ اور اسی بات نے آپ کو دعویٰ نبوت ورسالت کی طرف مائل کیا، وہ کہتا ہے:

> "Muhammad knew of the Jewish expectation of the coming Messiah. He knew that a prophet was promised in Torah, and linked this prophecy with Jesus' promise that he would send the comforter. For him, this belief in Messiah provided a support for his conviction of his call, but he cannot have invented it". (1)

"محمد (علیہ السلام) کو معلوم تھا کہ یہودی ایک مسیح کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

1۔ محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 98

انہیں معلوم تھا کہ تورات میں ایک رسول کے آنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے تورات کے اس وعدے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس وعدے کے ساتھ ملا دیا، کہ وہ ایک تسلی دینے والا بھیجیں گے۔ ایک نبی کے آنے کے عقیدے نے اس یقین میں محمد (ﷺ) کی مدد تو کی ہو گی کہ وہ اللہ کے رسول ہیں لیکن تورات اور مسیح کے یہ وعدے ان کی ایجاد نہیں ہو سکتے۔"

نارانڈرائے تسلیم کر رہا ہے کہ ایک نبی کی آمد کے متعلق تورات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وعدے حضور ﷺ کی ایجاد نہیں۔ یعنی یہ وعدے حقیقتاً تورات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں موجود ہیں۔ جب تورات اور انجیل میں ایسے وعدوں کے موجود ہونے کا مستشرقین کو یقین ہے تو انہیں چاہئے تھا کہ حضور ﷺ کی ذات اور آپ کی تعلیمات کو اس رسول موعود کی بیان کردہ نشانیوں کے تناظر میں دیکھتے۔ جیسے بحیریٰ راہب، ورقہ بن نوفل اور حضرت عبداللہ بن سلام نے دیکھا تھا اور حضرت محمد (ﷺ) کی ذات کی شکل میں اس رسول کو پہچان لیا تھا جس کی آمد کی بشارتیں سابقہ صحف آسمانی نے دی تھیں۔

تورات اور انجیل کے وعدے حضور ﷺ کے دعویٰ نبوت و رسالت کے محرکات نہیں بلکہ یہ وعدے حضور ﷺ کی صداقت کی ناقابل تردید دلیل ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی صدیوں پر محیط، ان گنت کوششوں کے باوجود، ان صحائف میں حضور ﷺ کی نشانیوں کا مل جانا، خدا کی قدرت اور اس کے آخری رسول کی صداقت کی دلیل ہے۔

اگر تورات اور انجیل میں ایک نبی کی آمد کی بشارتیں بھی ہیں، حضور ﷺ کے دور کے متعدد علمائے اہل کتاب، آپ کی ذات میں رسول موعود کی نشانیاں دیکھ بھی لیتے ہیں اور پھر آپ کا پیغام ایک بے نظیر عالمی انقلاب بھی برپا کرتا ہے اور چودہ سو سال سے اس کے ڈنکے دنیا میں ہر سو بج رہے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی ایسی ہستی، حضور ﷺ کے علاوہ، ظاہر بھی نہیں ہوئی جسے موعود Comforter (تسلی دینے والا) قرار دیا جا سکے، تو کیا وجہ ہے کہ حضور ﷺ، جن کی ذات میں اس آنے والے رسول کی تمام نشانیاں موجود ہیں، انہیں رسول موعود قرار نہ دیا جائے اور آپ کی دعوت کی غلط تعبیریں اور توجیہیں کرنے کے لئے زندگیاں برباد کر دی جائیں؟

حق وہی ہے جو قرآن حکیم فرماتا ہے کہ اہل کتاب حضور علیہ السلام کو یوں پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں۔ یقیناً قرآن حکیم کا فرمان سچا ہے اور یہود و نصاریٰ حضور علیہ السلام کو واقعی یوں پہچانتے ہیں جیسے اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں لیکن پھر حسد و بغض کی وجہ سے آپ کی رسالت کا انکار کر دیتے ہیں۔

ساتویں صدی عیسوی کے یہود و نصاریٰ کا بھی یہی عمل تھا اور بیسویں صدی عیسوی کے بزعم خویش مہذب اور محقق قسم کے یہود و نصاریٰ کا بھی یہی عمل ہے۔ حق روز روشن کی طرح واضح ہے لیکن آفتاب کے نور کا انکار کرنے والوں کا مرض ایسا ہوتا ہے جس کا علاج کسی انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔

مستشرقین نے جس طرح حضور علیہ السلام کی رسالت کے آغاز کے لئے مختلف قسم کے مادی اور نفسیاتی محرکات تلاش کیے ہیں، اسی طرح دین اسلام کے مختلف احکام کو بھی انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مستشرقین حضور علیہ السلام پر الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے ابتدا میں مشرکین کے مذہب کے خلاف اعلانیہ کچھ نہیں کہا اور نہ ہی ان کے بتوں پر اعلانیہ تنقید کی لیکن جب مشرکین مکہ آپ کی دعوت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو رد عمل کے طور پر حضور علیہ السلام نے ان کے مذہب پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ کبھی مستشرقین حضور علیہ السلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے بعض بتوں کے خلاف تو آواز اٹھائی لیکن بعض دوسرے بتوں کے خلاف آپ نے کچھ نہیں کہا۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام جب تک مکہ میں رہے، آپ نے شراب کو حرام قرار نہیں دیا کیونکہ آپ مکہ والوں کی مخالفت سے ڈرتے تھے لیکن جب آپ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے گئے اور کفار کی مخالفت کا اندیشہ نہ رہا تو آپ نے شراب کو حرام قرار دے دیا۔ اسی طرح وہ آپ پر الزام لگاتے ہیں کہ ابتدا میں آپ کو امید تھی کہ مدینہ کے یہودی آپ پر ایمان لے آئیں گے، اس لئے آپ نے یہودیوں کے خلاف سخت رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ یہی کہتے رہے کہ آپ وہی دین لے کر آئے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لائے تھے، لیکن جب آپ کو یقین ہو گیا کہ یہودی ایمان نہیں لائیں گے تو آپ نے ان پر شدید تنقید شروع کر دی اور ان کے مذہب پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ اسی طرح وہ آپ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ ابتدا میں اپنے آپ کو صرف عربوں کیلئے نذیر سمجھتے تھے لیکن جب آپ کی دعوت نے پھیلنا شروع کر دیا تو

آپ نے اپنے دین کو عالمی دین کا رنگ دے دیا۔ نماز کے بارے میں تو مستشرقین کا فیصلہ ہی یہ ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مسلمان صرف دو نمازیں پڑھتے تھے۔ اور باجماعت صرف جمعہ کی نماز ادا کی جاتی تھی۔ نماز پنجگانہ کا تصور اور تمام نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کا معمول، بعد کے مسلمانوں کی اختراع ہے۔ مستشرقین اسی رنگ میں آپ کی رسالت، آپ کے دین کے احکام اور آپ کی تاریخ کی تشریح کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا الزامات میں سے کوئی بھی الزام ایسا نہیں جو غیر جانبدارانہ تحقیق کے سامنے چند لمحے ٹھہر سکے۔ کیونکہ قرآن حکیم کی بے شمار آیات، حضور ﷺ کی بے شمار احادیث اور آپ کی سیرت طیبہ کا ایک ایک ورق، ان کی تردید کر رہا ہے۔

بت پرستی کی مخالفت جس انداز میں اسلام نے کی ہے، مروجہ یہودیت و نصرانیت کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ آج کے عیسائیوں نے اپنے عبادت خانوں میں مجسمے رکھے ہوئے ہیں، انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس ہستی پر بتوں کے معاملے میں مداہنت کا الزام لگائیں جس نے مکہ میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد پہلا کام ہی یہ کیا کہ خانہ کعبہ کو ہر قسم کے بتوں، مجسموں اور تصویروں سے پاک کیا۔

کفار کے خوف سے حرمت شراب کے حکم کو موخر کرنے کا شوشہ بھی کتنا مضحکہ خیز ہے۔ حضور ﷺ کے دل میں کفار مکہ کے بتوں کی توہین کرنے، ان کے آباؤ اجداد کو گمراہ کہنے اور ان کی معاشی، سماجی اور دینی قدروں پر تابڑ توڑ حملے کرنے کے وقت تو کفار مکہ کی مخالفت کا خوف پیدا نہ ہوا لیکن ان کو شراب نوشی سے روکتے وقت آپ خوف زدہ ہو گئے۔ کتنی لایعنی بات ہے۔ لیکن اس قسم کی باتیں لکھنے والوں کو بھی دنیا تحقیق کا امام مانتی ہے۔ اس سے بڑا عجوبہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

حضور ﷺ کے دل میں نہ تو کفار مکہ کے خلاف کینہ تھا اور نہ ہی یہودیوں کے خلاف۔ آپ کا دل تو ان سب کے لئے رحمت کے جذبات سے معمور تھا۔ آپ کی تو سب سے بڑی خواہش ہی یہ تھی کہ ابو جہل اور کعب بن اشرف جیسے لوگ ہٹ دھرمی چھوڑ دیں اور دوزخ کے گڑھے میں گرنے کے بجائے جنت کی ابدی بہاروں سے متمتع ہوں۔ آپ نے انہیں محبت سے، شفقت سے اور حکمت سے صراط مستقیم کی طرف آنے کی دعوت دی۔ آپ کے رب نے آپ کو دعوت کا یہی طریقہ سکھایا تھا۔ آپ کو آپ کے رب کی طرف

سے یہ حکم ملا تھا:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ (1)

"(اے محبوب!) بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے اور ان سے بحث و مناظرہ) اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ (اور شائستہ) ہو بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جو بھٹک گیا اس کے راستہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو۔"

حضور علیہ السلام نے کفار مکہ اور یثرب کے یہودیوں کو ان کی فکری اور عملی قباحتوں سے بڑے حکیمانہ انداز میں باخبر کیا تھا اور انہیں صراط مستقیم کی طرف دعوت دی تھی۔ تصادم کا راستہ تو ان دونوں قوموں نے خود اختیار کیا تھا۔ حضور علیہ السلام نے نہ تو کفار مکہ کو ان کے غلط عقائد سے آگاہ کرنے میں کوئی سستی کی تھی اور نہ ہی یہودیوں کی فکری بے راہرویوں کا پردہ چاک کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی۔ اس کے باوجود آپ نے ان کے ساتھ مصالحانہ رویہ روا رکھا تھا، لیکن ان دونوں قوموں نے حق کی شمع کو گل کرنے کی قسم کھالی۔ ان حالات میں حضور علیہ السلام کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ بے دین قوتیں حق کی شمع کو گل کرنے میں مصروف رہیں اور آپ ان کے خلاف کوئی ایکشن نہ لیں۔ جب کفار نے تصادم کا راستہ اختیار کیا تو حضور علیہ السلام کو بھی ان کے خلاف تلوار اٹھانے کا بارگاہ خداوندی سے اذن مل گیا۔

یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ حضور علیہ السلام نے یہودیوں کے غلط عقائد کے خلاف بھی اس وقت تک کچھ نہیں کہا جب تک آپ کو اس بات کا یقین نہ آگیا کہ یہ لوگ کسی صورت میں ایمان نہیں لائیں گے۔ اسلام نے اپنے عقائد ابتدا ہی میں اتنے واضح انداز میں بیان کر دیئے تھے، کہ جن مذاہب کے عقائد اسلام کے عقائد سے ٹکراتے تھے، ان کی خود بخود تردید ہو جاتی تھی۔ یہودیوں کو حضور علیہ السلام کے خلاف سب سے بڑا اعتراض تو یہ تھا کہ نبوت و رسالت کا منصب حزب مختار کے علاوہ کسی اور کے پاس کیسے جا سکتا ہے۔ رسالت کا دعویٰ اور اعلان تو آپ نے ہجرت سے تیرہ سال پہلے مکہ مکرمہ میں کر دیا تھا اور یہودیوں کو

1۔ سورۃ النحل: 125

اس حقیقت کا علم تھا۔ ان کے حزب مختار ہونے اور نبوت و رسالت کے منصب کے بلا شرکت غیرے مستحق ہونے کے عقیدے کی تردید تو حضور ﷺ کے اعلان نبوت کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔ اس لئے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں حضور ﷺ نے یہودیوں کے غلط عقائد کی تردید نہیں کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور ﷺ نے ہجرت کے بعد پوری کوشش کی تھی کہ مسلمان اور یہودی اپنے اپنے مذاہب پر کاربند رہتے ہوئے مدینہ طیبہ میں امن و سکون سے رہیں، لیکن یہودیوں نے آپ کی ان مخلصانہ مساعی کا مثبت جواب نہ دیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کر کے ان کی خلاف ورزی کی تھی اور انہیں اس جرم کی سزا بھی ملی تھی۔ حضور ﷺ نے یہودی قبائل کے خلاف جو کارروائیاں کیں، ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کارروائیاں، یہودی عقائد کے خلاف اسلامی حملوں کا آغاز تھیں کیونکہ ان کارروائیوں کا عقیدے کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلام نے اپنے عقائد تو ابتدا ہی سے انتہائی وضاحت سے بیان کر دیئے تھے اور ان عقائد میں سے جو عقائد کسی مذہب سے متصادم تھے ان میں کسی قسم کا ابہام نہ رہ گیا تھا۔ یہودی قبائل کے خلاف کارروائیاں اس وقت نہیں کی گئیں جب دونوں مذاہب کے عقائد میں اختلافات منظر عام پر آئے۔ بلکہ ان اختلافات کے منظر عام پر آنے کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معاہدے بھی ہوئے اور باہم امن و سکون سے رہنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ یہ کارروائیاں تو انتظامی یا سیاسی نوعیت کی تھیں، جو اس وقت کی گئیں جب یہودیوں نے معاہدوں کی خلاف ورزیاں کر کے مدینہ کے امن و سکون کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

حضور ﷺ نے یہودیوں کو صرف اس وجہ سے کوئی سزا نہیں دی کہ وہ یہودی ہیں بلکہ آپ نے تو انہیں اہل کتاب کہہ کر دیگر مذاہب باطلہ سے ممتاز کیا تھا لیکن یہودیوں نے رحمت دو عالم ﷺ کے رحیمانہ رویے سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور کیفر کردار تک پہنچ گئے۔

مستشرقین یہودیوں کے متعلق حضور ﷺ کے رویہ پر دو حوالوں سے حملہ کرتے ہیں۔ ایک تو وہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے ابتدا میں یہودیوں کی دلجوئی کے لئے بیت المقدس کو ہی اپنا قبلہ قرار دیا تھا جو یہودیوں کے لئے ایک مقدس مقام تھا لیکن جب آپ ان کے ایمان

لانے سے مایوس ہو گئے تو آپ نے ان کی مخالفت میں اپنا قبلہ بدل دیا۔ اور دوسرا الزام وہ حضور ﷺ پر یہ لگاتے ہیں کہ یہودیوں کے کاروبار کا دارومدار سود پر تھا۔ آپ نے ان کے کاروبار کو تباہ کرنے کے لئے سود کی حرمت کا اعلان کر دیا۔

یہ دونوں مفروضے اس لئے غلط ہیں کہ حضور ﷺ نے بیت المقدس کو قبلہ یہودیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مقرر نہیں کیا تھا بلکہ آپ کا معمول یہ تھا کہ آپ ہر اس معاملہ میں سابقہ شریعتوں کے احکام پر عمل کرتے تھے، جس کے متعلق آپ کے پاس وحی نہیں آتی تھی۔ انبیائے سابقین کا قبلہ بیت المقدس تھا، اس لئے حضور ﷺ نے بھی دوسرا حکم نازل ہونے تک اسے ہی قبلہ قرار دیئے رکھا۔ اگر تبدیلی قبلہ کے ساتھ یہودیوں کی دوستی یا مخاصمت کا کوئی تعلق ہوتا تو حضور ﷺ کسی ایسے عقیدے یا عمل کی تبلیغ نہ کرتے جو یہودیوں کے ہاں بھی مروج تھا۔ حضور ﷺ نے زندگی بھر بے شمار ایسے کاموں کی تبلیغ کی جو یہودیوں کے ہاں بھی مروج تھے۔ خدا کا تصور، عقیدہ رسالت و نبوت، آخرت، ثواب و عذاب، جنت و دوزخ یہ سب وہ عقیدے تھے جن کا اسلام نے پرچار کیا اور یہ عقیدے یہودیوں کے ہاں بھی مسلم تھے۔ جو ہستیاں یہودیوں کے لئے قابل احترام تھیں، حضور ﷺ نے ان کا یہودیوں سے کئی گنا زیادہ احترام کیا بلکہ یہودیوں نے ان کی پاک سیرتوں پر جن آلودگیوں کے دھبے لگا دیئے تھے، ان کو حضور ﷺ نے ان کے پاک دامنوں سے دور کیا۔

اگر حضور ﷺ نے یہودیوں کی مخاصمت کی وجہ سے قبلہ تبدیل کیا ہوتا تو آپ مخاصمت کے اس جذبے میں اپنے آپ کو اسی حد تک محدود نہ رکھتے بلکہ تمام یہودی شعائر کی مخالفت کرتے لیکن حضور ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہودیوں کے لئے قابل احترام شخصیت ہونے کی وجہ سے آپ نے ان سے قطع تعلق نہیں کیا بلکہ یہودیوں کو بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف تمہارے ہی بزرگ نہیں بلکہ ان کے ساتھ ہمارا تعلق تمہاری نسبت کہیں زیادہ ہے۔ دیگر انبیائے بنو اسرائیل جو یہودیوں کے اجداد تھے حضور ﷺ نے اپنے پیروکاروں کے لئے ان کے احترام کو فرض قرار دیا اور اپنی امت کو وضاحت سے بتا دیا کہ ان تمام عظیم ہستیوں کا احترام مسلمان ہونے کے لئے شرط ہے۔

اسلامی احکام پر مجموعی حیثیت میں، ایک نظر ڈالنے والا شخص فوراً اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ تبدیلی قبلہ کا سبب یہودیوں کی مخالفت نہ تھا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا جس کے

سامنے حضور ﷺ اور آپ کے تمام پیروکاروں نے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ سود کی حرمت کا حکم بھی حضور ﷺ نے اس لئے نہیں دیا تھا کہ آپ یہودیوں کے کاروبار کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے، بلکہ یہ حکم بھی رب قدوس نے اپنے حبیب کی امت کو معاشی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے دیا تھا۔ اسلامی احکام کے پہلے مخاطب یہودی نہیں بلکہ مسلمان تھے، اس لئے اسلام نے یہ حکم یہودیوں کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں بلکہ اسلامی ریاست سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کے معاشی مفادات کے تحفظ کے لئے دیا تھا۔ یہودی حضور ﷺ پر یہ الزام اس لئے بھی نہیں لگا سکتے کہ حرمت سود کا حکم ان کے لئے اجنبی نہ تھا۔ باہمی لین دین میں وہ خود سود کی حرمت کے قائل تھے لیکن دیگر اقوام کے ساتھ وہ سودی لین دین کو جائز سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس دوغلی پالیسی کو ختم کیا اور کلیۃً سود کی حرمت کا حکم نافذ کر دیا۔

قارئین کرام نے اسلام کے خلاف مستشرقین کے حملوں کی نوعیت کا مشاہدہ کیا۔ وہ اسلام کو عرب کے بدلتے ہوئے حالات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کی حالت میں تبدیلی سے جو تقاضے ابھرے تھے، وہ چودہ صدیاں کیسے قائم رہے۔ عربوں نے تو اسلام کی تعلیمات کو اپنے بدلتے ہوئے تقاضوں کے لئے موزوں سمجھا تھا، اس لئے انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن بیسویں صدی عیسوی کے مغربی سکالر اس دین کو کیوں قبول کر لیتے ہیں جو ساتویں صدی عیسوی کی ایک امی قوم کے بدلتے ہوئے معاشی اور سماجی تقاضوں کے نتیجے میں منظر عام پر آیا تھا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اکثر مذاہب کے پیروکاروں نے حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے اپنے مذاہب میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کر لی ہیں۔ عیسائیوں نے اپنے مذہبی احکام کو زندگی سے بیدخل کر کے چرچ کی چار دیواری میں بند کر رکھا ہے۔ وہ کئی ایسی چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں جن کو ان کے مذہب نے حرام قرار دیا ہے۔ یہودی بھی اپنی اجتماعی زندگی مذہبی تعلیمات کے مطابق نہیں بلکہ اپنی خود ساختہ پالیسیوں کے مطابق گزارتے ہیں۔ ہندو اپنے مذہب کی تعلیمات کے خلاف ایک برہمن اور ایک شودر کے ووٹ کو برابر مقام دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دنیائے اسلام کی اکثریت آج بھی اسی اسلام میں اپنی کامیابی اور نجات کو مضمر سمجھتی ہے جو حضور ﷺ نے ابوجہل،

ابو سفیان، ابو بکر اور عمر کے سامنے پیش کیا تھا۔ مستشرقین اور ان کی ذریت پورا زور لگاتی ہے کہ مسلمان بھی اپنے دین میں اسی قسم کی ترمیمات کریں جو انہوں نے کی ہیں لیکن مسلمان ان کی اس نصیحت کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ مسلمانوں کو قرآن وحدیث پر عمل پیرا دیکھتے ہیں تو انہیں بنیاد پرست قرار دیتے ہیں اور جب وہ جہاد کے اسلامی حکم پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو اہل مغرب انہیں دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔

اگر اسلام ساتویں صدی عیسوی کے بدلتے ہوئے حالات کے نتیجے میں منظر عام پر آیا ہوتا تو بیسویں صدی عیسوی میں امریکہ کے مائیک ٹائسن کو ملک عبد العزیز بنانے کی صلاحیت نہ رکھتا۔ مستشرقین کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ان کے مغربی بھائی جب اسلام کے دامن میں پناہ لیتے ہیں تو وہ ان مسلمانوں سے زیادہ بنیاد پرست ہوتے ہیں جن کو اسلام ورثے میں ملا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل مغرب کو وہ اسلام اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے جو چودہ سو سال پہلے قلب مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر نازل ہوا تھا، جسے مستشرقین اس دور میں جنم لینے والا ناپختہ دین کہتے ہیں۔ یہ لوگ اس اسلام سے متاثر نہیں ہو رہے جو مستشرقین کی مساعی سے متاثر ہونے والے کچھ خود فریب مسلمان پیش کر رہے ہیں۔

اسلام کا نت نئے قلوب کو فتح کرنا اور انہیں اپنے آستانے پر جبین فرسائی کے لئے مجبور کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دین صرف عربوں کے مخصوص حالات ہی کے لئے نہیں بلکہ ہر دور کے حالات کے لئے موزوں ہے۔ یہ اس ذات کا نازل کردہ ہے جو عربوں کی اجتماعی زندگی کے تقاضوں سے بھی آگاہ ہے اور جس کے سامنے بیسویں صدی عیسوی کی ترقی یافتہ دنیا کے تقاضے بھی عیاں ہیں۔ یہ دین کسی انسان کے تخیل یا نفسیاتی کیفیات کا نتیجہ نہیں بلکہ علیم وخبیر خدا کا نازل کردہ ہے، جس کے سامنے زمان ومکان کی حدود کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک امی بندے کو اس عالمی دین کا علمبردار اس لئے بنایا تھا تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ دین اس نے خود بنالیا ہے، یا کسی سے مدد حاصل کر کے اس کے قواعد وضوابط وضع کر لئے ہیں۔

اسلام کے الہامی دین ہونے کا یقین حاصل کرنے کے لئے قرآن حکیم کی کسی ایک آیت پر مخلصانہ غور فکر، حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ پر ایک نظر یا تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ ہی کافی ہے۔ ایک امی انسان کی زبان سے اگر علوم ومعارف کے وہ موتی جھڑے ہوں

جو آیات قرآنی کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں تو اس کا ایک اور صرف ایک ہی مطلب ہے کہ وہ عبد امی، خدا کا مقدس رسول ہے۔ اگر ایک انسان پوری دنیا کو گمراہی کی دلدل سے نکال کر ہدایت کی شاہراہ پر لگانے میں انتہائی مختصر مدت میں کامیاب ہو گیا ہے تو اس کی توجیہ بھی اس کے سوا ممکن نہیں کہ اس انسان پر خداوند کریم کی خصوصی نظر ہے۔

مستشرقین نے اسلام کے احکام کی جو مختلف توجیہیں کی ہیں، ان کے بے بنیاد ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مستشرقین کسی فرضی توجیہ پر اتفاق نہیں کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام کو الہامی دین کے علاوہ کچھ اور قرار دینا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا دوپہر کی، آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی، روشنی کو ضوء آفتاب کے سوا کچھ اور قرار دینے کی کوشش کرنا۔

حضور ﷺ پر شرک کا الزام

حضور ﷺ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ بت پرستی کا ماحول تھا۔ آپ کے آبائی شہر مکہ اور اس کے رہنے والوں کو عزت، احترام اور امن خانہ کعبہ کی برکت سے حاصل تھا جو خلیل و اسماعیل علیہما السلام نے خدائے واحد کی عبادت کے لئے خود خدا کے حکم سے تعمیر کیا تھا، لیکن وہ خانہ کعبہ تین سو ساٹھ بتوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ مکہ والے خدا کے تصور سے ناآشنا نہ تھے، وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے لیکن اس ایمان کے ساتھ وہ ہزاروں بتوں کی پوجا بھی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی پوجا اس لئے کرتے ہیں تاکہ ہمیں ان کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل ہو جائے۔

حضور ﷺ کو بارگاہ خداوندی سے جو فریضہ تفویض ہوا تھا، اس کی پہلی شق انسانیت کو بتوں کی پوجا کی اس ذلت سے روکنا اور ان کی جبینوں کو خدائے واحد کے سامنے جھکانا تھا۔

حضور ﷺ نے بنی نوع انسان کے سامنے جو فکری نظام پیش کیا اس کی پہلی دفعہ یہ تھی:

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

کہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں جو معبود بننے کی مستحق ہو۔ حضور ﷺ نے اسی بات سے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ آپ نے ابتداء میں لوگوں کو خفیہ طور پر اسلام کی دعوت دی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو حکم ملا کہ آپ اعلانیہ تبلیغ کریں۔ اور پھر اس دعوت نے حکم خداوندی کے مطابق عالمی دعوت کا رنگ اختیار کیا اور

حضور علیہ السلام نے ساری نسل انسانی کو بارگاہ خداوندی کی طرف بلانے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔

حضور علیہ السلام کی دعوت کو پانچ مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1:۔ قریبی رشتہ داروں اور خصوصی دوست احباب کو دین کی دعوت

2:۔ اپنی قوم اور اہالیان شہر کو دین اسلام کی طرف بلانا

3:۔ مکہ اور نواحی بستیوں کے افراد اور قبائل تک خدا کا پیغام پہنچانا

4:۔ تمام جزیرہ عرب کے باشندوں کو توحید کا درس دینا

5:۔ دنیا کی تمام قوموں اور مذاہب کو آخرت کے عذاب سے ڈرانا

ان تمام مراحل میں پیغمبر خدا علیہ التحیۃ والثناء نے جس پیغام کو عام کیا، وہ پیغام ایک ہی تھا۔ آپ خفیہ طور پر تبلیغ کا فریضہ سرانجام دینے میں مصروف تھے تو بھی آپ کا پیغام وہی تھا جس پیغام کو آپ نے اعلانیہ قوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ آپ نے اپنی رفیقہ حیات کے سامنے بھی وہی پیغام پیش کیا تھا، جو کوہ صفا پر تمام اہل مکہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ ہر مقام پر آپ کے پیغام کا اہم ترین جزو یہ تھا کہ بتوں کی عبادت چھوڑ دو اور خدائے واحد کی عبادت کرو۔ جو شخص بھی آپ کی دعوت کو قبول کر کے آپ کے دین میں داخل ہوتا، وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر خدا کی توحید کا اقرار کرتا اور بتوں سے اپنی برات کا اظہار کرتا۔

ان تمام حقائق کے باوجود مستشرقین حضور علیہ السلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ ابتدا میں اپنے آبائی دین کی طرف مائل تھے۔ مخالفین اپنے اس الزام کو ثابت کرنے کے لئے یہ تاثر دیتے ہیں کہ ابتدا میں آپ نے نہ تو توحید کا پرچار کیا اور نہ ہی بتوں کی مخالفت کی۔ قرون وسطی کے مستشرقین نے حضور علیہ السلام کو ایک بت کی شکل میں پیش کیا اور مسلمانوں کو تثلیث پرست قرار دیا۔ رولینڈ نے اپنی ایک مشہور نظم میں حضور علیہ السلام کو سونے اور چاندی کے ایک مجسمے کی شکل میں پیش کیا، اس مجسمے میں آپ کو ایک ہاتھی پر سوار دکھایا گیا تھا اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ مسلمان اس مجسمے کی عبادت کرتے تھے۔ اس مستشرق شاعر نے یہ بھی پروپیگنڈہ کیا کہ مسلمان تثلیث پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی تثلیث کے ارکان یہ ہیں: محمد، ابولون اور بتر فاجان۔ (1) روڈلف ولوھیم، ھوتنجر اور بلیاندر نے اپنے قارئین کو بتایا کہ محمد

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 300

(ﷺ) قبائلی سردار یا اپنی قوم کے سربراہ بننے پر قانع نہ تھے، بلکہ وہ اپنے آپ کو خدا دیکھنا چاہتے تھے۔(1)

قرون وسطیٰ میں یورپ میں حضور ﷺ کی جو تصویر کشی کی گئی، وہ اسی قسم کی تھی جس کی چند مثالیں سطور بالا میں پیش کی گئی ہیں۔ متاخر مستشرقین نے بعض مصلحتوں کے تحت اس رویے میں تبدیلی کی۔ انہوں نے بھی حضور ﷺ کے خلاف شرک اور بت پرستی کا الزام تو لگایا لیکن یہ الزام لگاتے وقت انہوں نے قدرے احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا۔ مستشرقین جس دور کو عصر نور کہتے ہیں، اس دور کے مستشرقین کی تحریروں میں بھی ہمیں اس بے بنیاد الزام کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جارج سیل حج کی رسوم کو مشرکانہ رسوم قرار دینے کے بعد کہتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے بت پرستی کا قلع قمع کیا لیکن جو رسمیں شرک سے متعلق تھیں اور عرب ان سے مانوس ہو چکے تھے، ان کو ختم کرنے کی کوشش کرنا آپ نے خلاف مصلحت سمجھا اور شرک کو اصولی طور پر ختم کرنے کے لئے بعض مشرکانہ رسوم کو مصلحتاً قبول کر لیا۔ وہ لکھتا ہے:

"Mohammad found it much easier to abolish idolatry itself, than to eradicate the superstitious bigotry with which they were addicted to that temple, and the rites performed there; Wherefore, after several fruitless trials to wean them therefrom, he thought it best to compromise the matter, and rather than to frustrate his whole design, to allow them to go to pilgrimage thither, and to direct their prayers thereto". (2)

"محمد (ﷺ) کو یہ بات آسان محسوس ہوئی، کہ اہل مکہ جس توہم پرستانہ ہٹ دھرمی سے مکہ کے گرجا کی عزت کے عادی تھے اور وہاں جو رسوم ادا کرتے تھے، ان کا قلع قمع کرنے کی بجائے خود عقیدہ شرک کی نفی کریں۔ اس لئے آپ نے، عربوں کو کعبہ سے روکنے کی کئی ناکام کوششوں کے بعد، یہ مناسب سمجھا کہ اس مسئلہ پر مصالحت کر لیں اور اپنے سارے منصوبے کو تباہ کرنے کی بجائے

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 312

2۔ جارج سیل، "The Koran"، (فریڈرک وارن اینڈ کمپنی لندن۔1890ء)، صفحہ 95، (مقدمہ)

لوگوں کو بیت اللہ کا حج کرنے اور نمازوں میں خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنے کی اجازت دے دیں۔"

منٹگمری واٹ بھی اس الزام میں جارج سیل کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Despite this extirpation of idolatry, many old ideas and practices were retained". (1)

"گو اسلام نے بت پرستی کو ختم کیا لیکن اس کے باوجود اس نے بہت سارے مشرکانہ نظریات اور رسوم کو باقی رکھا۔"

منٹگمری واٹ ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں حضور ﷺ پر بت پرستی کا الزام لگاتے ہوئے لکھتا ہے:

"Muhammad's original belief may have been in Allah as high god, or supreme deity, combined with lesser local deities whom he may have come to regard as angels who could intercede with the supreme being". (2)

"محمد (ﷺ) کا ابتدائی عقیدہ غالباً یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بڑا خدا ہے اور اس کے علاوہ کچھ مقامی چھوٹے خدا ہیں، جن کو محمد (ﷺ) نے فرشتوں کا نام دیا، جو خدا کے حضور شفاعت کر سکتے تھے۔"

مستشرق مذکور ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"It is further to be noted that in the early passages of the Quran there is no assertion that Allah is uniquely God. It is possible that Muhammad himself to some extent shared the belief of many of his contemporaries that Allah was a high god with whom other beings could intercede. It is unlikely that he thought of these beings as lesser deities, but, as just suggested, he may have thought of them as angels." (3)

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 310

2۔ محمد ایٹ مکہ، صفحہ 49

3۔ ایضاً، صفحہ 87

"مزید براں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں اس بات پر زور نہیں کہ اللہ تعالیٰ خدائے واحد ہے۔ یہ بات ممکن ہے کہ محمد (ﷺ) کا، اپنے اکثر ہم عصر لوگوں کے مطابق، یہ عقیدہ ہو کہ اللہ بڑا خدا ہے، جس کے سامنے دوسری کئی چیزیں شفاعت کر سکتی ہیں۔ اس بات کا امکان تو کم ہے کہ آپ ان شفاعت کرنے والوں کو چھوٹے خدا سمجھتے ہوں، لیکن جیسے کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، آپ اس مخلوق کو فرشتے سمجھتے ہوں گے۔"

قرآن حکیم نے مشرکین مکہ کو بار بار بتایا کہ تم خدا کے سوا جن چیزوں کی عبادت کرتے ہو، وہ کسی قسم کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس سے مستشرقین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قرآن حکیم بتوں کے وجود کا انکار نہیں کرتا بلکہ ان کی طاقت کا انکار کرتا ہے۔ منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

"In all these passages and in a number of briefer references there is no attempt to deny the existence of being worshipped, but they are described as powerless to do any thing for the worshippers and as repudiating them". (1)

"ان تمام آیات قرآنی میں ایسی چیزوں کے وجود کا انکار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جن کی عبادت کی جاتی ہے بلکہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی قسم کی طاقت کے مالک نہیں۔ اور وہ اپنے پجاریوں کو نہ تو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

قرآن حکیم میں مشرکین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم نے جن بتوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے، وہ تمہیں کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ منٹگمری واٹ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قرآن بتوں کو خدا سے چھوٹا خدا قرار دیتا ہے اور ان کے خدا کے برابر ہونے کا انکار کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"There seems to be a suggestion in the word, however, that they are junior partners, not equals". (2)

1۔ محمد ایٹ مکہ، صفحہ 90

2۔ ایضاً

"شرکا" کے لفظ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ بت خدا سے چھوٹے خدا ہیں، اس کے برابر نہیں۔"

ہم نے سطور بالا میں مستشرقین کی تحریروں کے چند اقتباسات نقل کر کے قارئین کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے کہ مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف کس قسم کے بے سروپا الزامات لگاتے ہیں۔ قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ حضور ﷺ پر بت پرستی کی طرف مائل ہونے کا الزام لگانے والوں میں جو مستشرق پیش پیش نظر آتا ہے، وہ منٹگمری واٹ ہے۔ منٹگمری واٹ کو ان مستشرقین میں شمار کیا جاتا ہے جو اپنے دل میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ مستشرق مذکور کی اور کئی عبارتیں ہیں جو واضح طور پر اسلام کو ایک مشرکانہ دین ثابت کرتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جنوں، فرشتوں اور شیاطین پر ایمان مشرکانہ نظریات تھے، جن کو اسلام نے بعض مصلحتوں کے تحت قائم رکھا۔ کبھی یہ مستشرق کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے بتوں پر جو حملے کئے، وہ حملے ان بتوں کے خلاف نہیں تھے جو خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے بلکہ آپ کے حملے خانہ کعبہ کے علاوہ دیگر صنم کدوں کے اصنام کے خلاف تھے۔ منٹگمری واٹ کی طرح ٹار انڈرائے بھی اسلام پر مشرکانہ تعلیمات کا حامل ہونے کا الزام لگاتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے بتوں کی شفاعت کا انکار نہیں کیا بلکہ آپ نے تو صرف ان کو خدا کی بیٹیاں کہنے سے روکا ہے۔(1) کبھی وہ کہتا ہے کہ محمد (ﷺ) تسلیم کرتے ہیں کہ بت فرشتے ہیں، اور بتوں کا حق شفاعت مسلم ہے۔(2) کبھی وہ کہتا ہے کہ ابتدا میں محمد (ﷺ) کے عقائد اپنے دیگر ہم قوم لوگوں کے عقائد سے متفق تھے۔

ہم نے یہاں اسلام کے متعلق صرف چند مستشرقین کے خیالات نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس قسم کا رویہ اسلام کے متعلق صرف ان ہی مستشرقین کا نہیں بلکہ اکثر مستشرقین اسلام کے خلاف اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

سطور بالا میں مستشرقین کے جن الزامات کو بیان کیا گیا ہے، ان کی تردید سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان الزامات کو ترتیب وار لکھا جائے تاکہ پھر اسی ترتیب سے ان الزامات کے

1۔ محمد: دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 21

2۔ ایضاً، صفحہ 22

جوابات دیئے جاسکیں۔ مستشرقین کے الزامات کو ہم اس ترتیب سے لکھ سکتے ہیں۔

1:۔ تین سال تک حضور ﷺ نے نہ تو توحید کا تصور پیش کیا اور نہ ہی آپ نے بتوں کے خلاف کچھ کہا۔

2:۔ قرآن حکیم بتوں کے وجود کا انکار نہیں کرتا بلکہ ان کی طاقت کا انکار کرتا ہے۔

3:۔ حضور ﷺ نے بعض بتوں کی مخالفت کی اور بعض بتوں کے متعلق نرم رویہ اختیار کیا۔

4:۔ حضور ﷺ نے بتوں کو فرشتے قرار دیا اور ان کی شفاعت کو تسلیم کیا، آپ نے صرف ان کو خدا کی بیٹیاں کہنے سے منع کیا۔

5:۔ اسلام نے شرک کو ختم کیا لیکن مشرکانہ رسوم کو جاری رکھا۔

6:۔ ابتدا میں حضور ﷺ کے عقائد اپنے ہم قوم لوگوں کے عقائد سے ملتے جلتے تھے۔

قرون وسطیٰ کے مستشرقین کے یہ مفروضے کہ مسلمان تثلیث کے پیروکار ہیں اور انہوں نے حضور ﷺ کا مجسمہ بنا رکھا ہے اور وہ اس مجسمے کی پوجا کرتے ہیں، ان کے اس قسم کے مفروضوں کو ہم نے عمداً اس لئے نظر انداز کر دیا ہے کہ متاخر مستشرقین خود ان مفروضوں کو غلط قرار دیتے ہیں۔ مستشرقین کے دیگر مفروضے بھی کوئی علمی وزن تو نہیں رکھتے لیکن چونکہ مستشرقین کو غیر جانبدار محقق سمجھا جاتا ہے اور ان کی تحریروں کو سند سمجھا جاتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ان کے مذکورہ بالا مفروضوں اور الزامات کی قلعی کھولی جائے تاکہ کوئی شخص مستشرقین کی علمی شہرت سے مرعوب ہو کر گمراہ نہ ہو جائے۔

مستشرقین کا پہلا الزام یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ابتدائی تین سال بتوں کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ مستشرقین کے پاس اپنے اس مفروضے کی دلیل یہ ہے کہ ابتداء میں کفار نے حضور ﷺ کی مخالفت نہیں کی۔ اگر آپ ابتدا ہی سے بتوں کے خلاف آواز اٹھاتے تو کفار ابتدا ہی سے آپ کی مخالفت شروع کر دیتے۔

مستشرقین کا یہ الزام اور اس کی دلیل دونوں بے بنیاد ہیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جب سے اسلام کی دعوت دینا شروع کی، آپ اسی وقت سے شرک کی مخالفت اور توحید کا پرچار کر رہے تھے۔ آپ نے اعلانیہ تبلیغ سے پہلے بھی جس کسی کو خفیہ طور پر اسلام کی دعوت دی، اس کو توحید ہی کی دعوت دی اور جس نے آپ کی دعوت کو قبول کیا اس نے سب سے پہلے اپنی زبان اور اپنے دل کی گہرائیوں سے کلمہ توحید ہی ادا کیا۔

حضور ﷺ پر خفیہ تبلیغ کے دوران ایمان لانے والوں میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بعد، سب سے مقدم ہیں۔ انہوں نے جن الفاظ کے ساتھ اپنے مومن ہونے کا اعلان کیا وہ الفاظ وضاحت کر رہے ہیں کہ وہ حضور ﷺ کی جس دعوت کو قبول کرنے کا اعلان کر رہے وہ توحید ہی کی دعوت ہے۔

انہوں نے پیغمبر خدا کی دعوت کے جواب میں یہ جملے اپنی زبان سے ادا کیے:

صَدَقْتَ بِاَبِیْ وَاُمِّیْ اَنْتَ وَاَهْلُ الصِّدْقِ اَنْتَ اَنَا اَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (1)

"میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ نے سچ فرمایا ہے اور آپ سچوں میں سے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔"

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے اعلان نبوت سے تین سال بعد نہیں بلکہ آپ کی دعوت شروع ہوتے ہی، ایمان لے آئے تھے۔ جن الفاظ سے آپ نے اپنے ایمان لانے کا اعلان کیا تھا، یقیناً دیگر "السابقون الاولون"، جن میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت زید بن حارثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پیش پیش تھے، انہوں نے بھی یہی کلمہ پڑھ کر حلقہ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بچوں میں سب سے پہلے اسلام لانے کا شرف حاصل ہے۔ ذرا وہ جملے ملاحظہ فرمایئے جن کے ذریعے حضور ﷺ نے اپنے اس عزیز اور پیارے چچیرے بھائی کو دعوت اسلام دی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نماز پڑھتے دیکھا تو پوچھا: آپ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں؟ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے ان سے فرمایا:

دِیْنُ اللّٰهِ الَّذِیْ اصْطَفَاهُ لِنَفْسِهٖ وَبَعَثَ بِهٖ رُسُلَهٗ فَاَدْعُوْكَ اِلَی اللّٰهِ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاِلٰی عِبَادَتِهٖ وَاِلَی الْكُفْرِ بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰی۔ (2)

1۔ ضیاء النبی، جلد 2، صفحہ 226

2۔ ایضاً، صفحہ 230، بحوالہ "السیرۃ النبویہ (زینی دحلان)"

"یہ اللہ کا دین ہے جسے اس نے اپنے لئے پسند کیا ہے۔ اور اس کی تبلیغ کے لئے رسول مبعوث کیے ہیں۔ پس میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لاؤ، اس کی عبادت کرو اور لات وعزیٰ کے ساتھ کفر کرو۔"

حضور علیہ السلام کے یہ الفاظ آپ کی دعوت کے بالکل آغاز میں آپ کی زبان سے نکلے تھے۔ اور یہ الفاظ اعلان کر رہے ہیں کہ اسلام کا پہلا نعرہ ہی توحید کا نعرہ تھا اور بتوں کی مخالفت سے ہی حضور علیہ السلام نے اپنے فریضہ نبوت کی ادائیگی کا آغاز کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوئی اجنبی نہ تھے بلکہ وہ حضور علیہ السلام کے گھر کے ایک فرد تھے۔ انہوں نے پہلی بار حضور علیہ السلام کو اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ مصروف نماز دیکھا تو حیرت سے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ سوال بتا رہا ہے کہ بعثت کے بعد یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حضور علیہ السلام سے پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے نہ تو ان کی آپس میں ملاقات ہوئی تھی اور نہ حضور علیہ السلام کو انہیں دعوت اسلام دینے کا موقعہ ملا تھا۔ مستشرقین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک ہی گھر میں رہنے والوں کی آپس میں ملاقات میں کتنا وقفہ درکار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ دعوت اسلامی کے پہلے دن کا ہے۔ جب حضور علیہ السلام پہلے ہی دن سے لات وعزیٰ کا انکار کرنے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی دعوت دے رہے تھے تو مستشرقین کس منہ سے کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ابتدائی تین سالوں میں بتوں کے خلاف کچھ نہیں کہا۔

بعض مستشرقین مسلمانوں کی تاریخ مرتب کرتے وقت صرف قرآنی بیان پر اعتماد کرتے ہیں۔ اگر وہ قرآن حکیم پر ذرا غور کرنے کی زحمت گوارا کریں تو انہیں پتہ چلے کہ قرآن حکیم کی جو پہلی آیت حضور علیہ السلام کو رسالت کی ادائیگی کا حکم دے رہی ہے، اس میں بتوں کی مخالفت کا حکم موجود ہے۔ حضور علیہ السلام پر سورہ اقراء کی ابتدائی چند آیتوں کے بعد جو آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں وہ سورہ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں۔ بعض علماء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ سورہ مدثر کی ان آیات ہی سے نزول وحی کا آغاز ہوا تھا۔ وہ آیات کریمہ ملاحظہ فرمایئے:

يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۙ(1)

1۔ سورۃ المدثر: 5-1

"اے چادر لپیٹنے والے اٹھئے اور (لوگوں کو) ڈرایئے اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے اور اپنے لباس کو پاک رکھئے اور بتوں سے (حسب سابق) دور رہئے۔"

یہاں قرآن حکیم واضح الفاظ میں حضور ﷺ کو حکم دے رہا ہے: "وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" علمائے لغت "الرجز" کا معنی بت قرار دیتے ہیں۔ ابو العالیہ، ربیع اور کسائی کہتے ہیں:

اَلرُّجْزُ بِالضَّمِ الصَّنَمُ وَبِالْكَسْرِ اَلنَّجَاسَةُ وَالْمَعْصِيَةُ (1)

"یعنی "رُجز" بت کو کہتے ہیں اور "رِجز" پلیدی اور گناہ کو کہتے ہیں۔"

کسائی کہتے ہیں:

"بِالضَّمِ اَلْوَثَنُ وَبِالْكَسْرِ اَلْعَذَابُ" (2) یعنی "رُجز" کا معنی بت اور "رِجز" کا معنی عذاب ہے۔

جب حضور ﷺ پر نازل ہونے والی ابتدائی آیات میں ہی بتوں کی مخالفت کا حکم موجود ہے تو یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ حضور ﷺ نے ابتدائی تین سالوں میں بتوں کے خلاف کچھ نہیں کہا؟

قرآن حکیم میں جہاں حضور ﷺ کو، اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرانے کا حکم ملا، وہاں بھی بتوں سے دور رہنے کا حکم ہے اور جہاں آپ کو اعلانیہ اپنی دعوت کو عام کرنے کا حکم ملا وہاں بھی شرک کی نفی موجود ہے۔ آپ نے اپنی دعوت کے ہر مرحلے پر بتوں کی مخالفت کی ہے۔ یہ حقیقت تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں آپ کو یہ حکم دیا گیا۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (3)

"ڈرایا کریں اپنے قریبی رشتہ داروں کو۔"

وہاں اس آیت کریمہ سے پہلی آیت میں یہ حکم بھی موجود ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ

"پس نہ پکارا کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو ورنہ تو ہو جائے گا ان

1۔ پیر محمد کرم شاہ، "ضیاء القرآن"، (ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور۔ 1400ھ)، جلد 5، صفحہ 417

2۔ ایضاً

3۔ سورۃ الشعراء: 214

لوگوں میں سے جنہیں عذاب دیا گیا ہے۔"

جب آپ کو اعلانیہ تبلیغ کا حکم ملا تو ارشاد ہوا

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (1)

"اعلان کر دیجئے اس کا جس کا آپ کو حکم دیا گیا اور منہ پھیر لیجئے مشرکوں سے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو تبلیغ کے ہر مرحلے پر شرک کی مخالفت اور توحید کا پرچار کرنے کا حکم دیا۔ حضور ﷺ نے اپنے پروردگار کے ہر حکم کی تعمیل کی اور اپنی دعوت کے ہر مرحلے پر توحید کے اثبات اور شرک کی نفی پر زور دیا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے توحید کا نعرہ لگا کر اپنے ایمان کا اظہار کیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے جب حضور ﷺ نے اپنی دعوت پیش کی تو واضح الفاظ میں فرمایا کہ میں تمہیں اس خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں جو وحدہ لاشریک ہے اور ساتھ ہی تمہیں لات اور عزیٰ کی جھوٹی خدائی کا انکار کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

حضور ﷺ کو جب اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرانے کا حکم ملا تو سب سے پہلے مرحلے پر آپ نے خاندان عبدالمطلب کے لوگوں کو جمع کیا۔ اس اجتماع میں خاندان عبدالمطلب کے علاوہ اولاد عبد مناف کے چند لوگ بھی حاضر تھے۔ اس اجتماع میں حضور ﷺ نے جو خطاب فرمایا، اس کے الفاظ یہ تھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَحْمَدُهٗ وَ اَسْتَعِيْنُهٗ وَ اُؤْمِنُ بِهٖ وَاَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَاَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، ثُمَّ قَالَ اِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ اَهْلَهٗ وَاللّٰهِ لَوْ كَذَبْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَا كَذَبْتُكُمْ وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ مَا غَرَرْتُكُمْ وَاللّٰهِ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اِنِّيْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَاِلَى النَّاسِ كَافَّةً وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ وَلَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ

1۔ سورۃ الحجر 94

سُوْٓءًا وَاِنَّهَا لِلْجَنَّةِ اَبَدًا اَوِالنَّارِ اَبَدًا وَاللّٰهِ يَا بَنِىْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ مَآ اَعْلَمُ شَابًّا جَآءَ قَوْمَهٗ بِاَفْضَلَ مِمَّا جِئْتُكُمْ بِهٖ اِنِّىْ قَدْ جِئْتُكُم بِاَمْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (1)

"سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں، اس سے مدد طلب کرتا ہوں، اس پر ایمان لایا ہوں اور اسی پر توکل کرتا ہوں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے جو یکتا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ پھر فرمایا: قافلہ کا پیشرو اپنے قافلہ والوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔ بفرض محال اگر میں دوسرے لوگوں سے جھوٹ بولوں تو بخدا تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بفرض محال، اگر میں ساری دنیا کے ساتھ دھوکا کروں تو تم سے دھوکا نہیں کر سکتا۔ اس ذات کی قسم جس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں، میں اللہ کا رسول ہوں۔ تمہاری طرف بالخصوص اور پوری انسانیت کی طرف بالعموم۔ بخدا تمہیں موت اس طرح آئے گی جس طرح تمہیں نیند آتی ہے اور قبروں سے زندہ کر کے یوں اٹھائے جاؤ گے جیسے تم خواب سے بیدار ہوتے ہو۔ اور جو عمل تم کرتے ہو ان کا تم سے محاسبہ ہو گا۔ تمہارے اچھے اعمال کی اچھی جزا اور برے کاموں کی بری جزا تمہیں دی جائے گی۔ ٹھکانا یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔ بخدا! اے فرزندان عبد المطلب! میں کسی ایسے نوجوان کو نہیں جانتا جو اس چیز سے بہتر چیز اپنی قوم کے پاس لے کر آیا ہو جو میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا و آخرت کی فوز و فلاح لے کر آیا ہوں۔"

قارئین کرام اس خطاب کو غور سے دوبارہ پڑھیں۔ حضور ﷺ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ پھر اسی کی ذات پر اپنے ایمان کا ذکر فرماتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ میں اسی کی ذات پر توکل کرتا ہوں۔ اس کے بعد گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ توحید کے اس واضح اعلان

1۔ ضیاء النبی، جلد 2، صفحہ 69-268، بحوالہ "السیرۃ الحلبیہ"

کے بعد آپ اپنے اہل خاندان سے گفتگو فرماتے ہیں۔ کیا حضور علیہ السلام کی یہ باتیں سننے کے بعد بھی کسی کے دل میں یہ شک باقی رہ جاتا ہے کہ آپ جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں وہ توحید کے سوا کچھ نہیں؟

اپنی دعوت کے اگلے مرحلے میں حضور علیہ السلام نے قریش کی تمام شاخوں کو دعوت دی۔ آپ کوہ صفا پر تشریف لے گئے اور مکہ کے تمام لوگوں کو بلایا۔ جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا:

يَا بَنِيْ كَعْبِ بْنِ لُوَيٍّ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ مُرَّةَ بْنِ كَعْبٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَابَنِيْ هَاشِمٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ عَبْدِ شَمْسٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ عَبْدِ مَنَافٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ زُهْرَةَ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا فَاطِمَةُ اَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ يَا صَفِيَّةُ عَمَّةُ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللهِ شَيْئًا اِلَّا اَنْ تَقُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (1)

"اے کعب بن لوی کے بیٹو! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔ اے مرہ بن کعب کے فرزندو! آتش جہنم سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے بنی عبد مناف آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے بنو زہرہ! آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے بنو عبد المطلب! آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اے فاطمہ! آتش جہنم سے اپنے آپ کو بچا۔ اے صفیہ، محمد (علیہ السلام کی پھوپھی) آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ، کہ میں اللہ تعالیٰ سے تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، مگر یہ کہ تم کہو: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

خاندان قریش کی تمام شاخوں کے سامنے حضور علیہ السلام نے جو خطاب فرمایا اس میں دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے ہر قبیلے کا علیحدہ علیحدہ نام لے کر فرمایا کہ اپنے آپ کو

1۔ ضیاء النبی، جلد 2، صفحہ 271، بحوالہ "السیرۃ الحلبیہ"

آگ کے عذاب سے بچاؤ اور دوسری چیز اس خطاب میں یہ ہے کہ آپ نے ان سب کو واضح الفاظ میں بتایا کہ آگ سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ تم کلمہ توحید پڑھ لو۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ابتدا میں بتوں کی مخالفت نہیں کی تھی۔ کیا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا نعرہ ان تین سو ساٹھ بتوں کی خدائی کا انکار نہ تھا جو مکہ والوں نے خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے؟ مکہ والوں نے جب حضور ﷺ کی زبان پاک سے یہ نعرہ سنا ہو گا تو کیا اس نعرے میں انہیں اپنے بتوں کی خدائی کا انکار نظر نہ آیا ہو گا؟

حق یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے فریضہ نبوت و رسالت کی انجام دہی کا آغاز ہی بت پرستی کی مخالفت اور توحید کے اعلان سے کیا تھا۔ یہ بات مکہ والوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ حضور ﷺ کے عقائد سے واقف تھے۔ ابو لہب نے اس محفل میں بھی حضور ﷺ کی مخالفت کی تھی جس میں صرف خاندان عبد المطلب کو جمع کیا گیا تھا۔ ابو لہب کی مخالفت کی وجہ یہی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ حضور ﷺ اپنے رشتہ داروں کو جو دعوت دینا چاہتے ہیں وہ دعوت توحید کے عقیدے پر مشتمل ہے اور بت پرستی کا قلع قمع کرنا اس دعوت کا بنیادی مقصد ہے۔

قریش کے سر بر آوردہ لوگ حضور ﷺ کے چچا کے پاس جاتے اور آپ کے خلاف ان سے جو شکایات کرتے، ان میں یہ شکایت سر فہرست ہوتی کہ آپ کا بھتیجا ہمارے خداؤں (بتوں) کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے مذہب کے عیب نکالتا ہے اور ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتا ہے۔

کفار مکہ حضور ﷺ کے تمام عقائد سے آگاہ تھے۔ وہ آپ کی مخالفت بھی کرتے تھے، لیکن ابتداء میں ان کی مخالفت میں شدت اس لئے نہ تھی کہ وہ آپ کی دعوت کی کامیابی کو خارج از امکان سمجھتے تھے اور اس نئے دین کو اپنی دینی، فکری اور سماجی قدروں کے لئے کسی قسم کا خطرہ نہیں سمجھتے تھے۔ جب انہیں اس نئے دین سے خطرہ محسوس ہوا تو پہلے انہوں نے حضور ﷺ کو مختلف حیلوں بہانوں سے روکنے کی کوشش کی۔ جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو آپ کے پیروکاروں کے خلاف تشدد آمیز کاروائیاں شروع کر دیں۔ گزشتہ صفحات میں جو حقائق بیان کئے گئے ہیں، ان کے پیش نظر مستشرقین کا یہ شوشہ بالکل

بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے ابتداء میں بتوں کی مخالفت نہیں کی۔

مستشرقین نے اسلامی تعلیمات کو شرک سے آلودہ ثابت کرنے کے لئے دوسرا شوشہ یہ چھوڑا ہے کہ قرآن حکیم بتوں کے وجود کا انکار نہیں کرتا، صرف ان کی طاقت کا انکار کرتا ہے۔ اگر علم اور تحقیق اسی چیز کا نام ہے تو پھر انسانیت کا خدا ہی حافظ ہے۔

انسان ہر دور میں مختلف مظاہر فطرت کی پوجا کرتا رہا ہے۔ شمس و قمر کو انسان نے اپنا معبود بنایا۔ آگ کے سامنے وہ سربسجود ہوا۔ کئی انسانوں نے خدائی کا دعویٰ کیا اور دوسرے متعدد انسانوں نے ان کے اس دعوے کو تسلیم کیا۔ مکہ والوں نے تین سو ساٹھ بت خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔ گردونواح کی بستیوں کے اپنے علیحدہ بت خانے تھے اور ان میں انہوں نے کئی کئی بت رکھے ہوئے تھے۔ عیسائی اہل کتاب ہو کر بھی تثلیث کے پیروکار تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ ان حالات میں قرآن حکیم یہ کیسے کہہ دیتا کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں جس کی عبادت کی جاتی ہو۔ قرآن حکیم کا مقصد توحید کا اثبات اور شرک کی نفی تھا۔ توحید کا مطلب یہ نہیں کہ یہ دعویٰ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز کی عبادت نہیں کی جاتی۔ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ ہوئی ہوتی تو انبیائے کرام کو توحید ثابت کرنے کیلئے کوششیں نہ کرنا پڑتیں۔ اسلام کی نظر میں توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا خالق، مالک اور رازق ہے۔ زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ عزت دینے والا بھی وہی ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت کے گڑھے میں بھی وہی پھینکتا ہے۔ کائنات کا نظام اسی کی مرضی کے مطابق چل رہا ہے۔ اس لئے صرف وہی اس قابل ہے کہ اس کو خدا سمجھا جائے، اس کی عبادت کی جائے اور اسی پر توکل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو خدا سمجھنا، اسے موت و حیات کا مالک سمجھنا اور اس کی عبادت کرنا شرک ہے۔

اسلام دنیا میں لوگوں کو یہ بتانے نہیں آیا تھا کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی عبادت کی جاتی ہو، کیونکہ جب اسلام آیا تھا تو انسانیت شرک کی دلدل میں سر سے لے کر پاؤں تک ڈوبی ہوئی تھی۔ کہیں شمس و قمر کو معبود سمجھا جا رہا تھا اور کہیں آگ سے لپکتے ہوئے شعلوں کے سامنے انسانی جبینیں جھک رہی تھیں۔ کہیں اپنے ہاتھوں سے پتھر تراشے جاتے تھے اور پھر ان تراشیدہ پتھروں کے سامنے سجدے کئے جاتے

تھے۔ اسلام انسانیت کو اس غلاظت سے نکالنے کے لئے آیا تھا۔ جو لوگ مختلف چیزوں کے سامنے سر بسجود ہو رہے تھے، اسلام ان کو یہ بتانے آیا تھا کہ تم جن چیزوں کو خدا سمجھ رہے ہو، جن کے سامنے سر بسجود ہو رہے ہو، ان کے ہاتھوں میں نہ تو تمہاری زندگی ہے اور نہ موت۔ نہ تمہیں یہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے، تو یہ اس کو اس حرکت سے روک نہیں سکتے۔ یہ چیزیں جو اپنے نفع اور نقصان پر قادر نہیں، وہ تمہیں کیا نفع یا نقصان پہنچائیں گی۔ یہ چیزیں خدائی کے قابل نہیں کیونکہ یہ بے کس اور بے بس ہیں۔ خدا تو وہ ہے جو ہر طاقت کا مالک ہے اور علی کل شی قدیر ہے۔

اسی چیز کا نام توحید کا اثبات اور شرک کی نفی ہے، اور یہ کام اسلام نے اس خوب صورتی سے کیا کہ کوئی دوسرا دین اس میں اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مستشرقین کا یہ کہنا کہ اسلام بتوں کے وجود کا انکار نہیں کرتا، صرف ان کی طاقت کا انکار کرتا ہے، اور پھر اس کے ذریعے اسلام کے دامن پر شرک کا الزام لگانا ایک بھونڈی حرکت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر اسلام اسی انداز میں توحید کو ثابت کرتا، جس انداز میں مستشرقین چاہتے ہیں تو وہ حقیقت کے خلاف ہوتا۔ جب دنیا میں ہر طرف بت ہی بت تھے اور اسلام ان بتوں کو توڑنے ہی کے لئے آیا تھا تو اسلام یہ کیسے کہ دیتا کہ بت موجود ہی نہیں ہیں۔ اسلام جو دین حق ہے اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی بات کرے جو خلاف واقعہ ہو۔

تیسرا شوشہ مستشرقین نے یہ چھوڑا ہے کہ قرآن حکیم نے بعض بتوں کی تو مخالفت کی ہے لیکن بعض دوسرے بتوں کے متعلق اسلام نے مصالحت کا رویہ اپنایا ہے۔

مستشرقین کا کمال یہ ہے کہ جب وہ اسلام کے خلاف کوئی شوشہ چھوڑتے ہیں تو یہ سوچ انہیں پریشان نہیں کرتی کہ جو بے بنیاد شوشہ وہ چھوڑ رہے ہیں، اسے تسلیم کون کرے گا۔ اس سے بڑی انہونی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس دین نے بت پرستی کی مخالفت کر کے ساری دنیا کی مخالفت مول لی، خود اس دین پر بتوں سے مصالحت کا الزام لگایا جائے۔ انسان حیران ہوتا ہے کہ اس قسم کی بات کہنے کے لئے مستشرقین کس چیز کو بطور دلیل پیش کریں گے۔ لیکن مستشرقین کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں اور اس فن میں وہ خوب ماہر ہیں۔ اپنے اس مفروضے پر وہ قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں:

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰیۙ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی (1)

"(اے کفار!) کبھی تم نے غور کیا لات و عزی کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے۔"

مستشرقین کہتے ہیں کہ سورہ نجم کی ان آیات اور ان سے بعد والی آیات میں نام لے کر تین بتوں پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہ تمام بت ایسے ہیں جن میں سے کوئی بھی مکہ والوں کا بت نہ تھا۔ ان بتوں میں سے ایک طائف میں، ایک وادی نخلہ میں اور ایک بحیرہ احمر کے کنارے واقع تھا۔ قرآن حکیم نے ان بتوں کی مخالفت تو کی جو مکہ کے علاوہ ارد گرد کی بستیوں میں تھے لیکن قرآن نے کسی ایسے بت کی مخالفت نہیں کی جو مکہ میں تھا۔ مستشرقین اس بے بنیاد الزام کی دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ حضور ﷺ کی مخالفت انہی لوگوں نے کی جو مکہ کے باشندے تھے لیکن ان کی جائدادیں طائف میں تھیں۔ مستشرقین ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مکہ کے بتوں کی مخالفت اس خوف سے نہیں کی کہ کہیں مکہ کے سردار آپ کے مخالف نہ ہو جائیں۔

اگر مکہ کے بتوں کے ساتھ مصالحت کا یہی مقصد تھا، تو یہ مقصد تو فوت ہو گیا تھا کیونکہ مکہ کے بڑے بڑے سرداروں کی جائدادیں طائف میں تھیں اور طائف کے بتوں کی مخالفت کر کے آپ نے ان سرداروں کو اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ ان کے مخالف ہو جانے کے بعد پھر کیا وجہ تھی کہ آپ مکہ کے بتوں کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرتے؟

حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کی دعوت کے ابتدائی مخاطب مکہ والے تھے۔ اور مکہ والے ان بتوں کی پوجا کرتے تھے جو مکہ میں تھے۔ آپ کا چچا ابولہب آپ کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ وہ اس لئے آپ کا مخالف نہیں ہوا تھا کہ آپ طائف کے بتوں کو برا بھلا کہتے تھے بلکہ وہ تو آپ کا مخالف اس لئے ہوا تھا کہ آپ ان بتوں کے خلاف آواز اٹھاتے تھے جن کی پوجا وہ خود کرتا تھا۔ قرآن حکیم نے نام لے کر بتوں کی مخالفت اس لئے نہیں کی کہ مکہ میں کوئی ایک بت تو تھا نہیں کہ اس کا نام لیا جاتا۔ تین سو ساٹھ بت تو صرف خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔ قرآن حکیم نے بتوں کی مخالفت کے لئے ایسا انداز اختیار کیا کہ تمام بتوں کی بے بسی کا بھی اظہار ہو جائے اور مشرکین نے ان بتوں کو جن صفات سے متصف کر رکھا

1۔ سورۃ نجم 20-19

تھااوران کے متعلق جو عقائد ان کے دلوں میں جاگزین تھے ان کی بھی تردید ہو جائے۔

حضور ﷺ نے بتوں پر اس شدت سے حملے کئے تھے کہ بتوں کے پجاری چیخ اٹھے تھے۔ انہیں اپنے خداؤں کی خدائی خطرے میں نظر آنے لگی تھی اور وہ ان کی خدائی کی حفاظت کے لئے تدبیریں سوچنے لگے تھے۔ اپنے خداؤں کے خلاف حضور ﷺ کی طرف سے تابڑ توڑ حملوں کو دیکھ کر ان کا جو ردعمل تھا، اس کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (1)

"کیا بنادیا ہے اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا، بیشک یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔ اور تیزی سے چل دیئے قوم کے سردار (رسول کے پاس سے) اور (قوم سے کہا) یہاں سے نکلو اور جمے رہو اپنے بتوں پر۔ بے شک اس میں اس کا کوئی (ذاتی) مدعا ہے۔ ہم نے تو ایسی بات آخری ملت (نصرانیت) میں بھی نہیں سنی، یہ بالکل من گھڑت مذہب ہے۔"

پریشانی کے ان جذبات کا اظہار کفار مکہ کے سرداروں نے اس وقت کیا تھا جب حضور ﷺ کی دعوت پر مکہ کے کئی لوگ بتوں سے بیزار ہونے لگے تھے۔ حمزہ اور عمر (رضی اللہ عنہما) جیسے بہادر جو پورے مکہ کے لئے باعث فخر تھے، ان کے دلوں میں بتوں کی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ مکہ کی سرزمین پر توحید کا پودا تناور درخت بنتا جارہا تھا اور بت پرستی کے محل کی بنیادیں کمزور ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ مکہ کے سرداروں کو اپنا مذہب اور اپنے بتوں کی خدائی، سب کچھ خطرے میں نظر آرہا تھا۔ وہ حیران تھے کہ توحید کا دعویٰ تو یہودیوں اور عیسائیوں نے بھی کیا تھا لیکن ان کے بتوں کی جو درگت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء نے بنائی تھی، وہ نہ عیسائیت نے بنائی تھی اور نہ ہی یہودیت نے۔

1۔ سورۂ ص: 7-5

مستشرقین قرآن حکیم کے اس جملے پر ذرا غور فرمائیں۔ مشرکین مکہ ببانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ ان کے بتوں پر جو حملے اسلام نے کئے ہیں، ایسے حملے تو ان پر عیسائیت نے بھی نہیں کئے۔ کیا مشرکین مکہ کا یہ واویلا اس بات کی دلیل نہیں کہ حضور ﷺ نے ان کے بتوں کی حقیقت کو ایسے واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا تھا کہ بتوں کے پجاریوں کو اپنے خداؤں کی خدائی خطرے میں نظر آنے لگی تھی؟

قرآن حکیم کے مخاطب پتھر کی بے جان مورتیاں نہیں بلکہ وہ خود فریب انسان ہیں جنہوں نے اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود پتھروں کو اپنا خدا بنا رکھا تھا۔ قرآن حکیم مشرکین کو ان کے اس رویے پر ان الفاظ میں تنبیہ کرتا ہے۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (1)

"خبردار! صرف اللہ کے لئے ہے دین خالص اور جنہوں نے بنالئے اس کے سوا اور والی (اور کہتے ہیں) ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان جن باتوں میں یہ اختلاف کیا کرتے ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس کو جو جھوٹا (اور) بڑا ناشکرا ہو۔"

اس آیت کریمہ میں قرآن حکیم مشرکین کو اس بنا پر جھوٹا اور کافر قرار دے رہا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری چیزوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا ایک ایک ورق شاہد ہے کہ آپ بت شکن بن کر تشریف لائے تھے۔ سارا مکہ آپ کا مخالف اس لئے تھا کہ آپ ان کے بتوں کے مخالف تھے۔ حضور ﷺ کے چچا کے پاس قریش مکہ کے جو وفود کئی بار گئے، ان کا سب سے بڑا مطالبہ یہی تھا کہ آپ ان کے بتوں کو برا بھلا کہنے سے باز آجائیں۔ قریش مکہ نے حضور ﷺ کو دولت اور حکومت کی پیشکش کی تھی اور اس کے بدلے میں مطالبہ ایک ہی کیا تھا کہ آپ ان کے بتوں کو کچھ نہ کہیں۔ کیا قریش

1۔ سورۃ الزمر 3

مکہ یہ سب باتیں ان بتوں کی وجہ سے کر رہے تھے جن کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہ تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے صرف لات، عزیٰ اور منات ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ خدا کے سوا جس کسی نے بھی کسی مخلوق کی عبادت کی، حضور ﷺ کا پیغام اس کے خلاف تھا۔ اس لئے مستشرقین کا یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے کہ قرآن حکیم نے بعض بتوں کی مخالفت کی اور بعض کے متعلق مصالحانہ رویہ اپنایا۔

اسلامی عقائد میں شرک کی آمیزش کو ثابت کرنے کے لئے مستشرقین نے ایک اور مفروضہ یہ پیش کیا ہے کہ مسلمان بتوں کو خدا تو نہیں سمجھتے، البتہ وہ انہیں فرشتے سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ بت جو فرشتے ہیں، یہ خدا کے حضور شفاعت کریں گے۔

یہ مفروضہ گھڑتے ہوئے مستشرقین نے انتہائی ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ یہاں انہوں نے بتوں اور فرشتوں کو گڈمڈ کر کے، ان کے بارے میں مسلمانوں کے عقائد سے غلط نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے پہلے گزارش کی ہے کہ قرآن حکیم کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو خدا کے سوا دوسری چیزوں کی پوجا کرتے ہیں، نہ کہ وہ چیزیں جن کی عبادت کی جاتی ہے۔ حضرت انسان نے کسی ایک چیز کو معبود نہیں بنایا۔ اس نے کبھی مختلف مظاہر فطرت کے سامنے سجدہ کیا۔ کبھی اپنے جیسے انسانوں کی بندگی کا طوق اپنے گلے میں ڈالا۔ کبھی خدا کے مقرب بندوں، نبیوں اور رسولوں کو خدا سمجھنے کی حماقت کی اور کبھی فرشتوں کے سر پر خدائی کا تاج رکھا۔

قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ تم خدا کے سوا جن چیزوں کی عبادت کرتے ہو، ان میں سے کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں۔ یہ سب چیزیں مخلوق ہیں۔ یہ خود محتاج ہیں اور جو محتاج ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ مخلوق کی عبادت کو قرآن حکیم نے کفر اور گمراہی قرار دیا، خواہ عبادت کسی پتھر کی کی جا رہی ہو، کسی نبی یا رسول کی یا کسی فرشتے کی۔

اسلام دین عدل ہے۔ یہ جرم کی سزا اسی کو دیتا ہے جس سے جرم سرزد ہوتا ہے، نہ کہ کسی دوسرے کو۔ عالم عیسائیت سینٹ پال کی پیروی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا کہتا ہے اور ان کی عبادت کرتا ہے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہمیشہ صرف ایک خدا کی بندگی کی اور اپنے پیروکاروں کو بھی صرف ایک خدا کی بندگی کا حکم دیا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھے گا کہ یہ عیسائی کہلانے والے لوگ

آپ کی پوجا کیا کرتے تھے، کیا انہیں ایسا کرنے کا حکم آپ نے دیا تھا؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بارگاہ خداوندی میں عرض کریں گے کہ پروردگار عالم! میری یہ مجال نہ تھی کہ میں ان کو کوئی ایسا کام کرنے کا حکم دیتا جس کا تو نے مجھے حکم نہ دیا تھا۔ میں نے تو ان سے بار بار کہا تھا کہ اس اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ پروردگار عالم! تو خود جانتا ہے کہ میں نے ان کو اپنی عبادت کا حکم نہیں دیا کیونکہ تو تو میرے دل کی گہرائیوں میں جنم لینے والے خیالات کو بھی جانتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا سمجھنے اور ان کی عبادت کرنے کے جرم کی سزا ان لوگوں کو ملے گی جنہوں نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے بری الذمہ ہیں۔

جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کیا کرتے ہیں، اسی طرح کچھ مشرک فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور ان کی پوجا کیا کرتے تھے۔ قرآن حکیم نے ان کے اس عقیدہ اور عمل کی تردید کر دی اور واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں نہیں اور نہ ہی وہ خدا ہیں، وہ تو خدا کے مقرب بندے ہیں اور اس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے والے ہیں۔ کافر چونکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے اس لئے قرآن حکیم نے ان کے اس عقیدے کا الزامی جواب دیا اور ان سے کہا کہ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ خدا نے تمہیں تو بیٹے دیئے ہیں اور اپنے لئے اس نے بیٹیاں پسند کی ہیں۔

قرآن حکیم نے ہر چیز کی اصلیت واضح کر دی ہے۔ اس نے بتا دیا ہے کہ شمس و قمر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں تو ضرور ہیں لیکن یہ مخلوق ہیں، خدا نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن بندوں کے سروں پر نبوت و رسالت کا تاج رکھا ہے، وہ اس کے مقرب بندے اور انسانوں کے مقتدا تو ہیں لیکن وہ نہ تو خدا ہیں اور نہ ہی خدا کے بیٹے ہیں۔ فرشتے خدا کے فرماں بردار بندے اور ہمہ وقت اس کی حمد و ثنا میں مصروف رہنے والے ہیں، وہ بھی خدائی کے مستحق نہیں۔ خدا صرف ایک ہے جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ قرآن حکیم نے ان حقائق کو جس وضاحت سے بیان کیا ہے، اس کی چند مثالیں ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ

وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (1)

"نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لئے کہ (جب) عطا فرما دے اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور حکومت اور نبوت تو پھر وہ کہنے لگے لوگوں سے کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر (وہ تو یہ کہے گا کہ) بن جاؤ اللہ والے، اس لئے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے رہتے تھے کتاب کی اور بوجہ اس کے کہ تم خود بھی اسے پڑھتے تھے۔ اور وہ (مقبول بندہ) نہیں حکم دے گا تمہیں اس بات کا کہ بنالو فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا (تم خود سوچو) کیا وہ حکم دے سکتا ہے تمہیں کفر کرنے کا، بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔"

یہ آیات کریمہ وضاحت کر رہی ہیں کہ جو لوگ انبیاء و رسل یا فرشتوں کو خدا سمجھتے ہیں، یہ ان کا اپنا فعل ہے، کسی نبی یا رسول نے انہیں اس کی دعوت نہیں دی۔ کیونکہ خدا کے کسی بندے سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر پر نبوت کا تاج سجائے اور وہ لوگوں کو اپنی یا فرشتوں کی عبادت کی دعوت دینے لگے۔ قرآن حکیم نے تو واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور فرشتے جن کو گمراہ انسانوں نے خدا بنا رکھا ہے، وہ تو اپنے بندہ ہونے پر نازاں ہیں۔ قرآن حکیم فرماتا ہے:

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (2)

"ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ہی

1۔ سورۃ آل عمران: 80-79

2۔ سورۃ النساء: 172

مقرب فرشتے اس کو (عار سمجھیں گے) اور جسے عار ہو اس کی بندگی سے
اور وہ تکبر کرے تو اللہ جلدی جمع کرے گا ان سب کو اپنے ہاں۔"

مشرکین فرشتوں کو مونث مخلوق قرار دیتے تھے۔ قرآن حکیم نے ان کے اس مفروضے کی تردید مندرجہ ذیل الفاظ سے کر دی، فرمایا:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا
اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ (1)

"اور انہوں نے ٹھہرا لیا فرشتوں کو جو (خداوند) رحمٰن کے بندے ہیں
عورتیں۔ کیا یہ موجود تھے ان کی پیدائش کے وقت؟ لکھ لی جائے گی ان
کی گواہی اور ان سے باز پرس ہوگی۔"

مشرک فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ قرآن حکیم نے یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی گمراہی کا بھی پردہ چاک کر دیا اور جن ہستیوں کے متعلق انہوں نے غلط عقائد گھڑ رکھے تھے، ان کی اصل حیثیت کو بھی واضح کر دیا۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ
مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ○
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا
لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (2)

"اور وہ کہتے ہیں بنا لیا ہے رحمٰن نے (اپنے لئے) بیٹا۔ سبحان اللہ! (یہ
کیونکر ہو سکتا ہے) بلکہ وہ تو اس کے معزز بندے ہیں، نہیں سبقت
کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اس کے حکم پر کاربند ہیں۔ اللہ
تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے گزر چکا
ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کے لئے جسے وہ پسند فرمائے
اور وہ (اس کی بے نیازی کے باعث) اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں۔"

1۔ سورۃ الزخرف 19

2۔ سورۃ الانبیاء 28-26

یہ آیات کریمہ بتارہی ہیں کہ خدا کے مقربین کو خدا کی اولاد قرار دینے والے، کفر و ضلالت کی ظلمتوں میں بھٹک رہے ہیں۔ وہ جن کو خدا کی اولاد قرار دیتے ہیں وہ تو خدا کے مقرب بندے ہیں اور اس کے حکم سے سر مو انحراف نہیں کرتے۔ وہ شفاعت بھی صرف اسی کی کریں گے جس کے لئے شفاعت کرنے کا انہیں اذن ہو گا۔

قرآن حکیم نے مشرکین کی گمراہی کا اعلان کیا۔ خدا کے سوا وہ جس چیز کی بھی عبادت کرتے تھے، انہیں بتایا کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت کی مستحق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کی خدائی کے عقیدے کی تردید کی اور ان چیزوں کی جو اصل حقیقت تھی اسے واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا۔ انبیاء و رسل کے متعلق بتایا کہ وہ میرے مقرب بندے ہیں۔ میری بارگاہ میں ان کو بڑا بلند مقام حاصل ہے۔ میں نے ان پر اپنے فضل و کرم کا مینہ برسایا ہے۔ ان کا مقام ساری مخلوق سے بلند ہے۔ میں نے انہیں ساری نسل آدم کے لئے راہنما بنایا ہے لیکن ان تمام عظمتوں، رفعتوں اور بلندیوں کے باوجود وہ خدا نہیں بلکہ میرے بندے ہیں۔ میری بندگی نے ہی ان کو یہ عظمتیں عطا کی ہیں اور میری بندگی ہی ان کے لئے باعث افتخار ہے۔ میرے ساتھ ان کا تعلق عبد اور معبود، خالق اور مخلوق کا ہے۔

فرشتوں کے متعلق اس نے اعلان کیا کہ یہ میرے مقرب بندے ہیں۔ ہمہ وقت میری حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں۔ وہی کرتے ہیں جس کا انہیں میری بارگاہ سے حکم ملتا ہے۔ یہ نہ میرے بیٹے ہیں اور نہ ہی بیٹیاں اور نہ ہی یہ عبادت کے لائق ہیں۔ باقی ساری مخلوق کی طرح یہ بھی میری رحمتوں کے محتاج ہیں اور ان کو بھی صرف بندگی ہی زیبا ہے۔

شمس و قمر کے متعلق بتایا کہ یہ میری قدرت کی نشانیاں ہیں۔ ان کو میں نے ہی پیدا کیا ہے اور میرے ہی حکم سے یہ اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ یہ انسانوں کے معبود نہیں بلکہ ان کو تو میں نے اشرف المخلوقات کی خدمت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ بتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اعلان فرمادیا کہ یہ بیچارے پتھر جن میں نہ شعور ہے نہ عقل، نہ یہ حرکت کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے اختیار میں کچھ ہے، گمراہ انسانوں نے ان کو گھڑ کر اور ان کو مختلف شکلیں دے کر، ان کو مختلف نام دے رکھے ہیں، ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ تمام وضاحتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک کی چار آیتوں کی ایک مختصر سی سورۃ میں توحید کا وہ مفہوم بتادیا جس نے شرک کی ہر صورت اور ہر

قسم کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں۔ فرمایا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۝ لَمْ يَلِدْ۝ وَلَمْ يُوْلَدْ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (1)

"(اے حبیب!) فرما دیجئے: وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ صمد ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔"

اس سورۂ پاک نے توحید کو اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ شرک کسی رنگ میں بھی ہو وہ اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن مستشرقین اس سے مطمئن نظر نہیں آتے، وہ چاہتے ہیں کہ قرآن نے جہاں بتوں کی خدائی کا انکار کیا ہے وہاں یہ بھی کہتا کہ بت ہیں ہی نہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ قرآن حکیم نے جہاں مشرکین کے اس عقیدے کا انکار کیا ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، وہاں قرآن حکیم یہ بھی کہتا کہ جس طرح بت سوائے ناموں کے کچھ نہیں اسی طرح فرشتے بھی کچھ نہیں۔

مستشرقین قرآن حکیم سے جس قسم کے رویے کی توقع رکھتے ہیں وہ ممکن نہ تھا کیونکہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھتا ہے۔ اس نے بتوں کو ان کے مقام پر رکھا ہے، انبیاء و رسل کو ان کے اپنے مقام پر اور فرشتوں کو ان کے مقام پر۔

مستشرقین کی اکثریت کا مذہب، عیسائیت چونکہ ساری دنیا کے گناہ گاروں کا بوجھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سر پر ڈالتا ہے، جنہیں وہ خدا کا اکلوتا بیٹا سمجھتے ہیں، اس لئے وہ مشرکین کے شرک کا بوجھ بھی ان چیزوں پر ڈالنا چاہتے ہیں جن کو وہ خدا کا شریک بناتے ہیں۔ خواہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں، خواہ حضرت عزیر علیہ السلام ہوں، خواہ خدا کے مقرب فرشتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہستیاں مشرکین کے فعل سے بری الذمہ ہیں اور قیامت کے دن مشرکین سے کسی قسم کا ناطہ نہ ہونے کا اعلان کریں گی۔ اس طرح یہ ہستیاں جن کو مشرکین خدا کا شریک سمجھ کر پوجتے رہے، قیامت کے دن وہ ان کے لئے باعث حسرت ثابت ہوں گی۔

مستشرقین نے اسلام پر بت پرستی کی حوصلہ افزائی کرنے کا الزام یہ کہہ کر بھی لگایا کہ

1۔ سورۃ اخلاص

اسلام نے گو بت پرستی کو ختم کیا لیکن اس نے بت پرستی کی بہت سی رسموں کو قائم رکھا۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے زیادہ زور مناسک حج پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حج کی رسوم، خانہ کعبہ کا تقدس اور حجر اسود کا احترام مشرکین مکہ کی رگ رگ میں رچ بس چکے تھے۔ حضور ﷺ کو معلوم تھا کہ یہ رسمیں مشرکانہ ہیں۔ آپ نے ان کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن جب دیکھا کہ یہ رسمیں مکہ والوں کے ذہنوں میں یوں سما چکی ہیں کہ ان کو ختم کرنے کی کوشش کرنا، اسلام کے اصل مقاصد کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا تو آپ نے ایسی رسموں کی مخالفت چھوڑ دی۔ اور مصلحتاً ان رسموں کو باقی رکھا جن کو چھوڑنے کے لئے مکہ والے کسی قیمت پر تیار نہ تھے۔

مستشرقین کا یہ کہنا کہ حضور ﷺ نے کئی مشرکانہ رسوم کو باقی رکھا تھا اور ان رسوم کو باقی رکھنے کا سبب مصلحت اندیشی تھا، سفید جھوٹ ہے۔ حضور ﷺ نے نہ صرف شرک کو مٹایا تھا بلکہ ہر وہ چیز، ہر وہ رسم اور ہر وہ سماجی قدر جس کا شرک سے دور کا بھی واسطہ تھا، آپ نے اس کو ختم کر دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خانہ کعبہ سے مشرکین مکہ کو انتہائی عقیدت تھی اور حج کی رسمیں بھی ان کو بڑی مرغوب تھیں۔ لیکن وہ پتھر جنہیں حضور ﷺ نے ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا تھا، ان پتھروں سے ان کی عقیدت خانہ کعبہ سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ اگر حضور ﷺ مصلحت اندیشی سے کام لیتے تو بتوں کے خلاف ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہ لاتے۔

حضور ﷺ نے زمانہ جاہلیت کی رسموں اور معمولات میں سے صرف انہی چیزوں کو باقی رکھا جن کا شرک کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائے واحد کی عبادت کے لئے تعمیر کیا تھا۔ چشمہ زمزم فرزند خلیل اور ان کی عظیم والدہ کے ایثار کا انعام تھا۔ حج کے تمام مناسک کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوا تھا۔ انہیں تعمیر کعبہ کی سعادت حاصل ہونے کے بعد حکم ملا تھا کہ وہ لوگوں کو حج بیت اللہ کے لئے ندا دیں۔ حضور ﷺ نے مناسک حج کو قائم رکھ کے سنت ابراہیمی کو زندہ رکھا تھا۔ جو رسوم مشرکین نے خود گھڑ کے ان کو حج کا حصہ بنا دیا تھا ان تمام رسموں کو حضور ﷺ نے ختم کر دیا تھا۔

شرک کو ختم کرنے کے لئے خانہ کعبہ کو تین سو ساٹھ بتوں سے پاک کرنا ضروری تھا،

خود خانہ خدا کی عظمت کو جھٹلانا ضروری نہ تھا۔ طواف کعبہ خدا کے حکم سے کیا جاتا تھا، میدان عرفات میں وقوف شرک نہ تھا بلکہ خدائے واحد کی عبادت کا ایک حسین انداز تھا، میدان "منیٰ" میں قربانی سنت خلیل تھی اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی سنت ام اسماعیل تھی۔ حضور ان چیزوں کو مٹانے کے لئے تشریف نہیں لائے تھے بلکہ آپ ان کو زندہ کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

مستشرقین سمجھتے ہیں کہ شرک کے خاتمے اور توحید کے قیام کے لئے ضروری تھا کہ حضور ﷺ صحیح یا غلط میں تمیز کئے بغیر ہر اس چیز کو ختم کر دیتے جو مشرکین کے ہاں مروج تھی۔ یہ انداز اصلاح مستشرقین کے نزدیک صحیح ہو تو ہو، کوئی باشعور انسان اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ کفار مکہ بت پرست تھے لیکن وہ بہادر، سخی، مہمان نواز اور وعدے کے پکے بھی تھے۔ کیا مستشرقین اسلام سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ مشرکین مکہ کے مشرکانہ عقائد کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ان کی ان انسانی خوبیوں کو بھی خامیاں قرار دیتا اور اپنے پیروکاروں کو ان خوبیوں سے محروم رکھنے کی کوشش کرتا؟

اسلام کا اسلوب یہ نہیں ہے۔ اسلام اس لئے آیا تھا کہ برائی جہاں ہے، اس کو جڑوں سے اکھیڑ دے اور نیکی کا پودا جہاں نظر آئے، اس کی آبیاری کر کے اسے تناور درخت بنائے۔ اسلام نے اپنا یہ فریضہ نہایت حسن وخوبی سے انجام دیا ہے۔

مستشرقین نے تو اسلام کا شرک کے ساتھ تعلق ثابت کرنے کے لئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جنوں، فرشتوں اور شیطانوں کے وجود کے عقائد مشرکانہ تھے، اسلام نے ان کو قائم رکھا۔

مستشرقین یہ لکھتے وقت شاید یہ بھول گئے ہیں کہ جن عقائد کو وہ مشرکانہ عقائد قرار دے رہے ہیں وہ تو ان ادیان میں بھی موجود ہیں، جو ان کی نظروں میں ادیان توحید ہیں۔ فرشتوں اور شیطانوں کے وجود کا عقیدہ صرف مشرکین مکہ ہی کا عقیدہ نہ تھا بلکہ یہ عقیدہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں بھی موجود تھا۔ عہد نامہ جدید اور عہد نامہ قدیم میں بار بار ان چیزوں کا ذکر ہوا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ منٹگمری واٹ ایک طرف تو فرشتوں کے وجود کے عقیدے کو مشرکانہ عقیدہ کہتا ہے اور پھر خود لکھتا ہے کہ یہ عقیدہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں بھی موجود تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"The christians and Jews believed in the existence of a secondary and subordinate kind of supernatural being, angels". (1)

"یہودی اور عیسائی ایک ثانوی قسم کی مافوق الفطرت مخلوق، فرشتوں پر یقین رکھتے تھے۔"

جس طرح فرشتوں کے وجود کا عقیدہ مشرکانہ نہیں تھا، اسی طرح وہ عقائد، رسوم اور افعال جن کو اسلام نے قائم رکھا، وہ سب توحید کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، ان کا شرک سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور جس رسم یا عقیدے کا شرک سے دور کا بھی واسطہ تھا، اسلام نے اس کو جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین: 62

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے

اخلاق و کردار پر حملے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار پر حملے

حسن خلق کی دولت سے مزین انسان اس پھول کی مانند ہوتا ہے جو اپنے ماحول میں بھینی بھینی خوشبو بسا دیتا ہے۔ جو اس کے نزدیک آتا ہے فرحت و سرور محسوس کرتا ہے۔ دل اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ دکھوں کے مارے ہوئے اس کے سائے میں پناہ تلاش کرتے ہیں اور بے کسوں کو اس کے سہارے کی امید ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک بد اخلاق انسان اس خار دار جھاڑی کی مانند ہوتا ہے جو ہر اس شخص کے دامن کو تار تار کر دیتی ہے جو اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے شخص کے قریب رہنے والے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے۔

خوش خلقی اور بد خلقی ایسی صفات ہیں جو چھپی نہیں رہتیں۔ کسی انسان کی معیت میں رہنے والے لوگ خوب جانتے ہیں کہ وہ انسان ان دو قسم کی صفات میں سے کس قسم کی صفات کا مالک ہے۔ سچ کو جھوٹ سے، عدل کو ظلم سے، سخاوت کو کنجوسی سے، پاک دامنی کو عیاشی سے، ایفائے عہد کو عہد شکنی سے، وفا کو بے وفائی سے، رحم کو بے رحمی سے، جرات کو بزدلی سے اور راست روی کو منافقت سے ممتاز کرنے کے لئے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنے ساتھ والے کے متعلق جانتا ہے کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا، باوفا ہے یا بے وفا، بہادر ہے یا بزدل، راست باز ہے یا منافق، پاک دامن ہے یا عیاش۔

جس شخص کو اس کے ساتھ بسنے والے حسن اخلاق کا سرٹیفکیٹ دے دیں وہ خوش خلق قرار پاتا ہے اور جس کے متعلق اس کے نزدیک رہنے والوں کا فیصلہ یہ ہو کہ وہ حسن اخلاق کے زیور سے بے بہرہ ہے، وہ بد اخلاق قرار پاتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ جس انسان کو اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے، اس کے ہم قوم، ہم علاقہ اور ہم عصر لوگ تو حسن اخلاق کا مرقع قرار دیں لیکن جن لوگوں کا اس کے ساتھ نہ زمانی تعلق ہو اور نہ مکانی، وہ اس شخص کو اخلاق کے زیور سے عاری ثابت کرنے پر مصر ہوں۔

بدقسمتی سے یہ عجیب و غریب سانحہ حبیب خدا، سرور کائنات، شاہ عرب و عجم، پیکر حسن و رعنائی اور انسانیت کے لئے اخلاق حسنہ کے نمونہ کامل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ پیش آیا ہے۔ جو لوگ آپ کے کاشانہ اقدس میں آپ کی معیت میں رہتے تھے، آپ کے شب و روز، آپ کی نشست و برخاست، آپ کے قول و فعل اور آپ کے اخلاق و کردار کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے تھے، انہیں تو آپ کی ہر حرکت اور آپ کی ہر ادا نہ صرف قابل تقلید بلکہ قابل فخر نظر آئی۔ جن لوگوں نے آپ سے دشمنی کی، آپ کے خلاف طعن و تشنیع کے تیر برسائے، آپ کے خلاف سازشیں کیں، وہ بھی آپ کو دھوکا باز اور خائن نہ سمجھ سکے بلکہ اپنی معاندانہ کاروائیوں کے باوجود اپنی قیمتی چیزیں اس امی کے پاس بطور امانت رکھتے رہے اور آپ کو صادق اور امین سمجھا۔ جن لوگوں کے درمیان آپ نے اپنی زندگی کے تریسٹھ سال گزارے ان کو آپ کے دامن عفت پر عیاشی کا کوئی داغ نظر نہ آیا، لیکن جن لوگوں کا نہ آپ کے ساتھ زمانی تعلق تھا نہ مکانی، جو نہ آپ کے ہم مذہب تھے نہ ہم قوم، ان کو آپ کی ذات عالی صفات کے دامن پر دھوکا بازی، فحاشی، وعدہ خلافی، بے وفائی، بزدلی اور عہد شکنی کے بے شمار دھبے نظر آگئے۔ حسد اور بغض کی لعنتیں انسان کو فکر و کردار کی جن پستیوں میں پھینک دیتی ہیں ان کی اس سے بہتر مثال ملنا ممکن نہیں۔

حضور ﷺ کو خالق کائنات نے حسن اخلاق کا نمونہ قرار دیا اور فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (1)

"اور بے شک آپ عظیم الشان خلق کے مالک ہیں۔"

یوں تو یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے لیکن اس میں کلام خداوندی کا جلال و جمال اپنے پورے جوبن پر نظر آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے کردار کی ان گنت خوبیوں کی تعبیر کیلئے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ لفظ "خلق" ہے۔ امام رازی "خلق" کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اَلْخُلُقُ مَلَكَةٌ نَفْسَانِيَةٌ يَسْهُلُ عَلَى الْمُتَّصَفِ بِهَا الْاِتْيَانُ بِالْاَفْعَالِ الْجَمِيْلَةِ

"یعنی خلق نفس کے اس ملکہ اور استعداد کو کہتے ہیں کہ جس میں وہ پایا

1۔ سورۃ القلم 4

جائے اس کے لئے افعال جمیلہ اور خصائل حمیدہ پر عمل پیرا ہونا آسان اور سہل ہو جائے۔"

امام رازی مزید فرماتے ہیں کہ کسی اچھے اور خوب صورت فعل کا کرنا الگ چیز ہے لیکن اس کو سہولت اور آسانی سے کرنا الگ چیز ہے۔ کوئی کام خلق اسی وقت کہلائے گا جب اس کے کرنے میں تکلف سے کام لینے کی نوبت نہ آئے۔ (کبیر) یعنی جس طرح آنکھ بے تکلف دیکھتی ہے، کان بے تکلف سنتے ہیں، زبان بے تکلف بولتی ہے اسی طرح سخاوت، شجاعت، حیا، حق گوئی اور تقویٰ وغیرہ تجھ سے کسی تردد اور توقف کے بغیر صدو پذیر ہونے لگیں تو اس وقت ان امور کو تیرے اخلاق شمار کیا جائے گا۔ (1)

خلق کا لفظ ہی اپنے اندر بے پناہ معنویت رکھتا ہے اور یہی ایک لفظ اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو وہ ملکہ عطا فرمایا ہے جس کی مدد سے آپ ہر اس کام کو انتہائی آسانی سے سرانجام دے سکتے ہیں جو خیر کے زمرے میں آتا ہو، جسے عقل سلیم عمدہ سمجھتی ہو یا جس کی وجہ سے انسان کا خدا اور مخلوق خدا کی نظر میں مقام بلند ہوتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے کردار کے تعارف کے لئے اس لفظ "خلق" کو بھی عظیم کی صفت سے موصوف فرمایا ہے اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کردار مصطفیٰ کو بیان کرنے کے لئے جو ترکیب استعمال فرمائی ہے اس کی شان ہی نرالی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ "اِنَّ لَكَ خُلُقًا عَظِيمًا" کہ آپ کا خلق عظیم ہے بلکہ فرمایا: "اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ" کہ بے شک آپ عظیم الشان خلق کے مالک ہیں۔ یعنی اخلاق حمیدہ اور اعمال پسندیدہ آپ کے زیر فرمان ہیں، آپ اپنی مرضی سے انہیں استعمال کرتے ہیں۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ (2)

"میں اس لئے مبعوث ہوا ہوں تا کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔"

اس عظیم کام کے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے خود آپ کی تربیت فرمائی۔ حضور ﷺ نے اس نعمت خداوندی کا اقرار ان الفاظ میں کیا:

1۔ ضیاء القرآن، جلد 5، صفحہ 331

2۔ موطا امام مالک، "کتاب حسن الخلق"، صفحہ 758

اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ تَاْدِیْبًا حَسَنًا (1)

''اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب سکھایا اور خوب ادب سکھایا۔''

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا، اس مقصد کیلئے آپ کی خصوصی تربیت فرمائی اور آپ کو قرآن حکیم جیسی عظیم کتاب عطا فرمائی جو محاسن اوصاف اور مکارم اخلاق کا مرقع ہے۔ حضور ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کو قرآن حکیم کی اخلاقی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالا اور پھر قرآن حکیم کو اور اپنی حیات طیبہ کو بطور نمونہ بنی نوع انسان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسی حقیقت کا انکشاف کیا تھا جب آپ سے حضور ﷺ کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا:

کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ (2)

''حضور ﷺ کا خلق قرآن تھا۔''

یعنی حضور ﷺ کی حیات طیبہ قرآن حکیم کی اخلاقی تعلیمات کی عملی تصویر تھی۔ آپ کی رفیقہ حیات کو آپ کے کردار کے آئینے میں قرآن حکیم کی اخلاقی تعلیمات کا حسن نظر آیا اور طویل عرصہ آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے والے خادم نے بھی آپ کے اخلاق کی بلندی کی شہادت دی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے لگاتار دس سال حضور ﷺ کی خدمت کی۔ حضور ﷺ نے مجھے کبھی ''اف'' تک نہیں کہا۔ جو کام میں نے کیا اس کے متعلق کبھی یہ نہیں فرمایا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا ہے اور جو کام میں نے نہیں کیا اس کے متعلق کبھی نہیں پوچھا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا۔ حضور ﷺ حسن و جمال میں بھی تمام لوگوں سے برتر تھے۔ میں نے کسی اطلس یا ریشم کو حضور ﷺ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم نہیں پایا۔ کوئی مشک، کوئی عطر، حضور ﷺ کے پسینے سے زیادہ خوشبودار، میں نے نہیں سونگھا۔''(3)

1۔ ضیاء القرآن، جلد 5، صفحہ 331

2۔ ایضاً، صفحہ 332

3۔ ایضاً

حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما نے تو حضور ﷺ کی معیت کی سعادت اس وقت حاصل کی تھی جب آپ اپنی پیغمبرانہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں مصروف تھے اور دنیا آپ کو محمد بن عبد اللہ کی بجائے محمد رسول اللہ کے نام سے جانتی تھی۔ لیکن اس سے طویل عرصہ پہلے جب آپ پر نزول وحی کا آغاز ہوا تھا تو آپ کی مونس و غمخوار اور محرم راز رفیقہ حیات نے یہ کہہ کر آپ کے حسن اخلاق کی تصدیق کی تھی:

فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحْمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تَقْرِی الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (1)

"حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے (آپ کے اظہار اضطراب پر) عرض کیا: ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو بے آبرو نہیں کرے گا۔ آپ قریبی رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں اور ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، جو مفلس و نادار ہو اس کو اپنی نیک کمائی سے حصہ دیتے ہیں، مہمان کی مہمانی نوازی کرتے ہیں، حق کی وجہ سے کسی پر کوئی مصیبت آجائے تو آپ اس کی مدد اور دستگیری فرماتے ہیں۔"

حضور ﷺ کے حسن اخلاق کے زیور سے آراستہ ہونے کی شہادت، آپ کی حیات طیبہ میں آپ کے سب سے زیادہ قریب رہنے والی ہستیاں دے رہی ہیں۔ یہ شہادت دینے والی ایک طرف آپ کی دو عظیم ازواج مطہرات ہیں اور دوسری طرف دس سال آپ کی خدمت کی سعادت سے مشرف ہونے والے آپ کے خادم ہیں۔ ان شہادتوں کے بعد آپ کے اخلاق میں کیڑے نکالنے کی سعی نامسعود وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل مریض ہو۔ اور ایسے لوگوں کے پروپیگنڈے سے حضور ﷺ کے اخلاق کا پاکیزہ دامن نہ پہلے میلا ہوا ہے اور نہ ہی انشاء اللہ آئندہ اس کی تابناکیوں میں کوئی فرق آئے گا۔

حضور ﷺ صرف خود ہی حسن اخلاق کا نمونہ نہیں ہیں بلکہ آپ نے اپنے پیروکاروں کو بھی حسن اخلاق کے اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش فرمائی ہے۔ آپ نے اپنی امت کو زیور

1۔ ضیاء النبی، جلد 2، صفحہ 192

اخلاق سے آراستہ کرنے کے لئے جو ہدایات فرمائی ہیں وہ آج بھی ہمارے سامنے ہیں۔

حضور ﷺ نے اپنی امت کو حسن اخلاق کے جو انمول درس دیئے ہیں ان کے چند نمونے قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہیں۔(1)

عَنْ اَبِیْ ذَرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُمَا کُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ (ترمذی حسن صحیح)

"حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! تم جہاں بھی ہو اللہ تعالی سے ڈرتے رہو۔ کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے فوراً بعد نیکی کرو، وہ نیکی اس کو مٹا دے گی۔ اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا کرو۔"

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ شَیْءٍ اَثْقَلُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ وَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَیُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ

"حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالی سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن مومن کے میزان میں حسن خلق سے زیادہ وزنی اور کوئی چیز نہ ہو گی اور اللہ تعالی فحش کلام کرنے والے بدزبان سے بغض رکھتا ہے۔"

وَعَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَا مِنْ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِی الْمِیْزَانِ اَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ وَاِنَّ صَاحِبَ حُسْنِ الْخُلُقِ لَیَبْلُغُ بِہٖ دَرَجَۃَ صَاحِبِ الصَّلٰوۃِ وَالصَّوْمِ

"حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں، میں

1۔ ضیاء القرآن، جلد 5، صفحہ 333

نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا: میزان عمل میں جتنی چیزیں رکھی جائیں گی ان میں حسن خلق سب سے زیادہ وزنی ہو گا اور اچھے اخلاق کا مالک اپنے حسن خلق کے باعث نماز پڑھنے والے، روزہ رکھنے والے کے مرتبہ کو پالیتا ہے۔"

مندرجہ ذیل حدیث پاک کو خصوصی توجہ سے پڑھیے۔

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ وَاَقْرَبِكُمْ مِنِّيْ مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَحَاسِنَكُمْ اَخْلَاقًا قَالَ اِنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَيَّ وَاَبْعَدَكُمْ مِنِّيْ مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَيْهِقُوْنَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ فَمَا الْمُتَفَيْهِقُوْنَ قَالَ اَلْمُتَكَبِّرُوْنَ

"حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ محبوب اور روز قیامت تم میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہوں گے ...... پھر فرمایا: میرے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قیامت کے دن تم میں مجھ سے سب سے زیادہ دور بیہودہ باتیں کرنے والے، زبان دراز اور متفیہقون ہوں گے۔ عرض کیا گیا، یارسول اللہ! پہلے دو لفظوں کا مطلب تو ہماری سمجھ میں آ گیا، تیسرے لفظ "اَلْمُتَفَيْهِقُوْنَ" کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا متکبر لوگ۔"

روح البیان میں علامہ اسماعیل حقی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک خلق کی تین سو ساٹھ صورتیں ہیں، جس شخص میں توحید کے ساتھ ان میں سے ایک صورت بھی پائی گئی وہ جنت میں داخل ہو گا۔ "قَالَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ هَلْ فِيَّ مِنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟" صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ!

کیاان میں سے کوئی صورت مجھ میں بھی پائی جاتی ہے۔

قَالَ کُلُّهَا فِیْكَ یَا اَبَابَكْرٍ وَاَحَبُّهَا اِلَی اللّٰهِ السَّخَاءُ

"حضور ﷺ نے فرمایا: اے ابو بکر! تم میں حسن خلق کی سب صورتیں موجود ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخاوت سب سے زیادہ محبوب ہے۔" (1)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور ﷺ کے دبستان اخلاق کے تربیت یافتہ ہیں۔ جب ان کی ذات میں حسن اخلاق کی تمام صورتیں موجود ہیں تو خود حضور ﷺ کی ذات عالی صفات میں یہ تمام صورتیں بدرجہ اتم موجود ہوں گی۔ لیکن بدقسمتی سے مستشرقین اس ہستی کے اخلاق میں کیڑے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں جس ہستی کا اخلاق و کردار دوسرے لوگوں کو اخلاق کے بلند ترین مقام پر پہنچانے کا ذریعہ ہے اور جس کی تعلیمات میں حسن خلق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

مستشرقین کو حضور ﷺ کی ذات میں دیگر خوبیاں تو نظر آتی ہیں لیکن ان کو آپ کی ذات میں حسن خلق کی خوبی کہیں نظر نہیں آتی اور وہ آپ کے متعلق عجیب قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

ٹار انڈرائے حضور ﷺ کے اخلاق کے متعلق یہ فیصلہ صادر کرتا ہے:

"In spite of everything that can be said in defence Muhammad's religious integrity and his loyalty to his call, his endurance, his liberality, and his generosity, we are not doing the prophet of Islam an injustice when we conclude that his moral personality does not stand upon the same level with his other endowments. and indeed, not even upon the same level with his religious endowments. But if we would be fair to him we must not forget that, consciously or unconsiously, we the chiristians are inclined to compare Mohammad with the unsurpassed and exalted figure whom we

---

1۔ ضیاء القرآن، جلد 5، صفحہ 333

meet in the Gospels ,and that we cannot avoid seeing his historical personality against the background of the perfect moral ideal to which the faith of his followers tried to exalt him. And when it is measured by such a standard, what personality is not found wanting?" (1)

"مذہبی راست بازی، اپنے مشن سے وفاداری، ثابت قدمی، روشن دلی اور سخاوت وغیرہ جو باتیں محمد ﷺ کے دفاع میں کہی جا سکتی ہیں، ان سب کے باوجود، یہ کہنا پیغمبر اسلام سے ناانصافی نہ ہوگی کہ ان کے اخلاق کا معیار وہ نہیں جو ان کی دیگر خوبیوں اور صلاحیتوں کا ہے۔ بلکہ ان کی اخلاقی شخصیت، ان کی مذہبی شخصیت کے ہم پلہ بھی نہیں ہے۔ لیکن محمد (ﷺ) کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم عیسائی محمد (ﷺ) کا مقابلہ اس بے مثال اور عظیم الشان شخصیت کے ساتھ کرنے کا رجحان رکھتے ہیں، جو ہمیں انجیلوں میں نظر آتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم محمد (ﷺ) کے اخلاق کو اس کامل اخلاقی معیار پر پرکھیں جو ان کے پیروکاروں کی عقیدت نے ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لئے قائم کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے جب معیار اتنا بلند ہو گا تو وہ کون سی شخصیت ہو گی جس میں خامیاں نظر نہیں آئیں گی۔"

مذکورہ بالا عبارت میں مستشرق موصوف یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ حضور ﷺ کی شخصیت کا دفاع کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس دفاع کے پردے میں ذات مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر انتہائی زبردست وار کر رہا ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کے اخلاق عمدہ تو نہیں ہیں لیکن آپ کے متعلق یہ فیصلہ اسی لئے صادر کیا جاتا ہے کہ آپ کے اخلاق کو پرکھنے والے یا تو آپ کا مقابلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بلند و بالا شخصیت سے کرتے ہیں اور یا آپ کے اخلاق میں جھول اس لئے نظر آتی ہے کہ آپ کے پیروکار، آپ کے حسن اخلاق کی جو تصویر کشی محض اپنی عقیدت کے جوش میں کرتے ہیں، حضور ﷺ اس پر پورے نہیں اترتے۔

1۔ محمد، دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 191

گویا مستشرق موصوف یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا اخلاقی معیار، یقیناً بلند تو نہیں ہے لیکن اس سلسلے میں آپ کو معذور سمجھنا چاہئے کیونکہ آپ کے اخلاق کو پرکھنے کے لئے جو معیار استعمال کیا جاتا ہے، وہ بہت بلند ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن اخلاق کی وہ بے مثال دولت عطا فرمائی ہے جو صرف انبیاء ورسل ہی کا حصہ ہے۔ ہم یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اخلاق کا موازنہ حضور ﷺ کے اخلاق سے کرنا مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ ہمارے رؤوف ورحیم پیغمبر نے ہمیں دیگر انبیاء کرام کے ساتھ آپ کے اس قسم کے موازنے سے منع فرمایا ہے جس سے کسی نبی یا رسول کے مقام میں کمی کا تاثر ملتا ہو۔ لیکن یہاں ہم مستشرقین کے سامنے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فیصلہ رکھنا مناسب سمجھتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے سب سے آخری وعظ میں اپنی قوم سے فرمایا تھا:

> "I have many things yet to say to you, but you are not able to bear them at present. However, when that one arrives, the spirit of the truth, he will guide you into all the truth, for he will not speak of his own impulse, but what things he hears he will speak, and he will declare to you the things coming". (1)

> "مجھے تم سے بہت ساری باتیں ابھی کہنی ہیں لیکن فی الحال تم ان باتوں کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہو۔ تاہم جب وہ تشریف لائے گا، جو سچائی کی روح ہے تو وہ تمہیں سچائی کی سب باتیں بتائے گا کیونکہ وہ اپنی خواہش سے کام نہیں کرے گا بلکہ وہ جو سنے گا وہی کہے گا۔ وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا تمہارے سامنے اعلان کرے گا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس بہت سی باتیں تھیں، جن کو برداشت کرنے کی ان کی امت میں ہمت نہ تھی۔ لیکن وہ باتیں جن کو سننے کی ان میں ہمت نہ تھی، ان باتوں کو سننے اور برداشت کرنے کی ہمت اس "سچائی کی روح" کی امت میں موجود تھی۔ یہ "سچائی کی

1۔ انجیل یوحنا، باب 16، آیات 13-12

روح" وہی ہستی ہے جس کے اخلاق مستشرقین کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت جن باتوں کو برداشت کرنے کے قابل نہ تھی ان میں سے بے شمار باتوں کا تعلق اخلاق سے بھی تھا کیونکہ خود بائیبل اس بات کی تصریح کر رہی ہے۔ بائیبل ان چیزوں کے بارے میں بتاتی ہے جو آنے والی "سچائی کی روح" لوگوں کو بتائے گی۔ ان باتوں میں سے یہ بھی ہیں:

"And when that one arrives he will give the world convincing evidence concerning sin and concerning righteousness and concerning judgement". (1)

"اور جب وہ تشریف لائے گا تو وہ دنیا کو نیکی، بدی اور عدل کے متعلق متاثر کن شہادت فراہم کرے گا۔"

وہ باتیں جن کا تعلق نیکی، بدی یا عدل سے تھا، یقیناً وہ اخلاقی تعلیمات تھیں، جن کے حسن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی شخصیت آراستہ بھی تھی اور آپ ان اخلاقی تعلیمات کے رنگ میں اپنی امت کو رنگنا ضروری بھی سمجھتے تھے لیکن امت کی عدم استعداد کی وجہ سے آپ نے ان تعلیمات کی تکمیل کا کام آنے والی "سچائی کی روح" کے لئے چھوڑ دیا۔ وہ سچائی کی روح تشریف لائی اور اعلان کیا:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ (2)

"مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔"

حضور ﷺ کی امت ان سچائیوں کو برداشت کرنے کے قابل بھی تھی اور آپ کے پیروکاروں نے ان تمام سچائیوں کو قبول بھی کر لیا تھا، جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے سامنے پیش کرنا خلاف مصلحت سمجھا تھا۔ اسی لئے حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بشارت دی تھی کہ حسن اخلاق کی تین سو ساٹھ صورتیں، سب تمہارے سراپے میں موجود ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہ ارشادات اعلان کر رہے ہیں کہ اگر تمام سچائیوں اور

1۔ انجیل یوحنا، باب 16، آیت 8

2۔ موطا امام مالک، صفحہ 758

اخلاقی خوبیوں کا کوئی حقیقی نمونہ کامل ہو سکتا ہے تو وہ وہی ہستی ہے جو ان تمام سچائیوں کا اظہار کرے گی اور جس کے نمونہ کامل کی پیروی میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی اخلاق حسنہ کا نمونہ کامل بن جائیں گے۔

ٹارانڈرائے کا یہ کہنا بھی بے بنیاد ہے کہ مسلمانوں نے جوش عقیدت میں اپنے آقا و مولیٰ کے اخلاق کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضور ﷺ کے اخلاق حسنہ کی تصویر کشی کی ہے، وہ اس رسول عربی ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے حسن اخلاق کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ وہ لوگ اپنی بچیوں کو زندہ درگور کیا کرتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر خون کی ندیاں بہاتے تھے اور رحمت و شفقت کے الفاظ ان کے لئے اجنبی تھے۔ انہوں نے حسن اخلاق کا درس دبستان محمدی سے لیا تھا۔ اسی تعلیم نے ان کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ انہیں حضور ﷺ کی شخصیت میں جو اخلاقی نمونے نظر آتے تھے وہ ان کے سابقہ تجربات کے خلاف تھے لیکن ان اخلاقی نمونوں نے ان کے قلب و نظر کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ انہوں نے دشمن پر رحم کرنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن حضور ﷺ نے اپنے خون کے پیاسوں کو عام معافی دینے کا حیران کن نمونہ ان کے سامنے پیش کیا تو وہ اس پر دل و جان سے نثار ہو گئے۔ بنی نوع انسان کے درمیان مساوات کا کوئی تصور ان کے ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھا لیکن حضور ﷺ نے ایک قریشی اور ایک حبشی کو برابر قرار دیا تو اس عجیب و غریب مگر پرکشش تعلیم کی تاثیرات نے ان کے دلوں کو موہ لیا۔

اخلاقی قدروں سے تو ان کو متعارف ہی حضور ﷺ نے کرایا تھا۔ وہ اس قابل کہاں تھے کہ اپنے تخیل کے زور پر حسن اخلاق کا ایک کامل معیار وضع کرتے اور پھر دنیا کو یہ دکھانے کی کوشش کرتے کہ وہ جس پیغمبر خدا کی امت ہیں، ان کے اخلاق اس مثالی معیار اخلاق پر پورے اترتے ہیں۔

مستشرقین یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ معیار متاخر مسلمانوں کے ذہنوں کی اختراع ہے کیونکہ بعد کے مسلمانوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے، اپنے اسلاف سے حاصل کیا ہے۔ انہوں نے عیسائیوں کی طرح اپنے دین کو بازیچہ اطفال کبھی نہیں بنایا کہ اس میں اپنی صوابدید کے مطابق ردوبدل کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سارا عالم یہودیت و عیسائیت مسلمانوں کو بنیاد

پرست اور قدامت پسند ہونے کا طعنہ دیتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اخلاق ساری نسل انسانی کے لئے بہترین نمونہ ہیں اور جو انسان آپ کے اخلاق میں کیڑے نکالنے کی کوشش کرتا ہے وہ پوری نسل انسانی پر ظلم کرتا ہے۔

ٹار انڈرائے جو بظاہر حضور ﷺ کا دفاع کرتا نظر آتا ہے، اس نے آپ کے اخلاق کریمہ پر جس قسم کے حملے کیے ہیں ان کی چند جھلکیاں قارئین کرام بھی ملاحظہ فرمالیں۔

حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش کو چند مجاہدین کے ساتھ ایک مشن پر بھیجا تھا۔ وفد کی مڈ بھیڑ کفار کے ایک قافلہ سے ہو گئی تھی، جس میں کافروں کا ایک آدمی قتل ہو گیا تھا۔ جس دن یہ واقعہ پیش آیا تھا، وہ دن ماہ رجب کا تھا جو حرمت والا مہینہ ہے۔ جب حضور ﷺ کو علم ہوا تھا تو آپ نے مجاہدین سے اظہار ناراضگی فرمایا تھا اور اپنے آپ کو ان کے اس فعل سے بری الذمہ قرار دیا تھا۔ اس واقعے پر تبصرے کرتے ہوئے ٹار انڈرائے کہتا ہے:

"What offends us is the calculating slyness with which he cleverly provokes Abdallah's action without assuming any responsibility for what occurred. This event reveals a trait of his character which is particularly uncongenial to the ideals of manliness of the Nordic races. He lacks the courage to defend an opinion openly, revealing a certain tendency to dodge and take advantage of subterfuges, to avoid an open espousal of his position". (1)

"جس بات پر ہمیں غصہ آتا ہے وہ ان کی وہ عیاری ہے جس سے انہوں نے عبداللہ کو ایک کام پر ابھارا لیکن اس کام کے نتائج کے متعلق کسی قسم کی ذمہ داری کو قبول نہ کیا۔ یہ واقعہ ان کے کردار کی ایک خصوصیت کو منکشف کرتا ہے جو خصوصی طور پر گوری نسلوں کے معیار مردانگی پر پوری نہیں اترتی۔ وہ کھلے عام اپنی رائے کا دفاع کرنے کی ہمت سے عاری ہیں جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ دھوکا دینے اور حیلے بہانے سے مفاد حاصل کرنے کا رجحان رکھتے ہیں

1۔ محمد، دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 143

اور اپنے موقف کی کھلے عام حمایت کرنے سے کتراتے ہیں۔

اس واقعہ کو دیگر مستشرقین نے بھی حضور ﷺ کے اخلاق و کردار کو داغ دار کرنے کے لئے جی بھر کر استعمال کیا ہے، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مزید بحث سے پہلے اس واقعہ کی تفصیلات سے قارئین کرام کو آگاہ کر دیا جائے۔

حضور ﷺ نے ہجرت کے دوسرے سال رجب کے مہینے میں حضرت عبد اللہ بن جحش کو مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ فرمایا۔ انہیں ایک خط بھی دیا اور فرمایا کہ اس خط کو دو دن کے سفر سے پہلے دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ جب دو دن گزر جائیں تو اس خط کو پڑھنا اور اس میں مندرج ہدایات کے مطابق عمل کرنا اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو مجبور نہ کرنا۔

دو دن کے سفر کے بعد انہوں نے خط پڑھا۔ اس میں لکھا تھا: جب تم میرا خط پڑھو تو سفر کو جاری رکھو حتی کہ نخلہ کے مقام تک پہنچ جاؤ جو مکہ اور طائف کے درمیان ہے۔ وہاں قریش کی نقل و حرکت پر نظر رکھو اور ہمیں ان کے حالات سے آگاہ کرو۔

حضرت عبد اللہ نے صورت حال سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کیا اور فرمایا کہ وہ کسی کو ساتھ دینے پر مجبور نہیں کریں گے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہما، جو اپنے گمشدہ اونٹ کی تلاش میں گئے تھے اور ان کو قریش نے گرفتار کر لیا تھا، ان کے علاوہ تمام ساتھی حضرت عبد اللہ بن جحش کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اور نخلہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ وہاں سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ گزرا جس کا سردار عمرو بن حضرمی تھا۔ یہ ماہ رجب کا آخری دن تھا۔ قافلہ قریش کو دیکھ کر حضرت عبد اللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کے ذہنوں میں قریش کے ان مظالم کی یاد تازہ ہو گئی جو انہوں نے کمزور مسلمانوں کے خلاف روا رکھے تھے۔ انہوں نے باہم مشورے شروع کئے۔ کسی نے کہا: "قسم بخدا! اگر تم ان کو آج کی رات مہلت دو گے تو یہ سرزمین حرم میں داخل ہو جائیں گے اور تمہاری زد سے بچ جائیں گے اور اگر آج تم ان کو قتل کرتے ہو تو یہ قتل حرمت والے مہینے کے اندر ہو گا۔" یہ سوچ کر وہ متردد ہوئے اور کسی قسم کی کاروائی کرنے سے خوف محسوس کیا۔ آخر کار انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ان پر حملہ کر دیا جائے، ان میں سے جن کو قتل کرنا ممکن ہو ان کو قتل کر دیا جائے اور ان سے مال اسباب چھین لیا جائے۔ ایک مجاہد نے تیر مار کر عمرو بن

حضرمی کو قتل کر دیا اور قریش کے دو آدمیوں کو قیدی بنالیا گیا۔ حضرت عبد اللہ بن جحش دو قیدیوں اور قافلے کا مال اسباب لے کر مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ انہوں نے مال غنیمت سے خمس نکال کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ جب حضور ﷺ نے یہ دیکھا تو فرمایا: "میں نے تمہیں حرمت والے مہینے میں قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔" آپ نے خمس وصول کرنے سے بھی انکار فرمادیا۔ حضرت عبد اللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ دوسرے مسلمان انہیں ان کے اس فعل پر سخت ست کہتے۔ قریش نے اس صورت حال کو غنیمت جانا اور ہر طرف یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے حرمت والے مہینے میں جنگ نہ کرنے کے مسلمہ اصول کو توڑ دیا ہے اور انہوں نے اس مہینے میں جنگ کی ہے۔ یہودی بھی اس صورت حال کو اسلام کے خلاف استعمال کرنے کے لئے میدان میں اتر آئے۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ نازل فرما کر کفر کے سرغنوں کا منہ بند کر دیا:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ (1)

"وہ پوچھتے ہیں آپ سے کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا حکم کیا ہے۔ آپ فرمائیے کہ لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے لیکن روک دینا اللہ کی راہ سے اور کفر کرنا اس کے ساتھ اور (روک دینا) مسجد حرام سے اور نکال دینا اس میں بسنے والوں کو اس سے، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں اللہ کے نزدیک اور فتنہ (وفساد) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور وہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر بن پڑے۔"

اس آیت کے نزول پر مسلمان خوش ہوئے۔ حضور ﷺ نے قافلے کے مال واسباب اور دو قیدیوں کو قبول فرمالیا۔ قریش نے اپنے قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے ان کو آزاد کرانے کی

1۔ سورۃ البقرہ: 217

درخواست کی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہم اس وقت تک ان کا فدیہ لے کر ان کو آزاد نہیں کریں گے جب تک ہمارے دو ساتھی (یعنی سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہما) ہمارے پاس پہنچ نہیں جاتے کیونکہ ہمیں خطرہ ہے کہ تم انہیں قتل نہ کر دو۔ اگر تم نے ان کو قتل کیا تو ہم ان کے بدلے میں تمہارے دو قیدیوں کو قتل کر دیں گے۔ حضرت سعد اور عتبہ مدینہ پہنچ گئے تو حضور ﷺ نے ان کے بدلے میں قریش کے دونوں قیدیوں کو رہا فرما دیا۔ قریش کے دو قیدیوں میں سے ایک کا نام حکم بن کیسان تھا، وہ مسلمان ہو گیا اور مدینہ طیبہ ہی میں قیام پذیر ہو گیا۔ دوسرا مکہ چلا گیا اور وہیں حالت کفر میں اس کو موت آئی۔(1)

قارئین کرام نے واقعہ کی تفصیلات ملاحظہ فرمالیں۔ اس میں کون سی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے حضور ﷺ کو مورد الزام ٹھہرایا جا سکے؟ حضور ﷺ کے ساتھ کفار مکہ برسر پیکار تھے۔ ان کے حالات سے باخبر رہنا آپ کے لئے ضروری تھا اور اسی مقصد کیلئے آپ نے یہ دستہ روانہ فرمایا تھا۔ اس دستے کو آپ نے جنگ کرنے کے احکامات دے کر نہیں بھیجا تھا اس لئے جو واقعہ پیش آیا اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ قریش کے ایک آدمی کو حرمت والے مہینے میں قتل کرنا، ان کے دو آدمیوں کو اسیر بنانا اور ان کے مال و اسباب پر قبضہ کرنا حضرت عبد اللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کا فعل تھا اور اس فعل کے متعلق صرف ان پر ہی اعتراض کیا جا سکتا ہے لیکن حضور ﷺ کی ذات پاک کسی بھی حیثیت میں اس واقعے کی وجہ سے مورد الزام نہیں ٹھہرتی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اکثر مورخین نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مجاہدین نے یہ کاروائی اس لئے کی تھی کہ ان کے خیال میں شعبان کا چاند طلوع ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہو تو پھر نہ حضور ﷺ پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے اور نہ ہی ان مجاہدین پر۔ لیکن ہم نے محمد حسین ہیکل کے حوالے سے اس واقعے کی جو تفصیلات سطور بالا میں رقم کی ہیں، ان میں بتایا گیا ہے کہ ان مجاہدین کو یہ علم تو تھا کہ حرمت والا مہینہ ختم نہیں ہوا، وہ اس وقت کاروائی کرنے میں متردد بھی تھے لیکن پھر کفار مکہ کے وہ مظالم ان کی آنکھوں کے سامنے آگئے جن کی وجہ سے انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ اس جذباتی کیفیت میں انہوں نے مذکورہ کاروائی کر دی۔ مدینہ پہنچنے پر نہ تو حضور ﷺ نے ان کے اس فعل کو پسند فرمایا اور نہ ہی دیگر مسلمانوں نے۔

1۔ ہیکل، "حیات محمد"، صفحہ 45-244

مستشرقین کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے خود حضرت عبد اللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کو اس کاروائی کا حکم دیا تھا لیکن جب یہ واقعہ پیش آگیا تو آپ نے اس کے متعلق کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اگر بات ایسے ہی ہوتی جیسے مستشرقین کہتے ہیں تو مدینہ طیبہ کے حالات بدل جاتے۔ حضور ﷺ کا خط حضرت عبد اللہ بن جحش کے پاس تھا۔ آپ نے انہیں کوئی حکم زبانی نہیں دیا تھا بلکہ ان کے مشن سے متعلقہ جملہ ہدایات اس خط میں مرقوم تھیں۔ اگر وہ یہ سمجھتے کہ اس واقعہ کی ذمہ داری ناحق ان پر ڈالی جارہی ہے تو وہ اس خط کو پیش کر دیتے اور عرض کرتے کہ میں نے وہی کچھ کیا ہے جس کا مجھے حکم ملا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے دفاع میں ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ انہیں احساس تھا کہ انہوں نے جو کام کیا ہے وہ شریعت اسلامیہ کے خلاف تھا اس لئے حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کے ساتھ ناراضگی کا اظہار کرنے میں حق بجانب ہیں۔

تاجدار مدینہ ﷺ نے اپنے غلاموں کو حریت اور مردانگی کا سبق دیا تھا۔ آپ نے انہیں یہ نہیں سکھایا تھا کہ اگر میں کوئی غلطی کر کے اس کا الزام تم پر ڈالنے کی کوشش کروں تو زبان سے ایک حرف نہ نکالنا بلکہ آپ نے تو انہیں مشکل ترین حالات میں جرات کے ساتھ کلمہ حق کہنے کی تلقین کی تھی۔ حضور ﷺ کی کوئی بات اگر صحابہ کرام کے دل میں کھٹکتی تو وہ فوراً آپ سے اس کی وضاحت طلب کرتے تھے اور آپ اس حرکت پر ان سے ناراض نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے فعل کی حکمت بتا کر ان کے دلوں کو مطمئن کیا کرتے تھے۔

سریہ نخلہ کے موقعہ پر کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ حضور ﷺ نے اپنے کسی فعل کی ذمہ داری قبول کرنے میں پس و پیش کیا۔ اگر آپ کا رویہ ایسا ہی ہوتا جیسا مستشرقین پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس واقعے کے بعد جب آپ کسی صحابی کو کسی مشن پر بھیجنے کا ارادہ کرتے تو وہ تعمیل ارشاد میں پس و پیش کرتا اور یہ سوچتا کہ آپ مجھے جس کام کا حکم دے رہے ہیں، اس کے نتائج کی ذمہ داری آپ خود قبول نہیں کریں گے بلکہ سارا بوجھ میرے کندھوں پر ڈالیں گے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ حضور ﷺ نے جب کبھی اپنے کسی غلام کو کسی کٹھن سے کٹھن ذمہ داری کے لئے منتخب فرمایا، اس نے اس کو سعادت سمجھا اور ایک لمحہ توقف کئے بغیر اس ذمہ داری کے لئے اپنے آپ کو پیش کر

دیا۔ صحابہ کرام کا یہ رویہ اس لئے تھا کہ انہیں یقین تھا کہ ان کے آقا و مولی اپنے افعال کا بوجھ دوسروں پر نہیں ڈالتے بلکہ ہر وہ ذمہ داری جس سے عہدہ برآ ہونا عام انسانوں کے لئے ممکن نہیں ہوتا، اسے آپ اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔

اس واقعے میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی عظمت کی ایک بہت بڑی داخلی شہادت موجود ہے۔ اگر مستشرقین تعصب کی عینک اتار کر اس دیکھتے تو اس واقعے کے حوالے سے انہیں حضور ﷺ پر یا اسلام پر اعتراض کرنے کی جرات نہ ہوتی۔

نخلہ میں جو کچھ پیش آیا تھا اس کی حقیقت کو سریہ نخلہ کے مجاہدین کے علاوہ وہی لوگ صحیح صحیح جانتے تھے جو مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی بنے تھے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ مسلمانوں کے اس فعل کے خلاف انہی لوگوں کے جذبات کو سب سے زیادہ مشتعل ہونا چاہئے تھا۔ لیکن جن لوگوں نے مسلمانوں کو اپنے کاروان پر حملہ آور ہوتے دیکھا، وہ مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے، مدینہ لائے گئے، مدینہ میں انہوں نے اس واقعہ کے متعلق حضور ﷺ اور دیگر مسلمانوں کے ردعمل کو دیکھا تو ان میں سے ایک شخص حکم بن کیسان کو اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت روز روشن کی طرح عیاں نظر آئی اور اس نے کلمہ توحید پڑھ کر پیغمبر اسلام کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ اگر اس واقعہ میں ایسی کوئی بات پیش آئی ہوتی جو قابل نفرت ہوتی تو ایسی صورت میں یہ شخص برضاء و رغبت اسلام قبول نہ کرتا جب کہ اس کے لئے آزاد ہو کر اپنے وطن واپس جانے کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

منٹگمری واٹ نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس واقعے کو حضور ﷺ کے خلاف استعمال کیا ہے۔ وہ بھی آپ کا دفاع کرنے کا تاثر دیتا ہے اور اس واقعہ کی توجیہ یہ کرتا ہے کہ شاید یہ واقعہ اس لئے پیش آیا کہ حضور ﷺ بذات خود مہینوں کی حرمت کے قائل نہ تھے۔ آپ اس رسم کو اہل مکہ کے قدیم مذہب کا حصہ سمجھتے تھے۔(1)

مستشرق مذکور یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کے نزدیک مہینوں کی حرمت کا کوئی تصور نہ تھا لیکن چونکہ اہل عرب متفقہ طور پر مہینوں کی حرمت کے قائل تھے اس لئے آپ نے کھل کر اس سماجی روایت کو توڑنے سے احتراز کیا لیکن واقعہ نخلہ کے موقعہ پر حرمت

1۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 111

والے مہینے کے دوران خون بہا کر عملاً اس روایت کا خاتمہ کر دیا اور اس کی ذمہ داری اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر ڈال دی۔

منٹگمری واٹ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے عربوں کی بے شمار ایسی رسموں کو علی الاعلان ختم کیا تھا جو ان کے نزدیک مہینوں کی حرمت سے بھی کئی گنا زیادہ متبرک تھیں۔ آپ کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ انسانی زندگی کی ہر غلط رسم کو ختم کر دیں۔ آپ نے اپنا یہ فرض منصبی بغیر کسی خوف وخطر کے سرانجام دیا تھا۔ جو لوگ آپ کے اشارہ پر اپنے خداؤں کو ریزہ ریزہ کرنے کیلئے تیار تھے ان سے آپ کو یہ خدشہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ اگر ان کے سامنے یہ اعلان کریں گے کہ مہینوں کی حرمت کا تصور جاہلانہ سوچ کا نتیجہ ہے تو وہ اس کی مخالفت کریں گے؟ ان لوگوں کے لئے تو صرف وہی بات صحیح تھی جو حضور ﷺ کی زبان پاک سے نکلتی تھی۔

اس واقعہ کو تاریخی پہلو سے دیکھا جائے تو بھی اس کی وجہ سے حضور ﷺ پر کسی قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا لیکن اس مقدمے کا جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے، اس کی شان ہی نرالی ہے۔

واقعہ نخلہ پیش آتا ہے، کفار مکہ اس کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کے لئے بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ یہودی موقع غنیمت جان کر میدان میں اترتے ہیں اور اس واقعہ کے حوالے سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر طعن و تشنیع کے تیر برسانا شروع کر دیتے ہیں۔ دشمنان اسلام کے اس رویہ سے اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ اپنے حبیب سے فرماتا ہے کہ یہ جو آپ سے حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں ان سے علی الاعلان کہہ دو کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حرمت والے مہینے میں جنگ کرنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اس کے ساتھ ان کو یہ بھی بتا دو کہ خدا کے بندوں کو خدا کی مقرر کردہ صراط مستقیم سے روکنا، خدا کی خدائی اور اس کی ان گنت نعمتوں کا انکار کرنا، لوگوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنا اور اہل حرم کو حرم سے نکالنا، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں۔ قتل بھی واقعی بہت بڑا گناہ ہے لیکن فتنہ و فساد قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔ تم یہ تمام کرتوت کرتے ہو اور ان تمام بداعمالیوں پر تمہیں ذرا شرم نہیں آتی اور مسلمانوں پر تم اعتراض کرتے ہو کہ انہوں نے حرمت والے مہینے کی حرمت کو توڑا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ

تم خود تو انصاف کی دھجیاں بکھیرتے رہو، کمزوروں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے رہو، نہ تمہیں خدا کے حقوق نظر آئیں اور نہ ہی مخلوق خدا کے، لیکن دوسرے لوگوں کی بھول تمہیں ایک گھناؤنا جرم نظر آئے۔ قانون سب کے لئے ایک ہوتا ہے۔ اگر تم شرافت کے تمام اصولوں پر کاربند ہوتے تو تمہیں حق پہنچتا تھا کہ مسلمانوں سے مواخذہ کرتے۔ لیکن جب تمہارا اپنا دامن ہی صاف نہیں تو تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم مسلمانوں پر اعتراض کرو۔

یہ آیت کریمہ اشارہ کر رہی ہے کہ اب حق و باطل کی آویزش کا ایک نیا مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ اب تک تو کفار مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے تھے اور مسلمان صبر و شکر سے سب کچھ برداشت کرتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ کفار تمہارے ساتھ محض اس لئے برسرپیکار ہیں کہ تم کو صراط مستقیم سے منحرف کر دیں۔ یہ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تمہارے خلاف مسلسل برسرپیکار رہیں گے، لیکن خبردار! اگر تم اپنے دین سے پھر گئے تو تمہاری دنیا اور آخرت تباہ ہو جائے گی۔

ان حالات میں مسلمانوں کے سامنے تین ہی صورتیں تھیں۔ یا تو وہ پہلے کی طرح ظلم سہتے اور صبر و شکر سے اپنے دین پر قائم رہتے۔ یا پھر اپنے دین کی حفاظت کے لئے اور کفار کے ظلم و عدوان کو روکنے کیلئے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے اور تیسری صورت یہ تھی کہ مسلمان کفار کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے اور اپنی دنیا اور آخرت تباہ کر لیتے۔

مسلمانوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور کفار کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا تہیہ کر لیا۔ کفار مکہ جو مسلمانوں کو بغیر کسی مزاحمت کے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے عادی ہو چکے تھے، انہیں مسلمانوں کا یہ رویہ بڑا برا لگا اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف طعن و تشنیع کے تیر برسانا شروع کر دیئے۔

واقعہ نخلہ کے رد عمل کے طور پر جو رویہ کفار مکہ اور یہودیوں نے اختیار کیا تھا، مستشرقین نے اسلام کے خلاف ہمیشہ وہی رویہ اپنایا ہے۔ وہ جب مسلمانوں پر کوئی اعتراض کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ اس سلسلے میں ان کا اپنا عمل کیا ہے۔ وہ تعدد ازواج کے حوالے سے مسلمانوں پر خواہش پرستی کا الزام لگاتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے اپنے قوانین گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز کی تعداد پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتے۔ مسلمانوں پر یہ اعتراض کرتے ہوئے وہ ان ننگ انسانیت کرتوتوں کو بھول جاتے ہیں جن کا

ارتکاب ان کی جوان نسلیں سر بازار کرتی ہیں۔ وہ مسلمانوں پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں لیکن خود انہوں نے جو کچھ صلیبی جنگوں میں کیا یا عالمی جنگوں کے دوران، انسانیت ان کے ہاتھوں جس جہنم سے گزری، وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یہ خود تو ظلم کریں اور مسلمان مسکین بن کر ہمیشہ ان کے مظالم سہتے رہیں۔ یہ خود تو ہر اخلاقی پابندی سے آزاد ہوں لیکن مسلمان فرشتوں سے بھی زیادہ پاکباز بن کر رہیں۔

مستشرقین جس طرح واقعہ نخلہ کو حضور علیہ السلام کے اخلاق پر حملہ کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، اسی طرح وہ آپ کے اخلاق پر حملہ کرنے کے لئے اپنے تخیل کے زور پر اور بھی کئی بنیادیں وضع کر لیتے ہیں۔ مثلاً حضور علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو دعوت اسلام دی تو انہوں نے آپ کی دعوت کو مسترد کر دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے دین پر کسی دوسرے دین کو ترجیح نہیں دیں گے۔ قرآن حکیم نے ان کے اس رویے کی مذمت فرمائی اور فرمایا کہ یہ کون سی عقلمندی ہے کہ اگر تمہارے آباؤ اجداد گمراہی کی راہوں پر گامزن تھے تو تم بھی ضرور گمراہی کے اس گڑھے میں چھلانگ لگاؤ۔

مستشرقین نے اس صاف اور واضح بات کو بھی حضور علیہ السلام کے اخلاق و کردار کو داغدار کرنے کا ذریعہ بنایا اور شوشہ یہ چھوڑا کہ چونکہ محمد (علیہ السلام) کے والد نے آپ کو بچپن ہی میں چھوڑ دیا تھا، اس لئے بچپن ہی سے آپ کے دل میں آباؤ اجداد کے خلاف نفرت کے جذبات پنپ رہے تھے، جن کا اظہار ان آیات میں ہوا جو کفار کو دین آباء کے ساتھ چمٹے رہنے پر برا بھلا کہتی ہیں۔ منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

"It has already been noted that pagans make following the afthers, an excuse for not becoming Muslims. Something of Muhammad's own unconscious bitterness at the father- figures who abandoned him may find expression in the attacks of the Quran on the fathers as bearers of ancestral tradition and opponents of religious truth". (1)

"یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ کفار اسلام قبول نہ کرنے کا بہانہ یہ بناتے تھے

1۔ محمد ایٹ مکہ، صفحہ 48

کہ وہ دین آباء پر قائم ہیں، (اس کو نہیں چھوڑیں گے)۔ آبائی روایات کا علمبردار ہونے اور مذہبی صداقت کا مخالف ہونے کی وجہ سے آباؤاجداد پر قرآن حکیم جو حملے کرتا ہے، ممکن ہے ان حملوں کے پیچھے محمد (ﷺ) کی وہ لاشعوری تلخی کارفرما ہو جو ان کے دل میں اس وجہ سے پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے آباء نے بچپن میں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔"

کیا تاریخی حقائق کے ساتھ اس سے بڑا مذاق ممکن ہے؟ "منٹگمری واٹ" جانتا ہے کہ حضور (ﷺ) کے والد کا انتقال آپ کی ولادت سے پہلے ہو چکا تھا اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے دادا اور ان کے انتقال کے بعد آپ کے چچا نے آپ کو جس محبت اور شفقت سے پالا تھا، اہل مغرب تو اس کے تصور سے بھی ناآشنا ہیں۔

حضور ﷺ کو دریتیم ہونے کے باوجود اپنے بچپن میں ایسے کسی تجربے سے گزرنا نہیں پڑا تھا جس کی وجہ سے آپ کے لاشعور میں آباؤاجداد کی نفرت ڈیرے ڈال لیتی۔ خدا کا رحمۃ للعالمین رسول جو دین لے کر تشریف لایا تھا، اس نے والدین کے جو حقوق متعین کئے اور اولاد کی نظروں میں ان کو جو مقام عطا کیا، آج کے ترقی یافتہ یورپ کے مہذب لوگ اپنے والدین کو وہ مقام دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ حیرت ہے کہ جو دین اپنے والدین کے سامنے "اف" تک کرنے سے روکتا ہے اور مشرک آباء کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تلقین کرتا ہے، مستشرقین اس دین کے داعی اول کو بھی دشمن آباء ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مستشرقین کی یہ تمام چالیں حضور ﷺ کو اخلاقی خوبیوں سے بے بہرہ ثابت کرنے کی کوششوں کے سوا کچھ نہیں۔

حضور ﷺ نے کفار مکہ سے بھی معاہدے کئے تھے اور مدینہ کے یہودیوں سے بھی۔ آپ نے ہمیشہ معاہدوں کی پابندی کی تھی اور باطل پرستوں کو جب بھی موقعہ ملا تھا انہوں نے ان معاہدوں کی خلاف ورزی کی تھی، لیکن منٹگمری واٹ کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے کفار مکہ کے ساتھ کئے جانے والے حدیبیہ کے معاہدے کو بھی توڑا تھا اور یہودیوں سے آپ نے جو معاہدے کئے تھے، ان کو توڑنے کے ذمہ دار بھی آپ ہی تھے۔(2)

مستشرق موصوف غالباً کفار اور یہودیوں کو ہر قسم کی قانونی اور اخلاقی پابندیوں سے

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 327

آزاد سمجھتا ہے۔ کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں، ان پر کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ یہ بات مسٹر واٹ سے مخفی نہیں کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ بھی کفار مکہ نے ہی توڑا تھا اور ان کی اس عہد شکنی کے نتیجے میں ہی مسلمانوں نے مکہ فتح کیا تھا۔ یہودیوں نے حضور ﷺ سے جو معاہدے کئے تھے، یہودیوں نے ان معاہدوں کی ایک بار نہیں بار بار خلاف ورزی کی تھی۔ مدینہ طیبہ پر جتنے خارجی حملے ہوئے تھے، ان میں یہودیوں کا کسی نہ کسی شکل میں ہاتھ ضرور تھا۔ یہ عجیب انداز تحقیق ہے کہ یہودی اپنے حلیفوں کے خلاف حریفوں سے ساز باز کرتے رہیں تو منٹگمری واٹ جیسے غیر جانبدار محقق کو عہد شکنی کی کوئی جھلک نظر نہ آئے اور حضور ﷺ ان کی بار بار کی عہد شکنیوں کی وجہ سے ان کے خلاف کاروائی کریں تو یہ غیر جانبدار محقق چیخ اٹھے اور یہ واویلا شروع کردے کہ محمد (ﷺ) نے یہودیوں کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کو توڑ دیا۔ یہ عجیب قسم کی تحقیق ہے اور عجیب قسم کی غیر جانبداری ہے۔ مستشرقین اگر اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتے تو کم از کم تاریخ کے ساتھ تو انصاف کریں۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کے اخلاق کو داغدار کرنے کے لئے جتنے شوشے چھوڑے ہیں، ان سب کی مثال یہی ہے۔ جو چیزیں حضور ﷺ کی خوبیاں اور آپ کی عظمت کی نشانیاں ہیں، مستشرقین ان چیزوں کو بھی بڑی عیاری سے آپ کی اخلاقی خامیاں شمار کرتے ہیں۔

حضور ﷺ نے اپنے لئے اور اپنے اہل خانہ کے لئے فقر و تنگدستی کی زندگی کو اختیار فرمایا تھا۔ جب آپ مدینہ کی اسلامی ریاست کے سربراہ تھے، اس وقت بھی آپ کے کاشانہ اقدس میں کئی کئی مہینے آگ نہیں جلتی تھی۔ ازواج مطہرات نے اس صورت حال میں تبدیلی کی درخواست کی تھی تو حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہیں اختیار دے دیا تھا کہ اگر تم مال دنیا کو پسند کرو تو میں تمہیں مال و متاع دے کر بڑی عمدگی سے فارغ کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن اگر تم خدا اور خدا کے رسول کو پسند کرو تو تمہیں فقر کی وہی زندگی اختیار کرنی ہوگی جو مجھے پسند ہے اور اس صورت میں تمہیں پروردگار عالم کی طرف سے اجر عظیم عطا ہوگا۔ اس پر تمام ازواج مطہرات نے خدا اور خدا کے رسول کو ہی اختیار کیا تھا اور سب نے تمام دنیوی لذتوں کو ٹھکرا دیا تھا۔

حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا یہ واقعہ، رسول معظم ﷺ اور ان کے اہل بیت کی مقدس زندگیوں کا ایک خوبصورت عکس ہے، لیکن ولیم میور کو اس واقعے میں حضور ﷺ کی حاسدانہ

فطرت منعکس نظر آتی ہے۔ قرآن حکیم کی آیت تخییر لکھنے سے پہلے وہ یہ تمہید باندھتا ہے:

"It is curious to mark how the Jealous temperament of Mahomet transpires through such passages of the coran as the following". (1)

"انسان یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ نیچے لکھی ہوئی آیت جیسی آیات قرآنی میں محمد (ﷺ) کی حاسدانہ فطرت کس طرح عیاں ہوتی ہے۔"

تخییر کے واقعہ میں حضور ﷺ نے باذن خداوندی جس راست بازی سے اپنی ازواج مطہرات کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا اختیار دیا تھا اور اس کے جواب میں ازواج مطہرات نے جس ایثار کا مظاہرہ کیا تھا، اس راست بازی اور ایثار کو حسد قرار دینا صرف کسی ایسے شخص کے لئے ہی ممکن ہے جو سورج کی روشنی کا انکار کرنے کی جرات رکھتا ہو۔ کسی سلیم الفطرت انسان کے لئے یہ کام ممکن نہیں ہے۔

ولیم میور اور ٹارانڈرائے مل کر حضور ﷺ کے متعلق یہ انکشاف کرتے ہیں کہ آپ پرانے دوستوں کو نظر انداز کرنے کا رجحان رکھتے تھے۔ ٹارانڈرائے آپ کی شخصیت کا فلسفیانہ تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"It cannot be denied that this type of personality indicates a certain tendency to neglect old friendships and loyalties in order to seek perpetually for new conquests". (2)

"اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کی شخصیت نت نئے لوگوں کے دل جیتنے کے شوق میں پرانی دوستیوں اور وفاداریوں کو نظر انداز کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔"

ٹارانڈرائے نے حضور ﷺ کی شخصیت میں جس خامی کا سراغ لگایا تھا، اسے ولیم میور نے یہود و نصاریٰ کے ساتھ آپ کے تعلقات کے تناظر میں پرکھا تو اس نتیجے پر پہنچا:

"Thus with threats of abasement and cruel words, Mahomet parted with those to whose teaching he

---

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 138

2۔ محمد، مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 187

owed so much .Having reached the pinnacle of his ambition, he cast aside the ladder by which he had climbed to it". (1)

"یوں توہین آمیز دھمکیوں اور ظالمانہ الفاظ کے ساتھ محمد (ﷺ) نے ان لوگوں سے رشتہ منقطع کیا جن کی تعلیمات سے آپ نے بہت کچھ حاصل کیا تھا، جب آپ اپنی آرزوؤں کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ گئے تو آپ نے اس سیڑھی کو دور پھینک دیا جس کے ذریعے آپ اس بلندی پر پہنچے تھے۔"

دوستوں کے ساتھ حضور ﷺ کے سلوک کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ مستشرقین آپ کا وہ سلوک دیکھتے جو آپ نے صدیق اکبر کے ساتھ کیا تھا جو آپ کے بچپن کے ساتھی تھے، یا انصار مدینہ کے ساتھ آپ کی لجپالی کے مناظر کو دیکھتے جن کی فداکاریوں کا صلہ دینے کے لئے آپ نے فتح مکہ کے بعد بھی مدینہ طیبہ ہی کو اپنا مسکن بنایا تھا اور اپنی امت کو بار بار انصار کی فداکاریوں کی یاد دلا کر ان کا حق ادا کرنے کی تلقین کی تھی۔ یہودی اور عیسائی تو ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کے دوست نہ بنے تھے۔ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کو مسلمانوں نے مشرکین کی نسبت اپنے قریب تر تو سمجھا تھا لیکن یہودیوں نے اس کا جواب کبھی خیر سگالی کے جذبات سے نہیں دیا تھا بلکہ انہوں نے ہمیشہ مشرکین کو مسلمانوں پر ترجیح دی تھی۔ اس لئے دوستوں کے ساتھ حضور ﷺ کی وفاداری کا اندازہ کرنے کیلئے دستوں کے ساتھ آپ کے سلوک دیکھنا چاہئے تھا نہ کہ ان لوگوں کے ساتھ آپ کے سلوک کو جنہوں نے قدم قدم پر آپ کی مخالفت کی تھی۔

حضور ﷺ نے تو آخر تک اپنی رفیقہ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سہیلیوں کے حقوق کو یاد رکھا اور وقتاً فوقتاً ان کے پاس تحائف بھیجتے رہے۔ جو شخص اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے احباب کو نظر انداز نہیں کرتا، اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے پرانے دوستوں کو نظر انداز کر کے نت نئے دوست بنانے لگے۔ حضور ﷺ کے متعلق یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو پہلے ابو جہل، ابو لہب، عبد اللہ بن ابی اور کعب بن اشرف جیسے لوگوں کو حضور ﷺ کا دوست قرار دے اور پھر یہ ثابت کرے کہ بعد میں

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 210

آپ نے ان لوگوں کی دوستی کو فراموش کر دیا۔

ہم نے سطور بالا میں اختصار سے ان اخلاقی بیماریوں کا تذکرہ کیا ہے جو مستشرقین حضور ﷺ کے کردار میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مختصر تذکرے سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مستشرقین کو حضور ﷺ کے کردار میں ہر اخلاقی بیماری نظر آ جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ حضور ﷺ کی شخصیت میں ہر برائی تلاش کر لیتے ہیں وہ آپ کے متعلق ان خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں، منٹگمری واٹ کہتا ہے:

"In his day and generation he was a social reformer, even a reformer in the sphere of morals". (1)

"اپنے زمانے میں محمد (ﷺ) ایک سماجی مصلح تھے اور آپ کی اصلاحات کا دائرہ اخلاقی پہلو کو بھی محیط تھا۔"

"The persecuted preacher of Mecca was no less a man of his time than the ruler of Medina". (2)

"مکہ کا مظلوم مبلغ صرف مدینہ کا حکمران ہی نہ تھا بلکہ اپنے دور کا ایک عظیم انسان بھی تھا۔"

ان تعریفی جملوں میں منٹگمری واٹ بظاہر حضور کی تعریف کر رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ یہاں بھی آپ کی شخصیت پر ایک انتہائی گھناؤنا وار کر رہا ہے۔ حضور ﷺ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے رسول ہیں اور آپ کا اسوۂ حسنہ ہی زندگی کے ہر شعبے میں، ہر ایک کے لئے، نمونہ کامل ہے لیکن منٹگمری واٹ یہ کہنا چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کی شخصیت کو اگر ان کے اپنے دور کے معیار پر پرکھا جائے تو آپ واقعی عظیم نظر آتے ہیں لیکن اگر آپ کی شخصیت کو آج کے ترقی یافتہ دور کے اخلاقی معیار پر پرکھا جائے تو آپ کی شخصیت میں بے شمار خامیاں نظر آتی ہیں۔(3)

منٹگمری واٹ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سی اخلاقی قدریں تھیں جن سے حضور ﷺ کے زمانے کے لوگ ناآشنا تھے اور آج کی متمدن دنیا ان سے بہرہ ور ہو گئی ہے۔ یورپ اور

1۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 234

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً، صفحہ 235

امریکہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں واقعی زبردست ترقی کی ہے لیکن وہ لوگ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انہوں نے اخلاق کے میدان میں بھی ترقی کی وہ منازل طے کی ہیں جن سے اب تک نسل انسانی نا آشنا تھی۔ یورپ میں نہ خاندانی نظام ہے، نہ باپ اور استاد کے احترام کا تصور ہے، نہ شرم وحیا کی اس بازار میں کوئی طلب ہے اور نہ ہی اخلاص و ایثار کی عظیم انسانی قدریں یورپ میں نظر آتی ہیں۔ ان کا میڈیا لوگوں کی نجی زندگی کا سراغ لگانا اور اسے اچھالنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ یورپ کا معاشرہ اصولوں پر نہیں مفادات کی بنیادوں پر چلتا ہے، البتہ انہوں نے یہ ترقی ضرور کی ہے کہ عریانی و فحاشی کو کلچر، جھوٹ اور منافقت کو ڈپلومیسی اور بے مروتی کو آزادی کا نام دے دیا ہے۔

حضور ﷺ کے اخلاق کو پرکھنے کیلئے معیار وہ اخلاقی اصول نہیں جو آپ کی بعثت سے پہلے عربوں میں رائج تھے، بلکہ معیار وہ اصول ہیں جن سے حضور ﷺ نے دنیا کو متعارف کرایا تھا۔ وہ اصول آج بھی قرآن و حدیث کی تعلیمات کی شکل میں موجود ہیں۔ اسی معیار پر حضور ﷺ کا خلق عظیم تھا اور یہی معیار قیامت تک آپ کے خلق عظیم کی گواہی دیتا رہے گا۔ اسی اخلاقی معیار پر پورا اترنے کے لئے آپ نے اپنے غلاموں کی تربیت کی تھی۔ اگر مستشرقین کے پاس اپنی تاریخ میں کوئی ایسی ہستی ہے جو اخلاق کے میدان میں صدیق و فاروق اور عثمان و حیدر کا مقابلہ کر سکے تو وہ پیش کریں۔

کسی انسان کے عظیم ہونے کی ایک بہت بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ دشمن بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ عظمت کی یہ نشانی حضور ﷺ کی ذات میں اپنے پورے جوبن پر نظر آتی ہے۔ آپ نے ایک نہیں ہزاروں دشمنوں کے دل جیتے ہیں۔ مستشرقین کے سامنے بھی سب سے بڑا مقصد آپ کی شان کو گھٹانا ہوتا ہے اور وہ اسی مقصد کے حصول کے لئے اپنی زندگیاں صرف کر دیتے ہیں لیکن اس حقیقت کے باوجود ان کے قلم سے کبھی کبھی ایسی باتیں بھی نکل جاتی ہیں جو حضور ﷺ کی عظمت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتی ہیں۔ جن لوگوں نے آپ کے اخلاقی مقام کو گھٹانے کی کوششیں کی ہیں وہ بھی کبھی کبھی آپ کے اخلاق کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مخالفین کے قلم سے آپ کی عظمت کے اعترافات کی چند جھلکیاں پیش خدمت ہیں۔

منٹگمری واٹ تسلیم کرتا ہے:

"......and established a religious and social framework for the life of a sixth of the human race today. This is not the work of a traitor or a lecher" (1)

"محمد (ﷺ) نے ایک روحانی اور سماجی نظام قائم کیا جو آج کی ترقی یافتہ دنیا کے چھٹے حصے کی راہنمائی کر رہا ہے۔ یہ کام کسی دھوکے باز یا عیاش شخص کا نہیں ہو سکتا۔"

"He gained men's respect and confidence by the religious basis of his activity and by qualities such as courage, resoluteness, impartiality and firmness inclining to severity but tempered by generosity. In addition to these he had a charm of manner which won their affection and secured their devotion." (2)

"آپ اپنے مذہبی افعال، جرات، استقلال، غیر جانبداری اور ثابت قدمی جیسی خصوصیات کے ذریعے لوگوں کا اعتماد حاصل کرتے۔ آپ تشدد کی طرف مائل تھے لیکن آپ کی سخاوت، اس میں توازن پیدا کر دیتی تھی۔ ان کے علاوہ آپ کا حسن اخلاق لوگوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیتا تھا۔"

ٹارانڈرائے لکھتا ہے:

"This reminds us of the fact that Muhammad himself actually possessed a generous nature, that he was able to let the past be forgotten, and that he often showed an understanding of how to win over former enemies by magnanimity". (3)

"اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ محمد (ﷺ) بذات خود کریم الطبع تھے۔ آپ ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر سکتے تھے۔ آپ کی زندگی میں بعض واقعات ایسے پیش آئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح آپ ماضی کے دشمنوں کے دل اپنی عالی ظرفی سے جیت لیتے تھے۔"

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 332

2۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 231

3۔ محمد، دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 2-71

فتح مکہ کے وقت حضور علیہ کی عظیم شخصیت کا جو بے مثال کردار چشم فلک نے دیکھا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تارانڈرائے لکھتا ہے:

"It is rarely that a victor has exploited his victory with greater self-restraint and forbearance than did Mohammad". (1)

"ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی فاتح نے فتح کے وقت اس تحمل اور ضبط نفس کا مظاہرہ کیا ہو، جس کا مظاہر محمد (علیہ) نے کیا تھا۔"

"His position as a ruler was strengthened by his generosity, and his ability to set personal opinions and feelings aside in order to reach larger goals". (2)

"حکمران کی حیثیت سے آپ کی پوزیشن اس لئے مضبوط ہوئی کہ آپ سخی تھے اور عظیم تر مقاصد کی خاطر اپنی ذاتی رائے اور احساسات کو قربان کر سکتے تھے۔"

حضور علیہ کے قول و فعل میں کامل مطابقت کو تسلیم کرتے ہوئے تارانڈرائے لکھتا ہے:

"Such moral self-consciousness doubtless presupposes an absence of apparent contradiction between Mohammed's religious ideal of life and his personal conduct". (3)

"اپنی ذات کا یہ اخلاقی شعور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ محمد (علیہ) نے زندگی کا جو مذہبی نمونہ کامل لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، اس میں اور آپ کے ذاتی کردار میں تضاد نہ تھا۔"

یہاں تارانڈرائے وہی بات کہہ رہا ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا نے کہی تھی جب آپ نے حضور علیہ کے اخلاق کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ آپ کے اخلاق قرآن حکیم کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔

ولیم میور حضور علیہ کی ذات پر حملے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا لیکن آپ

1۔ محمد، دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 166

2۔ ایضاً، صفحہ 167

3۔ ایضاً، صفحہ 180

کی اخلاقی عظمتوں کو وہ بھی ان الفاظ میں سلام کرتا ہے:

"In all his dealings he was fair and upright, and as he grew in years his honourable bearing won for him the title of Al-Ameen "the faithful". (1)

"محمد (ﷺ) معاملات میں راست باز اور انصاف پسند تھے۔ جب آپ کی عمر زیادہ ہوئی تو آپ کے شریفانہ طرز عمل کی وجہ سے قوم نے آپ کو "الامین" کا لقب دیا۔"

عبداللہ بن ابی مدینہ طیبہ میں حضور ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ ولیم میور تسلیم کرتا ہے کہ اس کی مسلسل دشمنی کے باوجود حضور نے اس کے ساتھ حلیمانہ سلوک کیا وہ کہتا ہے:

"considering his persistent opposition, Mahomet had upon the whole treated him throughout with much forebearance". (2)

"عبداللہ بن ابی کی مسلسل مخالفت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد (ﷺ) اس کے ساتھ ہمیشہ تحمل اور بردباری سے پیش آئے۔"

جو مستشرقین حضور ﷺ کی ان تمام اخلاقی خوبیوں کا خود اقرار کر رہے ہیں، وہ آپ کے خلاف لگائے جانے والے اخلاقی الزامات کی خود تردید کر رہے ہیں۔ یہ حضور ﷺ کی اخلاقی عظمت کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے۔

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 9

2۔ ایضاً، صفحہ 205

تعدّد ازواج
کا
مسئلہ اور مُستشرِقین

تعدد ازواج کا مسئلہ اور مستشرقین

اسلام اپنے پیروکاروں کو زندگی کے ہر شعبے کے متعلق راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ انسان کی نجی زندگی کے لئے بھی راہنما اصول پیش کرتا ہے اور قومی زندگی کے لئے بھی۔ اسلام کی تعلیمات انسان کی روحانی اور اخلاقی ضروریات کو بھی پورا کرتی ہیں اور اس کی مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے بھی راہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ جو چیزیں انسان کی شخصیت یا سماجی زندگی کے لئے مفید ہیں، اسلام ان کو ضروری قرار دیتا ہے اور جن چیزوں سے انسان کو اپنی نجی یا معاشرتی زندگی میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، اسلام ان کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

انسانی نسل کی افزائش اور انسانوں کے باہمی تعلقات کا انحصار مرد اور عورت کے باہمی تعلق پر ہے۔ کسی معاشرے میں یہ تعلق جتنا مضبوط، منظم اور منضبط ہوگا، وہ معاشرہ اتنا ہی پرامن اور خیرات و برکات کا حامل ہوگا۔ اور جس معاشرے میں اس تعلق کے کوئی متعین ضوابط نہ ہوں گے، اس معاشرے کی مثال اس جنگل کی سی ہوگی جہاں جانوروں کی دونوں صنفیں، بغیر کسی قاعدے کلیے کے، اختلاط کے عمل سے گزرتی ہیں اور اس طرح جانوروں کی افزائش نسل کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو انسانی زندگی کے اکثر شعبوں کی طرح یہ شعبہ بھی بغیر کسی قاعدے کلیے کے چل رہا تھا۔ ایک مرد کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں اور ایک عورت کے کئی کئی خاوند ہوتے تھے۔ اس صورت حال سے انسانی معاشرہ جس قسم کے مسائل سے دوچار ہو سکتا ہے اس کے تصور ہی سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہودیت اور عیسائیت کا زمانہ اسلام سے پہلے کا تھا لیکن ان مذاہب نے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے کسی قسم کی کاروائی نہ کی تھی۔ یہ بات ممکن نہیں تھی کہ اسلام، جو دین رحمت ہے، وہ بھی یہودیت اور نصرانیت کی طرح انسانی زندگی کے اس اہم ترین شعبے کو نظر انداز کر دیتا اور اس کے متعلق کسی قسم کے قوانین انسانیت کے سامنے پیش نہ کرتا۔

اسلام نے اس شعبے کے لئے تفصیلاً قوانین پیش کئے۔ عورت کو ایک سے زیادہ خاوند رکھنے سے منع کیا۔ مرد کے لئے بیویوں کی تعداد مقرر کی۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے جواز کے لئے شرائط مقرر کیں۔ وضاحت کے ساتھ بتایا کہ کن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ خاوند اور بیوی کے حقوق و فرائض کا تعین کیا۔ مرد کو بیوی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا اور بیوی کو خاوند کی فرماں برداری کی تلقین کی۔ زوجین کے باہمی اختلافات کے تباہ کن نتائج سے گھر اور معاشرے کو محفوظ رکھنے کیلئے تدابیر کیں۔ انتہائی ناگزیر حالات میں زوجین کی علیحدگی کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس کے لئے تفصیلی قواعد و ضوابط بیان فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ازدواجی زندگی کے یہ جملہ قواعد و ضوابط اتنے اہم تھے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس قسم کے تقریباً تمام احکامات کو قرآن حکیم کی شکل میں نازل فرمایا اور ان تمام کی پیروی ملت اسلامیہ پر فرض قرار دی۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو بیویوں کی تعداد کے متعلق یہ حکم دیا:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ (1)

"اور اگر ڈرو تم اس سے کہ نہ انصاف کر سکو گے تم یتیم بچوں کے معاملہ میں (تو ان سے نکاح نہ کرو) اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو، تین تین اور چار چار۔ اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی یا کنیزیں جن کے مالک ہوں تمہارے دائیں ہاتھ۔ یہ زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم ایک طرف ہی نہ جھک جاؤ۔"

خاوند اور بیوی کے مقدس تعلق کو خالق انس و جان نے ان حسین الفاظ میں بیان فرمایا:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (2)

1۔ سورۃ النساء 3

2۔ سورۃ البقرہ 187

"وہ تمہارے لئے پردہ، زینت اور آرام ہیں اور تم ان کے لئے پردہ، زینت اور آرام ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے گھر کے نظام کو منظم طور پر چلانے کے لئے اپنے حبیب ﷺ کی امت کو یہ حکیمانہ قانون عطا فرمایا:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (1)

"مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر، اس وجہ سے کہ فضیلت دی ہے اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر، اور اس وجہ سے کہ مرد خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں سے (عورتوں کی ضرورت و آرام کے لئے)۔"

مردوں اور عورتوں کے حقوق متعین کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (2)

"اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق، البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید ان پر جلال الفاظ میں فرمائی:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (3)

1۔ سورۃ النساء 34

2۔ سورۃ البقرہ 228

3۔ سورۃ النساء 21-19

"اور زندگی بسر کرو اپنی بیویوں کے ساتھ عمدگی سے۔ پھر اگر تم ناپسند کرو انہیں تو (صبر کرو) شاید تم ناپسند کرو کسی چیز کو اور رکھ دی ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں (تمہارے لئے) خیر کثیر۔ اور اگر تم ارادہ کرلو کہ بدلو ایک بیوی کو پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال، تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز۔ کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے اور کیوں کر (واپس) لیتے ہو تم مال کو حالانکہ مل جل چکے ہو تم (تنہائی میں) ایک دوسرے سے اور وہ لے چکی ہیں تم سے پختہ وعدہ۔"

قرآن حکیم نے تفصیلاً یہ بھی بتایا کہ کون سی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے اور کون سی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ قرآن حکیم نے طلاق اور عدت کے مسائل بھی تفصیل سے بیان کر دیئے تاکہ مسلمانوں کی خانگی اور ازدواجی زندگی میں کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ عورتوں اور مردوں، سب کو اپنے حقوق کا بھی علم ہو اور اپنے فرائض کا بھی۔ انہیں یہ بھی پتہ ہو کہ ازدواجی زندگی میں کون سا فعل خدا کی رضا کا باعث ہے اور کون سا کام اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنے گا۔

چاہئے تو یہ تھا کہ دنیا بھر کے اہل علم اسلام کی ان بے نظیر تعلیمات کی وجہ سے اس کی عظمت کا اعتراف کرتے اور ان زندگی بخش تعلیمات کو اپنی نجی اور اجتماعی زندگیوں میں اپنا کر، انسانی معاشرے کو رشک جنت بناتے لیکن مستشرقین نے اسلام کی ان نورانی تعلیمات کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا۔ مستشرقین چونکہ قرآن حکیم کو حضور ﷺ کے دماغ کی اختراع قرار دیتے ہیں اس لئے وہ ان قرآنی آیات کو بھی حضور ﷺ کے کردار کو داغ دار کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تعدد ازواج کے مسئلے پر وہ تین پہلوؤں سے حضور ﷺ اور آپ کے دین پر حملہ کرتے ہیں۔ اولاً، وہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت کو خواہش پرستانہ تعلیم قرار دے کر اسلام پر حملہ کرتے ہیں۔ ثانیاً، وہ حضور ﷺ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی امت کے مردوں کے لئے بیویوں کی جو حد مقرر کی، آپ نے خود اس پر عمل نہیں کیا اور اپنے لئے بیویوں کی تعداد کی کسی حد کو قبول نہیں کیا۔ ثالثاً، وہ حضرت زینب بنت جحش رضی

اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور ﷺ کی شادی کو ایک افسانہ محبت بنا کر پیش کرتے ہیں اور اسطرح حضور ﷺ کو بندہ خواہشات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ذیل میں ان تینوں پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کریں گے۔

تعدد ازواج کے اسلامی قانون پر مستشرقین کے تبصرے

اسلام نے مسلمانوں کی ازدواجی زندگی کے لئے جو حکیمانہ احکام دیئے ہیں، ان کی ایک جھلک قرآنی آیات کے حوالے سے قارئین کرام سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب ہم وہ نتائج قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو ان تعلیمات سے مستشرقین نے اپنے تخیل کے زور پر اخذ کیے ہیں۔ منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

"We conclude, then, that virilocal polygyny, or the multiple virilocal family, which for long was the distinctive feature of Islamic society in the eyes of Christendom, was an innovation of Muhammad's. There may have been some instances of it before his time, but it was not widespread, and it was particularly foreign to the outlook of the Medinans." (1)

"ایک خاوند اور کئی بیویوں پر مشتمل گھرانہ جو مدتوں عیسائیوں کی نظروں میں اسلامی معاشرے کی خصوصی پہچان رہا، وہ محمد (ﷺ) کے ذہن کی اختراع تھی۔ ممکن ہے آپ سے پہلے اس کی چند مثالیں موجود ہوں لیکن یہ رسم عام نہ تھی اور خصوصاً اہل مدینہ کے لئے یہ بات بالکل نئی تھی۔"

منٹگمری واٹ "سورۂ نساء" کی وہ آیت تحریر کرتا ہے جس میں چار تک بیویوں کی اجازت دی گئی ہے اور اس پر یہ تبصرہ کرتا ہے:

"The interesting point is that the verse is not placing a limit on a previous practice of unlimited polygyny. It is not saying to men who had six or ten wives, you shall not marry more than four. On the contrary it is encouraging men who had only one wife (or perhaps

---

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 277

two) to marry upto four. It is not the restriction of an old practice but the introduction of something new." (1)

"دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ یہ آیت لامحدود کثرت ازواج کی سابقہ رسم کی حد بندی نہیں کر رہی۔ جن لوگوں کی چھ یا دس بیویاں تھیں، یہ آیت ان سے یہ نہیں کہہ رہی کہ تمہیں چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں۔ اس کے برعکس جن لوگوں کی ایک بیوی تھی یا دو بیویاں تھیں، یہ آیت ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے کہ وہ چار تک شادیاں کریں۔ اس آیت میں کسی پرانی رسم پر پابندی نہیں لگائی جا رہی بلکہ ایک نئی چیز متعارف کرائی جا رہی ہے۔"

اس مفروضے میں منٹگمری واٹ دیگر مغربی علماء کو بھی اپنا ہم خیال بتاتا ہے اور کہتا ہے:

"European scholars have recognized that this verse of the Quran is an exhortation and not a restriction, and have further asserted that there are no clear cases of polygyny at Medina before Islam". (2)

"مغربی علماء نے قرآن کی اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس میں زیادہ شادیوں کی ترغیب دی جا رہی ہے، ان پر پابندی عائد نہیں کی جا رہی۔ مغربی علماء نے اس حقیقت پر بھی زور دیا ہے کہ مدینہ میں اسلام سے پہلے کثرت ازواج کی مثالیں ناپید ہیں۔"

منٹگمری واٹ نکاح کو ایک ایسی اصطلاح قرار دیتا ہے جو زن و مرد کے اختلاط کی ہر اس صورت کو شامل ہے جو اسلام سے پہلے مروج تھی۔ چونکہ مسلمان شادی کے لئے نکاح کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس لئے مستشرق مذکور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک بھی "نکاح" کا لفظ اسی وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"The Arabic word nikah, usually translated "mariage," is wider in meaning than its European equivalents. its sense in Islamic law has been defined as a contract for the legalization of intercourse and the procreation of

---

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 274

2۔ ایضاً، صفحہ 275

children. Forms of union sanctioned by custom in Pre-Islamic Arabia are called types of nikah in Arabic, though in European languages some of them are nearer to prostitution than to marriage." (1)

"عربی لفظ نکاح جس کا ترجمہ اکثر "میرج" کیا جاتا ہے، اس کے مفہوم میں یورپی زبانوں کے ان الفاظ کی نسبت زیادہ وسعت ہے جو اس لفظ کے ہم معنی ہیں۔ اسلامی قانون میں لفظ "نکاح" کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ وہ معاہدہ ہے جس کے ذریعے مرد وزن کے اختلاط اور بچوں کی پیدائش کو قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے کی عربی رسمیں مرد وزن کے اختلاط کی جن صورتوں کو جائز قرار دیتی تھیں انہیں عربی میں نکاح کی قسمیں کہا جاتا ہے، گو مغربی زبانوں میں اختلاط کی یہ صورتیں شادی کی نسبت عصمت فروشی سے زیادہ قریب ہیں۔"

منٹگمری واٹ نے اپنے تخیل کے زور پر اسلام کے قوانین نکاح پر اسی قسم کے عجیب و غریب تبصرے کئے ہیں۔ ہم نے یہاں صرف قارئین کو مستشرقین کے انداز فکر سے متعارف کرانے کے لئے چند اقتباسات نقل کئے ہیں۔ تعدد ازواج کے اسلامی قانون کے متعلق اکثر مستشرقین کا رویہ وہی ہے جو منٹگمری واٹ کا ہے۔ کئی نام نہاد مسلمان جو اسلامی علوم کو اسلامی مصادر سے حاصل کرنے کی بجائے مغربی مصنفین کی کتابوں سے حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں وہ بھی اسلام کے اس قانون سے ناخوش رہتے ہیں اور غالباً اس دین کا پیروکار ہونے پر خجالت بھی محسوس کرتے ہیں جو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔

تعدد ازواج کے مسئلہ پر اسلام کا موقف بیان کرنے سے پہلے ہم یہ وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ تعدد ازواج کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو انسان تصور کیا جائے اور اسے عام حیوانوں کی محض ایک قسم قرار نہ دیا جائے۔ حیوانوں میں بھی جنسی اختلاط کا عمل ہوتا ہے لیکن ایک حیوان کا یہ عمل صرف جنسی خواہش کی تسکین کے لئے ہوتا ہے۔

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 78-277

حیوانوں کے اس عمل کے نتیجے میں افزائش نسل کا عمل رونما ہوتا ہے لیکن اس میں حیوان کے ارادے یا خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

شادی کا مقصد

اگر انسانوں میں بھی جنسی اختلاط کا وہی واحد مقصد قرار دیا جائے جو حیوانوں کے پیش نظر ہوتا ہے تو پھر واقعی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کو جنس پرستی کہا جا سکتا ہے اور جس شخص کی متعدد بیویاں ہوں اسے بھی جنس پرست اور عیاش کہا جا سکتا ہے لیکن اگر انسان کو انسان تصور کیا جائے اور ازدواج کو انسانی معاشرے کا ایک اہم ترین ادارہ قرار دیا جائے تو پھر تعدد ازواج کے قانون پر تنقید کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ آیا یہ قانون معاشرے کے مفاد میں ہے یا اس سے انسانی معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے؟ یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ یہ قانون زوجین کے لئے مفید ہے یا مضر۔ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شادی کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ جو لوگ تعدد ازواج کو عیش پرستی قرار دیتے ہیں لیکن عصمت فروشی کو قانونی جواز مہیا کرتے ہیں، ہمیں علم نہیں کہ ان لوگوں کے نزدیک شادی کس مقصد کے لئے ہوتی ہے لیکن اسلام کے نزدیک شادی ایک معاشرتی ادارہ ہے جس کو بے شمار مقاصد حاصل کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

اسلام ایک ایسی قوم تیار کرنا چاہتا ہے جس کے افراد کی زندگیوں میں خیر کے جلوے ضیا بار ہوں اور ان کے دامن شر کے داغوں سے پاک ہوں۔ یہ قوم نہ صرف خود شر سے کنارہ کش ہو کر خیر پر کاربند رہے بلکہ ساری نسل انسانی کو خیر کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کوئی آسان کام نہیں۔ جو لوگ اس کام کے لئے میدان عمل میں آتے ہیں انہیں نمرود، فرعون، قارون، ھامان، ابو جہل اور ابو لہب جیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ وہی افراد یا جماعتیں ٹکر لے سکتی ہیں جو ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں، اور جرات کے ساتھ ان کے سامنے کلمہ حق کہہ سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے جس قوم کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مشکل فریضہ سونپا ہے، اس نے اس قوم کو اس فریضہ سے کامیابی کے ساتھ سبکدوش ہونے کے لئے یہ حکم دیا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ (1)

"اور تیار رکھوان کے لئے جتنی استطاعت رکھتے ہو، قوت و طاقت اور بندھے ہوئے گھوڑے تاکہ تم خوف زدہ کردو اپنی جنگی تیاریوں سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اور دوسرے لوگوں کو ان کھلے دشمنوں کے علاوہ۔"

جولوگ خیر کے دشمن ہیں وہ خدا کے بھی دشمن ہیں اور ملت اسلامیہ کے بھی دشمن ہیں۔ ایسے دشمنوں کو خوف زدہ رکھنے کیلئے مسلمانوں کو قوت حاصل کرنے کا حکم مل رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ترقی، آج کے دور میں، دشمن کو جارحانہ عزائم سے باز رکھنے کے لئے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ مسلمانوں کو اس میدان میں ترقی کے لئے بھی اپنے پورے وسائل بروئے کار لانے کی ضرورت ہے، لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ اتفاق واتحاد ایسی قوتیں ہیں جن کے بغیر کسی قوم کو وقار حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے ملت اسلامیہ میں ان خصوصیات کو پیدا کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے اور اس نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (2)

"بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پرا باندھ کر گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔"

حضور ﷺ نے مسلمانوں کی اس صفت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى عُضْوًا تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ جَسَدِهٖ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى (3)

1۔ سورۃ الانفال: 60

2۔ سورۃ الصف: 4

3۔ صحیح البخاری، جلد 4، صفحہ 53، کتاب الادب

"باہمی محبت اور رحمت میں مسلمانوں کی مثال ایک جسم کی ہے۔ جس طرح جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم بے چین ہو جاتا ہے اسی طرح ملت اسلامیہ کا ایک فرد مبتلائے مصیبت ہو تو ساری ملت اس کا درد محسوس کرتی ہے۔"

گویا اسلام جو ملت قائم کرنا چاہتا ہے اس کا فریضہ ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ اس فریضے کو ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم قوت و شوکت کی دولت سے بہرہ ور ہو۔ قوت و شوکت کے لئے ضروری ہے کہ اس ملت کی صفوں میں اتفاق اور اتحاد ہو اور مسلمان ایک دوسرے کے لئے ایثار اور قربانی کے جذبات سے سرشار ہوں۔ اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق جو چیزیں ملی شان و شوکت اور قوت و عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہوں، ان چیزوں کے حصول کے لئے ساری ملت ہمہ وقت کوشاں رہے۔

اسلام نے اس مثالی امت کے قیام کے لئے گھر کو پہلا مدرسہ قرار دیا ہے اور اس گھر کی بنیاد رشتہ ازدواج پر قائم ہوتی ہے۔ وہ گھر جس میں نہ صرف مرد جمع ہوتے ہیں، نہ صرف عورتیں اور نہ صرف بچے بلکہ گھر وہ جگہ ہے جہاں ملت کے تمام عناصر ترکیبی جمع ہو جاتے ہیں۔

اسلام چاہتا ہے کہ ملت اسلامیہ کے اس بنیادی مدرسہ میں سکون ہو، محبت ہو اور رحمت ہو تاکہ یہ سکون، یہ محبت اور یہ رحمت گھر کے افراد میں ایک دوسرے کے لئے اعتماد اور ایثار کے جذبات پیدا کریں۔ یہ محبت گھر سے نکل کر خاندان میں اور خاندان سے نکل کر پوری ملت میں اپنی تنویرات دکھائے تاکہ ملت ان خوبیوں سے بہرہ ور ہو جن کی بدولت وہ اپنا فریضہ منصبی آسانی سے ادا کر سکے۔

قرآن حکیم نے رشتہ ازدواج کا مقصد یہ بیان فرمایا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (1)

"اور اس کی (قدرت کی) ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے پیدا فرمائیں

1۔ سورۃ روم 21

تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں تاکہ تم سکون حاصل کرو ان سے اور
پیدا فرمادیئے تمہارے درمیان محبت اور رحمت (کے جذبات) بے شک
اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

انسانی زندگی کا سفر انتہائی کٹھن ہے، اس میں انسان کو انتہائی صبر آزما حالات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس کو اپنی زندگی میں ایسے ایسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہ اس کی جسمانی، ذہنی اور فکری صلاحیتیں شل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہ کیفیت انسان کی قوت کار کو نہ صرف کم کرتی ہے بلکہ اسے ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ پروردگار عالم جو رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی، اسے اپنے بندوں کی اس کمزوری کا علم ہے اس لئے اس نے ایسے انتظامات فرمادیئے ہیں کہ تھکا ماندہ انسان پھر تازہ دم ہو کر ایک نئے جذبے اور نئے ولولے کے ساتھ اپنے سفر پر گامزن ہو جاتا ہے۔

انسان کا جسم جب مسلسل کام سے تھک جاتا ہے تو اس کی تھکاوٹ کو دور کرنے اور اس کی قوت کار کو ایک نئی زندگی عطا کرنے کے لئے نیند جیسی نعمت پیدا فرمائی گئی ہے۔ نیند انسان کی تھکاوٹ کو ختم کر کے اس کو نئے سرے سے پوری قوت کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہونے کے قابل بنا دیتی ہے۔ قرآن حکیم نے بیوی کی بھی یہی اہمیت بیان فرمائی ہے کہ خاوند جب زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرتے کرتے تھک جائے، اس کی جسمانی صلاحیتیں مزید کام کرنے کے قابل نہ رہیں، ہجوم مصائب اسے پریشان کر دے، تو گھر پہنچنے پر اسے اپنی رفیقہ حیات کی محبت، ایثار، خلوص اور اپنائیت کے سائے میں سکون ملے۔ اسے دیکھتے ہی اس کی تھکاوٹ ختم ہو جائے۔ اس کی رفاقت کا احساس اسے زندگی کی تلخیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ولولہ تازہ عطا کرے۔ جب وہ زندگی کے ہنگاموں میں دن کے طویل اور صبر آزما لمحے گزار کر شام کو گھر پہنچے تو سکون، مودت اور رحمت کی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ ساری کلفتیں بھول جائے۔ زندگی اسے عذاب محسوس نہ ہو بلکہ وہ اسے ایک انمول عطیہ خداوندی شمار کرے اور خدا کی اس بے پایاں نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے اس کے احکام کی پیروی میں لگ جائے۔ یہ سکون وہ چیز ہے جس سے وہ لوگ قطعاً نا آشنا ہیں جو اسلام کے رحیمانہ قوانین پر تنقید کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں کچھ تقاضے ودیعت کر دیئے ہیں۔ یہ تقاضے پورے نہ

ہوں تو بھی انسان سکون کی دولت سے محروم رہتا ہے اور اگر ان تقاضوں کو کسی قاعدے کلیے کے بغیر پورا کرنے کی کوشش کی جائے تو بھی انسان سکون کی بجائے بے سکونی کا شکار ہو جاتا ہے۔

انسانی فطرت چاہتی ہے کہ کوئی اس پر اعتماد کرنے والا ہو۔ کوئی اس سے محبت کرتا ہو۔ کسی کے دل میں اس کے لئے خلوص اور ایثار کے جذبات موجزن ہوں۔ کوئی ایسا ہو جس کے سامنے وہ اپنے دل کی وہ باتیں کہہ سکے جو عام لوگوں کے سامنے نہیں کہی جا سکتیں۔ صنف مخالف سے قرب کی خواہش بھی انسانی فطرت کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا ہے۔ اسلام جو دین رحمت ہے، جو دین فطرت ہے اس نے گھر کو ایک ایسا مرکز بنا دیا ہے جس میں انسانی فطرت کے ان تمام تقاضوں کو پورا کرنے کا بندوبست ہوتا ہے۔ جو دو انسان ایک دوسرے کے ان فطری تقاضوں کو پورا کرنے کا سبب بنتے ہیں، ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت وایثار کے وہ جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی بدولت انسان زندگی کی ہر تلخی کا مقابلہ خندہ پیشانی کے ساتھ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

چونکہ رشتہ ازدواج کا مقصد یہ ہے کہ زوجین سکون، مودت اور رحمت کی نعمت سے بہرہ ور ہوں اس لئے اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے لئے اس کو شریک حیات کے طور پر منتخب کریں جو شادی کے اس عظیم مقصد کو پورا کر سکے۔ انسانوں کی طبیعتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر مرد ہر عورت کے ساتھ رہ کر سکون حاصل کر سکے یا ہر عورت کے لئے ہر مرد سکون کا باعث ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رفیق حیات کے انتخاب کو اسلام نے مرد اور عورت کے اپنے اختیار پر چھوڑا ہے اور ان کو یہ اختیار دینے کے بعد ان کی ایسی راہنمائی فرمائی ہے کہ اگر وہ اس راہنمائی کے مطابق اپنے اختیار کو استعمال کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ شادی کے یہ عظیم مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ حضور ﷺ نے اس سلسلے میں اپنی امت کی راہنمائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِخَیْرِ مَا یَکْنِزُ الْمَرْءُ؟ اَلْمَرْءَۃُ الصَّالِحَۃُ(1)

"کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ ایک انسان کے لئے سب سے عمدہ خزانہ

1۔ عبد القادر احمد عطا، "لماذا تزوج الرسول تسع نساء"، (دار البیان قاہرہ۔ 1978ء)، صفحہ 5

کیا ہے؟ سنو وہ پاکباز عورت ہے۔"

اس کے بعد حضور علیہ السلام نے خود اس بات کی وضاحت فرما دی کہ پاکباز عورت کون سی ہے، فرمایا:

اَلَّتِیْ اِذَا نَظَرَ اِلَیْھَا زَوْجُھَا سَرَّتْہُ وَاِذَا اَمَرَھَا اَطَاعَتْہُ وَاِذَا غَابَ عَنْھَا حَفِظَتْہُ (1)

"پاکباز عورت وہ ہے کہ جب اس کا خاوند اس کی طرف دیکھے تو مسرت محسوس کرے، جب خاوند اسے کوئی حکم دے تو اس کی اطاعت کرے، اور جب خاوند غیر حاضر ہو تو خاوند (کے گھر، عزت، اولاد اور مال) کی حفاظت کرے۔"

ایک اور مقام پر حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ (2)

"ایسی عورتوں سے شادی کرو جو محبت کرنے والی اور بچوں کو جنم دینے والی ہوں کیونکہ میں دیگر امتوں کے سامنے تمہاری کثرت کی وجہ سے فخر کروں گا۔"

جب عورت ایسی ہو جسے دیکھ کر خاوند کا دل مسرور ہو، جو اپنی اطاعت شعاری سے خاوند کا دل جیت لے، جسے خاوند اپنی عزت و آبرو اور مال و اولاد کا دیانت دار محافظ سمجھتا ہو، جس کے بطن سے اسے نیک اور صالح اولاد بھی عطا ہو، مرد کے لئے نہ اس سے بڑا کوئی خزانہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس کو وہ سکون مہیا کر سکتی ہے، جو سکون اسے اس پاکباز رفیقہ حیات کے قرب میں محسوس ہوتا ہے۔

ازدواجی مسائل اور ان کا حل

جب شادی کے تمام مقاصد پورے ہو رہے ہوں تو شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو کسی نئی تدبیر سے گھر کے اس رشک جنت ماحول کو مکدر کرنے کی غلطی کرے۔ اس صورت میں

1۔ عبدالقادر عطا، "لماذا تزوج الرسول تسع نساء"، (دار البیان قاہرہ۔1978ء)، صفحہ 5

2۔ ایضاً، صفحہ 6

ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت بھی اسے دوسرے نکاح کی طرف مائل نہیں کر سکتی، کیونکہ اس صورت میں اسے خدشہ ہوتا ہے کہ شاید دوسری شادی کے بعد گھر میں وہ ماحول برقرار نہ رہ سکے جس میں رہنے کا وہ عادی ہو چکا ہے، لیکن بے شمار صورتیں ایسی بھی پیش آجاتی ہیں جب شادی کے مقاصد کماحقہ پورے نہیں ہوتے۔ گھر بھی ہوتا ہے، خاوند اور بیوی بھی اس گھر میں موجود ہوتے ہیں لیکن وہاں سکون موجود نہیں ہوتا۔ گھر میں سکون نہ ہونے کی وجوہات کچھ بھی ہوں، اس بے سکونی کا ذمہ دار مرد ہو یا عورت، گھر ہو اعتماد نہ ہو، میاں بیوی ہوں بچے نہ ہوں، دو انسان رشتہ ازدواج میں منسلک ہوں لیکن ان کی طبیعتیں آپس میں نہ ملتی ہوں، بیماری یا کسی آفت نے زوجین میں سے کسی ایک کو فریضہ زوجیت کے قابل نہ چھوڑا ہو، ان تمام صورتوں میں "Status quo" کا حکم نافذ کر دینا نہ تو مصلحت ہے اور نہ ہی اس طرح ازدواج کے اہم ترین معاشرتی ادارے سے کماحقہ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اسلام متبادل راستے تجویز کرتا ہے تاکہ شادی کے مقاصد کماحقہ پورے ہو سکیں۔

اگر گھر میں یہ سقم عورت کی وجہ سے ہو، اگر خاوند یہ سمجھتا ہو کہ اس کے گھر میں بے سکونی کی ذمہ دار عورت ہے تو اس کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس عورت کے گھر میں رہتے ہوئے سکون قطعی طور پر ممکن نہیں اور اس کے نزدیک اس عورت کے ساتھ نباہ کرنے کی کوئی صورت نہیں تو مرد کو شریعت اجازت دیتی ہے کہ وہ اس عورت کو عمدہ طریقے سے فارغ کر دے اور کسی ایسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے لے جس کے ذریعے زوجیت کے جملہ مقاصد پورے ہو سکیں۔ اور اگر خاوند یہ سمجھتا ہو کہ اس بیوی کے گھر میں رہتے ہوئے دوسری عورت کے ذریعے ان مقاصد زوجیت کو حاصل کیا جا سکتا ہے جن کی تکمیل اس پہلی بیوی کے بس میں نہیں تو مرد کو اجازت ہے کہ وہ چار تک عورتوں کو اپنے نکاح میں جمع کر لے۔ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وہ ان تمام عورتوں کے ساتھ عادلانہ سلوک کرے اور اگر وہ اس شرط کو پورا نہ کر سکے تو اسے حکم ہے کہ ایک ہی بیوی پر قناعت کرے۔

ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت کو عدل سے مشروط کرنے میں بھی ایک بہت بڑی حکمت ہے۔ یعنی اگر مرد اپنے گھر میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھے گا اور ان کے درمیان

عدل قائم کرنے میں ناکام رہے گا تو اس صورت میں وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے تحت ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ بلکہ سرے سے شادی کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ کیونکہ جس گھر کے کچھ افراد یہ محسوس کریں گے کہ اس گھر میں ان کی حق تلفی ہو رہی ہے اور ان کے حقوق پورے نہیں ہو رہے، وہ گھر تسکین اور رحمت و مودت کا گہوارہ نہیں ہو گا بلکہ وہ گھر میدان جنگ کی شکل اختیار کرلے گا۔ اس گھر سے حسد، رقابت اور عناد کے شعلے ابھریں گے، جو گھر کے ہر فرد کے سکون کو برباد کردیں گے۔ آج کل کے جو مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور عدل کی شرط کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے، ان کے گھروں کی حالت عبرت ناک ہوتی ہے۔ بیویوں کی باہمی چپقلش خاوند کا سکون برباد کردیتی ہے۔ وہ دن بھر کے کام سے تھکا ماندہ گھر پہنچتا ہے تو گھر اسے سکون مہیا کرنے کی بجائے طرح طرح کے جنجالوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی جو بیوی یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا، اس کے دل میں تو خاوند کے خلاف منفی جذبات ہوتے ہی ہیں، اس کی اپنی اولاد جو اس ناراض بیوی کے بطن سے ہوتی ہے، ان کے دلوں میں بھی اپنے والد کے خلاف نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے حکم دیا ہے کہ اگر تم ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل قائم نہ رکھ سکو تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔

اسلام نے جس طرح مرد کو ناگزیر حالات میں ایک بیوی کی جگہ دوسری عورت کو اپنی زوجیت میں لینے کی اجازت دی ہے، اسی طرح اگر عورت یہ محسوس کرے کہ اس کا خاوند اس کے ازدواجی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے اور اس مرد کے ساتھ رہتے ہوئے اس کے مقاصد زوجیت پورے نہیں ہو رہے تو عورت بھی عدالت کے ذریعے اس مرد سے علیحدگی حاصل کرسکتی ہے اور عدت گزارنے کے بعد اپنی مرضی کے مرد سے دوسری شادی کرسکتی ہے۔

مندرجہ بالا بحث میں صرف ایک گھر اور میاں بیوی کے حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن اسلام کا ہر قانون پورے معاشرے کے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اگر کسی ملک کی نصف آبادی اپنے اپنے گھروں میں سکھ اور چین سے زندگی بسر کر رہی ہو اور باقی نصف آبادی اس نعمت سے محروم ہو تو جن لوگوں کو سکھ اور چین میسر ہے، ان کا سکھ اور چین بھی

دیرپا نہیں ہوگا۔ کیونکہ کسی معاشرے کا جو طبقہ احساس محرومی کا شکار ہو وہ اس قسم کی حرکتیں کرنے لگتا ہے جن سے سارے معاشرے کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں ایک ہزار مرد اس وجہ سے سکون کی دولت سے محروم ہوں کہ ان کی بیویاں بیمار ہیں، بانجھ ہیں یا ان کے ازدواجی تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل نہیں اور اسی معاشرے میں کئی ہزار عورتیں ایسی موجود ہوں جو مردوں کی تعداد کی کمی کی وجہ سے ازدواجی خوشیوں سے محروم ہوں اور ملک کا قانون نہ خاوند کو بیوی بدلنے کی اجازت دیتا ہو اور نہ ایک سے زیادہ عورتوں کو اپنے نکاح میں جمع کرنے کی اجازت دیتا ہو تو اس ملک اور معاشرے میں سکون کہاں سے آئے گا؟ اسی قسم کی صورت حال سے عہدہ برا ہونے کے لئے اسلام نے تعدد ازواج کی اجازت دی ہے۔

اسلام نے تعدد ازواج کی اجازت دیتے وقت مرد اور عورت کے حالات کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور پورے معاشرے کے حالات کو بھی۔ مستشرقین اسلام کے اس حکیمانہ رویے سے خوش نہیں اور وہ تعدد ازواج کے رحیمانہ قانون کی وجہ سے اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ دین اپنے پیروکاروں کو خواہش پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔

تعدد ازواج کی رسم اسلام سے پہلے

مستشرقین کے اس الزام کے جواب کیلئے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ آیا اسلام سے پہلے تعدد ازواج کا قانون موجود تھا یا نہیں۔ اگر اسلام سے پہلے تعدد ازواج کا قانون موجود تھا تو یہودیت اور عیسائیت، جو مستشرقین کے پسندیدہ دین ہیں، انہوں نے اس قانون کو ختم کرنے کے لئے کیا کوششیں کی تھیں؟ اسلام نے جن خانگی مسائل کا حل تعدد ازواج کی شکل میں پیش کیا ہے ان مسائل سے نبٹنے کے لئے دیگر ادیان نے یا نظام ہائے حیات نے کیا تدابیر کی ہیں؟ عورتوں کے لئے، اجتماعی طور پر، ایک خاوند ایک بیوی والا قانون زیادہ مفید ہے یا تعدد ازواج کا قانون؟

گزشتہ صفحات میں منٹگمری واٹ کے جو اقتباسات درج کئے گئے ہیں، ان میں وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ تعدد ازواج کا قانون اسلام کی اختراع ہے، اسلام سے پہلے یہ قانون عام نہیں تھا اور خصوصاً مدینہ کے لوگ تو تعدد ازواج کے قانون سے کلیۃً ناآشنا تھے۔

منٹگمری واٹ کا یہ کہنا نہ صرف غلط ہے بلکہ جھوٹ بھی ہے اور تاریخ کے ساتھ مذاق بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے پہلے نہ تو بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی تھی اور نہ ہی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لئے کوئی شرط تھی۔ ہر مرد آزاد تھا کہ جتنی چاہے بیویاں رکھے اور ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ منٹگمری واٹ، جو دعویٰ کر رہا ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں میں ایک سے زیادہ بیویوں کا رواج نہ تھا، وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ اسلام سے پہلے بھی ایک خاوند کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی تھیں۔ وہ لکھتا ہے:

"A man of Taif is said to have had ten wives, apparently at once". (1)

"کہا جاتا ہے کہ طائف کے ایک آدمی کی دس بیویاں تھیں اور بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ وہ سب بیک وقت اس کے نکاح میں تھیں۔"

لیکن منٹگمری واٹ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ ایک آدمی کی دس بیویاں تھیں، یہ کہتا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ دس بیویاں کس سماجی نظام کے مطابق تھیں، اس لئے ہم اس ایک آدمی کے عمل کو عام قانون تصور نہیں کر سکتے۔ اس گفتگو سے منٹگمری واٹ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ مدینہ میں یہ رواج نہیں تھا کہ ایک آدمی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں جو اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہتیں۔

جس طرح یہاں منٹگمری واٹ نے اپنے موقف کی مخالفت کرنے والی دلیل کو توڑ مروڑ کر اپنے موقف کے حق میں استعمال کیا ہے اسی طرح اس نے ایک اور قلابازی بھی کھائی ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ابن سعد نے ایسے لوگوں کی فہرست دی ہے جن کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں لیکن وہ کہتا ہے کہ اس فہرست سے تعدد ازواج کی رسم اس لئے ثابت نہیں ہوتی کیونکہ ایسی عورتیں بھی تھیں جن کے ایک سے زیادہ خاوند تھے۔ اس حقیقت کی وجہ سے یہ فہرست زیادہ بیویوں کی رسم کے موجود ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ مستشرق موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"Ibn Sa'd's biographies, of course, have numerous examples of men who had more than one wife, but this is balanced by the examples of women with more

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 276

than one husband". (1)

"ابن سعد کی تاریخ میں بے شمار مثالیں ایسی ہیں جن میں ایک مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں لیکن چونکہ ایسی عورتوں کی مثالیں بھی موجود ہیں جن کے ایک سے زیادہ خاوند تھے، اس لئے حساب برابر ہو جاتا ہے۔"

جو لوگ تاریخی حقائق سے اس طرح کے نتیجے نکال سکتے ہیں وہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے دین اور اس کے پیغمبر ﷺ کی ذات میں وہی شخص کیڑے نکال سکتا ہے جس کا معیار تحقیق یہی ہو ورنہ حقیقی محقق نہ رات کو دن کہہ سکتا ہے اور نہ ہی سورج کو بے نور کہنے کی جسارت کر سکتا ہے۔

منٹگمری واٹ جو کہتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب اور خصوصاً مدینہ میں ایک سے زیادہ بیویوں کا رواج نہ تھا، وہ خود کہتا ہے کہ عرب میں مدینہ سمیت کچھ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایک آدمی نے دو بہنوں کو بیک وقت اپنے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کر رکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"There are a few examples (including some from Medina) of a man marrying two sisters". (2)

"کچھ مثالیں ایسی ہیں، جن میں کچھ مثالیں مدینہ کی بھی ہیں، کہ ایک آدمی نے دو بہنوں سے شادی کر رکھی تھی۔"

مستشرقین خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام سے پہلے عرب میں تعدد ازواج کی رسم موجود تھی۔ عربوں کے متعلق تو شاید مستشرقین یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کریں کہ ان کے معاشرے میں تو ہر اخلاقی برائی موجود تھی، ان میں سے ایک برائی یہ بھی تھی، لیکن ہم مستشرقین کی توجہ اس تلخ حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ تعدد ازواج کی رسم صرف عربوں ہی میں موجود نہ تھی بلکہ مستشرقین کی اپنی قوم جو حزب مختار ہونے کی مدعی ہے ان میں بھی یہ رسم موجود تھی۔

اگر مستشرقین بائیبل کا بنظر غور مطالعہ فرمانے کی زحمت گوارا کریں تو انہیں بے شمار

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 275

2۔ ایضاً

ایسی مثالیں ملیں جہاں ایک آدمی کی کئی کئی بیویاں تھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داوٗد علیہ السلام کی متعدد ازواج پر بائیبل گواہ ہے۔ فرانس کے بادشاہ عیسائی تھے اور کلیسا ان کا پورا پورا احترام کرتا تھا، ان فرانسیسی بادشاہوں کی بھی کئی کئی بیویاں تھیں۔(1)

حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازواج کی رسم، طلوع اسلام سے صدیوں پہلے کی رسم ہے۔ یہ ہر معاشرے میں موجود رہی ہے بلکہ انتہائی گھناؤنی شکلوں میں موجود رہی ہے۔ اسلام سے پہلے تعدد ازواج کی جو رسمیں تھیں ان میں سے متعدد ایسی تھیں جن کی موجودگی میں نہ گھر کا سکون برقرار رہ سکتا تھا اور نہ ہی معاشرے کا۔ ایک مرد کی لاتعداد بیویاں ہوتی تھیں اور ایک عورت کے بے شمار خاوند۔ ان شادیوں کیلئے نہ کسی ضابطے کی پابندی ضروری تھی اور نہ ہی ازدواج کے معاشرتی ادارے کو منضبط رکھنے کیلئے کوئی قانون تھا۔ جو مذاہب اسلام سے پہلے آئے انہوں نے ان قبیح رسموں کو ختم کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ ہندومت بڑا پرانا مذہب تھا لیکن اس مذہب کی حالت یہ تھی کہ ہندوؤں کے ہیرو پانچ پانڈو بھائی ایک ہی عورت کے خاوند تھے۔ یہودیت اور عیسائیت الہامی مذاہب تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے دنیا میں تعدد ازواج کی متعدد قبیح رسمیں قائم رہیں لیکن انہوں نے ان رسموں کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا۔ جارج سیل کہتا ہے کہ کچھ یہودی علماء نے باہمی مشورے سے بیویوں کی تعداد کی حد چار مقرر کی تھی لیکن ان کا مذہبی قانون اس سلسلے میں ان پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔(2) عیسائیوں کے نزدیک بھی قانون وہی معتبر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو انجیل نازل ہوئی تھی اس کے متعلق بھی عیسائی یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ اس میں تعدد ازواج کی ممانعت کا کوئی قانون موجود تھا۔ اس سلسلے میں علامہ زکریا ہاشم زکریا رقم طراز ہیں:

قَدْ عَرَفْنَا اَنَّ تَعَدُّدَ الزَّوْجَاتِ مُبَاحٌ فِی الشَّرَائِعِ کُلِّهَا مِنْ اِبْرَاهِیْمَ اِلٰی مُوْسٰی وَ اِنَّنِیْ لَا اَظُنُّ اَنَّ الْاِنْجِیْلَ الَّذِیْ اُنْزِلَ اِلٰی عِیْسٰی حَرَّمَهٗ وَلٰکِنْ

1۔ زکریا، "المستشرقون والاسلام"، صفحہ 346

2۔ The Koran، صفحہ 104

الْمُفْسِدِيْنَ قَدْ فَهِمُوْا مِنْ شَرَائِطِ الْجَمْعِ بَيْنَ الزَّوْجَاتِ مَا سَاعَدَهُمْ عَلٰى فَهْمِ الْمَنْعِ فَحَرَّفُوْهَا هٰذَا التَّحْرِيْفَ(1)

"ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک تمام شریعتوں میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت تھی اور میں نہیں سمجھتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو انجیل نازل ہوئی تھی اس نے اس کی ممانعت کی ہو لیکن شریر لوگوں نے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لئے جو شرائط تھیں ان سے تعدد ازواج کی ممانعت سمجھی اور انجیل میں تحریف کر دی۔"

فرانسیسی بادشاہوں کا متعدد عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھنا اور اس کے باوجود اہل کلیسا کا ان بادشاہوں کا احترام کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا جائز تھا۔ اس گفتگو سے ثابت ہوا کہ اسلام سے پہلے تعدد ازواج کی رسم بغیر کسی قید اور ضابطے کے دنیا بھر میں موجود تھی اور کسی مذہب نے اس کی بیخ کنی کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ شرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے اس رسم کی ان تمام شکلوں کو ممنوع قرار دے دیا جن سے فرد یا معاشرے کا سکون برباد ہو سکتا تھا، جن سے نسب میں اختلاط کا اندیشہ تھا یا جن کی وجہ سے مقاصد زوجیت فوت ہونے کا خطرہ تھا۔

ازدواجی قوانین میں اسلام کی اصلاحات

اسلام نے سب سے پہلے تو یہ بتایا کہ تم کن عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو اور کن عورتوں سے نکاح تمہارے لئے حرام ہے۔ اسلام کے اس حکم نے ان تمام قباحتوں کا قلع قمع کر دیا جو محرمات سے شادی کی وجہ سے معاشرے میں پیدا ہوتی تھیں۔ وہ معاشرہ جس میں بھائی بہن سے شادی کرتا ہو، باپ بیٹی کو اپنی زوجیت میں لیتا ہو یا بیٹا اپنے باپ کی منکوحہ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتا ہو، اس معاشرے کو انسانی معاشرہ کہنا ہی ممکن نہیں ہے۔ بلکہ منٹگمری واٹ تو تسلیم کرتا ہے کہ اسلام نے محرمات کی جو فہرست دی ہے، ان میں

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 329

سے بعض عورتوں کو محرمات قرار دینا ایک نیا خیال تھا، وہ لکھتا ہے:

"The prohibition of marriage with a step daughter and probably also that with a daughter-in-law was novel, as well as that with a setp-mother". (1)

"سوتیلی بیٹی، بہو اور سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح کی ممانعت، ایک نیا خیال تھا۔"

یہی مستشرق ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"Some ideas about forbidden degrees may have come to Muhammad from the Jews, but he differs from the Jewish practice in forbidding marriage with nieces". (2)

"محرمات کے متعلق کچھ خیالات، ممکن ہے محمد (ﷺ) نے یہودیوں سے لئے ہوں لیکن بھتیجیوں اور بھانجیوں سے نکاح کی حرمت کے معاملے میں اسلام کا قانون یہودیوں کے عمل سے مختلف ہے۔"

جب یہودی اپنی بھتیجیوں اور بھانجیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی لعنت میں گرفتار تھے، تو اس دور کی دنیا میں اور کون ہوگا جو اس لعنت سے محفوظ ہوگا؟ یہ اعزاز صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے انسانیت کو اس قسم کی ننگ انسانیت حرکتوں سے باز آنے کا حکم دیا۔ اگر یہودیت اور عیسائیت میں اس قسم کا کوئی مثبت قانون تھا بھی تو وہ "بچوں کی روٹی کتوں کے سامنے ڈالنے" کے قائل نہ تھے اور جو قانون اس (بزعم خویش) لاڈلی قوم کے لئے تھا، اس میں وہ دیگر انسانوں کو اپنا ساتھی بنانے کے روادار نہ تھے۔

دوسرے نمبر پر اسلام نے حکم دیا کہ عورت بیک وقت ایک سے زیادہ خاوند نہیں رکھ سکتی کیونکہ اس طرح نسب کے مختلط ہونے اور معاشرے کا سکون برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔

تیسرے نمبر پر اسلام نے مرد پر پابندی عائد کر دی کہ وہ ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا۔ اسے چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ان تمام کے درمیان عدل قائم کر سکتا ہو۔ اگر عدل کرنے کے قابل نہ ہو تو اسے حکم ہے کہ صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 280

2۔ ایضاً، صفحہ 83

اسلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ صرف اس نے ہی غیر محدود بیویوں کی رسم کو ختم کیا اور بیویوں کی تعداد کی حد مقرر کی۔ منٹگمری واٹ کا یہ شور مچانا بے بنیاد ہے کہ اسلام نے متعدد بیویوں والے مردوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ چار سے زیادہ بیویاں نہ رکھیں بلکہ اسلام ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے جن کی بیویاں چار سے کم ہیں، کہ وہ چار تک شادیاں کریں۔ لطف کی بات یہ ہے مستشرق موصوف یہ حکم قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ سے اخذ کر رہا ہے جو واضح الفاظ میں اعلان کر رہی ہے کہ اگر تم متعدد بیویوں کے درمیان عدل قائم نہ رکھ سکو تو صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔

ہم نے وہ آیت کریمہ اس مضمون کی ابتدا میں بھی لکھی ہے لیکن قارئین کی سہولت کے لئے اس آیت کریمہ کو ایک بار پھر یہاں لکھا جاتا ہے تاکہ وہ خود اندازہ لگا سکیں کہ آیا اس آیت سے وہ نتیجہ نکالنا ممکن ہے جو مستشرقین نے نکالا ہے یا نہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا (1)

”اگر ڈرو تم اس سے کہ نہ انصاف کر سکو گے یتیم بچوں کے معاملہ میں (تو ان سے نکاح نہ کرو) اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو، تین تین اور چار چار۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی یا کنیزیں جن کے مالک ہوں تمہارے دائیں ہاتھ۔ یہ زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم ایک طرف ہی نہ جھک جاؤ۔“

وہ لوگ جو یتیم بچیوں کے ساتھ ان کے مال اور جمال کی وجہ سے شادی کرتے تھے لیکن چونکہ ان بچیوں کے مفادات کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا، اس لئے ان کے حقوق ادا کرنے میں وہ پس و پیش سے کام لیتے تھے، ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تمہیں یہ اجازت نہیں کہ تم نکاح کو کمزوروں کے حقوق غصب کرنے کیلئے استعمال کرو۔ نکاح کے لئے عدل

1۔ سورۃ النساء 3

شرط ہے۔ اگر تم یتیم بچیوں کے ساتھ عدل نہیں کر سکتے تو ان کے ساتھ نکاح مت کرو۔ ان کے علاوہ دوسری عورتوں کے ساتھ، اپنی مرضی کے مطابق، تمہیں چار تک شادیاں بیک وقت کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن یہ اجازت بھی غیر مشروط نہیں بلکہ چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت بھی عدل کی شرط سے مشروط ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان انصاف قائم رکھنے کی ہمت رکھتا ہو اسے اجازت ہے لیکن جو ان کے درمیان عدل قائم نہ رکھ سکے وہ صرف ایک ہی بیوی رکھے۔

عدل کی شرط کوئی معمولی شرط نہیں اور نہ ہی اس کو پورا کرنا آسان ہے۔ تمام عورتیں جمال، صحت، اخلاق، سلیقے اور اطاعت شعاری میں برابر نہیں ہوتیں۔ ان خوبیوں میں فرق کی وجہ سے مرد کے دل میں فطری طور پر ان کی طرف میلان میں بھی فرق ہوگا۔ طبعی میلان کے اس فرق کی وجہ سے تمام بیویوں کے درمیان عدل قائم رکھنا انتہائی مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم مسلمانوں کے سامنے دو ہی صورتیں رکھتا ہے کہ تعدد ازواج کی اجازت اس شرط سے مشروط ہے۔ اگر اس شرط کو اس کی تمام مشکلات کے باوجود پورا کر سکتے ہو تو اس اجازت پر عمل کرو لیکن یاد رکھو، اللہ تعالیٰ تمہاری ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اور قیامت کے دن تم سے تمہارے سلوک کا حساب لے گا۔ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تم ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ عدل نہیں کر سکو گے تو تمہیں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے بلکہ تم صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔ قرآن حکیم نے اس شرط کو پورا کرنے کی مشکلات سے بھی آگاہ فرما دیا ہے تاکہ کوئی مسلمان غلط فہمی میں غلط فیصلہ نہ کر بیٹھے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (1)

"اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ پورا پورا انصاف کرو اپنی بیویوں کے درمیان اگرچہ تم اس کے بڑے خواہش مند بھی ہو۔ تو یہ نہ کرو کہ جھک جاؤ (ایک بیوی کی طرف) بالکل اور چھوڑ دو دوسری کو جیسے وہ

1۔ سورۃ النساء: 129

(درمیان میں) لٹک رہی ہو۔ اور اگر تم درست کرلو (اپنا رویہ) اور
پرہیزگار بن جاؤ تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

قرآن حکیم کی جو آیت کریمہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے جواز پر اتنی کڑی شرط لگا رہی ہے، مستشرقین اسی آیت کریمہ سے یہ مفہوم اخذ کرتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ کم بیویاں رکھنے والے مردوں کو ترغیب دے رہی ہے کہ وہ چار تک شادیاں کریں۔ مستشرقین واقعات اور نصوص سے اس قسم کے نتائج اخذ کرنے کے فن میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ منٹگمری واٹ تو صرف یہ کہہ رہا ہے کہ اسلام نے چار سے زیادہ بیویاں رکھنے والوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ چار سے زیادہ بیویاں اپنے پاس نہ رکھیں بلکہ اس نے چار سے کم بیویوں والے مردوں کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ چار تک عورتوں کو اپنے نکاح میں جمع کریں لیکن بعض مستشرقین ایسے بھی ہیں جو اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنے پیروکاروں کو لاتعداد بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ جارج سیل اپنے ہم مسلک مستشرقین کی اس غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Several learned men have fallen into the vulgar mistake that Mohammed granted to his followers an unbounded plurality". (1)

"کئی پڑھے لکھے لوگ اس عامیانہ غلطی میں مبتلا ہوئے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے پیروکاروں کو، لاتعداد عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھنے کی اجازت دی۔"

مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام (ﷺ) کے متعلق اکثر اس قسم کی عامیانہ غلطیوں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے پہلے ہر طرف جنسی اباحیت کا رواج تھا۔ اسے نہ تو یہودیت نے ختم کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی عیسائیت نے۔ بلکہ ان مذاہب کے پیروکاروں نے اس اہم ترین سماجی مسئلے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ جب اسلام نے اس سماجی شعبے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ازدواج کے معاشرتی ادارے کو قوانین و ضوابط کے ذریعے منظم کیا تو ان مذاہب کے پیروکار سب کچھ چھوڑ کر اسلام کے پیچھے پڑ گئے کہ اسلام نے تعدد ازدواج کی رسم کو کلیۃً ختم کیوں نہیں کیا۔ یہود و نصاریٰ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ

1۔ The Koran، صفحہ 103

انہوں نے علمی بددیانتی کا ثبوت دیتے ہوئے تاریخی حقائق کو پس پشت ڈال دیا اور اسلام پر یہ الزام لگانا شروع کر دیا کہ تعدد ازواج کی رسم اسلام سے پہلے نہ تھی، اسلام نے اس رسم کو ایجاد کیا۔ اس طرح وہ لوگ اسلام کو ایک ایسا دین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اپنے پیروکاروں کو خواہش پرستی کی کھلی چھٹی دیتا ہے۔ یہ لوگ اگر واقعی تعدد ازواج کی رسم کو برا سمجھتے تھے تو پہلے انہیں یہودیت اور عیسائیت پر اعتراض کرنا چاہئے تھا جنہوں نے اس اہم ترین سماجی مسئلے کے حل کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔

اسلام کے خلاف مستشرقین کے اکثر الزامات کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ غلامی کا بھی ہر دور میں رواج رہا ہے اور کسی مذہب نے غلاموں کی حالت میں بہتری کیلئے کچھ نہیں کیا جب کہ اسلام نے غلاموں کے حقوق متعین کئے، ان کے آقاؤں کو ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی تلقین کی اور بتایا کہ انسان ہونے کے ناطے وہ بھی اشرف المخلوقات ہیں اور ان کے ساتھ بھی انسانوں جیسا سلوک ہونا چاہئے۔ جب اسلام نے غلاموں کے متعلق اس قسم کے قواعد وضوابط پیش کئے تو وہ لوگ جن کے ہاں خود غلامی کا دستور موجود تھا، وہ اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کرنے لگے کہ اسلام نے غلامی کے دستور کو کلیۃً ختم کیوں نہیں کیا۔ تعدد ازواج کے سلسلے میں بھی ان کے اعتراضات کی نوعیت یہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے تعدد ازواج کی رسم کو کلیۃً ختم نہیں کیا بلکہ اس کو ایسی شرائط اور ضوابط کا پابند بنایا کہ ان کی موجودگی میں نہ صرف یہ کہ بہت کم معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں بلکہ یہ قانون بے شمار معاشرتی مسائل کا حل بھی بن جاتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اگر تعدد ازواج کا قانون فرد یا معاشرے کے لئے نقصان دہ ہوتا اور یہ کسی مسئلے کا حل نہ ہوتا تو اسلام اس کو کلیۃً ختم کر دیتا۔ لیکن چونکہ یہ قانون بے شمار فوائد کا حامل تھا اس لئے اسلام نے اس کو قائم تو رکھا لیکن اس کو مفید بنانے کے لئے اس پر کئی شرائط عائد کر دیں۔

تعدد ازواج کے قانون کی ضرورت

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سے سماجی مسائل ہیں جن کے حل کے لئے تعدد ازواج کا قانون ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ اس کی تعلیمات قیامت تک کے انسانوں کے لئے راہنمائی مہیا کرتی ہیں۔ انسانی زندگی

کے بعض مسائل تو وہ ہیں جو انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور زمان و مکان کی تبدیلی سے ان میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جبکہ انسانی زندگی کے بعض مسائل وہ ہوتے ہیں جو انسانی معاشرے کو ہمیشہ درپیش نہیں رہتے۔ البتہ کسی بھی وقت انسانی معاشرے کو ان مسائل سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس کے قوانین ہمہ گیر ہیں۔ جو مسائل انسانی زندگی میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں، اسلامی قوانین ان کا حل بھی پیش کرتے ہیں اور جو مسائل انسانی معاشرے کو کبھی کبھی پیش آتے ہیں، ان کا حل بھی اسلام نے مہیا کردیا ہے۔ تعدد ازواج کا قانون بھی ایسا ہے کہ گو ہر وقت تو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کبھی کبھی ایسے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا حل تعدد ازواج کے علاوہ نہ ممکن ہے اور نہ ہی اسلام کے سوا کسی نظام حیات نے ان مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی معاشرے کو یہ مسئلہ درپیش ہو کہ اس میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو تو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ عورتیں جو زائد ہیں، جن کو خاوند مہیا نہیں ہو سکتا، ان کا کیا کیا جائے؟ یہ مسئلہ قوموں کو اکثر درپیش آتا رہتا ہے۔ جو قوم دشمن سے برسرپیکار ہو اور اس کے لاکھوں مرد جنگ کی نذر ہو جائیں، لازماً اس قوم میں مردوں کی تعداد کم ہو گی اور عورتوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ وہ کام جن میں زیادہ خطرات سے واسطہ پڑتا ہے وہ کام بھی عموماً مرد ہی کرتے ہیں اور ان کاموں میں بھی مردوں کی جانیں زیادہ ضائع ہوتی ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں مردوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

یہ بات ہم محض قیاس سے نہیں لکھ رہے بلکہ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ دنیا کی اکثر اقوام مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ ہونے کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ علامہ زکریا ہاشم زکریا لکھتے ہیں:

> "شماریات سے پتہ چلتا ہے کہ بچپن سے لے کر آغاز شباب تک مردوں میں شرح اموات عورتوں کی نسبت بلند ہوتی ہے۔ یہ حقیقت معاشرے میں مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ ہونے کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ قوموں کے درمیان جو جنگیں ہوتی ہیں ان میں جہاں چار ہزار مرد قتل ہوتے

ہیں وہاں صرف ایک عورت قتل ہوتی ہے۔اس طرح خطرناک کاموں کی وجہ سے بھی مرد عورتوں کی نسبت زیادہ ہلاک ہوتے ہیں۔ان تمام وجوہات کی بناپر عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ ہو جاتی ہے۔"(1)

زکریاہاشم زکریانے ایک ماہر شماریات "سپلیج جرینمرج" کے حوالے سے لکھاہے کہ امریکہ کے محکمہ شماریات کے اندازے سے پتہ چلتاہے کہ امریکہ میں ہر دس سال میں دس لاکھ عورتوں کااضافہ ہوگا۔(2)

شادی کے معاملات کی ماہر "ڈاکٹر ماریون لانجر"اس صورت حال کے متعلق لکھتی ہے:

"عورتوں کی نسبت مردوں کی تعداد میں کمی کے مسئلے کے ہمارے سامنے دو ہی حل ہیں۔یا تو تعدد ازواج کو قانوناً جائز قرار دیا جائے اوریاکوئی ایسا طریقہ ایجاد کیا جائے جس سے مردوں کی عمریں بڑھائی جاسکیں۔ لیکن کیاایساکوئی طریقہ ایجاد کرنا ممکن ہے جس سے مردوں کی عمروں میں تو اضافہ ہو لیکن عورتوں کی عمروں میں اضافہ نہ ہو؟یاکیادنیااس سنگین مسئلے کے حل کے لئے تعدد ازواج کی طرف ہی رجوع کرے گی؟"(3)

مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ ہونے کامسئلہ اکثر ممالک کو درپیش ہوتا ہے۔ خصوصاًان ممالک میں یہ مسئلہ انتہائی بھیانک شکل اختیار کر لیتاہے جن کا کسی تباہ کن جنگ سے واسطہ پڑتاہے۔اس صورت حال میں اگر تمام مرد ایک ایک عورت سے شادی کریں تو بھی عورتوں کی ایک معقول تعداد باقی بچ جاتی ہے جن کے ساتھ شادی کرنے والا کوئی مرد موجود نہیں ہوتا۔

اسلام نے اس مسئلے کاحل تعدد ازواج کی شکل میں پیش کر دیاہے لیکن مستشرقین اسلام کے پیش کردہ اس حل سے خوش نہیں، وہ اس حل کو عیش پرستی قرار دیتے ہیں۔ ہم ان لوگوں سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آپ لوگ تعدد ازواج کو شجرہ ممنوعہ سمجھتے ہیں اور اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ خود آپ نے اس معاشرتی

1۔المستشرقون والاسلام، صفحہ 21-320

2۔ایضاً، صفحہ 321

3۔ایضاً، صفحہ 22-321

مسئلے کا کیا حل پیش کیا ہے؟

مستشرقین اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے تعدد ازواج کی اجازت دے کر عورت کا احترام کم کیا ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ معاشرے کی وہ عورتیں جن کے لئے خاوند موجود نہیں، کیا وہ عورت کہلانے کی مستحق نہیں؟ کیا ان عورتوں کی فطرت ان چیزوں کا تقاضا نہیں کرتی جن کا تقاضا دوسری عورتوں کی فطرت کرتی ہے؟ کیا معاشرے کا یہ فرض نہیں کہ وہ ان محروم عورتوں کے متعلق بھی غور کرے؟

اگر معاشرے میں ایسے باہمت لوگ موجود ہوں جو ایک سے زیادہ بیویوں کے حقوق پورے کر سکتے ہوں، ان کے اخراجات بھی برداشت کر سکتے ہوں اور ان میں عدل بھی قائم کر سکتے ہوں تو کیا یہ مناسب نہیں کہ وہ قربانی کے جذبے کے ساتھ آگے بڑھیں اور ان محروم عورتوں میں سے، حسب استطاعت، دو یا تین خواتین کو اپنی زوجیت کے سائے میں لے لیں؟ اس صورت میں تعدد ازواج کا قانون مرد کی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ نہیں ہو گا بلکہ بے آسرا خواتین کو عزت، وقار، گھر، سکون اور اولاد جیسی نعمتیں دینے کا ذریعہ بن جائے گا۔

اسلام نے اس قسم کی عورتوں کے ان گنت مسائل کا حل تعداد ازواج کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جو قومیں اس اسلامی حل کو شجرہ ممنوعہ سمجھتی ہیں انہوں نے خود ان مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کیا بلکہ انہوں نے ان مسائل کو جوں کا توں چھوڑ دیا ہے۔ اسلام پر تنقید کے سوا اس سلسلے میں ان کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ وہ عورتیں جن کی زندگی کے بے شمار مسائل کا حل معاشرہ نہیں سوچتا وہ ان مسائل کا حل خود سوچتی ہیں اور جو حل وہ خود سوچتی ہیں اس کا نتیجہ معاشرے کو فحاشی کے اڈوں، کنواری ماؤں، ناجائز بچوں اور جنسیت زدہ قوم کی شکل میں نظر آجاتا ہے۔

مستشرقین اس عورت کے جذبات کے متعلق سوچتے ہیں جس کو خاوند کا سایہ حاصل ہوتا ہے لیکن ان عورتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کا کوئی خاوند نہیں ہوتا۔ مستشرقین کی سوچ عورتوں کے کسی طبقے کے لئے بھی مفید نہیں۔ معاشرہ جن عورتوں کو خاوند مہیا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا وہ عورتیں طوائفیں بننے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور جس

معاشرے میں جگہ جگہ طوائفیں پھر رہی ہوں وہاں کسی عورت کو یہ ضمانت نہیں مل سکتی کہ اس کا سہاگ کسی اور کی زلف پیچاں کا اسیر نہیں بن جائے گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ برازیل میں نوجوان عورتوں نے تعدد ازواج کو جائز قرار دینے کے مطالبے کئے ہیں۔(1)

اگر تعدد ازواج کے قانون کو اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ صنف نازک کے لئے باعث برکت ورحمت نظر آتا ہے اور مردوں پر یہ قانون بڑی سخت ذمہ داری عائد کرتا ہے، لیکن وہ لوگ جو شادی کو صرف مرد کی جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ اس معاشرتی مسئلے کے ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

عورتوں کی تعداد کی زیادتی تو ایک صورت ہے جس میں تعدد ازواج کا قانون ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی خاوند اور بیوی کی ازدواجی زندگی میں ایسی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں جن میں تعدد ازواج کی اجازت کے بغیر مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہر انسان فطری طور پر یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کے بچے ہوں جن کی بدولت اس کے گھر کے گلشن میں بہار آئے اور وہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور زندگی کا سہارا بنیں۔ شادی کرتے وقت جو مقاصد انسان کے پیش نظر ہوتے ہیں ان میں ایک اہم ترین مقصد یہ بھی ہوتا ہے۔ شادی کے وقت کسی انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جس عورت کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہا ہے وہ عورت بچے جننے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر شادی کے بعد مرد اور عورت کو معلوم ہو جائے کہ عورت بانجھ ہے اور خاوند کو اس کے بطن سے اولاد ملنے کی کوئی توقع نہیں تو اس صورت حال سے خاوند کے جذبات متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شادی کرتے وقت اس نے خوابوں کا جو محل تعمیر کیا تھا وہ دھڑام سے زمین بوس ہو جاتا ہے۔ وہ عورت جس کو اس نے اپنے دل میں بسایا تھا، اس کی نظروں میں اس کا پہلا مقام باقی نہیں رہتا۔ یہ صورت حال ایسی ہے جس کی ذمہ دار نہ عورت ہے اور نہ مرد۔ یہ قدرت کا اپنا فیصلہ ہے۔ لیکن بانجھ عورت ہے، وہ تو قضائے الٰہی سے اولاد کی نعمت سے محروم ہوئی ہے۔ مرد جو اولاد کے قابل ہے اس کو دائمی طور پر اولاد سے محروم رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ ایسے مرد کو اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھنے والا قانون بنانا نہ مصلحت اندیشی ہے اور نہ ہی انصاف۔ وہ قانون جو انسان کو اپنی فطرت سے دائمی طور پر جنگ کرنے پر مجبور کرے، وہ نہ عملی دنیا میں نافذ ہو

1۔ مفتریات المبشرین علی الاسلام، صفحہ 175

سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ذی شعور شخص ایسے قانون کی تعریف کر سکتا ہے۔

اسلام نے اس مسئلے کا حل یہ پیش کیا ہے کہ عورت بانجھ ہے تو مرد کو نہیں چاہئے کہ وہ اس کے لئے عورت کو مورد الزام ٹھہرائے کیونکہ اس میں عورت کا کوئی قصور نہیں، یہ قدرت کا اپنا فیصلہ ہے۔ مرد کو چاہئے کہ وہ اس عورت کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اس کے حقوق ادا کرے۔ اس کے ساتھ اسی محبت اور اپنائیت سے پیش آئے جس محبت سے اس نے اس کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ ہاں اسے اجازت ہے کہ وہ اولاد کی آرزو پوری کرنے کے لئے کسی اور موزوں عورت یا دو تین عورتوں کو اپنی زوجیت میں لے لے اور ان سب کے ساتھ برابری کا سلوک کرے۔

جو عورت خاوند کی اولاد کی آرزو پوری کرنے کے قابل نہیں، اسے چاہئے کہ وہ اس صورت حال کو فراخدلی کے ساتھ قبول کرلے۔ کیونکہ اگر وہ خود غرضی کا مظاہرہ کرے گی اور اپنی دائمی محرومی میں اپنے خاوند کو بھی دائمی طور پر بلاوجہ شریک کرنے کی کوشش کرے گی تو خاوند کا دل اس کی محبت کے جذبات سے خالی ہو جائے گا۔ ان جذبات کی جگہ منفی جذبات اس کے دل میں گھر کرلیں گے اور ان کا گھر، جو ان کی جنت ہے، اس کی بہاریں رخصت ہو جائیں گی۔

آج دنیا بھر میں یہ رسم عام ہے کہ جو شادی شدہ جوڑے اولاد کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں وہ کسی دوسرے کی اولاد کو اپنا لیتے ہیں۔ اس رسم سے کئی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ غیر محرم عورتیں محرمات قرار پاتی ہیں اور وراثت کا قانون متاثر ہوتا ہے۔ کیا کسی غیر کے بچے کو گود لینے سے یہ بہتر نہیں کہ عورت اپنے گھر میں اپنے خاوند کی دوسری بیوی کو برداشت کرے۔ اس کے بطن سے جو اولاد ہو اس سے خاوند کی آنکھ ٹھنڈی ہو۔ یہ عورت بھی اس کے لئے حقیقی ماں کی طرح قابل احترام ہو۔ کسی اجنبی کو گود لینے کی بجائے وہ اپنے خاوند کی اولاد کو گود میں لے، اسے حقیقی ماں کا پیار دے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو عورتیں اپنی سوکن کے بچوں کے ساتھ پیار کرتی ہیں، وہ بچے اپنی حقیقی ماں سے بھی زیادہ اس سوتیلی ماں کا احترام کرتے ہیں۔

اس مسئلے کا ایک حل تو یہ ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ مستشرقین اس اسلامی حل کو جنس پرستی کا نام دیتے ہیں۔ اگر مستشرقین کی بات مان لی جائے اور مرد کو دوسری شادی

کرنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا جائے تو دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ مرد کو حکم دیا جائے کہ وہ ساری زندگی اسی ایک عورت کے ساتھ رہے۔ اپنی اولاد کی آرزو کو قربان کر دے اور احساس محرومی کا شکار ہو کر اپنا سکون بھی برباد کرے، اپنے گھر کا بھی اور معاشرے کا بھی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مرد اس بانجھ عورت کو فارغ کر دے اور اس کی جگہ دوسری عورت کو اپنی زوجیت میں لے لے تاکہ اسے جمع بین الزوجات کی غلطی نہ کرنی پڑے۔

ہم مستشرقین سے پوچھتے ہیں کہ اس صورت حال میں عورت کے حق میں مفید کیا ہوگا:

(ا) ایسے گھر میں خاوند کے ساتھ تنہا رہنا جہاں نہ محبت ہو، نہ ایثار ہو، نہ خلوص ہو بلکہ ہر طرف نفرت، بے زاری اور مایوسی کے مہیب سائے منڈلا رہے ہوں۔

(ب) بانجھ ہونے کی وجہ سے خاوند سے علیحدہ ہو جانا۔ (اس صورت میں کوئی دوسرا مرد بھی اس کو اپنی زوجیت میں لینے کی غلطی نہیں کرے گا کیونکہ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ عورت بانجھ ہے)

(ج) خاوند کا وہ گھر جس کی کبھی وہ بلاشرکت غیرے ملکہ تھی، اس میں خاوند کی ایک اور بیوی کو بھی قبول کر لینا اور پورے گھر کی بجائے آدھے گھر کی ملکہ بن کر رہنا؟

یقیناً ان تینوں صورتوں میں سے وہی صورت عورت کے لئے مفید ترین تھی جس کو اسلام نے تجویز کیا ہے۔

یہاں ایک سوال ہو سکتا ہے کہ عورت کے بانجھ ہونے کا حل تو اسلام نے پیش کیا ہے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ عورت بانجھ نہ ہو بلکہ مرد ہی بچے پیدا کرنے کے قابل نہ ہو۔ یہ صورت حال واقعی پیش آسکتی ہے لیکن اسلام نے اس کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ اگر مرد اس قابل نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو اولاد کا تحفہ دے سکے تو اسلام عورت کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ ہمیشہ اس مرد کے ساتھ رہے اور اس کی دائمی محرومی میں اس کی شریک بنی رہے۔ وہ عورت عدالت کے ذریعے اس مرد سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے۔ عدت گزرنے کے بعد اپنی مرضی کے دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے اور اس طرح اولاد کی آرزو پوری کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔

تعدد ازواج کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری

ہے کہ طب جدید و قدیم اس بات پر متفق ہیں کہ مرد کی طبعی کیفیت عورت کی طبعی کیفیت سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مرد میں جنسی رغبت عورت کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے، جس کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ جنسی عمل کے بعد عورت کو مدت دراز تک مختلف نازک سے نازک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ استقرار حمل، وضع حمل، رضاعت اور ننھے بچے کی تربیت، یہ سارے مرحلے عورت کو یوں مشغول رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی طلب کم ہی رونما ہوتی ہے جبکہ مرد ان تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی صورتیں ایسی پیدا ہو سکتی ہیں جب عورت مرد کی جنسی تسکین کے قابل نہیں ہوتی۔ مثلاً عورت کبھی دائمی مریض ہوتی ہے یا اسے کوئی ایسا عارضہ لاحق ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ مرد کی جنسی تسکین نہیں کر سکتی۔

جنسی رغبت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کی تسکین اس کا حق ہے، لیکن انسانی معاشرے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہاں لوگوں کو جنسی خواہش کی تسکین کی کھلی چھٹی نہیں دی جا سکتی بلکہ اس فطری خواہش کی تسکین کو قواعد و ضوابط کا پابند رکھا جاتا ہے۔ رشتہ ازدواج کے متعدد معاشرتی فوائد میں سے ایک اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے مرد اور عورت کی جنسی خواہش کی تسکین کو منظم بنایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں کسی قسم کی عار نہیں کہ ان کا دین نہ صرف اس فطری تقاضے کو پورا کرنے کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ نکاح میری سنت ہے اور جو شخص میری سنت سے روگردانی کرے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس فطری تقاضے کی تسکین اس لئے مستحسن قدم ہے کہ اگر اس کی تسکین پر پابندی لگائی جائے گی تو وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لئے پروردگار عالم نے انسانی فطرت میں اس جذبے کو پیدا فرمایا ہے۔

اسلام نے منظم طریقے سے اس جذبے کی تسکین کی اجازت دی ہے لیکن عیسائی اس جذبے کی تسکین کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن اس پارسائی کے لبادے میں ان کے راہب اور راہبات اپنی خانقاہوں میں جو حرکتیں کرتے ہیں وہ پوری انسانیت کے لئے باعث عار ہیں۔

اسلام اس جذبے کی تسکین کے لئے شادی کی اجازت دیتا ہے۔ اگر ایک شادی کے

ذریعے مرد کے اس جذبے کی تسکین ہو رہی ہو تو وہ کسی دوسری طرف دیکھنے کا خیال بھی نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس اگر مرد کا گھر بھی ہو، اس کی بیوی بھی ہو لیکن کسی وجہ سے اس کے اس جذبے کی تسکین نہ ہو رہی ہو تو معاشرے کے سارے مردوں سے یہ توقع کرنا حماقت ہے کہ وہ صبر و شکر سے وقت پاس کرلیں گے اور اپنے جنسی جذبے کی تسکین کے لئے کسی دوسری طرف نہیں دیکھیں گے۔

اسلام نے دیگر کئی معاشرتی مسائل کی طرح اس مسئلے کا حل بھی تعدد ازواج کی شکل میں پیش کیا ہے اور بدکاری کے خلاف اتنا سخت قانون بنایا ہے کہ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو مذاہب تعدد ازواج کی اجازت نہیں دیتے ان کے نزدیک بدکاری نہ جرم ہے اور نہ ہی اس پر کوئی سزا دی جاتی ہے۔ اہل نظر غور کریں کہ اس صورت میں عورت کے لئے بہتر کیا ہے:

(ا) یہ کہ اس کے گھر میں ایک یا چند عورتیں اور بھی موجود ہوں، جو اس کے خاوند کے باقاعدہ نکاح میں ہوں، انہیں خاوند کا تحفظ حاصل ہو، معاشرے میں وہ معزز خواتین شمار ہوتی ہوں اور ان سب کی اولاد جائز اولاد متصور ہو۔

(ب) یا یہ کہ عورت کا خاوند اس کی نظروں سے چھپ کر اپنے جنسی جذبے کی تسکین کی صورتیں تلاش کرتا رہے جس کی تسکین کرنے سے وہ عورت قاصر ہے۔ جن عورتوں سے وہ رشتہ ازدواج کے بغیر جنسی تعلق قائم کرے وہ معاشرے میں طوائفیں کہلائیں، ان کی اولاد ناجائز اولاد قرار پائے اور معاشرے کا ہر فرد ان سے نفرت کرتا ہو؟

جن قوموں نے تعدد ازواج کے قانون کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے ان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ بدکاری کے خلاف سخت قانون نافذ کریں۔ یورپ میں فحاشی اور عریانی کا سیلاب آیا ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ لوگ قانون بناتے وقت انسانی فطرت کے تقاضوں کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ کوئی مذہب یا نظام حیات جو اپنے پیروکاروں کو اپنے فطری تقاضوں کو کچلنے کی تلقین کرتا ہو، اس مذہب کے پیروکار ساری حدیں عبور کر کے اباحیت کے جنگل میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر وہی کچھ کرتے ہیں جو جنگل میں جانور کرتے ہیں۔ اس طرح انسانی معاشرہ طرح طرح کے مسائل کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایسے معاشرے کو انسانی معاشرہ کہنا ہی ممکن نہیں رہتا۔

اس میں شک نہیں کہ جس گھر میں ایک سے زیادہ بیویاں ہوں، اس گھر میں کچھ مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان مسائل کی نسبت وہ مسائل کئی گنا زیادہ سنگین ہوتے ہیں جن سے تعدد ازواج کے قانون کی وجہ سے معاشرہ محفوظ رہتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اسلام کسی کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ صرف اجازت دیتا ہے اور اس پر بھی کڑی شرائط عائد کرتا ہے۔ جو آدمی اس اجازت کو استعمال کرنا چاہتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد بیویوں کی شکل میں اسے کن اضافی مسائل کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور اس کے لئے کن کڑی شرائط کو پورا کرنا ضروری ہوگا۔ کوئی شخص ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا فیصلہ اسی وقت کرتا ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں جہاں اس کے لئے کئی مسائل پیدا کریں گی وہاں اس کے کئی مسائل کو حل بھی کریں گی جو ان نئے مسائل کی نسبت کئی گنا زیادہ سنگین ہیں۔

تعدد ازواج کے حق میں اہل مغرب کی آرا

اسلام نے جو قانون چودہ صدیاں پہلے پیش کیا تھا اور جس کے خلاف کئی صدیاں دنیائے عیسائیت و یہودیت غیظ و غضب کا اظہار کرتی رہی ہے، اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ جو انسان اسلام کے اس قانون کے خلاف زہر اگلتے رہے ہیں، وہ اب اس کی اہمیت سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ دبے الفاظ میں اور کچھ کھل کر اس قانون کی حمایت کرنے لگے ہیں۔ برازیل کی عورتوں کا تعدد ازواج کو جائز قرار دینے کے حق میں مظاہرے کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ جس قانون کو اب تک صنف نازک کے وقار کا دشمن قرار دیا جاتا رہا ہے اس کے متعلق اب صنف نازک نے خود اس حقیقت کو پا لیا ہے کہ وہ قانون ان کے لئے باعث ذلت نہیں بلکہ باعث رحمت ہے۔ جدید سائنسی انکشافات نے بھی اس قانون کے متعلق اہل مغرب کا رویہ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب مغرب میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس قانون کا دفاع کر رہے ہیں۔ فرانسیسی مستشرق 'الفونس اتیین دینیہ'' اپنی کتاب ''محمد رسول اللہ'' میں کہتا ہے:

> ''امر واقع یہ ہے کہ تعدد ازواج کا دستور ساری دنیا کے تمام خطوں میں موجود ہے۔ اور جب تک یہ دنیا باقی ہے یہ دستور باقی رہے گا۔ اس کو ختم کرنے کے

لئے جتنے بھی سخت قوانین بنائے جائیں یہ ختم نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فیصلہ صرف یہ کرنا ہے کہ آیا اس کو قانونی جواز مہیا کر دیا جائے یا اس کو قانوناً تو منع کیا جائے لیکن یہ خفیہ یا اعلانیہ طور پر منافقانہ انداز میں جاری رہے اور کوئی چیز اس کا راستہ نہ روک سکے۔"(1)

مختلف مغربی سیاح، جن میں "جیرال دی نیر فال" اور "لیڈی موجان" قابل ذکر ہیں، انہوں نے ساری دنیا کی سیاحت کی ہے۔ تمام قوموں کے حالات کو قریب سے دیکھا ہے اور آخر کار وہ تعدد ازواج کے مسئلے کے متعلق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گو اسلام تعدد ازواج کی اجازت دیتا ہے اور عیسائیت اس کو ممنوع قرار دیتی ہے لیکن عملاً معاملہ برعکس ہے۔ تعدد ازواج کا دستور مسلمانوں کی نسبت عیسائیوں میں زیادہ ہے۔(2)

"الفونس دینیہ" نے اپنی کتاب "اشعۃ خاصۃ بنور الاسلام" میں تعدد ازواج کے مسئلے پر خوبصورت بحث کی ہے۔ ہم اس بحث کے چند اقتباسات "المستشرقون والاسلام" کے حوالے سے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

"اسلام کے قوانین فطرت کے قوانین سے متصادم نہیں اور نہ ہی اسلام انسانی فطرت کو کچلنے کے حق میں ہے۔ جب کہ عیسائیت کے قوانین فطرت سے متصادم ہیں۔ عیسائیت کے قوانین فطرت کے قوانین سے کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ اکثر شعبہ ہائے حیات میں متصادم ہیں۔ اس کی ایک مثال راہب ہیں جو اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق شادی نہیں کرتے اور مجرد رہتے ہیں۔ اسلام کے قوانین چونکہ فطرت کے مطابق ہوتے ہیں اس لئے ان پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں تو بہت ہیں لیکن یہاں ہم صرف تعدد زوجات کے قانون کے متعلق گفتگو کریں گے، جس کی وجہ سے اہل مغرب نے اسلام کے خلاف بہت شور بلند کیا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنا بہت ہی اچھی بات ہے لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں عمل کیا ہے۔ ہر حال میں صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنے کا قانون فطرت سے متصادم ہے اور اس قانون کا نفاذ عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اس صورت حال میں اسلام، جو آسانی کا دین ہے، اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 44-343

2۔ ایضاً، صفحہ 344

کار نہ تھا کہ وہ اس مسئلے کا ایسا حل تجویز کر دے جو موزوں ترین ہو لیکن یہ حل فرض کی شکل میں نہ ہو۔ اسلام نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ یہ تھا کہ اس نے شرعی بیویوں کی تعداد کو کم کر دیا حالانکہ اسلام سے پہلے عربوں میں بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی۔ بیویوں کی تعداد کم کرنے کے بعد اسلام نے ایک ہی بیوی رکھنے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً" (النساء، آیہ 3)

یعنی اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی۔ کون سا شخص ایسا ہے جو اپنی متعدد بیویوں میں عدل قائم رکھ سکے، لہٰذا اس شرط کے ساتھ تعدد ازواج کے قانون کا نفاذ انتہائی مشکل ہو جاتا ہے لیکن اسلام نے اس کو جس عمدگی اور حکمت سے پیش کیا ہے وہ اسلام ہی کا حصہ ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ کیا عیسائیت نے تعدد زوجات کی ممانعت کے سخت ترین قوانین کے ذریعے عملاً تعدد زوجات کی رسم کو ختم کر دیا ہے اور کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ عیسائیت اس قانون کو نافذ کرنے میں کامیاب رہی ہے؟ جو شخص یہ بات کہنے کی جسارت کرے گا ہر طرف سے لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔ عوام کو تو چھوڑیں فرانس کے بادشاہوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جن کی متعدد بیویاں ہوتی تھیں، اس کے باوجود اصحاب کنیسہ ان کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔

تعدد زوجات کا قانون طبعی قانون ہے اور جب تک دنیا باقی ہے یہ قانون باقی رہے گا۔ اسی لئے عیسائیت نے ممانعت کے ذریعے اس رسم کو ختم کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کے الٹے نتائج بر آمد ہوئے ہیں اور ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ عیسائیت جس شدت سے اس کو روکنے کی کوشش کرتی ہے لوگ اسی شدت کے ساتھ اس کام کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ ایک بیوی کا قانون جس پر مسیحیت کاربند ہے، یہ اپنے دامن میں بے شمار برائیوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور ان برائیوں کے نتائج تین شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں: فحاشی، طوائفیں اور ناجائز بچے۔" (1)

منٹگمری واٹ تعدد ازواج کے قانون کی وجہ سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو بدنام کرنے کی کوشش کرنے والوں میں پیش پیش ہے، لیکن اس قانون کی افادیت کو تسلیم کے

1۔ مستقبل قوانین اسلام، صفحہ 46-345

بغیر وہ بھی نہیں رہ سکا۔ وہ خود لکھتا ہے:

"It remedied some of the abuses due to the growth of individualism. It provided honourable marriage for the excess women, and checked the oppression of women by their guardians; and it thereby lessened the temptation to enter into the loose unions allowed in the matrilineal society of Arabia. In view of some of the practices hitherto current, this reform must be regarded as an important advance in social organization". (1)

"تعدد زوجات کے قانون نے بعض ان زیادتیوں کا مداوا کر دیا جو انفرادیت پسندی کے ترقی کر جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں۔ اس قانون نے زائد عورتوں کو باعزت طور پر رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے مواقع فراہم کئے، سرپرستوں کی طرف سے عورتوں پر کی جانے والی زیادتیوں کو کم کیا۔ اس قانون نے نکاح کے بغیر جنسی تعلقات قائم کرنے کی ترغیبات کو کم کیا، جس کی عرب معاشرہ میں اجازت تھی۔ اس زمانے میں جو رسوم موجود تھیں ان کے پیش نظر معاشرے کی تنظیم کے سلسلے میں یہ اصلاح بڑا اہم قدم تھا۔

منٹگمری واٹ اور اس جیسے دیگر کئی مستشرقین تعدد ازدواج کے قانون کی انتہائی مخالفت کے باوجود اس کی افادیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر انہوں نے اسلام کے خلاف تعصب اور حسد کی بنا پر اس قانون کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ نہ کیا ہوتا تو وہ کب کے اس کے جواز کا فتویٰ دے چکے ہوتے لیکن اسلام کا بغض انہیں اس قانون کی افادیت کو سمجھ لینے کے بعد بھی، اعلانیہ اس کی حمایت کی اجازت نہیں دیتا۔

اہلِ مغرب سے ایک گزارش

تعدد ازواج کا قانون کئی معاشرتی مسائل کا واحد حل ہے۔ یہ مسائل آج یورپ میں انتہائی سنگین شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اہل یورپ انسانی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 277

کے جائز راستوں کو بند کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کریں گے، لوگ اسی شدت کے ساتھ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ناجائز راستوں پر چلیں گے اور معاشرے میں اتنی ابتری پھیلے گی کہ اس کا علاج کسی کے لئے بھی ممکن نہ ہوگا۔

اسلام اہل مغرب کا دشمن سہی لیکن وہ ایک ماہر طبیب کی طرح ایک انتہائی خطرناک اور موذی معاشرتی مرض کا علاج تجویز کر رہا ہے۔ اس علاج کو قبول کر لینے میں ہی اہل مغرب کا بھلا ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام نے اگر مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے تو چاہئے تھا کہ عورت کو بھی ایک سے زیادہ خاوند رکھنے کی اجازت ہوتی۔

اس قسم کی بات وہی شخص کر سکتا ہے جو مرد اور عورت میں مساوات قائم کرنے کے جوش میں اتنا آگے نکل جاتا ہے کہ وہ ان دو جنسوں کے طبعی فرق کو بھی مدنظر نہیں رکھتا۔ اس قسم کے لوگ ممکن ہے کل یہ بھی کہنا شروع کر دیں کہ عورت ازدواجی زندگی میں جن مراحل سے گزرتی ہے ان تمام مراحل سے مرد بھی گزرے تاکہ زوجین کے درمیان مساوات کا منشا پورا ہو سکے۔

مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ یہ اجازت بے شمار مسائل کا حل ہے۔ عورت کو ایک سے زیادہ خاوند رکھنے کی اجازت اس لئے نہیں دی جا سکتی کہ یہ قانون کسی مسئلے کا حل نہیں ہوگا بلکہ بے شمار مسائل کو جنم دے گا۔ اس قانون کا پہلا تحفہ تو یہ ہوگا کہ کسی کا نسب محفوظ نہیں رہے گا اور نسب معاشرے میں جس قسم کے جذبات الفت و محبت کو جنم دینے کا ذریعہ بنتا ہے، معاشرہ ان انسانی جذبات سے محروم ہو جائے گا۔ اس قانون کا دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح جنگل میں مختلف جانور ایک مادہ کو حاصل کرنے کے لئے باہم برسرپیکار ہوتے ہیں اور جو نر جانور زیادہ طاقتور ہوتا ہے وہ اس مادہ کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے، انسانی معاشرہ بھی اسی لعنت کا شکار ہو جائے گا۔ نہ گھر کا سکون باقی رہے گا اور نہ ہی معاشرے کا۔ متعدد بیویوں کا قانون انسانی فطرت کے مطابق تھا اس لئے اسلام نے حدود و قیود کے ساتھ اس کو باقی رکھا اور متعدد خاوندوں کا قانون انسانی

فطرت سے متصادم تھا اس لئے اسلام نے اس کو ختم کر دیا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ تعدد ازواج سمیت اسلام کے ازدواجی قوانین چودہ صدیوں سے ملت اسلامیہ کی اجتماعی زندگی میں نافذ ہیں لیکن ان قوانین کی وجہ سے کبھی ملت اسلامیہ کسی سنگین صورت حال سے دوچار نہیں ہوئی جبکہ ان قوانین کی مخالفت کرنے والی قومیں بے شمار سماجی مسائل سے دوچار ہیں۔ اس کے باوجود اہل مغرب اسلامی قوانین کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور اپنے قوانین کی تباہ کاریوں کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتے۔ اہل مغرب کا اصل مقصد یہ ہے کہ تہذیب کے جس نور سے وہ خود محروم ہیں اس سے مسلمانوں کو بھی محروم کر دیں۔ لیکن ان کی یہ آرزو انشاءاللہ العزیز کبھی پوری نہ ہوگی۔

پیغمبرِ اسلام عَلَیہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام

کی شادیوں کےخلاف مُستشرقین کا

واویلا اوراِس کی حقیقت

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شادیوں کے خلاف مستشرقین کا واویلا اور اس کی حقیقت

اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو جتنی زیادہ نعمتیں عطا فرماتا ہے اسی حساب سے اس کا امتحان بھی سخت لیتا ہے اور اس پر ذمہ داریاں بھی دوسرے بندوں کی نسبت زیادہ سخت عائد کرتا ہے۔

انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کی افضل ترین مخلوق ہیں۔ ان کا مقام ساری مخلوق سے بلند ہے۔ اسی لئے ان کی ذمہ داریاں بھی دیگر انسانوں کی نسبت زیادہ کٹھن ہوتی ہیں۔ ذمہ داریوں کے اسی اختلاف کی وجہ سے بعض قوانین میں بھی نبی کا حکم اپنی امت سے مختلف ہوتا ہے۔

حضور ﷺ اللہ رب العزت کے آخری رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو کٹھن ذمہ داریاں آپ کو سونپی ہیں وہ آپ سے پہلے کسی نبی یا رسول کو بھی نہیں سونپی گئیں۔ آپ کو حکم ملا کہ ساری دنیا سے شرک کی لعنت کو ختم کر کے توحید خداوندی کا علم بلند کریں، جو لوگ بتوں کے سامنے سربسجود ہیں انہیں خدائے واحد کے سامنے جھکنے کی ترغیب دیں، جو لوگ طاقت اور دولت کے نشے میں مست، اپنی خدائی کے دعوے دار بنے بیٹھے ہیں، ان کے سامنے حقیقت کا آئینہ رکھیں اور ان کو ان کی اصل حیثیت سے آگاہ کریں اور انسانیت کے سامنے ایک ایسا نمونہ عمل رکھیں جو قیامت تک پوری نسل انسانی کی راہنمائی کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ پر انسانیت کے لئے ایک دستور حیات نازل فرمایا، جس کی روشنی میں سفر کر کے وہ اپنی منزل مقصود کو پا سکے۔ اس دستور حیات کے قوانین عام انسانوں کی دنیوی اور اخروی کامیابی کی ضمانت تھے لیکن حضور ﷺ کی ذمہ داری چونکہ اپنی امت کے ہر فرد کی ذمہ داری سے کہیں زیادہ کٹھن تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ قوانین ایسے نازل فرمائے جو آپ کے لئے خاص تھے اور امت ان قوانین سے مستثنیٰ تھی۔ ان مخصوص قوانین میں سے کچھ وہ ہیں جو حضور ﷺ پر امت کی نسبت زیادہ کٹھن فرائض عائد

کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن میں حضور ﷺ کو کچھ ایسی مراعات عطا فرمائی گئی ہیں جو امت کو عطا نہیں فرمائی گئیں۔ اس قسم کے قوانین میں سے بعض وہ ہیں جن تعلق ازدواجی زندگی سے ہے۔

امت کے افراد کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتے ہیں۔ ہر عورت جس کے ساتھ وہ نکاح کریں اس کا مہر ادا کرنا واجب ہے۔ ان کی زوجیت میں جتنی عورتیں ہوں ان سب کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے کا حکم ہے۔ کسی کی بیویوں کی تعداد جب چار سے کم ہو تو اسے مزید نکاح کرنے کی ممانعت نہیں ہوتی۔

ان قوانین کی جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمتوں کے تحت حضور ﷺ کے لئے کچھ اور قوانین نازل فرمائے ہیں جو ان احکام سے مختلف ہیں جو امت کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَالَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (1)

"اے نبی (مکرم!) ہم نے حلال کر دی ہیں آپ کے لئے آپ کی ازواج جن کے مہر آپ نے ادا کر دیئے ہیں اور آپ کی کنیزیں جو اللہ نے بطور غنیمت آپ کو عطا کی ہیں۔ اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں، جنہوں نے ہجرت کی آپ کے ساتھ اور مومن عورت اگر وہ

1۔ سورۃ الاحزاب 50

اپنی جان نبی کی نذر کر دے اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ (اجازت) صرف آپ کے لئے ہے دوسرے مومنوں کے لئے نہیں۔ ہمیں خوب علم ہے جو ہم نے مقرر کیا ہے مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں تاکہ آپ پر کسی قسم کی تنگی نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

بیویوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو امتیازی شان عطا فرمائی اور جہاں ایک امتی کو تمام بیویوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے کا حکم دیا وہاں حضور ﷺ کو ارشاد فرمایا:

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَ یَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا (1)

"(آپ کو اختیار ہے) دور کر دیں جس کو چاہیں اپنی ازواج سے اور اپنے پاس رکھیں جس کو چاہیں۔ اور اگر آپ (دوبارہ) طلب کریں جن کو آپ نے علیحدہ کر دیا تھا تب بھی آپ پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اس رخصت سے پوری توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور وہ آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور سب کی سب خوش رہیں گی جو کچھ آپ انہیں عطا فرمائیں گے۔ اور (اے لوگو!) اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا بردبار ہے۔"

عام امتی پر چار بیویوں کی حد کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے کسی بھی مرحلے پر ایک بیوی کو دوسری بیوی سے بدلنے یا کسی اور عورت سے شادی کرنے پر کوئی قانونی پابندی نہیں لیکن حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ایک مرحلہ آیا جب آپ کو مزید نکاح کرنے یا کسی زوجہ کو دوسری زوجہ سے بدلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ارشاد خداوندی ہوا:

1۔ سورۃ الاحزاب:51

لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ۔ وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا (1)

"حلال نہیں آپ کے لئے دوسری عورتیں اس کے بعد اور نہ اس کی اجازت ہے کہ آپ تبدیل کرلیں ان ازواج سے دوسری بیویاں اگرچہ آپ کو پسند آئے ان کا حسن بجز کنیزوں کے اور اللہ تعالیٰ پر چیز پر نگران ہے۔"

حضور علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کے متعلق جو خصوصی احکامات نازل فرمائے تھے، آپ نے ان پر عمل کیا۔ آپ کی ازواج مطہرات کی تعداد چار سے زیادہ تھی۔ سیرت کی کتابوں میں گیارہ ایسی خوش نصیب خواتین کا ذکر ملتا ہے جن کو حضور علیہ السلام نے زوجیت کا شرف بخشا تھا۔ مستشرقین نے حضور علیہ السلام کی ازواج کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس مسئلے پر بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کے بیویوں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ جن عورتوں کے ساتھ نکاح کی حضور علیہ السلام نے ضرورت محسوس کی آپ نے ان کے ساتھ نکاح کیا، ہمیں اس کا انکار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مستشرقین کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ حضور علیہ السلام نے اپنی امت کے لئے تو بیویوں کی تعداد کی حد مقرر کر دی تھی اور آپ کے کسی امتی کو چار سے زیادہ عورتوں کو اپنے نکاح میں جمع کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن آپ نے خود اس پابندی کو قبول نہ کیا اور جن عورتوں سے اور جتنی عورتوں سے چاہا شادی کرلی۔

حضور علیہ السلام کے لئے ازدواج کے یہ خصوصی قوانین اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام پاک میں نازل فرمائے تھے۔ یہ قوانین حضور علیہ السلام نے اپنی مرضی سے نہیں گھڑے تھے لیکن مستشرقین چونکہ قرآن حکیم کو حضور علیہ السلام کے ذہن کی اختراع قرار دیتے ہیں اس لئے وہ آپ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے بیویوں کی تعداد کی اس حد کو نظر انداز کر دیا جو آپ نے خود اپنی امت کے لئے مقرر کی تھی اور پھر اپنی اس خواہش پرستی کو جواز مہیا کرنے کے لئے وحی کا سہارا لیا اور یہ دعویٰ کیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی

1۔ سورۃ الاحزاب: 52

طرف سے خصوصی اجازت ملی ہے کہ آپ جتنی عورتوں سے چاہیں شادی کرلیں۔

حضور ﷺ کے مخالف تعدد ازواج کے سلسلے میں آپ کے خلاف جو زبان استعمال کرتے ہیں، اس غلیظ زبان کو یہاں نقل کرنا ذوق سلیم کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار تو ہے لیکن جو لوگ مستشرقین کی غیر جانبداری اور انصاف پسندی پر کامل ایمان رکھتے ہیں، ان کو حقیقت حال سے آگاہ کرنے اور زیر بحث موضوع کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کے لئے یہ ناگوار فریضہ انجام دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ولیم میور شان رسالت میں یوں ہرزہ سرائی کرتا ہے:

"Mahomet was now going on to three-score years; but weakness for the sex seemed only to grow with age, and the attractions of his increasing harem were insufficient to prevent his passion from wandering beyond its ample limits". (1)

"اب محمد (ﷺ) کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن جنس مخالف کی طرف میلان کی کمزوری میں عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ آپ کے بڑھتے ہوئے حرم کی کشش آپ کو اپنی وسیع حدود سے تجاوز سے روکنے کے لئے کافی نہ تھی۔"

اکثر مستشرقین نے حضور ﷺ کی متعدد ازواج کے حوالے سے آپ کے متعلق اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے نہ تو حضور ﷺ کی شادیوں کو آپ کی پوری زندگی کے پس منظر میں دیکھا ہے اور نہ انہوں نے یہ سوچا ہے کہ آیا تاریخ میں کوئی اور بھی ایسی ہستی موجود تو نہیں، جن کا وہ انتہائی احترام کرتے ہیں، لیکن ان کی شادیاں حضور ﷺ سے بھی زیادہ تھیں۔

اگر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر کسی انسان کے خلاف جنس پرستی کا الزام لگتا ہے تو یہ الزام صرف حضور ﷺ پر نہیں لگنا چاہئے بلکہ یہ الزام تاریخ انسانی کے ان تمام کرداروں پر لگنا چاہئے جنہوں نے ایک سے زیادہ عورتوں کو اپنی زوجیت میں جمع کیا تھا۔ لیکن یہ عجیب قسم کی غیر جانبداری ہے کہ جس کام کی وجہ سے حضور ﷺ پر جنس پرستی کا الزام لگایا جاتا

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 126

ہے، اس کام کی وجہ سے کسی دوسرے پر یہ الزام نہیں لگایا جاتا۔

تعدد زوجات کی وجہ سے حضور ﷺ کے خلاف جنس پرستی کا الزام لگانے والے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ آپ نے اپنی امت کے سامنے جو قانون پیش کیا تھا، آپ نے خود اس پر عمل نہیں کیا۔ گویا اگر اسلام تعدد زوجات کے سلسلے میں عام امتیوں پر بھی کسی قسم کی پابندی عائد نہ کرتا اور جو دستور پہلے دنیا میں رائج تھا اسی کو قائم رکھتا تو یقیناً کوئی شخص اسلام کو، اس کام کی وجہ سے، مورد الزام نہ ٹھہراتا، کیونکہ حضور ﷺ سے پہلے جس طرح عام لوگوں میں تعدد ازواج کی رسم عام تھی اسی طرح تاریخ کی بے شمار عظیم شخصیات نے بھی اس رسم پر عمل کیا تھا لیکن کسی نے ان شخصیات کو اس وجہ سے ان الزامات کا نشانہ نہ بنایا تھا جن الزامات کا نشانہ حضور ﷺ کو بنایا گیا۔

دنیا کے تمام مذاہب میں تعدد ازواج کا رواج تھا۔ ان مذاہب کی نظروں میں محترم ہستیاں خود اس پر کاربند تھیں اور اس کی وجہ سے ان کے تقدس میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔

مثلاً ہندو مت کو لیجئے۔ اس مذہب کے اکابر کی کئی کئی بیویاں تھیں۔

(1) سری رام چندر جی کے والد مہاراجہ دسرت کی تین بیویاں تھیں۔

(2) سری کرشن جی کی، جو اوتاروں میں شمار ہوتے ہیں، سینکڑوں بیویاں تھیں۔

(3) پانڈوؤں کے جد اعلیٰ راجہ پانڈو کی دو بیویاں تھیں۔

(4) راجہ شنتن کی دو بیویاں تھیں۔

(5) بکھتر اریج کی دو بیویاں اور ایک لونڈی تھی۔(1)

مستشرقین جو اپنے آپ کو ماہرین علوم شرقیہ کہتے ہیں، وہ جس طرح اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں اسی طرح ہندو مت کا بھی مطالعہ کرتے ہوں گے کیونکہ جس طرح اسلام ایک مشرقی مذہب ہے اسی طرح ہندو مت بھی ایک مشرقی مذہب ہے اور اس طرح وہ بھی ان کے شعبہ تحقیق سے تعلق رکھتا ہے۔ مستشرقین کو اپنے مطالعے کی بنا پر معلوم ہے کہ ہندو اکابر بھی ایک سے زیادہ شادیوں کی رسم پر کاربند تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے نہ تو ہندو راجاؤں کو دو دو اور تین تین بیویاں رکھنے پر جنس پرست کہا اور نہ ہی سری کرشن جی کی سینکڑوں بیویوں کے باوجود ان پر یہ الزام لگایا۔

1۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، "رحمۃ للعالمین"، (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ س ن)، جلد 2، صفحہ 127

ممکن ہے مستشرقین ہندو اکابر کی مثالوں پر یہ کہیں کہ وہ تو غیر الہامی مذہب کے پیروکار تھے، ان کے عمل کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا لیکن تعدد ازواج کی مثال صرف ہندو اکابر تک محدود نہیں بلکہ خود الہامی مذاہب میں بھی اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ہم سے یہ مطالبہ بجا طور پر کیا جاسکتا ہے کہ آپ حضرت محمد ﷺ کو خدا کا نبی اور رسول مانتے ہیں اس لئے آپ کے عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے غیر الہامی مذاہب کے اکابر کی زندگیوں کو بطور دلیل پیش کرنے کے بجائے انبیائے کرام کی زندگیوں کو پیش کریں تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ حضور ﷺ کا یہ عمل منہاج نبوت کے مطابق ہے۔ لیکن مستشرقین ہم سے یہ جائز مطالبہ نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مستشرقین کو معلوم ہے کہ متعدد انبیائے کرام نے بھی ایک سے زیادہ شادیاں کیں۔

یہود و نصاریٰ حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد علیہم السلام کی روحانی عظمتوں کے قائل ہیں اور ان کو خدا کے برگزیدہ بندے اور نبی تسلیم کرتے ہیں۔ ان برگزیدہ ہستیوں کی زندگیوں سے اگر ہمیں تعدد ازواج پر عمل پیرا ہونے کا ثبوت مل جائے تو یقیناً اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضور ﷺ کا متعدد عورتوں سے شادی کرنا منہاج نبوت کے عین مطابق تھا۔ اور جس طرح اس عمل کی وجہ سے دیگر انبیائے سابقین کے تقدس میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اسی طرح اس عمل کی وجہ سے حضور ﷺ کے تقدس اور عظمت میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

یہود و نصاریٰ کی الہامی کتابیں خود ہمیں بتاتی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔(1)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم بھی تھا:

"In case you go out to the battle against your enemies and Jehovah your God has given them into your hand and you have carried them away captive; and you have seen among the captives a woman beautiful in form, and you have got attached to her and taken her

---

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 29-128

for your wife, you must then bring her into the midst of your house. She must now shave her head and attend to her nails, and remove the mantle of her captivity from off her and dwell in your house and weep for her father and mother a whole lunar month; and after that you should have relations with her, and you must take possession of her as your bride, and she must become your wife." (1)

"اگر تم دشمن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے جاؤ اور تمہارا خدا دشمنوں کو تمہارے قبضے میں دے دے، تم ان کو قیدی بنالو اور تم ان کے درمیان ایک خوب صورت عورت دیکھو جو تمہیں اچھی لگے اور تم اسے اپنی بیوی بنالو تو تم اسے اپنے گھر میں لاؤ، وہ اپنا سر مونڈے اور ناخن تراشے اور غلامی کا لباس اتار کر تمہارے گھر میں رہے اور ایک پورا قمری مہینہ اپنے ماں باپ کا سوگ منائے۔ اس کے بعد تم اس سے خلوت کرو اور بطور دلہن اسے اپنے قبضے میں لو اور وہ تمہاری بیوی بنے۔"

بائبل کی یہ تعلیمات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کر رہیں کہ آپ کو اس اجازت پر زندگی میں صرف ایک بار عمل کرنے کا اختیار ہے یا جب بھی دشمن سے جنگ پیش آئے، آپ اس اجازت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

بائبل کے مختلف مقامات پر حضرت داؤد علیہ السلام کی نو بیویوں، دس حرموں اور ان کے علاوہ کچھ اور حرموں اور جوروؤں کا ذکر ملتا ہے۔(2)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق بائبل ہمیں بتاتی ہے:

"And he came to have seven hundred wives, princesses, and three hundred concubines". (3)

"اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی سات سو بیویاں اور تین سو لونڈیاں تھیں۔"

1۔ کتاب استثناء، باب 21، آیات 10-13

2۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 129

3۔ سلاطین اول، باب 11، آیہ 3

ہم نے انبیائے کرام کی جو مثالیں سطور بالا میں پیش کی ہیں یہ سب بائیبل سے ماخوذ ہیں۔ اگر حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی کو معیار نبوت پر پرکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ کا متعدد عورتوں سے نکاح کرنا منہاج نبوت کے عین مطابق تھا۔ جو لوگ کسی مذہب کو مانتے ہیں وہ حضور ﷺ پر تعدد ازواج کی وجہ سے اس لئے اعتراض نہیں کر سکتے کہ ان کے اپنے اکابر بھی اس پر عمل پیرا رہے ہیں اور جو لوگ کسی مذہب کو مانتے ہی نہیں ہیں ان کے لئے اعتراض کی گنجائش اس لئے نہیں کہ وہ تو جنسی تعلقات کے لئے نکاح کی قید کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، دوسروں پر اعتراض کا ان کو کیا حق پہنچتا ہے؟

مستشرقین جس بات کو سب سے زیادہ اچھالتے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی خواہشات پر مکمل کنٹرول حاصل تھا، اس لئے آپ نے ایک شادی کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جبکہ ان کے مقابلے میں حضرت محمد (ﷺ) کو اپنی خواہشات پر مکمل کنٹرول حاصل نہ تھا، اس لئے آپ نے متعدد عورتوں سے شادیاں کیں۔ اس کے بعد وہ ان دو مقدس ہستیوں کے درمیان موازنہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان دو انسانوں کے مابین کتنا تفاوت ہے جن میں سے ایک کو اپنی خواہشات پر مکمل کنٹرول حاصل ہو اور دوسرا زندگی بھر اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے سرگرداں رہے۔

اولاً تو ان مبشرین کا یہ موازنہ ہی بڑا عجیب ہے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک نبی نہیں بلکہ خدا اور خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ اگر وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہیں تو پھر نفسانی خواہشات یا ان پر کنٹرول کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ شاید عیسائی مستشرقین کو اس بات کا احساس نہیں کہ ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں حضرت عیسی علیہ السلام کا حضور ﷺ سے موازنہ کر کے وہ الوہیت مسیح کے عیسائی عقیدے کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ جو عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا نہیں مانتے بلکہ خدا کا مقدس رسول مانتے ہیں اگر وہ ان دو عظیم ہستیوں کے درمیان موازنہ کریں تو انہیں اس کا حق پہنچتا ہے لیکن ان عیسائیوں کو بھی موازنہ کرنے سے پہلے ہی یہ فیصلہ نہیں کر لینا چاہئے کہ مجرد رہنا تقدس کی نشانی ہے اور کتخدائی سے انسان کا تقدس مجروح ہو جاتا ہے۔ خدا کا رسول دنیا پر نسل انسانی کا راہنما بن کر تشریف لاتا ہے۔ منکرین رسالت ہر دور میں انبیاء و مرسلین پر یہ اعتراض کرتے آئے ہیں

کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی راہنمائی کے لئے کسی کو بھیجنا ہی تھا تو کیوں نہ کسی فرشتے کو اس کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس اعتراض کا جواب بارگاہ خداوندی سے انہیں یہی ملتا رہا ہے کہ انسانوں کی راہنمائی کا فریضہ وہی انجام دے سکتا ہے جو ان کی اپنی جنس سے ہو۔ جس کی زندگی کے تقاضے وہی ہوں جو عام انسانوں کی زندگی کے ہیں۔ جو انسانوں کے سامنے ایک نمونہ کامل پیش کرے جس کے مطابق عمل کر کے وہ اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکیں۔

تمام انبیائے کرام جو دنیا میں تشریف لائے، انسانی تقاضے بھی ان کے ساتھ تھے اور وہ ان کو پورا بھی کرتے تھے۔ انہیں بھوک بھی لگتی تھی اور وہ کھانا بھی کھاتے تھے۔ انہیں پیاس بھی لگتی تھی اور وہ پانی بھی پیتے تھے۔ حالت غم میں وہ غمگین بھی ہوتے تھے اور مسرت کے لحات میں شاداں و فرحاں بھی ہوتے تھے۔ وہ شادیاں بھی کرتے تھے، گھر بھی بساتے تھے، اولاد کی نعمت پا کر اس کا شکر بھی کرتے تھے اور بے اولاد ہونے کی صورت میں گڑگڑا کر خدا سے اولاد کی التجا بھی کرتے تھے۔ حضور ﷺ بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے۔ جو کام دیگر انبیائے کرام کرتے رہے تھے وہ کام حضور ﷺ نے بھی کئے۔ انبیاء و رسل کی یہ سنت تمام نسل انسانی کے لئے باعث رحمت ہے کیونکہ اب اگر وہ کھاتے ہیں تو یہ کام بھی سنت انبیاء کے مطابق ہے۔ اگر پیتے ہیں تو یہ بھی خدا کے مقدس رسولوں کی سنت ہے۔ اگر وہ نکاح کرتے ہیں تو بھی انبیائے کرام کی ایک سنت پر عمل کرتے ہیں۔ اگر اولاد کی نعمت ملنے پر انکا دل مسرور ہوتا ہے اور وہ اس سرور کا اظہار بھی کرتے ہیں تو یہ بھی سنت انبیائے کے مطابق ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ ابنیائے کرام کو کھانے اور پینے کی ضروریات سے بے نیاز رکھتا تو اکل و شرب کا عمل خلاف سنت انبیاء قرار پاتا۔ اگر انبیائے کرام نے نکاح کو شجر ممنوعہ قرار دیا ہوتا تو ان کی امتوں کے لوگ بھی نکاح کو معیوب سمجھتے۔ اور اگر دنیا مجرد انبیائے کرام کی سنتوں پر عمل کرتی تو نہ کسی کے گھر کے آنگن میں پھول کھلتے اور نہ بچوں کی معصوم باتیں گھروں کو رشک جنت بناتیں۔ گھر ویران ہو جاتے اور دنیا انسانوں کے وجود سے خالی ہو جاتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شادی نہیں کی، اس میں کچھ حکمت ضرور ہو گی جسے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے مقدس رسول ہیں اور خدا کا رسول وہی کچھ کرتا ہے جس کا اسے بارگاہ خداوندی سے حکم ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل

حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس عمل کو ان کا خاصا تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس کو ان کی ایسی سنت قرار نہیں دیا جا سکتا جس پر عمل کرنا ان کے سارے پیروکاروں کے لئے بھی ضروری ہو۔ انبیائے کرام کی زندگیوں میں متعدد چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ان کے خواص شمارے ہوتی ہیں اور امت کو ان کی پیروی کا حکم نہیں دیا جاتا۔

بعض عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس سنت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پوری دنیائے عیسائیت اس سنت عیسوی کو اپنی اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کی کبھی جرات نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے انجام کا وہ خوب اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس بحث سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ انسانی معاشرے میں مجرد رہنا نہیں بلکہ انبیاء ورسل کی سنت پر عمل کرتے ہوئے کتخدائی کی زندگی گزارنا ہی محمود اور مقبول ہے۔ آج عیسائیت کے چند محدود حلقوں کو چھوڑ کر ساری دنیا میں عزت ووقار کی نظروں سے انہی لوگوں کو دیکھا جاتا ہے جو متاہل زندگی گزارتے ہیں۔ مجرد آدمی کا نہ معاشرے میں کوئی وقار ہے اور نہ ہی کوئی اس پر اعتماد کر سکتا ہے۔ اس لئے اس بات کو حضور ﷺ کے مقام کو گھٹانے کے لئے استعمال کرنا کہ آپ نے شادیاں کیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کوئی شادی نہیں کی، نہ صرف غلط ہے بلکہ الٹا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام کو گھٹانے کی کوشش کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شادی نہ کرنے سے ان میں کوئی انسانی کمزوری ثابت ہوتی اور نہ ہی مختلف مقاصد کے تحت متعدد عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی وجہ سے حضور ﷺ میں کسی انسانی کمزوری کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح دیگر انبیاء ورسل کو بھی ان کی ازدواجی زندگی کی وجہ سے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

تعدد ازواج کا دستور ہمیشہ انسانوں میں مروج رہا ہے اور اس کی وجہ سے کسی بھی انسان کے معاشرتی مقام میں کمی نہیں آئی۔ یہی حال حضور ﷺ کا بھی ہے لیکن جب ہم حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حضور ﷺ نے تمام شادیاں جنسی جذبے کی تسکین کے پیش نظر کی ہی نہیں تھیں بلکہ شادیوں سے آپ کے مقاصد اتنے بلند تھے کہ مستشرقین ان کے تصور سے بھی قاصر ہیں۔ حضور ﷺ کی شادیوں کے مسئلے پر تفصیلاً غور کرنے سے پہلے آپ کی حیات طیبہ کے مندرجہ ذیل حقائق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

1:۔ حضور ﷺ نے پچیس سال کی عمر تک کوئی شادی نہیں کی۔

2:۔ آپ کے مردانہ حسن اور نسبی وجاہت کی وجہ سے ان عورتوں کی کمی نہ تھی جو آپ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا چاہتی تھیں۔

3:۔ آپ نے جنسی اباحیت کے ماحول میں اپنا عنفوان شباب تجرد کی حالت میں گزارا لیکن کسی کو آپ کے دامن عفت پر کوئی دھبہ نظر نہ آیا۔

4:۔ آپ نے پہلی شادی پچیس سال کی عمر میں کی۔ جس خاتون کو سب سے پہلے آپ نے اپنی زوجیت کا شرف بخشا وہ آپ سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھی۔ شادی کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ حضور ﷺ کے نکاح میں آنے سے پہلے وہ دو خاوندوں کی زوجیت میں رہ چکی تھیں۔

5:۔ حضور ﷺ نے اپنی عمر کا پچیس سال کا عرصہ اسی واحد خاتون کے ساتھ گزارا جس کے ساتھ آپ سب سے پہلے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ اپنی عمر کے پچاسویں سال تک اور اپنی زوجہ محترمہ کی عمر کے پینسٹھویں سال تک، جب تک آپ کی وہ زوجہ محترمہ زندہ رہیں، آپ نے دوسری شادی نہیں کی۔

6:۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد آپ نے جس خاتون سے شادی کی وہ ایک بیوہ اور معمر خاتون تھیں۔

7:۔ ایک زوجہ محترمہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوا آپ کی تمام ازواج مطہرات میں سے کوئی بھی باکرہ نہ تھیں حالانکہ حضور ﷺ اپنے امتیوں کو باکرہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ آپ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرے پر خوشبو اور مسرت کے کچھ آثار دیکھے تو آپ نے ان سے یہ گفتگو فرمائی:

هَلْ تَزَوَّجْتَ قَالَ: نَعَمْ۔ قَالَ: بِكْرًا اَمْ ثَيِّبًا قَالَ: بَلْ ثَيِّبًا۔ فَقَالَ لَهُ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيهِ: فَهَلاَّ بِكْرًا تُلاَعِبُهَا وَتُلاَعِبُكَ وَتُضَاحِكُهَا وَتُضَاحِكُكَ (1)

"آپ نے ان سے پوچھا کیا تم نے شادی کی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں یارسول اللہ۔ آپ نے پوچھا: کیا تم نے کسی باکرہ عورت سے

1۔ محمد علی صابونی، "شبہات واباطیل حول تعدد زوجات الرسول"، (مکہ مکرمہ۔1980ء)، صفحہ 11

شادی کی ہے یا غیر باکرہ سے؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! غیر باکرہ عورت سے شادی کی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں کسی باکرہ عورت سے شادی کرنی چاہئے تھی کہ وہ تمہارے ساتھ دل لگی کرتی اور تم اس کے ساتھ دل لگی کرتے۔ وہ تمہارے ساتھ ہنسی مذاق کرتی اور تم اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے۔"

8۔ حضور ﷺ نے متعدد خواتین کو اپنے نکاح میں لینے کے باوجود فرمایا:

مَالِیْ فِی النِّسَآءِ مِنْ حَاجَةٍ (1)

"یعنی مجھے عورتوں کی کوئی حاجت نہیں ہے۔"

9۔ حضور ﷺ کی اکثر شادیاں پچپن سے لے کر انسٹھ سال تک کی عمر کے درمیان ہوئیں۔

جو شخص حضور ﷺ کی بیویوں کی تعداد کو گن کر آپ کے کردار کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے اور ایسا کرتے وقت مندرجہ بالا حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے کیا اس شخص کو غیر جانبدار محقق اور انصاف پسند عالم کہا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ جو شخص پچیس سال کی عمر تک مجرد رہے اور پچیس سے پچاس سال تک کا عرصہ ایک معمر خاتون کی رفاقت میں گزارے اور اس طویل عرصے میں کوئی جذبہ نہ تو اسے کسی غلط کام کی طرف متوجہ کر سکے اور نہ وہ مزید خواتین سے نکاح کا خیال اپنے دل میں لائے، کیا یہ بات ممکن ہے کہ جب اس شخص کی عمر پچپن سال ہو جائے تو یکایک اس کے جنسی جذبات طوفان بن کر امڈ آئیں اور عورتوں کی کوئی تعداد اسے مطمئن نہ کر سکے۔

ایک شخص جو اپنی خواہشات کا غلام ہو، اس کے ہاتھ میں اقتدار بھی ہو، ہزاروں لوگ اس کے اشارہ ابرو پر جانیں قربان کرنے کے لئے تیار بھی ہوں، قوم کا ہر فرد اس کے ساتھ رشتہ مصاہرت قائم کرنے کو ایک بہت بڑی سعادت سمجھتا ہو اور حسین سے حسین تر دوشیزاؤں کے ساتھ شادی کرنے کے راستے میں اس کے لئے کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو، ایسا شخص کیا کرے گا؟ کیا وہ اپنی زوجیت کے لئے حسین ترین دوشیزاؤں کو منتخب کرے گا یا اس کی نگاہ انتخاب بیوہ اور معمر خواتین پر پڑے گی؟ یقیناً ایسا شخص اپنی زوجیت کے لئے حسین ترین دوشیزاؤں کو چنے گا اور وہ کسی بیوہ خصوصاً عمر رسیدہ بیوہ سے نکاح کے خیال کو

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 131، بحوالہ دارمی

کبھی دل میں نہیں لائے گا۔

حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے تاریخی حقائق ہمارے سامنے ہیں۔ آپ کی ازدواجی زندگی پر بحث کرتے وقت دو چیزوں کو خصوصی طور پر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ آپ نے ایک سے زیادہ عورتوں کو زوجیت کا شرف اس وقت بخشا جب آپ کی عمر پچپن سال سے تجاوز کر چکی تھی اور پیرانہ سالی کا دور شروع ہو چکا تھا۔

دوسری چیز یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ حضور ﷺ نے، کسی قسم کی مجبوری کے بغیر، اپنی زوجیت کے لئے، سوائے ایک کے، تمام بیوہ خواتین کو منتخب فرمایا۔

ایک تیسری بات بھی اس سلسلے میں ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جو آدمی خواہش پرست ہوتا ہے وہ صنف نازک کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیویوں کے جائز اور ناجائز مطالبے اور فرمائشیں پوری کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے لیکن حضور ﷺ نے تو، مدینہ کا بے تاج بادشاہ ہوتے ہوئے بھی، اپنے کاشانہ اقدس کو فقر کا گہوارہ بنا رکھا تھا۔ ازواج مطہرات کو آپ نے بیگمات اور رانیوں کی طرح ناز نخرے سے نہیں رکھا بلکہ ایک بار جب انہوں نے اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کا مطالبہ کیا تو آپ نے باذن خداوندی، اپنی ازواج مطہرات کو دوٹوک الفاظ میں بتادیا کہ اگر تم مال و دولت کی خواہش مند ہو تو اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے تمہیں خدا کے رسول سے علیحدگی اختیار کرنی پڑے گی اور اگر تم خدا کے رسول کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتی ہو تو پھر تمہیں قناعت اور صبر و شکر سے گزر بسر کرنی پڑے گی، معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے چاہو تو دنیوی مال و متاع کو اختیار کو لو اور چاہو تو خدا اور خدا کے رسول ﷺ کو۔ اس پیشکش کے جواب میں تمام ازواج مطہرات نے حضور ﷺ ہی کو پسند کیا تھا اور کاشانہ نبوت کی شان فقر و استغناء پر دنیا کی ہر دولت کو قربان کر دیا تھا۔

حضور ﷺ کا اپنی ازواج مطہرات کو یہ اختیار دینا اور اس کے جواب میں تمام ازواج مطہرات کا دنیوی مال و دولت کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر آپ کو اختیار کرنا، اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ حضور ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات کا باہمی رشتہ جنسی خواہشات کی بنیادوں پر قائم نہ تھا بلکہ یہ رشتہ ان عظیم مقاصد کی بنیادوں پر قائم تھا جن کے لئے سب کچھ قربان کیا جا سکتا تھا۔ حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی میں اس کے علاوہ بھی بے

شمار ایسی داخلی شہادتیں موجود ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ کا متعدد خواتین سے شادی کرنا جنسی خواہشات کی تسکین کی خاطر نہ تھا بلکہ اس کے مقاصد کچھ اور تھے۔

اس بحث کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اگر حضور ﷺ نے شادیاں کرتے وقت جنسی تقاضوں کو زیادہ اہمیت نہ دی تھی تو پھر آپ نے متعدد خواتین سے شادیاں کن مقاصد کے تحت کیں اور ان شادیوں میں حکمت کیا تھی؟

حضور ﷺ کی شادیوں کے مقاصد

علامہ محمد علی صابونی نے اپنی کتاب "شبہات واباطیل حول تعدد زوجات الرسول" میں اس موضوع پر بڑی خوبصورت بحث کی ہے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی متعدد شادیوں کے ان گنت مقاصد کو ان شعبوں میں تقسیم کیا ہے: تعلیمی مقاصد، تشریعی مقاصد، سماجی مقاصد اور سیاسی مقاصد۔

تعلیمی مقاصد

انسانی زندگی کے بے شمار مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق خصوصی طور پر عورتوں کے ساتھ ہے۔ اسلام ان نسوانی مسائل کے متعلق بھی تفصیلی راہنمائی فراہم کرتا ہے کیونکہ صنف لطیف نصف امت ہے اور اسلام نصف امت کے مسائل کو نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ جن مسائل کا تعلق عورتوں کی نسوانی زندگی کے ساتھ ہے ان کے متعلق کوئی عورت کسی غیر محرم مرد کے ساتھ گفتگو کرنے سے شرماتی ہے۔ گو اہل مغرب ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں شرم وحیا کی انسانی اقدار معاشرے سے رخصت ہو گئی ہیں لیکن ان کی یہ ترقی انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں حیا کا مادہ رکھا ہے اور جو چیزیں انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہیں ان میں شرم وحیا کی صفت بہت اہم ہے۔ حضور ﷺ عورتوں کے مسائل کے متعلق جو تعلیمات لے کر مبعوث ہوئے تھے ان تعلیمات کو امت کی عورتوں تک پہنچانے، عورتوں کو وہ مسائل سمجھانے اور ان پر عمل کر کے دکھانے کے لئے آپ کو ایسی خواتین کی ضرورت تھی جو انتہائی پاک باز، ذہین، فطین، دیانت دار اور متقی ہوتیں اور فریضہ رسالت کی تبلیغ کے لئے مخلص کارکنوں کی

حیثیت سے کام کر سکتیں۔ ایسی عورتیں جو حضور علیہ کی گھریلو زندگی کی تفصیلات کو محفوظ کرتیں، انہیں امانت اور دیانت کے ساتھ امت کی عورتوں تک پہنچاتیں، ملت کی عورتیں اپنے جن مسائل کو حضور علیہ کی خدمت میں پیش کرنے سے شرماتی تھیں، ان عورتوں سے وہ مسائل سنتیں، ان مسائل کو حضور علیہ کی خدمت میں پیش کرتیں، حضور علیہ اس مسئلے کا جو حل بتاتے اسے عورتوں تک پہنچاتیں اور ان کو ان پر عمل کرنے کا طریقہ بھی سمجھاتیں۔

ان کاموں کے لئے حضور علیہ کو ایسی خواتین کی ضرورت تھی جو مذہب یا معاشرے کی طرف سے کسی قدغن کے بغیر، آپ کے کاشانہ اقدس میں آپ کے ساتھ رہ سکتیں۔ یہ کام صرف وہی خواتین کر سکتی تھیں جو حضور علیہ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتیں۔

ہجرت کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور بہت جلد ان نفوس قدسیہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی جن کی تعلیم کا فریضہ حضور علیہ کو انجام دینا تھا۔ صرف ایک بیوی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ان گوناگوں ذمہ داریوں سے تنہا عہدہ برآ ہو سکتی۔

جب اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ حضور علیہ جب اپنے امتیوں کو باکرہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی ترغیب دیتے تھے تو آپ نے خود اس پر عمل کیوں نہ کیا۔ حضور علیہ نے جن مقاصد کے تحت شادیاں کی تھیں ان مقاصد کے لئے آپ کو تجربہ کار اور جہاں دیدہ خواتین کی ضرورت تھی اور آپ نے ان ہی خواتین کا انتخاب فرمایا جو اس مقصد کے لئے معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ آپ نے ایک کے سوا تمام بیوہ خواتین کو اپنی زوجیت میں لیا۔ یہ خواتین بیوہ تو تھیں لیکن ذہانت، فطانت اور دیانت داری میں اپنی مثال آپ تھیں۔ حضور علیہ نے جس ایک باکرہ خاتون کو شرف زوجیت بخشا وہ بھی اپنی صغر سنی کے باوجود مذکورہ بالا صفات میں کسی جہاندیدہ خاتون سے کم نہ تھیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا مقاصد کو جس حسن و خوبی کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے پورا کیا وہ انہی کا حصہ ہے۔

عورتوں کے مسائل، مثلاً حیض، نفاس، جنابت اور امور زوجیت کے مسائل ایسے تھے جو نہ تو عورتیں کھل کر حضور علیہ کے سامنے پیش کر سکتی تھیں اور نہ ہی حضور علیہ کھل کر ان کا جواب دے سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرم و حیا حضور علیہ کی صفات میں سے

ایک اہم ترین صفت ہے اور حدیث کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ حضور ﷺ اتنے حیادار تھے جتنی حیادار، دلہن اپنے حجلہ عروسی میں ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کی تبلیغی زندگی میں بعض ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کسی خاتون نے کوئی مسئلہ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اشارے اور کنائے کے ذریعے اس مسئلے کا جواب سائلہ کو سمجھانا چاہا لیکن وہ اس مسئلے کو نہ سمجھ سکی۔ ہم یہاں اس قسم کی ایک مثال پیش کرتے ہیں تاکہ یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو کہ حضور ﷺ کی ازواج مطہرات نے کس طرح امت کی خواتین کو دین کے مسائل سمجھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک انصاری عورت نے حضور ﷺ سے غسل حیض کے متعلق سوال کیا۔ حضور ﷺ نے اسے غسل حیض کا طریقہ سمجھایا اور پھر فرمایا: ایک خوشبودار روئی کا گالا لو اور اس کے ذریعے طہارت حاصل کرو۔ اس عورت نے عرض کیا: روئی کے گالے کے ذریعے کیسے طہارت حاصل کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اس کے ساتھ طہارت حاصل کرو۔ اس نے پھر عرض کیا: یارسول اللہ! (ﷺ) میں اس کے ذریعے کیسے طہارت حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا: سبحان اللہ! اس کے ساتھ طہارت حاصل کرو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: میں نے یہ صورت حال دیکھی تو اس عورت کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اسے بتایا کہ اس روئی کے گالے کو فلاں مقام پر رکھو اور اس کے ذریعے خون کا اثر ختم کرو۔ فرماتی ہیں: میں نے اس عورت کو تفصیل سے سمجھایا کہ روئی کے گالے کو کس مقام پر رکھنا ہے۔(1)

قارئین کرام اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسئلہ طہارت کا تھا جو اسلام کی اکثر عبادات کے لئے شرط ہے۔ اس عورت کے لئے اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اس مسئلے کے متعلق حضور ﷺ سے استفسار کرے۔ لیکن حضور ﷺ حیا کی وجہ سے اس غیر محرم عورت کے سامنے اس مسئلے کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اس صورت حال میں ایک ایسی خاتون کی ضرورت تھی جو حضور ﷺ کی محرم ہو اور اس مسئلے کی تفصیلات کو حضور ﷺ سے سیکھ کر اس عورت کو سمجھا سکے۔ یہی کام اس موقعہ پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سر انجام دیا اور باقی امہات المومنین نے بھی اسی انداز میں تعلیم امت کے فریضہ کی

1۔ شبہات واباطیل حول زوجات الرسول، صفحہ 15

ادائیگی میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ مسلمان عورتوں کا معمول یہ تھا کہ جب ان کو اس قسم کا کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ امہات المومنین میں سے کسی کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور اپنا مسئلہ عرض کرتیں۔ ان کو اگر اس مسئلے کا حل پہلے سے معلوم ہوتا تو ان عورتوں کو بتا دیتیں وگرنہ حضور ﷺ سے پوچھ کر سائلہ کو اس مسئلے کا حل سمجھا دیتی تھیں۔

ازواج مطہرات کی علمی خدمات صرف خواتین کے مسائل کے ساتھ ہی خاص نہیں تھیں بلکہ حضور ﷺ کی بے شمار قولی اور فعلی سنتیں، جن کا تعلق خانگی زندگی کے ساتھ تھا، ان سنتوں کو محفوظ کرنے اور امانت داری کے ساتھ ان کو امت تک منتقل کرنے کا مقدس فریضہ بھی ان خوش قسمت خواتین نے ہی ادا کیا ہے۔ اس لئے امہات المومنین عورتوں کے جملہ مسائل کی بھی معلمات تھیں اور مردوں کے خانگی مسائل، خصوصاً جن کا تعلق حضور ﷺ کی سنت فعلی کے ساتھ تھا وہ بھی امت تک حضور ﷺ کی ازواج مطہرات ہی کے ذریعے پہنچے ہیں۔

ان حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضور ﷺ کی ازواج مطہرات صرف امہات المومنین ہی نہیں بلکہ وہ ملت کی معلمات بھی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو آدھا دین حضور ﷺ کی ازواج مطہرات کی وساطت سے ہی ملا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امت پر ان کے احسانات کی وجہ سے انہیں ساری امت کی مائیں قرار دیا گیا اور حضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے ساتھ کسی دوسرے کے نکاح کو حرام قرار دے دیا گیا۔

تعلیم دین کے یہ مدرسے حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی اور آپ کے انتقال کے بعد بھی علم کا نور پھیلاتے رہے۔ اکابر صحابہ کرام بھی مشکل ترین مسائل کا حل دریافت کرنے کیلئے کسی ام المومنین کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہاں سے انہیں مشکل ترین سوالات کے جوابات مل جاتے تھے۔ اس طرح حضور ﷺ نے تعدد زوجات کے قانون کو ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کرنے کے لئے استعمال کیا جس میں ماہرین علوم اسلامیہ کی ایک جماعت علمی خدمات انجام دینے میں مصروف تھی۔ جو شخص حضور ﷺ کی شادیوں کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس اہم ترین مقصد کو نظر انداز کر دیتا ہے وہ اس مسئلے کی حقیقت کو کیسے سمجھ سکتا ہے؟

تشریعی مقاصد

زمانہ جاہلیت میں ایسی کئی رسمیں موجود تھیں جن سے انسانی معاشرے میں بڑے سنگین مسائل پیدا ہوتے تھے۔ تباہ کن نتائج کی حامل ہونے کے باوجود، اس قسم کی رسمیں لوگوں کی زندگیوں میں یوں رس بس چکی تھیں کہ کسی انسان کے لئے ان رسموں کی مخالفت کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ حضور علیہ السلام کے فریضہ نبوت ورسالت میں جس طرح خدا کی زمین کو بتوں سے پاک کرنے کا کام شامل تھا اسی طرح انسانی معاشرے سے تمام غلط اور نقصان دہ رسموں کا قلع قمع کرنا بھی آپ کے فرائض نبوت میں سے ایک تھا۔ ایسی رسمیں جو انسانوں کے رگ و پے میں سماچکی تھیں ان کو ختم کرنا اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک حضور علیہ السلام خود ان رسموں کے خلاف عمل کر کے لوگوں کے سامنے نمونہ پیش نہ کرتے۔

اس قسم کی رسموں میں سے ایک رسم کسی غیر کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنانے کی بھی تھی۔ ایک شخص کسی اجنبی کے بیٹے کو کہہ دیتا کہ تو میرا بیٹا ہے۔ اس کے اس قول سے وہ اس کا بیٹا قرار پاتا اور نسب، میراث، طلاق، شادی اور مصاہرت کے تمام مسائل میں اس کی حیثیت ایک حقیقی بیٹے جیسی ہو جاتی۔ اس طرح معاشرے میں بے شمار مسائل جنم لیتے۔ مستحق لوگ میراث سے محروم ہو جاتے اور ایک غیر مستحق شخص ساری جائداد کا وارث بن جاتا۔ محرمات کے سلسلہ میں یہ رسم انتہائی تباہ کن نتائج برآمد کر سکتی تھی۔ اس رسم کو ختم کرنا ضروری تھا، لیکن جو شخص صدیوں پرانی رسم کو ختم کرنے کی کوشش کرتا، اس پر ہر طرف سے طعن و تشنیع کے تیروں کی بارش برستی۔ یہ فریضہ اتنا کٹھن تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ادائیگی کے لئے حضور علیہ السلام کے کسی خادم کی بجائے خود آپ کو منتخب فرمایا اور آپ کو یہ قدیم رسم توڑنے کا حکم دیا۔ اس رسم کو توڑنے پر ہر طرف سے طعن و تشنیع کے تیر برسے لیکن حضور علیہ السلام نے ثابت قدمی اور استقلال سے سب کچھ برداشت کیا اور تنقید کرنے والوں کی تنقید کا جواب آپ کے رب کریم نے خود دیا۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے حضور علیہ السلام کی شادی خاص طور پر اسی مقصد کے لئے ہوئی تھی۔ اس شادی کے لئے احکام حضور علیہ السلام کو بارگاہ خداوندی سے وحی متلو یعنی قرآن حکیم کے ذریعے ملے تھے۔

حضور ﷺ نے عربوں کے دستور کے مطابق حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متبنیٰ بنایا۔ اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحش کے ساتھ ان کا نکاح کیا۔ اللہ تعالیٰ نے لے پالک بیٹے کے متعلق غلط رسموں کو ختم کرنے کے لئے تدبیر یہ کی کہ حضرت زید بن حارثہ حضرت زینب کو طلاق دیں اور عدت گزرنے کے بعد حضور ﷺ حضرت زینب کے ساتھ نکاح کر لیں۔ حضور ﷺ کو خدشہ یہ تھا کہ اس نکاح کی صورت میں منافقین، یہودی اور دیگر دشمنان اسلام طوفان بدتمیزی برپا کریں گے اور کہیں گے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کو انسانوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، آپ صرف اور صرف خدا سے ڈریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں واضح الفاظ میں فرمایا:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (1)

"پھر جب پوری کر لی زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا تا کہ (اس عملی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ پورا کر لیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔"

حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اپنے نکاح میں لے لیا جو آپ کے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ تھیں۔ جب امتیوں کے سامنے اپنے پیارے نبی کی سنت آ گئی تو اب اس غلط رسم کے خلاف عمل کرنے میں ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ گئی۔

اس شادی کے ذریعے حضور ﷺ نے ایک بہت بڑا سماجی مسئلہ حل کیا تھا اور ایک انتہائی اہم قانون عملاً نافذ کیا تھا لیکن مستشرقین حضور ﷺ کے اس حکیمانہ طرز عمل کو آپ کے اخلاق کو داغدار کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ حضرت زینب بنت جحش کے

1۔ سورۃ الاحزاب: 37

ساتھ حضور ﷺ کی شادی کو مستشرقین نے انتہائی ناروا انداز میں اچھالا ہے۔ ہم انشاء اللہ العزیز ایک مستقل فصل میں مستشرقین کی ان ہرزہ سرائیوں کا جواب دیں گے، یہاں ہم صرف اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے متعدد خواتین کے ساتھ نکاح کرنے کے کچھ مقاصد تشریعی نوعیت کے تھے اور حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ آپ کی شادی اس کی بہترین مثال ہے۔ حضرت زینب بنت جحش دیگر امہات المومنین کے سامنے اس بات پر فخر کا اظہار کرتی تھیں کہ حضور ﷺ کے ساتھ تمہاری شادیاں تو تمہارے اہل خانہ نے کی ہیں لیکن حضور ﷺ کے ساتھ میری شادی خود رب کریم نے سات آسمانوں کے اوپر کی ہے۔

سماجی مقاصد

وفاداری اہم ترین انسانی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ دوست کا حق دوستی ادا کرنے کی کوشش کرنا، محسن کے احسان کو یاد رکھنا، خادم کی خدمات کو فراموش نہ کرنا، یہ ایسی خصوصیات ہیں جو انسانیت کا زیور شمار ہوتی ہیں۔ اسلام وفا کا دین ہے اور اسلام کا پیغمبر وہ لجپال ہے جسے دنیا میں تو کیا قیامت کے روز بھی اپنے غلاموں کی فکر ہو گی۔ حضور ﷺ نے جب شرک کی ظلمتوں میں نعرہ توحید بلند کیا تھا اس وقت آپ کی دعوت کو قبول کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ان مشکل ترین حالات میں بھی کچھ نفوس قدسیہ ایسے تھے جنہوں نے حضور ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے میں ذرا بھر تاخیر نہیں کی اور پھر اس کٹھن ترین مشن کے ایک ایک مرحلے پر وہ آپ کے دست و بازو بنے رہے۔ اس راستے میں انہوں نے حضور ﷺ اور آپ کی دعوت کے لئے جو قربانیاں دیں وہ تاریخ جاں نثاری کا ایک زریں باب ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فداکاروں کے اس مقدس قافلے کے سرخیل ہیں اور اس قافلے میں جو نفوس قدسیہ شامل تھے ان میں عمر فاروق، عثمان غنی، حیدر کرار اور زید بن حارثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسی مقدس ہستیوں کے نام آتے ہیں۔ ہجرت کے بعد انصار مدینہ نے حضور ﷺ کے مشن کے لئے جو قربانیاں دی تھیں، ان کی مثال بھی پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے۔

حضور ﷺ کے غلاموں کی ان جاں نثاریوں کا اصل صلہ تو قیامت کے دن ان کو اللہ

تعالیٰ خود عطا فرمائے گا لیکن حضور ﷺ نے اس دنیا میں بھی ان غلاموں کو نوازنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انصار کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق کا خیال رکھنے کی جو تاکید امت کو حضور ﷺ نے بار بار فرمائی ہے، وہ آپ کی شان لجپالی کا اظہار ہے۔ اپنے خادموں کو نوازنے کے لئے حضور ﷺ نے ایک اسلوب یہ اپنایا کہ آپ نے ان کے ساتھ رشتہ مصاہرت قائم کیا۔ آپ نے حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی صاحبزادیوں کو اپنے نکاح میں لیا۔ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے نکاح میں اپنی صاحبزادیاں دے کر ان کے ساتھ رشتہ مصاہرت قائم کیا۔ ان غلاموں کے لئے حضور ﷺ کی اس عطا سے بڑی کسی نعمت کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو اپنے باپ پر ترجیح دی تھی اور حضور ﷺ کی غلامی کو آزادی اور ناز و نعمت کی زندگی سے بہتر سمجھا تھا اور پھر تبلیغ حق کے کٹھن فریضے میں قدم قدم پر جاں نثاری کے مظاہرے کئے تھے۔ حضور ﷺ نے اپنی پھوپھی کی بیٹی کا نکاح ان کے ساتھ کر کے ان کی عزت افزائی فرمائی۔

جن لوگوں کے ساتھ حضور ﷺ نے اپنی شادیوں کے ذریعے رشتہ مصاہرت قائم کیا تھا، انہیں بھی اس بات کا علم تھا کہ حضور ﷺ نے ان کی دلجوئی کی خاطر یہ رشتہ قائم فرمایا ہے۔ وہ اس رشتے کے قیام پر حضور ﷺ کے ممنون احسان تھے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تو حضور ﷺ کی غلامی پر ناز تھا۔ انہوں نے حضور ﷺ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا، اس کے باوجود ان کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے حضور ﷺ کے احسانات کا حق ادا کر دیا ہے، لیکن حضور ﷺ نے ان کی ان قربانیوں کو فراموش نہ کیا تھا جو انہوں نے آپ کے مشن کی خاطر دی تھیں۔

آپ اپنے صدیق کے متعلق ان جذبات کا اظہار فرماتے تھے:

مَا لِاَحَدٍ عِنْدَنَا یَدٌ اِلاَّ وَقَدْ کَافَیْنَاہُ بِھَا مَا خَلاَ اَبَابَکْرٍ فَاِنَّ لَہٗ عِنْدَنَا یَدًا یُکَافِیْہِ اللّٰہُ تَعَالٰی بِھَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَمَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَحَدٍ قَطُّ مَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَبِیْ بَکْرٍ۔ وَمَا عَرَضْتُ الْاِسْلاَمَ عَلٰی اَحَدٍ اِلاَّ کَانَتْ لَہٗ کَبْوَۃٌ اِلاَّ اَبَا بَکْرٍ فَاِنَّہٗ لَمْ یَتَلَعْثَمْ وَلَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلاً لاَ تَّخَذْتُ

اَبَا بَکْرٍ خَلِیْلاً اَلاَ وَاِنَّ صَاحِبَکُمْ خَلِیْلُ اللّٰہِ تَعَالٰی (1)

''ہم پر جس کسی نے کوئی احسان کیا ہے ہم نے اس کا بدلہ چکا دیا ہے، سوائے ابو بکر کے کیوں کہ ان کے ہم پر وہ احسانات ہیں جن کا بدلہ انہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی عطا فرمائے گا۔ مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں پہنچایا جتنا نفع مجھے ابو بکر کے مال سے پہنچا ہے۔ میں نے جس کسی کو بھی اسلام کی دعوت دی، اس نے اس کو قبول کرنے میں تردد کیا لیکن ابو بکر نے بغیر کسی تردد کے میری دعوت کو قبول کر لیا۔ اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابو بکر کو ہی خلیل بناتا۔ سنو! تم اس بات سے آگاہ رہو کہ تمہارے نبی خدا کے خلیل ہیں۔''

جس شخص کے متعلق حضور ﷺ کے دل میں اس قسم کے جذبات تھے، اس کو آپ دنیا میں جو سب سے بڑا معاوضہ عطا کر سکتے تھے، وہ یہ تھا کہ آپ اس کے ساتھ رشتہ مصاہرت قائم فرماتے۔ یہ اعزاز آپ نے اپنے صدیق کو عطا فرمایا اور ان کی صاحبزادی کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔

جن نفوس قدسیہ نے دبستان نبوت میں تربیت حاصل کی تھی ان کے درمیان مال و دولت، جاہ و حشمت اور اسی قسم کی عارضی چیزوں میں تو باہم مقابلہ نہیں ہوتا تھا البتہ نیکی کے کاموں میں وہ باہم مسابقت ضرور کرتے تھے۔ دین اسلام کے لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمات کو کون نہیں جانتا۔ ان کو صحابہ کرام میں بہت بلند مقام حاصل تھا لیکن انہیں شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ نیکیوں میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اپنے اس احساس کا انہوں نے کئی بار اظہار بھی فرمایا تھا۔ حضور ﷺ نے جب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ساتھ رشتہ مصاہرت میں منسلک کیا تو آپ نے اپنے اس دوسرے مخلص ترین صحابی کو بھی وہ اعزاز عطا فرمانا چاہا جو صدیق اکبر کو عطا فرمایا تھا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی بیوہ ہو گئیں۔ اپنی بیٹی کے مستقبل کے لئے ان کا فکر مند ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ حضور ﷺ نے ان کی بیوہ بیٹی کو

1۔ شبہات واباطیل حول زوجات الرسول، صفحہ 24

اپنی زوجیت میں قبول فرما کر ایک طرف تو ان کی پریشانی دور فرمائی اور دوسری طرف ان کو وہ اعزاز عطا فرمایا جو ان کے لئے حاصل حیات تھا۔ جس طرح صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی صاجزادیوں کے ساتھ حضور ﷺ کی شادیوں کے مقاصد میں سے ایک مقصد اپنے غلاموں کی دلجوئی تھا اسی طرح آپ کی دیگر کئی شادیوں میں بھی سماجی مقاصد سر فہرست تھے۔

سیاسی مقاصد

حضور ﷺ کی شادیوں کے متعدد مقاصد میں سے ایک مقصد دشمنوں کے دل جیتنا، اسلام کے ساتھ ان کی مخالفت کو کم کرنا، قبائل کو اس رشتے کے ذریعے اپنے قریب تر کرنا اور اس طرح نور حق کو پھیلانے کے لئے راستہ ہموار کرنا بھی تھا۔ ہم یہاں چند مثالیں درج کرتے ہیں جن سے پتہ چلے گا کہ حضور ﷺ کی شادیوں کے ذریعے کتنے سیاسی فوائد حاصل ہوئے۔

(1) بنو مصطلق کا قبیلہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دشمنی میں پیش پیش تھا۔ اس قبیلے کا سردار حارث اسلام کا کٹر دشمن تھا۔ غزوہ بنو مصطلق میں اس قبیلے کو شکست ہوئی اور اس قبیلے کے متعدد لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے۔ ان قیدیوں میں بنو مصطلق قبیلہ کے سردار کی ایک بیٹی جویریہ بنت حارث بھی تھیں۔ انہوں نے اپنے اسیر کنندہ سے مکاتبت کا معاہدہ کیا اور زر مکاتبت ادا کرنے کی خاطر حضور ﷺ سے مدد کی درخواست کی۔ حضور ﷺ کو جب یہ پتہ چلا کہ یہ سردار قبیلہ کی بیٹی ہیں تو آپ نے ان کے سامنے یہ پیشکش کی کہ اگر انہیں منظور ہو تو آپ ان کا زر فدیہ ادا کر کے ان کے ساتھ نکاح کر لیں۔ حضرت جویریہ نے حضور ﷺ کی اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ حضور ﷺ نے ان کا زر مکاتبت ادا کر کے ان کے ساتھ نکاح کر لیا۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے حضرت جویریہ سے نکاح کر لیا ہے تو انہوں نے بنو مصطلق قبیلہ کے تمام اسیروں کو یہ کہ کر رہا کر دیا کہ یہ لوگ حضور ﷺ کے سسرالی رشتہ دار ہیں ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ان کو اپنی قید میں رکھیں۔ اس طرح آزاد ہونے والے کوئی ایک دو آدمی نہ تھے بلکہ حضرت جویریہ کی برکت سے آزادی کی نعمت تقریباً سو گھرانوں کو حاصل ہوئی۔ بنو مصطلق نے جب حضور ﷺ کی اس عالی ظرفی اور مسلمانوں کے دلوں میں موجزن حب رسول کے جذبے کا مشاہدہ کیا تو وہ سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

یہ بات معمولی نہیں ہے کہ ایک شادی کی برکت سے اسلام کے ایک کٹر دشمن قبیلے نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی دشمنی چھوڑ کر حضور ﷺ کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

فَمَا رَأَيْنَا اِمْرَأَةً كَانَتْ اَعْظَمَ بَرَكَةِ عَلٰى قَوْمِهَا مِنْهَا(1)

"ہم نے کسی عورت کو نہیں دیکھا جو اپنی قوم کے لئے اس سے زیادہ برکت کا باعث بنی ہو جتنی برکت کا باعث جویریہ اپنی قوم کے لئے بنیں۔"

(2) حیی بن اخطب بھی بنو مصطلق کے سردار حارث کی طرح اسلام کا زبردست دشمن تھا۔ اس کی بیٹی صفیہ بنت حیی بن اخطب غزوۂ خیبر میں مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوئیں۔ حضور ﷺ نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان کے سامنے دو صورتیں رکھیں۔

پہلی صورت یہ تھی کہ وہ اسلام قبول کریں اور آپ انہیں آزاد کر کے اپنی زوجیت کا شرف بخشیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اگر وہ یہودیت پر قائم رہنا چاہیں تو آپ انہیں آزاد کر دیں اور وہ اپنی قوم کے پاس واپس چلی جائیں۔ انہوں نے اسلام قبول کر کے حضور ﷺ کی زوجیت میں آنا پسند کیا۔(2) حضرت صفیہ سے حضور ﷺ کا نکاح اس لحاظ سے انتہائی مفید تھا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان سے حضور ﷺ کے نکاح سے پہلے یہودی مسلمانوں کے خلاف ہر جنگ میں کسی نہ کسی شکل میں شریک نظر آتے ہیں لیکن اس نکاح کے بعد اسلام کی ابتدائی تاریخ میں یہودی کسی جنگ میں مسلمانوں کے مدمقابل نظر نہیں آتے۔(3)

(3) ابوسفیان کی اسلام دشمنی سے کون واقف نہیں۔ قوم قریش کا نشان جنگ ابوسفیان کے گھر میں رہتا تھا۔ جب یہ نشان باہر کھڑا کیا جاتا تو قوم کے ہر فرد پر آبائی ہدایات اور قومی روایات کے اتباع میں لازم ہو جاتا تھا کہ سب کے سب اس جھنڈے کے نیچے فوراً جمع ہو جائیں۔ اسلام کے خلاف اکثر جنگوں میں ابوسفیان ہی نے لشکر قریش کی قیادت کی۔ حضور ﷺ نے اسلام کے اس کٹر دشمن کی لخت جگر ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس رشتے کا اثر یہ ہوا کہ ابوسفیان کی اسلام دشمنی کا زور ٹوٹ گیا اور بہت جلد وہ

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 175

2۔ شبہات واباطیل، صفحہ 30-29

3۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 132

اسلام کے جھنڈے تلے اپنی جان کی بازی لگانے کے لئے تیار کھڑا نظر آیا۔ کیا وہ نکاح حضور ﷺ کی ایک انتہائی کامیاب سیاسی تدبیر نہ تھی جس نے اسلام کے سب سے بڑے دشمن کو اسلام کی صفوں میں لا کھڑا کیا تھا؟ حضور ﷺ کی تمام شادیوں کے پس منظر میں اسی قسم کے عظیم مقاصد کار فرما تھے۔

اسلام کے نزدیک کسی عام مسلمان کی شادی کا مقصد بھی جنسی خواہشات کی تسکین تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ہر شادی کے متعدد مقاصد ہوتے ہیں جن میں سے جنسی خواہش کی جائز اور منظم تسکین بھی ایک مقصد ہے لیکن مسلمان صرف اس ایک مقصد کے لئے شادی نہیں کرتا۔ حضور ﷺ بھی بحیثیت افضل البشر ہونے کے، انسانی فطرت کے اس تقاضے سے مستثنیٰ نہ تھے لیکن اس مقصد کیلئے آپ کو ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اسی لئے پچاس بلکہ پچپن سال کی عمر تک، جو اس قسم کی خواہشات کے عروج کا زمانہ ہوتا ہے، آپ نے صرف ایک زوجہ محترمہ پر اکتفاء کیا۔ اس کے بعد آپ نے جو شادیاں کیں ان کے پیچھے تعلیمی، سماجی، تشریعی اور سیاسی مقاصد کار فرما تھے۔ ہم یہاں تمام ازواج مطہرات کے متعلق فرداً فرداً کچھ حقائق لکھتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد انسان کو ذرہ برابر شک نہیں رہتا کہ ان شادیوں کے مقاصد انتہائی اعلیٰ تھے اور ان شادیوں کی وجہ سے مستشرقین نے حضور ﷺ پر جو الزامات لگائے ہیں وہ بدنیتی اور علمی خیانت پر مبنی ہیں۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وہ خوش قسمت خاتون ہیں جن کے ساتھ حضور ﷺ نے اپنا عالم شباب گزارا تھا اور ان کے انتقال تک آپ نے کسی دوسری خاتون کو شرف زوجیت بخشنے کے بارے میں کبھی سوچا تک نہ تھا۔ جب حضور ﷺ کے ساتھ ان کی شادی ہوئی، اس وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ وہ اس سے پہلے دو بار بیوہ ہو چکی تھیں اور صاحب اولاد تھیں۔ شادی کے وقت حضور ﷺ کی عمر پچیس سال تھی لیکن عمر اور ازدواجی حالت کا یہ فرق اس مقدس جوڑے کے باہمی جذبات خلوص و محبت میں حائل نہ ہو سکا۔ اس مقدس رشتہ ازدواج پر علامہ محمد علی صابونی نے بڑا خوب صورت تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

وَقَدِ اخْتَارَهَا صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِ لِسَدَادِ رَأْيِهَا وَوَفْرَةِ

ذَكَائِهَا وَكَانَ زَوَاجُهُ بِهَا زَوَاجًا حَكِيْمًا مُوَفَّقًا لِاَنَّهُ كَانَ زَوَاجَ الْعَقْلِ لِلْعَقْلِ وَلَمْ يَكُنْ فَارِقُ السِّنِّ بَيْنَهُمَا بِالْاَمْرِ الَّذِیْ يَقِفُ عَقَبَةً فِیْ طَرِيْقِ الزَّوَاجِ لِاَنَّهُ لَمْ يَكُنِ الْغَرَضُ مِنْهُ قَضَاءَ (الْوَطَرِ وَالشَّهْوَةِ) وَ اِنَّمَا كَانَ هَدَفًا اِنْسَانِيًّا سَامِيًا فَمُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ قَدْ هَيَّأَهُ اللهُ لِحَمْلِ الرِّسَالَةِ وَتَحَمُّلِ اَعْبَاءِ الدَّعْوَةِ وَقَدْ يَسَّرَ اللهُ تَعَالٰی لَهٗ هٰذِهِ الْمَرْءَةَ التَّقِيَّةَ النَّقِيَّةَ الْعَاقِلَةَ الذَّكِيَّةَ لِتُعِيْنَهٗ عَلَى الْمُضِیِّ فِیْ تَبْلِيْغِ الدَّعْوَةِ وَنَشْرِ الرِّسَالَةِ وَهِیَ اَوَّلُ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ مِنَ النِّسَآءِ (1)

"حضور ﷺ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو ان کی اصابت رائے اور ذہانت و فطانت کی وجہ سے منتخب کیا تھا۔ حضور ﷺ کی ان سے شادی ایک حکیمانہ شادی تھی۔ اور اس میں توفیق خداوندی شامل تھی۔ یہ عقل کی عقل سے شادی تھی۔ عمر کا فرق اس رشتے کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ اس لئے نہ بن سکا کہ اس شادی کا مقصد قضائے شہوت نہیں تھا بلکہ یہ شادی عظیم انسانی مقاصد کی خاطر عمل میں آئی تھی۔ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت کا بار گراں اٹھانے اور تبلیغ کی کٹھن ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے تیار کیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے لئے اس پاکباز، عفت مآب، فطین اور عقلمند خاتون کے ساتھ زندگی گزارنا آسان بنا دیا تاکہ وہ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں آپ کی مدد کر سکیں۔ یہی وہ خوش قسمت خاتون ہیں جن کو عورتوں میں سب سے پہلے قبول اسلام کا شرف حاصل ہوا۔"

بعثت کے بعد حضور ﷺ کی پیغمبرانہ جدوجہد کے ایک ایک مرحلے پر اس شادی کی برکتیں پوری آب و تاب کے ساتھ عیاں نظر آئیں۔ حضور ﷺ پر جب پہلی وحی نازل

1۔ شبہات واباطیل حول زوجات الرسول، صفحہ 35

ہوئی تھی اور ثقل وحی سے مضطرب ہو کر حضور ﷺ نے گھر پہنچ کر اپنے اہل خانہ سے فرمایا تھا۔ زَمِّلُوْنِی زَمِّلُوْنِی یعنی مجھے کمل اوڑھادو، تو آپ کی اس محرم راز رفیقہ حیات نے آپ کی کتاب حیات پر ایک نظر ڈال کر یہ نتیجہ فوراً نکال لیا تھا:

اَبْشِرْ كَلَّا وَاللهِ مَا يُخْزِيْكَ اللهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَصْدُقُ الْحَدِيْثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِى الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (1)

"آپ کو مبارک ہو۔ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو بے آبرو نہیں کرے گا۔ آپ قریبی رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ حق گوئی سے کام لیتے ہیں۔ کمزوروں اور ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ مفلس و نادار کو اپنی نیک کمائی سے حصہ دیتے ہیں۔ مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی وجہ سے کسی پر کوئی مصیبت آجائے تو آپ اس کی دستگیری فرماتے ہیں۔"

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی ذکاوت و فطانت اور خلوص و جاں نثاری کے سبب حضور ﷺ کے دل میں وہ مقام حاصل کیا تھا جو اور کسی کو حاصل نہ ہوا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اپنے قول کے مطابق حضور ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے سوائے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے، کسی کے متعلق، ان کے دل میں جذبات رقابت پیدا نہیں ہوئے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو انہوں نے دیکھا تک نہ تھا لیکن حضور ﷺ ان کا ذکر اس کثرت سے فرماتے تھے کہ ایک روز جذبہ رقابت میں حضرت صدیقہ نے یہ الفاظ ان کے بارے میں کہہ دیے:

"حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک عمر رسیدہ خاتون ہی تو تھیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کا نعم البدل عطا فرمادیا ہے۔" حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اشارہ اپنی ذات کی طرف تھا۔ حضور ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو آپ نے فرمایا:

لَا وَاللهِ مَا اَبْدَلَنِىَ اللهُ خَيْرًا مِّنْهَا لَقَدْ اٰمَنَتْ بِىْ اِذْ كَفَرَ النَّاسُ وَصَدَّقَتْنِىْ اِذْ كَذَّبَنِى النَّاسُ وَوَاسَتْنِىْ

1۔ شبہات واباطیل حول زوجات الرسول، صفحہ 36

بِمَا لِهَا اِذْ حَرَمَنِیَ النَّاسُ وَرَزَقَنِیَ اللّٰہُ مِنْهَا الْوَلَدَ دُوْنَ غَیْرِهَا مِنَ النِّسَاءِ (1)

”نہیں، خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کا نعم البدل عطا نہیں فرمایا۔ وہ اس وقت مجھ پر ایمان لائیں جب دوسرے لوگوں نے کفر کیا۔ انہوں نے اس وقت میری تصدیق کی جب دوسرے لوگ میری تکذیب کر رہے تھے۔ انہوں نے اس وقت اپنے مال سے میری مدد کی جب دوسرے لوگ میری مدد نہیں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے دیگر عورتوں کے برعکس ان کے بطن سے مجھے اولاد عطا فرمائی۔“

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جنہوں نے اپنی جاں نثاری سے حضور ﷺ کے دل میں اتنا بلند مقام حاصل کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی قربانیوں کے مقبول ہونے کا مژدہ اسی دنیا میں سنا دیا تھا۔ بخاری شریف کی حدیث ہے:

اَتٰی جِبْرِیْلُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ هٰذِهٖ خَدِیْجَةُ قَدْ اَتَتْ مَعَهَا اِنَاءٌ فِیْهِ اِدَامٌ اَوْطَعَامٌ اَوْ شَرَابٌ فَاِذَا هِیَ اَتَتْكَ فَاقْرَءْ عَلَیْهَا السَّلَامَ مِنْ رَبِّهَا وَمِنِّیْ وَبَشِّرْهَا بِبَیْتٍ فِی الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لاَ صَخَبَ فِیْهِ وَلاَ نَصَبَ (2)

”جبریل امین حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا: حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک برتن لے کر حاضر ہو رہی ہیں، جس میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہے۔ جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور میری طرف سے سلام پہنچا دیں اور انہیں جنت میں خالص مروارید کے ایک محل کی بشارت دیں جس میں کسی قسم کا رنج و الم نہیں۔“

جس خاتون کی شان یہ ہو کہ زمانہ جاہلیت میں بھی قوم اسے طاہرہ کہہ کر بلاتی ہو۔ جس

1۔ شبہات و اباطیل حول زوجات الرسول، صفحہ 37-36

2۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 146

سے خدا بھی راضی ہو اور حبیب خدا بھی راضی ہو، اس خاتون سے شادی کا مقصد محض جنسی خواہش کی تسکین تک محدود قرار دینا پرلے درجے کی بے ذوقی اور انسانی اقدار سے لاعلمی کی دلیل ہے۔

حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق قریش کے قبیلہ بنو عبد شمس سے تھا، جن کی اسلام دشمنی کو مستشرقین جانتے بھی ہیں اور تسلیم بھی کرتے ہیں۔ یہ خاتون سکران بن عمرو بن عبدود کے نکاح میں تھیں۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور پھر ان کی ترغیب پر ان کے خاوند نے بھی اسلام کا طوق اپنے گلے کی زینت بنالیا۔ دین کی جو دولت انہیں نصیب ہوئی تھی اس کی حفاظت کے لئے دونوں نے دوبار حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ حضرت سکران بن عمرو کا انتقال ہو گیا تو حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بے یارومددگار رہ گئیں۔ ان حالات میں اگر وہ اپنے قبیلہ میں واپس جاتیں تو اہل قبیلہ ان کیلئے زندگی کو اجیرن بنادیتے اور دولت دین کی حفاظت ان کے لئے انتہائی مشکل ہو جاتی۔ اس وقت ان کی عمر پچپن سال کے قریب تھی۔ (1) یہ عمر وہ تھی جس میں اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ کوئی شخص ان کے ساتھ نکاح کر کے ان کو پناہ گاہ فراہم کرتا۔ حضور ﷺ نے دین کی اس مجاہدہ کے حالات کا جائزہ لیا۔ ان کے ایثار، استقلال اور ثابت قدمی کو دیکھا اور خدا کی اس نیک بندی کو دنیا اور دین کے فتنوں سے بچانے کے لئے، اسے اپنی زوجیت میں لے لینے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ وہ وقت تھا جب حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انتقال فرما چکی تھیں اور حضور ﷺ نے ابھی کسی دوسری خاتون سے شادی نہیں کی تھی۔ اس طرح حضور ﷺ نے ان کے ساتھ نکاح کر کے ان کو پناہ گاہ مہیا فرمائی، ان کی قربانیوں اور ثبات واستقلال پر ان کو خراج تحسین پیش کیا، دشمنان دین سے ان کی جان کی بھی حفاظت فرمائی اور ان کے دین کی بھی اور اپنے اس عمل کے ذریعے انسانیت اور لجپالی کی ایک ایسی عظیم مثال قائم کی جس کی تاثیر سے کئی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اگر انسان کی نیت میں فتور نہ ہو تو وہ حضور ﷺ کے اس نکاح میں آپ کی بے نظیر

1۔ الشیخ محمد محمود الصواف، "زوجات النبی الطاہرات وحکمۃ تعدد ھن"، (دار العلم جدہ۔ 1985ء)، صفحہ 28

عظمتوں کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن مستشرقین کی نیت اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق لکھتے ہوئے صاف نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں حضور ﷺ کی اس شادی میں بھی جنس پرستی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اگر بات وہی ہوتی جو مستشرقین کہتے ہیں تو حضور ﷺ، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے انتقال کے بعد، کسی حسین و جمیل دوشیزہ کو شرف زوجیت عطا فرماتے۔ آپ کا پچپن سال کی ایک معمر خاتون کو شرف زوجیت کے لئے منتخب فرمانا اور حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی تک کا عرصہ اسی ایک معمر خاتون کے ساتھ گزارنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی اس شادی کا مقصد جنسی جذبات کی تسکین نہ تھا بلکہ آپ کے پیش نظر وہ عظیم انسانی مقاصد تھے جن کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو انسان کو حیوان ناطق سے زیادہ بھی کچھ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں صرف ایک باکرہ خاتون سے نکاح کیا اور وہ خوش نصیب خاتون حضرت عائشہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں۔ ان کو زوجیت رسول کا شرف عطا ہونے کے بڑے بڑے سبب دو تھے۔ ایک آپ کی ذہانت، فطانت اور پاکبازی اور دوسرا آپ کے والد ماجد کا اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے ایثار۔ حضور ﷺ نے جن مقاصد کے تحت متعدد خواتین کو شرف زوجیت عطا فرمایا تھا، حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ نکاح سے وہ تمام مقاصد حاصل ہوئے تھے۔ اس نکاح کے ذریعے حضور ﷺ نے اپنے مخلص ترین صحابی کو اس کی جاں نثاریوں کا سب سے بڑا صلہ، جو اس دنیا میں ممکن تھا، عطا فرمایا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی زوجہ محترمہ ہونے کی وجہ سے کئی احکام کے نزول کا سبب بنی تھیں جو امت کے لئے رحمت تھے۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے دینی تعلیمات کی اشاعت کے لئے جو خدمات انجام دیں وہ آپ ہی کا حصہ ہیں۔ نکاح کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر صرف چھ برس تھی اور رخصتی کے وقت آپ کی عمر نو سال تھی۔ (1)

کون ذی شعور شخص یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ پچاس سال سے اوپر کا ایک صاحب اولاد

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 332

آدمی ایک چھ سال کی بچی کے ساتھ محض اپنی خواہشات کی تسکین کی خاطر نکاح کرے؟ حق بات یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنے مخلص ترین صحابی کو شرف مصاہرت عطا کرنا چاہتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا گو بچی تھیں لیکن نگاہ نبوت نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس بچی میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو دین اسلام کی ایک قابل فخر معلمہ اور مبلغہ کے لئے ضروری ہیں۔ نگاہ نبوت نے ان کی پاکیزگی فطرت اور ان کی عفت مآبی کا بھی اندازہ لگا لیا تھا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ حضور ﷺ نے اس رشتے سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ کماحقہ پوری ہوئیں۔

علم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مقام نہ صرف امہات المومنین میں بلند ترین تھا بلکہ اکثر اکابر صحابہ بھی آپ کے بحر علم سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

مَا اَشْكَلَ عَلَيْنَا اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ اِلاَّ وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا (1)

"ہم اصحاب رسول ﷺ کو جب بھی کسی حدیث پاک کو سمجھنے میں مشکل پیش آئی اور ہم نے اس کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا تو ان کے پاس اس حدیث کے متعلق علم موجود پایا۔"

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

مَارَأَيْتُ اِمْرَأَةً اَعْلَمَ بِطِبٍّ وَلاَ فِقْهٍ وَّ لاَ شِعْرٍ مِّنْ عَائِشَةَ(2)

"میں نے کسی عورت کو طب، فقہ اور شعر کے علوم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بڑھ کر نہیں پایا۔"

امام زہری فرماتے ہیں۔

لَوْ جُمِعَ عِلْمُ عَائِشَةَ اِلٰى جَمِيْعِ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ

1۔ شبہات واباطیل حول زوجات الرسول، صفحہ 40

2۔ ایضاً

وَعِلْمِ جَمِيْعِ النِّسَآءِ لَكَانَ عِلْمُ عَائِشَةَ اَفْضَلَ (1)

"اگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علم کے مقابلے میں تمام امہات المومنین بلکہ تمام عورتوں کے علوم کو رکھا جائے تو حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علم کا پلہ بھاری نکلے۔"

حضرت عطا بن ابی رباح فرماتے ہیں:

كَانَتْ عَائِشَةُ اَفْقَهَ النَّاسِ وَاَحْسَنَ النَّاسِ رَأْيًا فِي الْعَامَّةِ(2)

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تمام انسانوں سے زیادہ احکام دین کو سمجھنے والی تھیں اور امور عامہ میں آپ کی رائے صائب ترین ہوتی تھی۔"

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اسی علمی شان کو دیکھ کر حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو حکم دیا تھا:

خُذُوْا نِصْفَ دِيْنِكُمْ عَنْ هٰذِهِ الْحُمَيْرَآءِ (3)

"اپنے دین کا نصف علم اس حمیراء یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سیکھو۔"

تیمم کی اجازت حضور ﷺ کی امت کی خصوصیات میں سے ہے۔ امت کو یہ نعمت حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وساطت سے عطا ہوئی تھی۔ ایک سفر میں آپ کا ہار گم ہو گیا۔ حضور ﷺ نے چند صحابہ کرام کو ہار کی تلاش کے لئے روانہ فرمایا۔ راستے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ پانی موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان صحابہ کرام نے بلاوضو نماز پڑھی۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بڑے رنج والم کے ساتھ سارا واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اسی وقت آیۂ تیمم نازل ہوئی جو قیامت تک امت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے لئے ایک بہت بڑا انعام ہے۔ اسی لئے اس موقعہ پر حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

1۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 36

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً، صفحہ 35

نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مخاطب کر کے کہا تھا

جَزَاكِ اللّٰهُ خَيْرًا مَا نَزَلَ بِكِ اَمْرٌ اِلاَّ جَعَلَ اللّٰهُ لَكِ مِنْهُ فَرَجًا وَمَخْرَجًا وَجَعَلَ لِلْمُسْلِمِيْنَ بَرَكَةً (1)

"اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ جب بھی آپ کو کوئی مشکل پیش آئی، اللہ تعالیٰ نے خود آپ کے لئے اس مصیبت سے نکلنے کا راستہ پیدا فرمادیا اور وہ مشکل عام مسلمانوں کے لئے باعث برکت بن گئی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی علمی وجاہت کی شہادت اکابر صحابہ کرام نے بھی دی اور خود خدا کے مقدس رسول ﷺ نے بھی آپ کی علمی عظمتوں سے قوم کو روشناس کرایا۔ جب قلب و ضمیر کے مریضوں نے آپ کی عفت کے شفاف دامن کو داغدار کرنے کی سازش کی تو آپ کی عفت مآبی کی شہادت رب قدوس نے اپنے مقدس کلام کے ذریعے دی۔ پروردگار عالم نے آپ پر الزام لگانے والوں کو جھوٹا کہا۔ ان کی بات سننے والے مسلمانوں کو اس غلطی پر تنبیہ کی اور یہ عظیم اصول بیان فرمایا:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ج وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ج اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (2)

"ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے ہیں۔ اور پاک (دامن) عورتیں پاک (دامن) مردوں کے لئے ہیں اور پاک (دامن) مرد پاک (دامن) عورتوں کے لئے ہیں۔ یہ مبرا ہیں ان تہمتوں سے جو وہ (ناپاک) لگاتے ہیں۔ ان کے لئے ہی (اللہ کی) بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔"

قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ وضاحت فرمارہی ہے کہ کسی خاتون کا حبیب خدا کی زوجیت میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عورت پاکباز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے پاک بندوں کے لئے پاک بیویوں کا ہی انتخاب فرماتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 153

2۔ سورۃ نور 36

ان گنت خوبیوں کی ایک مختصر سی جھلک سطور بالا میں پیش کی گئی ہے۔ آپ کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے حضور ﷺ آپ سے تمام ازواج مطہرات کی نسبت زیادہ محبت فرماتے تھے۔ محبت کے اس فرق کے باوجود آپ تمام ازواج مطہرات کے درمیان عدل قائم رکھتے تھےاور بارگاہ خداوندی میں عرض کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَآ اَمْلِكُ فَلَا تُؤَاخِذْنِیْ فِیْمَا لَا اَمْلِكُ (1)

"اے اللہ تعالیٰ ازواج مطہرات کے درمیان جتنا عدل میرے بس میں ہے وہ تو میں کرتا ہوں لیکن جو بات میرے بس میں نہیں اس پر میرا مواخذہ نہ فرما۔"

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضور ﷺ کو جو محبت تھی، اس محبت کی وجہ سے آپ ایک کڑی آزمائش میں بھی مبتلا ہوئیں لیکن آپ محبت کی اس آزمائش سے کامیاب ہو کر نکلیں۔ جن مقدس خواتین کو حضور ﷺ نے شرف زوجیت عطا کیا تھا، ان کی حالت ساری دنیا کی خواتین سے مختلف تھی۔ عام اصول یہ ہے کہ غریب اور نادار لوگوں کی بیویاں روکھی سوکھی کھا کر اور جو ملے، پہن کر صبر و شکر سے وقت گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں اور امراء، حکمرانوں اور بادشاہوں کی بیگمات ناز و نعمت میں رہتی ہیں۔ ازواج النبی ﷺ تاجدار عرب کی ازواج تھیں لیکن گھر کی مالی حالت وہ تھی جس کا اس معیار کی خواتین تصور بھی نہیں کر سکتیں۔

بعض مستشرقین نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضور ﷺ ہر سال اپنی ازواج کو خیبر وغیرہ کی زمینوں کی آمدنی سے مال کثیر عطا فرماتے تھے اور مال کی کثرت کی وجہ سے ان کے درمیان حسد کے جذبات پروان چڑھتے تھے۔ مستشرقین کا یہ شوشہ تاریخی حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قومی آمدنی کی بہت سی مدیں ایسی تھیں جو مکمل طور پر حضور ﷺ کے تصرف میں تھیں اور آپ کو بارگاہ خداوندی سے قومی آمدنی کی ان مدوں میں سے اپنے اہل خانہ پر خرچ کرنے کی اجازت بھی تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے اختیاری طور پر اپنے گھر کیلئے فقر کی نعمت کو ہی پسند فرمایا تھا۔

1۔ شبہات و اباطیل حول زوجات الرسول، صفحہ 40

ازواج مطہرات نے جب دیکھا کہ مہاجرین وانصار کے گھروں میں اب فارغ البالی آ گئی ہے۔ وہ اب پہلے کی نسبت کہیں زیادہ خوش حال زندگی گزار رہے ہیں لیکن کاشانہ نبوت میں اب بھی فقر ہی کی حکمرانی ہے، تو انہوں نے مل کر حضور ﷺ سے اپنی حالت کی شکایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب ازواج مطہرات نے حضور ﷺ کی خدمت میں اپنا مطالبہ پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے آیت تخییر نازل فرمائی جس میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنی ازواج سے کہہ دیں کہ اگر تم مال دنیا چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں مال کثیر عطا کر کے عمدگی کے ساتھ فارغ کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا قرب چاہتی ہو تو پھر تمہیں اسی عسرت اور تنگ دستی کی زندگی پر قناعت کرنا پڑے گی، البتہ قرب رسول میں عسرت کی زندگی پر تمہیں اجر عظیم ملے گا۔

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے سب سے پہلے حضرت صدیقہ سے فرمایا:

> "میں تم سے ایک بات کہنے والا ہوں، اس کے جواب میں جلدی نہ کرنا، بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے اس کا جواب دینا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت تخییر پڑھ کر آپ کو سنائی۔"

یہ آپ کی محبت کا بھی امتحان تھا، آپ کی عقل کا بھی امتحان تھا اور آپ کے خلوص و جاں نثاری کا بھی امتحان تھا لیکن اس سوال کے جواب میں آپ نے جو بات کہی اس نے ثابت کر دیا کہ آپ ان تمام امتحانوں سے کامیاب نکلی ہیں۔ آپ نے عرض کیا:

> اَوَفِیْ ھٰذَا اَسْتَاْمِرُ اَبَوَیَّ فَاِنِّیْ اُرِیْدُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَۃَ (1)

> "کیا میں اس بات میں اپنے والدین سے مشورہ کروں! میں تو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور آخرت کی زندگی کو منتخب کرتی ہوں۔"

حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس جواب نے ایک طرف خود ان کو وفا کے اس امتحان میں کامیاب قرار دیا اور دوسری طرف آپ کا یہ عمل دیگر ازواج مطہرات کے لئے ایک عمدہ مثال بن گیا اور انہوں نے بھی آپ کی پیروی میں وہی جواب دے کر اس کڑے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ ازواج مطہرات کو اس جاں نثاری کا صلہ یہ ملا کہ

1۔ شبہات واباطیل حول زوجات الرسول، صفحہ 41

حضور ﷺ کو ان کے علاوہ دیگر خواتین سے نکاح کرنے اور ان کے بدلے دوسری عورتوں کو اپنی زوجیت میں لینے سے منع کر دیا گیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو پوری امت کی معلمہ تھیں، جو کئی رحیمانہ شرعی ضابطوں کے نزول کا سبب بنیں، جن کی سنت پر ازواج النبی ﷺ نے عمل کر کے زندگی کے سب سے بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی، ان کا مقام ملاءِ اعلیٰ میں بھی بڑا بلند ہے۔ آپ خود فرماتی ہیں:

قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: یَا عَائِشَۃُ ھٰذَا جِبْرِیْلُ یُقْرِئُکِ السَّلَامَ فَقُلْتُ وَعَلَیْہِ السَّلَامُ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ قَالَتْ: وَھُوَ یَرٰی مَالَا أَرٰی (1)

"حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عائشہ! یہ جبریل ہیں، تمہیں سلام کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا: وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پھر حضرت صدیقہ نے فرمایا: وہ جو چیزیں دیکھ سکتے ہیں، میں نہیں دیکھ سکتی۔"

حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا:

کَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ کَثِیْرٌ وَلَمْ یَکْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَرْیَمُ ابْنَۃُ عِمْرَانَ وَآسِیَۃُ امْرَأَۃُ فِرْعَوْنَ وَخَدِیْجَۃُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ وَفَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَ فَضْلُ عَائِشَۃَ عَلَی النِّسَاءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلٰی سَآئِرِ الطَّعَامِ (2)

"مردوں میں سے تو بہت سے لوگ مرتبہ کمال تک پہنچے ہیں لیکن عورتوں میں یہ مقام صرف مریم بنت عمران، آسیہ زوجہ فرعون، خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد نے حاصل کیا ہے اور عائشہ کو عورتوں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو ثرید کو تمام کھانوں پر فضیلت حاصل ہے۔"

جب انسان حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علمی کارناموں، آپ کے

1۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 35

2۔ ایضاً، صفحہ 36

خلوص اور آپ کی ذکاوت و فطانت کو دیکھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ نگاہ نبوت نے چھ سال کی عمر میں آپ کا انتخاب کیوں کیا تھا۔

محمد ﷺ، جو اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جن کی عظمتوں کی ایک جھلک سطور بالا میں پیش کی گئی ہے، ان دو عظیم ہستیوں کے عقد زوجیت کا مقصد کسی سفلی جذبے کو قرار دینا، کسی ایسے شخص کا کام ہی ہو سکتا ہے جسے ذوق کی لطافت سے ذرہ برابر حصہ نہ ملا ہو۔

حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضور ﷺ کو جتنی محبت اپنے مشن کے ساتھ تھی اتنی کسی چیز سے نہ تھی اور انسانوں میں سے جو لوگ آپ کے اس مشن کے مخلص کارکن تھے ان سے زیادہ آپ کی نظروں میں کوئی محبوب نہ تھا۔ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے مشن کے مخلص سپاہی تھے لیکن صدیق و فاروق اور عثمان و حیدر رضی اللہ عنہم کا اپنا ایک خاص مقام تھا۔ حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَ تَعَالیٰ اَیَّدَنِیْ مِنْ اَھْلِ السَّمَآءِ بِجِبْرَئِیْلَ وَ مِیْکَائِیْلَ وَمِنْ اَھْلِ الْاَرْضِ بَاَبِیْ بَکْرٍ وَّ عُمَرَ وَرَاٰھُمَا مُقْبِلَیْنِ فَقَالَ ھٰذَانِ السَّمْعُ وَالْبَصَرُ (1)

”بے شک اللہ تعالیٰ نے اہل آسمان میں سے جبریل و میکائیل اور اہل زمین میں سے صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے ذریعے میری مدد فرمائی ہے۔ آپ نے اپنے ان دونوں صحابیوں کو (ایک دفعہ) آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: یہ میرے لئے آنکھ اور کان کی مانند ہیں۔“

یہ لوگ حضور ﷺ کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتے تھے کہ آپ نے ان کو کفر و شرک کی گمراہیوں سے نکال کر توحید کی لذتوں سے آشنا کیا تھا۔ وہ حضور ﷺ کے اس احسان کے بدلے میں آپ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ ان کے خلوص اور جاں نثاری کو قائم رکھنے کیلئے آپ کو مزید کسی تدبیر کی ضرورت نہ تھی لیکن حضور

1۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 42

ﷺ ایسے آقا نہ تھے جو غلاموں سے صرف خدمت لینا جانتے ہوں اور ان کو نوازنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوں۔ آپ نے ان مخلصین کو دل کھول کر نوازا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کے بعد حضور ﷺ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ مصاہرت رسول کا جو اعزاز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا ہوا ہے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس اعزاز سے محروم رہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ اعزاز آپ نے ان کی کم سن بچی کو اپنی زوجیت میں قبول کر کے عطا فرمایا تھا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ اعزاز عطا کرنے کے لئے آپ نے ان کی اس صاجزادی سے نکاح کر لیا جو بیوہ ہو چکی تھیں۔

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا پہلا نکاح حضرت خنیس بن حذافہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا تھا۔ یہ ایک بہادر جنگجو اور جاں نثار مجاہد تھے۔ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ وہ جنگ بدر میں شریک ہوئے، بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما بھی اس جنگ میں زخمیوں کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کی خدمات سر انجام دینے میں مصروف تھیں۔ اپنے سہاگ کو شہادت کا تاج اپنے سر پر سجائے دیکھ کر بھی انہوں نے صبر و شکر کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دل پر جو گزری ہو گی اس کا اندازہ وہی عورت لگا سکتی ہے جس کا سہاگ لٹ جائے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جو کوہ الم ٹوٹا تھا اس کی ٹیسیں آپ کے والدین کیسے محسوس نہ کرتے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی لخت جگر کے مستقبل کی فکر دامنگیر ہوئی۔ آپ نے اپنی صاجزادی کے لئے کفو میں رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اپنی لخت جگر کے مستقبل کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پریشانی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ اس حدیث پاک سے لگایا جا سکتا ہے:

اَخرَجَ الْاِمَامُ الْبُخَارِیُّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بن عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: اَنَّ عُمَرَ حِیْنَ تَاَیَّمَتْ حَفْصَةُ مِنْ (خُنَیْسِ ابْنِ حُذَافَةَ) وَکَانَ شَهِدَ بَدْرًا وَتُوُفِّیَ بِالْمَدِیْنَةِ لَقِیَ عُثْمَانَ فَقَالَ: اِنْ شِئْتَ اَنْکَحْتُكَ حَفْصَةَ قَالَ: سَاَنْظُرُ فِیْ اَمْرِیْ فَلَبِثَ لَیَالِیَ فَقَالَ: قَدْ بَدَالِیَ اَنْ لاَّ اَتَزَوَّجَ

قَالَ عُمَرُ: فَقُلْتُ لِاَبِیْ بَکْرٍ اِنْ شِئْتَ اَنْکَحْتُکَ حَفْصَۃَ فَصَمَتَ فَکُنْتُ عَلَیْہِ اَوْجَدَ مِنِّی عَلٰی عُثْمَانَ فَلَبِثَ لَیَالِیَ ثُمَّ خَطَبَھَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَنْکَحْتُھَا اِیَّاہُ فَلَقِیَنِیْ اَبُوْبَکْرٍ فَقَالَ: لَعَلَّکَ وَجَدْتَ عَلَیَّ حِیْنَ عَرَضْتَ عَلَیَّ حَفْصَۃَ فَلَمْ اَرْجِعْ اِلَیْکَ شَیْئًا قُلْتُ: نَعَمْ قَالَ: اِنَّہٗ لَمْ یَمْنَعْنِیْ اَنْ اَرْجِعَ اِلَیْکَ اِلاَّ اَنِّیْ عَلِمْتُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَکَرَھَا فَلَمْ اَکُنْ لِاُفْشِیَ سِرَّہٗ وَلَوْ تَرَکَھَا لَقَبِلْتُھَا (1)

"حضرت امام بخاری نے حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضرت خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے جنگ بدر میں شہید ہونے کی وجہ سے حضرت حفصہ بیوہ ہو گئیں۔ حضرت عمر حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے ملے اور فرمایا: اگر آپ پسند کریں تو میں حفصہ کی شادی آپ سے کر دوں؟ انہوں نے کہا: میں اس معاملہ میں غور کروں گا۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے کہا: میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شادی نہ کروں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: اگر آپ پسند کریں تو میں حفصہ کی شادی آپ سے کر دوں؟ وہ خاموش رہے۔ ابو بکر کے اس رویہ سے مجھے اس سے بھی زیادہ رنج پہنچا جتنا رنج مجھے عثمان کے رویے سے پہنچا تھا۔ کچھ عرصہ بعد حضور ﷺ نے حفصہ کے لئے پیغام نکاح دیا اور میں نے اس کی شادی حضور ﷺ سے کر دی۔ پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ مجھے ملے اور فرمایا: شاید تم مجھ سے اس بات پر خفا ہوئے ہو گے کہ تم نے حفصہ سے شادی کی پیشکش کی اور میں خاموش رہا؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: تمہاری پیشکش کا جواب نہ دینے کی واحد وجہ یہ تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ حضور ﷺ نے حفصہ کا ذکر کیا ہے۔ میں آپ کا راز

1۔ شبہات واباطیل حول زوجات الرسول، صفحہ 43-42

افشاء نہ کر سکتا تھا۔ اگر آپ ان سے نکاح نہ کرتے تو میں ان کو قبول کر لیتا۔"

ان حالات میں حضور ﷺ نے حضرت حفصہ سے نکاح کیا۔ اس نکاح کے ذریعے حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ساتھ رشتہ مصاہرت میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے برابر کر دیا۔ اسلام کی ایک مخلص مجاہدہ جس نے دین کی خاطر میدان بدر میں خدمات سر انجام دیتے ہوئے اپنا سہاگ قربان کیا تھا، اس نکاح کے ذریعے حضور ﷺ نے اس مجاہدہ کے زخموں پر مرہم رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی لخت جگر کی بیوگی نے جس پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا، حضور ﷺ نے اس نکاح کے ذریعے انہیں اس پریشانی سے نکالا۔ اور اس بات کی شہادت جبریل امین نے دی کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا واقعی اس قابل تھیں کہ کاشانہ نبوی کی زینت بنتیں۔ حضرت جبریل امین نے حضور ﷺ کے سامنے حضرت حفصہ کی تعریف ان الفاظ میں کی:

فَاِنَّهَا قَوَّامَةٌ صَوَّامَةٌ وَاِنَّهَا زَوْجَتُكَ فِي الْجَنَّةِ (1)

"حضرت حفصہ عبادت میں مشغول رہنے والی اور روزے کی پابند ہیں۔
وہ جنت میں بھی آپ کی زوجہ ہوں گی۔"

حضور ﷺ کی عمر جب پچپن سال سے زیادہ تھی اس وقت آپ نے اس بیوہ خاتون سے نکاح کیا تھا اور اس نکاح کے ذریعے بے شمار سماجی مقاصد پورے کئے تھے۔ حضور ﷺ کے اس مشفقانہ اور حکیمانہ طرز عمل پر آپ کی عظمتوں کو سلام عقیدت پیش نہ کرنا اور اسے آپ کی عظمتوں کو گھٹانے کے لئے استعمال کرنا بدنیتی کی انتہا ہے۔ حضرت حفصہ سے نکاح حضور ﷺ کو ایک عظیم مدبر اور لجپال آقا ثابت کرتا ہے نہ کہ ایک جنس پرست انسان۔

حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ان کا پہلا نکاح طفیل سے ہوا۔ ان کا دوسرا نکاح اسلام کے بطل جلیل حضرت عبیدہ بن حارث سے ہوا جو جنگ بدر میں تاریخ وفا کا روشن ترین باب رقم کرتے ہوئے شہید ہوئے اور حبیب خدا ﷺ کے زانو پر اپنا رخسار رکھ کر اپنے سر پر شہادت کا تاج سجایا۔ اس جنگ

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 162

میں ان کی زوجہ محترمہ حضرت زینب بنت خزیمہ بھی مجاہدین اسلام کی خدمت میں مصروف تھیں۔ سہاگ دین کی آن پر قربان ہو گیا لیکن خدا کی یہ بندی زبان پر حرف شکایت نہ لائی۔ اس کے بعد ان کا نکاح حضرت عبد اللہ بن جحش سے ہوا۔ جنگ احد میں انہوں نے بھی اپنے سر پر شہادت کا تاج سجایا اور حضرت زینب کو داغ مفارقت دے کر دار آخرت کو سدھار گئے۔ اسلام کی یہ مخلص مجاہدہ جس نے حق و باطل کے ابتدائی دو معرکوں میں اپنے دو سر تاج قربان کر کے انتہائی صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا تھا، حضور ﷺ نے ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے ان کو اپنی زوجیت کا شرف عطا فرمایا۔ جب حضور ﷺ نے ان سے نکاح کیا اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی (1) اور نکاح کے بعد وہ بہت کم عرصہ زندہ رہیں۔

اس نکاح کے ذریعے حضور ﷺ نے اسلام کے سر بکف مجاہدوں کو یقین دہانی کرائی کہ ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ خدا کی راہ میں ان کی شہادت کے بعد ان کے اہل و عیال بے یار و مددگار نہیں ہوں گے بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر انہیں اس ہستی کا سایہ عاطفت حاصل رہے گا جسے رب قدوس نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔

مستشرقین حضور ﷺ کی اس شادی کو بھی آپ کی خواہش پرستی کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ منصف قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا مستشرقین کے اس الزام کو عقل تسلیم کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت زینب بنت خزیمہ کے ساتھ حضور ﷺ کا نکاح آپ کی شان رحمۃ للعالمینی کا اظہار ہے۔ اس نکاح کو حضور ﷺ کی شان گھٹانے کے لئے استعمال کرنا ایسا ہی ہے جیسے سورج کو پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین بارہ سو سال سے حضور ﷺ کی شان کو گھٹانے کی کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہیں لیکن خدا کے حبیب کی شان اسی طرح مسلسل مائل بہ عروج ہے جیسے سورج نصف النہار کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ مستشرقین کے اس قسم کے الزامات سے حضور ﷺ کی شان میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا ہے۔ حضرت زینب بنت خزیمہ کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ام المساکین کہہ کر بلاتے تھے۔

1۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 49

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضرت ام سلمہ ھند بنت ابی امیہ المخزومیہ وہ خوش نصیب خاتون ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے راستے میں بے پناہ قربانیاں دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے خاوند ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھی تھے اور آپ کے رضاعی بھائی بھی۔ دونوں میاں بیوی نے اسلام کی خاطر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور اسلام کی خاطر ہر سختی کو انتہائی صبر سے برداشت کیا تھا۔ غزوہ احد میں حضرت ابو سلمہ نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور ان کی عظیم اہلیہ مجاہدین کی خدمت میں مصروف رہیں۔ اس جنگ میں حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ شدید زخمی ہوئے۔ ان کا یہ زخم تو مندمل ہو گیا لیکن کچھ عرصہ بعد ایک اور مہم کے دوران ان کا پہلا زخم پھر کھل گیا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے انتقال کے وقت حضور ﷺ ان کے پاس موجود تھے۔ ان کے انتقال کے بعد حضور ﷺ نے خود اپنے دست اقدس سے ان کی آنکھیں بند کی تھیں اور ان کے لئے دعائے مغفرت بھی فرمائی تھی۔

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بیوہ اور چار یتیم بچے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سر سے خاوند کا سایہ اٹھ گیا تھا اور چار معصوم بچوں کی کفالت کا بوجھ ان کے کندھوں پر آپڑا تھا۔ ایسے حالات میں ایک مشرقی عورت جس کرب والم سے گزرتی ہے اس کا اندازہ شاید وہ اہل مغرب نہ کر سکیں جن کی حکومتیں بچوں کو ان کے والدین کے مظالم سے بچانے کیلئے خصوصی محکمے قائم کرنے پر مجبور ہیں۔ اپنے رضاعی بھائی کی بیوہ اور اس کے بچوں کو کسمپرسی کی حالت میں دیکھنا حضور ﷺ کے شفیق دل پر شاق گزرا اور آپ نے ان کو اپنی رحمۃ للعالمینی کی چادر میں چھپانے کا فیصلہ کر لیا۔ عدت گزرنے کے بعد آپ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پیغام نکاح بھیجا لیکن انہوں نے معذرت کی اور اس کے تین سبب بتائے۔ پہلا سبب یہ بتایا کہ میں معمر ہوں۔ دوسرا یہ کہ میں یتیم بچوں کی ماں ہوں اور تیسرا یہ کہ میرے جذبات رقابت بہت شدید ہیں۔ حضور ﷺ نے انہیں کہلا بھیجا کہ تمہارے یتیم بچوں کو میں اپنے بچوں کی طرح رکھوں گا اور خدا سے دعا کروں گا کہ تمہارے جذبات رقابت کی شدت کم ہو جائے۔ حضور ﷺ نے ان کی عمر زیادہ ہونے کی بھی پروانہ کی اور ان سے نکاح کر لیا۔ اس طرح حضور ﷺ

نے اپنے رضاعی بھائی کے یتیم بچوں کی کفالت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیا اور ان کی بیوہ کے اس گہرے زخم پر مرہم رکھا جو انہیں ابو سلمہ جیسے عظیم خاوند کی جدائی سے لگا تھا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ نکاح کی ان تفصیلات پر غور کرنے والا انسان حضور ﷺ کی عظمتوں کا معترف ہو جاتا ہے کہ آپ نے اپنے رضاعی بھائی اور اپنے مشن کے ایک عظیم مجاہد کی شہادت کے بعد ان کی بیوہ اور بچوں کو بے یار و مددگار نہیں رہنے دیا بلکہ اپنے کاشانہ اقدس میں انہیں ایک باوقار زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دل میں اپنے عظیم خاوند کا جو احترام تھا اور قول رسول پر ان کو جو یقین کامل تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی یہ حدیث پاک سن رکھی تھی۔

مَامِنْ مُسْلِمٍ تُصِيْبُهُ مُصِيْبَةٌ فَيَسْتَرْجِعُ وَيَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْنِيْ خَيْرًا مِّنْهَا اِلَّا اَخْلَفَ اللّٰهُ لَهٗ خَيْرًا مِّنْهَا (1)

"جب کسی مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، وہ اس پر "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھتا ہے اور یہ دعا مانگتا ہے۔ اے اللہ تعالیٰ! اس مصیبت پر مجھے اجر عطا فرما اور مجھے اس کا نعم البدل عطا فرما، تو اللہ تعالیٰ اس کو نعم البدل عطا فرماتا ہے۔ جب حضرت ابو سلمہ کا انتقال ہوا تو یہ حدیث پاک ان کے ذہن میں آئی۔ انہیں خیال آیا کہ ابو سلمہ سے بہتر کون ہو سکتا ہے، وہ حضور ﷺ کے عظیم صحابی اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے، لیکن انہیں یہ بھی یقین تھا کہ جو بات حضور ﷺ کی زبان پاک سے نکلی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اس مصیبت کے وقت وہ دعا مانگی جو حضور ﷺ سے مروی تھی۔ ان کی یہ دعا قبول ہوئی، اللہ تعالیٰ نے انہیں ابو سلمہ سے بہتر خاوند عطا فرمایا اور خدا کے حبیب نے انہیں اپنی زوجیت کا شرف بخشا۔

حضور ﷺ کو اپنے مشن میں معاونت کے لئے جس قسم کی ذہین و فطین زوجات کی ضرورت تھی حضرت ام سلمہ اس معیار پر پوری اترتی تھیں اور ایک مرحلہ ایسا آیا جب انتہائی مشکل ترین مرحلہ پر حضور ﷺ نے ان سے مشورہ کیا۔ ان کے مشورے نے نہ صرف مسئلہ حل کر دیا بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو انتہائی کڑی آزمائش سے بچالیا۔

1۔ ازواج النبی الطاہرات، صفحہ 52

صلح حدیبیہ کی شرطیں مسلمانوں کو اپنی توہین نظر آتی تھیں۔ وہ عمرہ کئے بغیر مدینہ واپس لوٹنے میں خجالت محسوس کرتے تھے لیکن حضور ﷺ نے صلح کا معاہدہ کر لیا جس کے مطابق اس سال مسلمانوں کو عمرہ کئے بغیر واپس لوٹ جانا تھا۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو حلق کرا کے احرام کھولنے کا حکم دیا تو مسلمانوں نے اس حکم کی تعمیل میں توقف کیا۔ یہ مرحلہ حضور ﷺ کے لئے انتہائی نازک تھا۔ جن لوگوں نے متعدد مقامات پر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دی تھیں، آج ان کی قربانیوں کے ضائع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ خدا کا مقدس رسول انہیں ایک کام کا حکم دے رہا تھا اور وہ اس کی تعمیل میں توقف کر رہے تھے۔ اس نازک ترین موقعہ پر حضور ﷺ کی نگاہ انتخاب جس ہستی پر پڑی وہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ آپ حضرت ام سلمہ کے خیمے میں تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا: لوگ ہلاک ہو گئے، میں انہیں حکم دے رہا ہوں اور وہ اس کی تعمیل نہیں کر رہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مسئلے کا حل فوراً تلاش کر لیا۔ وہ خود ایک مخلص مومنہ تھیں اور مخلص مسلمانوں کی فطرت سے واقف تھیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ آپ لوگوں کے سامنے خود حلق کرائیں، جب لوگ آپ کو ایسا کرتے دیکھیں گے تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ یہ خدائی فیصلہ ہے، اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں تو آپ کی اقتداء میں وہ حلق کرانے میں ذرا تامل نہیں کریں گے۔ حضرت ام سلمہ کا اندازہ بالکل ٹھیک اور آپ کا مشورہ بالکل صائب نکلا۔ جونہی حضور ﷺ باہر تشریف لائے اور حجام کو حکم دیا کہ وہ آپ کے سر کے بال کاٹے تو مسلمانوں نے حضور ﷺ کی اقتداء کرنے میں ایک دوسرے سے مسابقت شروع کر دی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حضور ﷺ کے ساتھ شادی انتہائی نیک مقاصد کیلئے عمل میں آئی تھی۔ کوئی انصاف پسند شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ چار یتیم بچوں کی ماں جو بیوہ اور عمر رسیدہ تھیں، ان کے ساتھ حضور ﷺ کے نکاح کا مقصد ان کی دلجوئی کے علاوہ کچھ اور تھا۔

حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ابوسفیان اسلام کا بہت بڑا دشمن تھا۔ کفار مکہ نے اسلام کے خلاف جو جارحانہ کاروائیاں کی تھیں ان میں سے اکثر کی قیادت اس کے ہاتھ میں تھی۔ یہ اسلام کا معجزہ تھا کہ دین کے اس سخت ترین دشمن کی بیٹی حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔ حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان کا نکاح عبیداللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ یہ بھی مسلمان ہو گیا تھا۔

ابوسفیان کا قبیلہ حضور ﷺ کے قبیلے بنو ہاشم کا پرانا حریف تھا۔ ابوسفیان اس قبیلے کا سردار تھا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اپنے باپ کی طرف سے بھی یہ خوف تھا اور اپنے پورے قبیلے کی طرف سے بھی کہ وہ آپ کو دین عزیز سے پھیرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کریں گے۔ ان حالات میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اپنے خاوند سمیت حبشہ ہجرت کر گئیں۔ حبشہ میں عبیداللہ بن جحش نے مرتد ہو کر دین عیسائیت قبول کر لیا۔ اس نے حضرت ام حبیبہ کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے بہت منت سماجت کی لیکن آپ نے اس سے برات کا اظہار کر دیا۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دین عزیز کی خاطر اپنے والدین، قبیلہ، گھر، وطن اور خاوند سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور اب دیار غیر میں بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ مکہ واپسی کا وہ خیال بھی نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ ان کا والد ابوسفیان اور ان کی والدہ ہندہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ ان کے پاس واپس جانے کا مطلب یا تو دین سے ہاتھ دھونا تھا اور یا جان کی بازی ہارنا۔ حضور ﷺ کو جب دین کی اس مخلص مجاہدہ کے حالات کا علم ہوا تو آپ نے ان کی بے کسی کو ختم کرنے اور انہیں ان کی قربانیوں کا صلہ دینے کا ارادہ فرمایا۔ آپ نے شاہ حبشہ نجاشی کے ذریعے حضرت ام حبیبہ کو پیغام نکاح بھجوایا۔ یہ نوید جانفزا سن کر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دل کی جو کیفیت ہو گی اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا۔ انہوں نے اس پیشکش کو سعادت دارین سمجھ کر قبول کر لیا۔ نجاشی نے حضور ﷺ کے حکم کے مطابق ان کا حضور ﷺ کے ساتھ نکاح کر دیا اور اپنے پاس سے چار سو دینار بطور مہر ادا کئے۔ نجاشی کی طرف سے جملہ حاضرین کو کھانا کھلایا گیا اور اس نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو انتہائی عزت و احترام سے حضرت شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ

مدینہ طیبہ روانہ کر دیا۔(1)

حضور ﷺ کے اس نکاح سے نہ صرف ایک مخلص مومنہ کی شب غم سحر آشنا ہوئی بلکہ اس سے بے شمار سیاسی فوائد بھی حاصل ہوئے۔ ابوسفیان اور اس کا قبیلہ حضور ﷺ کو نسب میں اپنا ہم پلہ سمجھتا تھا اس لئے آپ کے ساتھ حضرت ام حبیبہ کے نکاح پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا، بلکہ ابوسفیان نے اس نکاح کی خبر سن کر دشمنی کے باوجود، حضور ﷺ کے ساتھ اس رشتے پر فخر کیا تھا۔ اگر ام حبیبہ دیار غیر میں کسی ایسے مسلمان سے نکاح کر لیتیں جس کو ان کا قبیلہ اپنا ہم پلہ نہ سمجھتا تو ان کی عداوت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ وہ اسلام کے خلاف ایک نئے جوش کے ساتھ حرکت میں آتے لیکن ام حبیبہ کے ساتھ حضور ﷺ کے نکاح کی وجہ سے ان کی مخالفت کی شدت میں کمی آگئی۔ یہ نکاح 7ھ میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ابوسفیان اسلام کے خلاف کسی کاروائی کی قیادت کرتا نظر نہیں آتا۔ حضرت ام حبیبہ کے ساتھ حضور ﷺ کے نکاح نے اس کی مخالفت کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس وقت پوری کر دی جب آپ کا باپ ابوسفیان آپ کو دین آباء کی طرف واپس موڑنے کے لئے آپ کے پاس مدینہ طیبہ آیا۔ وہ اپنے دل میں بڑے خواب لے کر آیا تھا کہ اس کی بیٹی اسے دیکھ کر تمام تلخیاں بھول جائے گی اور اس کی دعوت پر فوراً اپنے گھر والوں کے پاس مکہ جانے کے لئے تیار ہو جائے گی لیکن جس صورت حال سے اس کو واسطہ پڑا اس نے اس کے اندر کے فرعون کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ وہ اپنی لخت جگر کے پاس پہنچا۔ بستر لگا ہوا تھا، اس نے بستر پر بیٹھنے کا ارادہ کیا لیکن اس کی لخت جگر نے اس کے ہاتھ کو بھی بستر کے ساتھ نہ لگنے دیا اور بستر فوراً لپیٹ دیا۔ ابوسفیان حیران تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ پوچھا: بیٹی! کیا تم مجھے اس بستر کے قابل نہیں سمجھتیں یا تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ بستر میرے شایان شان نہیں؟ حضرت ام حبیبہ فوراً گویا ہوئیں: تم اس بستر کے قابل کیسے ہو سکتے ہو، یہ رسول خدا ﷺ کا بستر ہے اور تم ایک مشرک اور نجس شخص ہو۔ اپنی لخت جگر کے دل میں اپنے سب سے بڑے دشمن کا یہ مقام دیکھ کر ابوسفیان کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ اس کے بعد وہ زیادہ عرصہ اسلام سے دور نہ رہ سکا اور کلمہ توحید پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اس طرح حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ حضور

1۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 69

ﷺ کے نکاح نے پہلے کفار مکہ کی اسلام دشمنی کی شدت کو کم کیا، پھر اس نکاح کی برکت سے سردار قریش حلقہ بگوش اسلام ہو گیا اور اسکے نتیجے میں لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونے لگے۔

اس ازدواج کی ان متعدد برکتوں کو نظر انداز کر کے، اس کو منفی زاویے سے دیکھنے کی کوشش وہی بدنصیب کر سکتے ہیں جن کے دل بھی بیمار ہوں، جن کی روحیں بھی بیمار ہوں اور جن کے ضمیر مر چکے ہوں۔ یہ نکاح حضور ﷺ کی دور اندیشی، معاملہ فہمی، غریب نوازی اور رحمت کی دلیل ہے۔ ہزاروں درود و سلام ہوں اس آقا پر جس نے کسی بے کس کو بے کس نہیں رہنے دیا۔

حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضرت جویریہ سے حضور ﷺ کے نکاح کی سیاسی حکمت کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس نکاح میں اور بھی کئی حکمتیں تھیں۔ یہ اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی اور عرب کی ایک معزز خاتون تھیں۔ جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوئی تھیں۔ اس زمانے کے عربوں بلکہ ساری دنیا کے دستور کے مطابق جنگی قیدی غلام اور لونڈیاں بن جاتے تھے اور ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ مذاہب نے اس رسم کو بدلنے کے لئے کچھ نہ کیا تھا۔ حضور ﷺ ذلت کی پستیوں میں کراہتے ہوئے انسانوں کو انسانی عظمتوں سے روشناس کرانے تشریف لائے تھے۔ آپ انسانوں کو انسانوں اور دوسری مخلوق کی بندگی سے آزاد کرا کے خدائے واحد کی بندگی پر جمع کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ آپ اس لئے تشریف نہیں لائے تھے کہ معزز لوگوں کو ذلت کی پستیوں میں دھکیل دیں۔ قریش مکہ حضور ﷺ کے خلاف اس لئے برسرپیکار تھے کہ انہیں خوف تھا کہ آپ کی تحریک کی کامیابی کی صورت میں ان کا وقار ختم ہو جائے گا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ حضور ﷺ اور آپ کی تحریک کی کامیابی کی وجہ سے ان کو عزت کا وہ بلند مقام ملا تھا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

بنو مصطلق قبیلے کے کئی لوگ اسیر ہو کر غلام بن گئے تھے۔ ان میں ان کے سردار کی بیٹی بھی شامل تھی۔ گو وہ لوگ حضور ﷺ کے کٹر دشمن تھے اور انہوں نے آپ کے مشن کو

تباہ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی، لیکن حضور ﷺ دنیوی بادشاہ نہ تھے کہ اپنے دشمن کو ذلت کے گڑھے میں دیکھ کر خوش ہوتے بلکہ آپ تو رحمت عالم بن کر تشریف لائے تھے۔ آپ نے ایک ایسی سنت قائم کی جس کے ذریعے شکست خوردہ دشمن کے لئے ذلتوں کے نہیں بلکہ رفعتوں کے راستے کھل گئے۔ آپ نے اس لونڈی کا زر مکاتبت ادا کیا جو سانحہ اسیری سے پہلے اپنے قبیلے کی معزز ترین خاتون تھی، پھر آپ نے اس کے ساتھ نکاح کر کے اسے ان رفعتوں پر پہنچادیا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ پہلے وہ صرف ایک قبیلے کے لئے محترم تھیں لیکن اس مقدس رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد، اب وہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کی ماں تھیں۔ حضور ﷺ کی اس سنت کے ذریعے مسلمانوں کو یہ سبق ملا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اگر کسی عارضی سبب سے کوئی انسان ذلت کے گڑھے میں گر جائے تو تمہارا کام خوشی کے شادیانے بجانا نہیں بلکہ اس بدنصیب انسان کو ذلت کے اس گڑھے سے نکالنے کی کوشش کرنا تمہارا قومی فریضہ ہے۔

اس نکاح کی برکت سے بنو مصطلق قبیلہ کے تمام قیدیوں کو رہائی بھی ملی تھی اور تمام قبیلہ بتوں کی بندگی کا طوق اپنی گردن سے اتار کر خدائے واحد کی بندگی کی طرف مائل بھی ہوا تھا۔ خود حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر اس سلوک کا یہ اثر ہوا تھا کہ ان کا باپ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: سردار قوم کی بیٹی کو لونڈی بنانا اچھی بات نہیں اس لئے آپ میری بیٹی کو آزاد کر دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اسے اختیار ہے چاہے تو تمہارے ساتھ چلی جائے اور چاہے تو میرے ساتھ رہے۔ لیکن جب اس نے اپنی لخت جگر سے بات کی تو انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دی۔(1)

حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تو حضور ﷺ کے اس عمل میں آپ کی شان رحمت ورافت جلوہ گر نظر آئی۔ ان کے قبیلے نے بھی اس واقعہ کو حضور ﷺ کی صداقت کا ناقابل تردید ثبوت سمجھا، لیکن مستشرقین کے نزدیک یہ واقعہ حضور ﷺ کی خواہش پرستی کی دلیل ہے۔ یہ عجیب قسم کی وکالت ہے کہ جو لوگ بذات خود حضور ﷺ کے اس عمل سے متاثر ہوئے تھے، وہ تو مطمئن تھے، حضور ﷺ کی رحمت و شفقت کا اعتراف کرتے تھے لیکن صدیوں بعد کچھ لوگ ان کے خیراتی وکیل بن بیٹھے ہیں اور وہ اس عمل کی وجہ سے

1۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 75

حضور علیہ السلام پر ایسے الزامات لگاتے ہیں جن کا ان لوگوں نے خود کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

جس طرح دیگر امہات المومنین کچھ شرعی قوانین کے نزول و نفاذ کا سبب بنیں اسی طرح حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ذریعے بھی امت مسلمہ کو کچھ قوانین اور زندگی بخش تعلیمات عطا ہوئیں۔ ایک دفعہ صبح کے وقت حضور علیہ السلام حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت وہ مصلے پر بیٹھی مصروف عبادت تھیں۔ چاشت کے وقت حضور علیہ السلام پھر ان کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت بھی مصلے پر بیٹھی تھیں۔ حضور علیہ السلام نے ان سے پوچھا: کیا تم صبح سے اسی طرح مصروف عبادت ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا: میں نے یہاں سے جانے کے بعد چار کلمات زبان سے ادا کئے ہیں۔ اگر ان کا تمہارے اتنے وقت کے اوراد کے ساتھ وزن کیا جائے تو وہ تمہارے اوراد سے بھاری نکلیں۔ وہ کلمات یہ ہیں:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضٰى نَفْسِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ (1)

مستشرقین کے نزدیک تو شاید یہ معمولی بات ہو لیکن جو لوگ صرف نیکیوں کے میدان میں باہمی مسابقت کرتے تھے اور جن کے نزدیک آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی تھی، ان کے لئے حضور علیہ السلام کی یہ تعلیمات انتہائی قیمتی سرمایہ تھیں اور آج بھی یہ تعلیمات ملت اسلامیہ کے لئے ایک انمول تحفہ ہیں۔

ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سبب امت کو نفلی روزے کے متعلق بھی ایک حکم ملا تھا۔ آپ نے جمعہ کے دن روزہ رکھا۔ حضور علیہ السلام نے آپ سے پوچھا: کیا تم نے کل بھی روزہ رکھا تھا؟ آپ نے عرض کیا: نہیں۔ حضور علیہ السلام نے پوچھا: کیا آئندہ کل تمہارا روزہ رکھنے کا ارادہ ہے؟ عرض کیا: نہیں۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا: تو پھر آج بھی روزہ افطار کر دو۔ اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ حضور علیہ السلام نے صرف جمعہ کے دن اکیلا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ حضور علیہ السلام کی ایک اور حدیث پاک سے بھی اس حکم کی وضاحت ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

لَا يَصُوْمُ اَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اِلَّا اَنْ يَصُوْمَ قَبْلَهٗ اَوْ

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 175

بَعْدَہٗ (1)

"تم میں سے کوئی شخص صرف جمعہ کا روزہ نہ رکھے۔ اگر جمعہ کے دن روزہ رکھنے کا ارادہ ہو تو اس سے پہلے یا بعد بھی ایک دن روزہ رکھے۔"

یہ تفصیلات اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ حضرت جویریہ سے حضور ﷺ کا نکاح عظیم انسانی مقاصد کی خاطر ہوا تھا اور اس کے متعلق مستشرقین نے جو واویلا مچایا ہے وہ ان کے مریض ذہنوں کی اختراع ہے، حقیقت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت صفیہ بنت حیی بنت اخطب رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضرت صفیہ کے ساتھ حضور ﷺ کے نکاح کی حکمتیں بھی بعینہ وہی تھیں جو حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ نکاح کرتے وقت پیش نظر تھیں۔ یہ مشہور یہودی قبیلے بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں۔ جنگ خیبر میں اسیر ہوئی تھیں۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی یہ تعلیم راسخ ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کا کام کسی انسان کو ذلیل کرنا نہیں بلکہ ذلت کی پستیوں میں گرے ہوئے لوگوں کو اٹھا کر، رفعتیں اور عظمتیں عطا کرنا ہے۔ حضرت صفیہ جنگ میں قیدی ہو کر لونڈی بنی تھیں، لیکن وہ حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں اور اس سے پہلے سالم بن مشکم اور کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں رہ چکی تھیں۔ یہ سب یہودیوں کے سردار تھے۔ مسلمانوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ صفیہ کے نسبی مقام کا تقاضا ہے کہ آپ خود ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرمائیں۔ حضور ﷺ نے اس تجویز کو پسند فرمایا لیکن پہلے ان کو اختیار دیا کہ اگر تم دین یہودیت پر قائم رہنا چاہو تو میں تمہیں آزاد کر دیتا ہوں اور تمہیں تمہارے قبیلے والوں کے پاس واپس بھیج دیتا ہوں اور اگر تم اسلام قبول کر لو تو میں تمہیں آزاد کر کے تمہارے ساتھ نکاح کرنے کیلئے تیار ہوں۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے دین پر اسلام کو ترجیح دی اور حضور ﷺ نے انہیں اپنی زوجیت میں قبول فرما لیا۔ (2)

بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت صفیہ دین یہودیت پر قائم رہی تھیں۔ یہ غلط

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 175، بحوالہ بخاری و مسلم

2۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 8-77

ہے۔ اگر وہ دین یہودیت پر قائم رہتیں تو ام المومنین ہونے کا شرف حاصل نہ کر سکتیں۔ حضور ﷺ کا یہ نکاح بھی عظیم انسانی مقاصد کی خاطر عمل میں آیا تھا اور اس کے متعلق مستشرقین کی تمام ہرزہ سرائیں بے بنیاد ہیں۔

حضرت میمونہ بنت حارث الہلالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ان کے ساتھ حضور ﷺ کا نکاح 7ھ میں عمرہ قضا کے موقعہ پر ہوا۔ یہ پہلے حویطب بن عبدالعزیٰ کے نکاح میں تھیں اور اس کے بعد ان کا نکاح ابورھم بن عبدالعزیٰ سے ہوا تھا۔ عمرہ قضا کے موقعہ پر یہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ (1)

ان سے نکاح کی حضور ﷺ کو ترغیب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی ایک بہن ام الفضل لبابہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ حضرت میمونہ بڑھاپے کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان کی پارسائی اور ان کے ایثار کی وجہ سے انہیں اس قابل سمجھتے تھے کہ وہ حضور ﷺ کی ازواج مطہرات میں شامل ہوں اور ام المومنین ہونے کی سعادت حاصل کریں۔ (2)

حضرت میمونہ کے ساتھ نکاح نے کئی لوگوں کو حضور ﷺ کے ساتھ رشتہ مصاہرت میں پرو دیا تھا۔ عربوں کے نزدیک اس قسم کے تعلقات کی بڑی اہمیت تھی اس لئے ان تعلقات نے اسلام کی اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ حضرت میمونہ کی آٹھ بہنیں تھیں جو بڑے اہم لوگوں کی زوجیت میں تھیں۔ ان کی ایک بہن حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ تھیں اور ایک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ تھیں۔ اسی طرح ان کی دیگر بہنیں بھی بڑے اہم لوگوں کے گھروں میں تھیں۔ اس نکاح کی وجہ سے ان تمام لوگوں کے ساتھ حضور ﷺ کا رشتہ قائم ہوا جس کے آپ کی دعوت پر بڑے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

شیخ محمد محمود الصواف لکھتے ہیں کہ حضرت میمونہ غزوہ تبوک میں شریک ہوئی تھیں اور

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 180

2۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 82

وہاں زخمیوں کی مرہم پٹی اور ان کو پانی پلانے کی خدمات انجام دیتی رہی تھیں۔ علامہ "الصواف" یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت میمونہ وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے میدان جنگ میں زخمیوں کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کے لئے خواتین کی ایک جماعت تیار کی تھی۔ دوران جہاد ان کو ایک تیر لگا تھا، جس سے آپ شدید زخمی ہو گئی تھیں۔(1)

اس شادی کا مقصد بھی ایک معمر بیوہ کی دلجوئی اور اس کے رشتہ داروں کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنا تھا۔ فریقین کی عمر کے جس حصے میں یہ شادی ہوئی، اس عمر میں شادی کے مقاصد وہ نہیں ہوتے جو مستشرقین کو نظر آتے ہیں۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا

مستشرقین نے حضور ﷺ کی شادیوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ ہرزہ سرائیاں، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ آپ کے نکاح کے متعلق کی ہیں۔ انہوں نے اس تاریخی واقعہ کو افسانوی رنگ دے کر لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اور اسکے ذریعے مسلمانوں کے دلوں سے حضور ﷺ کی عظمت کے نقوش کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ ہم اس شادی کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے تاکہ مستشرقین کی طرف سے پھیلائے جانے والے شکوک وشبہات کے جالوں کے تار ٹوٹ جائیں اور حقیقت پوری آب وتاب کے ساتھ قارئین کے سامنے بے نقاب ہو جائے۔

حضور ﷺ کی اس شادی پر آپ کے زمانے کے یہودیوں، منافقوں اور دیگر دشمنان اسلام نے بھی بہت اعتراضات کئے تھے۔ اس شادی کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے اہم پہلوؤں پر قرآن حکیم نے خود روشنی ڈالی ہے۔ حضور ﷺ کے معاصرین نے اس شادی پر اس لئے اعتراضات کئے تھے کہ حضرت زینب، حضرت زید رضی اللہ عنہما کی مطلقہ تھیں جو حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ عربوں کے نزدیک منہ بولا بیٹا، حقیقی بیٹے کی ہی حیثیت رکھتا تھا اور ان کے نزدیک متبنّیٰ کی مطلقہ کے ساتھ شادی، حقیقی بیٹے کی مطلقہ کے ساتھ شادی کی طرح ہی ناپسندیدہ تھی۔

حضور ﷺ کو اس شادی کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے زمانہ جاہلیت کی ایک نہیں بلکہ کئی

2۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 81

ناپسندیدہ رسموں کو توڑا تھا۔ ان رسموں کو توڑنے کے خلاف جس زبردست سماجی رد عمل کا خطرہ تھا، اس کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری پروردگار عالم نے اپنے حبیب لبیب ﷺ اور ان کے قریب ترین لوگوں کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ اس واقعے کی تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت زینب کون تھیں اور حضرت زید کون تھے۔

حضرت زینب کے متعلق صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ آپ حضور ﷺ کی پھوپھی عمیمہ کی بیٹی اور حضرت عبدالمطلب کی نواسی ہیں۔

حضرت زید کا تعلق شام سے تھا۔ تہامہ کے چند سواروں کا ادھر سے گزر ہوا۔ یہ ابھی بچے ہی تھے۔ ان سواروں نے انہیں پکڑ لیا، اپنے ساتھ عرب لائے اور انہیں فروخت کر دیا۔ حکیم بن حزام بن خویلد نے، جو ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے، انہیں خرید لیا اور اپنی پھوپھی صاحبہ کو بطور تحفہ پیش کر دیا۔ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے زید کو حضور ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا۔(1) حضرت زید بن حارثہ کا آبائی نسب قضاعہ تک منتہی ہوتا ہے اور ان کی ماں کا نسب بھی معن میں "طی" سے ملتا ہے۔ گویا حضرت زید رضی اللہ عنہ نجیب الطرفین تھے۔(2)

حضرت زید کے والد نے ان کی گمشدگی کے وقت سے مسلسل ان کی تلاش کی تھی۔ آخرکار ان کی محنت رنگ لائی اور ان کا لخت جگر انہیں مل گیا۔ آپ کے والد، چچا اور ایک بھائی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حارثہ نے حضور ﷺ سے عرض کیا: اے محمد! (ﷺ) تم لوگ بیت اللہ کے پڑوسی ہو۔ تم مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہو اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہو۔ میرا بیٹا آپ کے پاس ہے۔ آپ ہم پر احسان فرمائیں اور ہمارے بچے کو زرفدیہ لے کر آزاد فرمادیں۔ آپ بطور فدیہ جتنی رقم کا مطالبہ کریں گے ہم وہ رقم ادا کر دیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمہارے سامنے ایک بات رکھتا ہوں جو تمہارے مطالبے سے کہیں بہتر ہے۔ انہوں نے پوچھا: وہ بات کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں زید کو اختیار دیتا ہوں۔ اگر وہ تمہیں اختیار کرے تو تم فدیہ ادا کئے بغیر اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا پسند کرے تو تم اسے یہیں رہنے دو۔ انہوں

1۔ ضیاء القرآن، جلد 4، صفحہ 13

2۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 167

نے عرض کیا:

آپ نے بہت اچھی بات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

حضور علیہ السلام نے حضرت زید کو بلایا اور فرمایا: زید! کیا تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور عرض کیا: یہ میرے والد ہیں، یہ میرے چچا ہیں اور یہ میرے بھائی ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم نے ان کو پہچان لیا ہے۔ اب تمہیں اختیار ہے اگر تم ان کے ساتھ جانا چاہو تو ان کے ساتھ جا سکتے ہو اور اگر تم میرے پاس رہنا چاہو تو تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: میں کبھی کسی شخص کو آپ پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ آپ ہی میرے لئے باپ اور چچا کے قائم مقام ہیں۔ ان کے باپ نے کہا: زید! کیا تم غلامی کو آزادی پر ترجیح دے رہے ہو؟ آپ نے فرمایا: میں اس عظیم ہستی کو کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔ جب حضور علیہ السلام نے اپنے غلام کے اس خلوص کو دیکھا تو فرمایا:

اَشْهِدُوْا اَنَّهٗ حُرٌّ وَاَنَّهٗ اِبْنِیْ یَرِثُنِیْ وَاَرِثُهٗ (1)

”تم گواہ رہو، یہ آزاد ہے، اب یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ میرا وارث بنے گا اور میں اس کا وارث بنوں گا۔“

جب حضرت زید کے والد اور چچا نے حضور علیہ السلام کا یہ حسن سلوک دیکھا تو وہ حضرت زید کو حضور علیہ السلام کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ اب انہیں اطمینان تھا کہ ان کے بیٹے کے سر پر ایک ایسی ہستی کا سایہ ہے جس کی شفقت، شفقت پدری سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔

اس کے بعد حضرت زید کو زید بن محمد کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ بعثت کے بعد بھی حضرت زید کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس نسب پر انہیں جتنا فخر تھا اور حبیب خدا کے ساتھ اس نسبت سے ان کو جو مسرت محسوس ہوتی ہو گی اس کا اندازہ وہ خود ہی لگا سکتے ہیں۔ ان کو حضور علیہ السلام نے اپنا بیٹا بنایا تھا اور عربوں کے دستور کے مطابق منہ بولا بیٹا تمام معاملات میں حقیقی بیٹے کی طرح ہی ہوتا تھا۔ عربوں کے ہاں یہ ایک رسم تھی اور اس رسم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عظمتوں کی معراج پر پہنچا دیا تھا، لیکن اس رسم میں کئی سماجی قباحتیں تھیں۔ اس رسم سے وراثت اور مصاہرت کے قوانین بری طرح متاثر ہوتے تھے۔ اسلام زمانہ جاہلیت کی تمام غلط اور نقصان دہ رسموں کو ختم کرنے کے لئے تشریف لایا تھا۔ اسلام نے حکم دیا کہ

1۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 61

ہر آدمی کو اس کے حقیقی باپ سے منسوب کیا جائے اور آدمی کو منہ بولے باپ کی طرف منسوب کرنے کی رسم کو ختم کر دیا جائے۔ ارشاد خداوندی ہوا:

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْكُمْ (1)

"بلایا کرو انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے۔ یہ زیادہ قرین انصاف ہے اللہ کے نزدیک۔ اگر تمہیں علم نہ ہو ان کے باپوں کا تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بعد حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زید بن محمد کی بجائے زید بن حارثہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا اور حضرت زید اللہ تعالیٰ کے حکم پر جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے بھی ہمہ وقت تیار تھے لیکن خدا کے حبیب ﷺ کے ساتھ انہیں جو بے مثال نسبت تھی، اس سے محروم ہونے پر انہیں صدمہ ضرور پہنچا ہو گا۔ جس گھر میں زید بن محمد کے نام سے پکارے جانے پر وہ اپنے آپ کو گھر کا فرد سمجھتے تھے، اس گھر میں زید بن حارثہ کے نام سے پکارے جانے پر انہیں اجنبیت اور وحشت محسوس ہوتی ہو گی لیکن خدا اور خدا کے رسول کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جاہلیت کی ایک رسم کو توڑنے کے لئے حضرت زید کے حوصلے کا امتحان ہوا تھا لیکن عالم بالا میں ایک اور رسم کو توڑنے کے ذریعے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نئی عظمتیں عطا ہونے کے سامان ہو رہے تھے۔ عرب انسان کی قدر و قیمت اس کے نسب سے مقرر کرتے تھے۔ اعلیٰ نسب والا انسان معزز تھا خواہ اس کے اخلاق و کردار کی کیفیت کیسی ہی ہوتی اور کمتر نسب والا انسان ہر قسم کی انسانی خوبیوں سے مالا مال ہو کر بھی بے وقار رہتا تھا۔ یہ معاشرتی طرز عمل انسانیت کی توہین تھی۔ یہ طرز عمل عربوں تک محدود نہ تھا بلکہ ساری دنیا کی تمام مہذب قومیں اس مرض کا شکار تھیں۔ یہ طرز عمل دور مظلمہ تک محدود نہ تھا بلکہ آج بھی موجود ہے۔ آج کے اہل مغرب بھی گوری چمڑی والے لوگوں کو رنگ دار لوگوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہودی اپنے آپ کو خدا کی لاڈلی مخلوق اور دوسری قوموں کو کمتر مخلوق سمجھتے ہیں۔ ہٹلر کے دماغ میں، جرمنوں کے بہترین قوم ہونے کا بھوت سمایا تھا اور اس نے لاکھوں انسانوں کو موت

1۔ سورۃ الاحزاب 5

کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ اسلام اس تباہ کن بیماری کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسلام نے نسل، علاقے، زبان، رنگ اور وطن کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور تقویٰ کو انسانی عظمت کا معیار قرار دیا۔

ارشاد خداوندی ہوا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (1)

"اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے اور بنا دیا ہے تمہیں مختلف قومیں اور مختلف خاندان تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سے زیادہ معزز اللہ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ علیم (اور) خبیر ہے۔"

انسانوں میں برابری کے اس اسلامی اصول کو عربوں کی زندگی میں عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے قربانی درکار تھی۔ حضور ﷺ نے باذن خداوندی اس قربانی کے لئے اپنی پھوپھی کے کنبہ کو منتخب فرمایا۔ حضرت زینب بنت جحش معزز ترین قبیلے کی فرد تھیں۔ ان کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا جو عرب کا معزز ترین قبیلہ شمار ہوتا تھا۔ وہ فخر قریش حضرت عبد المطلب کی نواسی تھیں اور تاجدار دوجہاں حضرت محمد ﷺ کی پھوپھی زاد تھیں۔ حضور ﷺ نے اذن خداوندی کے مطابق انہیں اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے پیغام نکاح بھیجا۔ حضرت زینب اور ان کے اہل خاندان کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ قریش کی معزز ترین خاتون ایک آزاد کردہ غلام سے نکاح کرے، یہ زمانے کے دستور کے مطابق ان کی توہین تھی۔ حضرت زینب اور ان کے بھائی حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ خدائی فیصلہ تھا، ان کے انکار سے ٹل نہیں سکتا تھا۔ حکم خداوندی نازل ہوا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ

1۔ سورۃ الحجرات: 13

وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (1)

"نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مومن عورت کو کہ جب فیصلہ فرمادے اللہ تعالیٰ اور اللہ کا رسول کسی معاملہ کا تو پھر انہیں کوئی اختیار ہو اپنے اس معاملہ میں۔ اور جو نافرمانی کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔"

جب یہ ارشاد خداوندی حضرت زینب اور ان کے بھائی نے سنا تو فوراً حضرت زید کے ساتھ حضرت زینب کے نکاح پر اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا، چنانچہ حضور ﷺ نے ان دونوں کا نکاح کر دیا۔ اس نکاح کے ذریعے حضور ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے اس احساس کی تلخی کو کم کیا تھا کہ وہ ایک آزاد کردہ غلام ہیں۔ آپ نے ایک معزز قریشی خاتون سے ان کا نکاح کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زید کا سماجی مقام کمتر نہیں بلکہ وہ قبیلہ قریش کے کفو ہیں۔ اس اعزاز کے ذریعے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ زخم بھی مندمل ہو گیا جو زید بن محمد کہلوانے کے اعزاز سے محروم ہونے کے سبب آپ کو لگا تھا۔ حضور ﷺ نے اس نکاح کے ذریعے جہاں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حوصلہ افزائی کی تھی وہاں اس مثال کے ذریعے غلاموں کو معاشرے میں بلند ترین مقام حاصل ہو گیا تھا۔

دوسری جانب حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے گھر والوں کے لئے یہ ایک کڑا امتحان تھا، لیکن انہوں نے اپنی تمام مصلحتوں اور اپنے تمام احساسات کو خدا اور رسول کے حکم پر قربان کر دیا اور اس کڑے امتحان میں سرخروئی حاصل کی۔

اللہ تعالیٰ نہ کسی کے خلوص کو ضائع کرتا ہے اور نہ ہی کسی کی قربانیوں کو ضائع کرتا ہے۔ اس نے اپنی اس مخلص بندی کے ایثار کا بدلہ اسے اسی دنیا میں دینے کا ارادہ فرمایا۔ جس طرح پہلے ایک قبیح رسم کو ختم کرنے کے لئے ان سے ان کے احساسات اور جذبات کی قربانی مانگی گئی تھی، اسی طرح اب ایک اور قبیح رسم کو ختم کر کے ان کے سر پر عزت کا وہ تاج سجایا جانے والا تھا جو کسی کسی کا مقدر بنتا ہے۔

لوگوں کو ان کے منہ بولے باپوں کی طرف منسوب کرنے کی رسم ختم ہو چکی تھی، زینب اور زید رضی اللہ عنہما کے نکاح کے ذریعہ نسلی تفاخر کا بت پاش پاش ہو چکا تھا اور غلام

1۔ سورۃ الاحزاب 36

انسانی عظمتوں سے بہرہ ور ہو چکے تھے، لیکن ابھی ایک انتہائی قبیح رسم باقی تھی۔ منہ بولے بیٹے کی بیوی کو حقیقی بیٹے کی بیوی کا مقام حاصل تھا۔ جس طرح حقیقی بیٹے کی مطلقہ سے نکاح ناجائز سمجھا جاتا تھا اسی طرح منہ بولے بیٹے کی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح کو ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ یہ رسم بے شمار مسائل پیدا کرتی تھی۔ اس رسم کی وجہ سے کئی ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح ناجائز قرار پاتا تھا جن کے ساتھ حقیقت میں نکاح جائز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس رسم کو ختم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ یہ رسم عربوں کے دل و دماغ میں یوں رچ بس چکی تھی کہ ان کے لئے اس کو توڑنے کا تصور بھی ناممکن تھا، اس لئے اس رسم کو توڑنے کے لئے بھی قربانی درکار تھی۔ یہ قربانی کوئی عام قسم کی قربانی نہ تھی۔ یہ قربانی وہی شخص دے سکتا تھا جو چاروں طرف سے برسنے والے طعن و تشنیع کے تیروں کا پامردی سے مقابلہ کر سکتا۔ اس قربانی کے لئے اس آدمی کی ضرورت تھی جس کی ہمت پر زمانہ رشک کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کے لئے اس ہستی کو منتخب فرمایا جس نے سینکڑوں بتوں کے پجاریوں کے جھرمٹ میں نعرہ توحید بلند کرنے کی جرات کی تھی۔ جسے نعرہ توحید بلند کرنے سے نہ دشمن کی سختیاں روک سکی تھیں اور نہ ہی ان کی پھبتیاں اس کے عزائم کو متزلزل کر سکی تھیں۔ جس نے اہل مکہ، طائف کے باسیوں اور عرب کے میلوں میں جمع ہونے والے قبائل کے سامنے ان کے بتوں کی بے بسی کا اعلان کیا تھا اور ہر قسم کے رد عمل کا پامردی سے مقابلہ کیا تھا۔ جس نے اپنے چچا کے سامنے، جب انہوں نے کفار مکہ کے اصرار پر آپ کو نئے دین کی دعوت کے بارے میں اپنے رویے میں تبدیلی کے لئے کہا تھا، یہ تاریخی جملے کہے تھے:

يَا عَمِّ وَاللهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِيْ وَالْقَمَرَ فِيْ يَسَارِيْ عَلٰى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللهُ اَوْ اَهْلَكَ فِيْهِ مَا تَرَكْتُهٗ (1)

"اے میرے چچا! اگر وہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ میں رکھ دیں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ میں اور یہ توقع کریں کہ میں دعوت حق کو ترک کر دوں گا، تو یہ ناممکن ہے۔ یا تو اللہ تعالیٰ اس دین کو غلبہ دے دے گا، یا میں اس کے لئے جان دے دوں گا۔ اس وقت تک میں اس کام

1۔ ضیاء النبی، جلد 2، صفحہ 275

کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔

وہی ہستی جس نے عربوں کے مزعومات کے ہر بت کو پاش پاش کیا تھا، صرف وہی ہستی اس مذکورہ رسم کو ختم کرنے کی ذمہ داری قبول کر سکتی تھی۔

اگر حضرت زید اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما کی شادی پر تمام پہلوؤں سے غور کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ اس شادی سے جہاں ایک طرف نسلی تفاخر کے بت کو توڑنا مقصود تھا وہاں اسی شادی کے ذریعے متبنیٰ کی بیوی کے ساتھ نکاح کی حرمت والی رسم کو توڑنا بھی مقصود تھا۔

حضور ﷺ کی تعلیمات شریک حیات کے انتخاب کو مرد اور عورت کی صوابدید پر چھوڑتی ہیں۔ شریعت محمدیہ اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی کی مرضی کے بغیر اس کی شادی کی جائے۔ لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی کی ناپسندیدگی کے باوجود انہیں اس شادی کا حکم دیا گیا۔ انہیں اپنی ناپسندیدگی کے اظہار پر تنبیہ کی گئی اور واضح کیا گیا کہ یہ خدا اور خدا کے رسول کا حکم ہے، تمہیں اپنی مرضی کو قربان کر کے تعمیل ارشاد کرنی چاہئے۔ حضرت زینب اور ان کے اہل خانہ مخلص مومن تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا بخوبی علم تھا:

فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْــٴًـا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا(1)

"شاید تم ناپسند کرو کسی چیز کو اور رکھ دی ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں (تمہارے لئے) خیر کثیر۔"

جب انہیں پتہ چلا کہ یہ خدا کا حکم ہے تو انہوں نے اس یقین کے ساتھ اس کو قبول کر لیا کہ یقیناً یہ رشتہ ان کے لئے ایسی رحمتیں اور برکتیں لائے گا جن کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا۔

یہ شادی چونکہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مرضی کے مطابق نہ تھی اس لئے ان کی ازدواجی زندگی میں وہ رونق نہ آسکی جو شادی کا اصل مقصد ہے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روحانی عظمتوں کا تو کون انکار کر سکتا ہے لیکن ان کی جسمانی خوبیاں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو متاثر نہ کر سکتی تھیں۔ اپنی نسبی شرافت پر حضرت زینب رضی اللہ

1۔ سورۃ النساء 19

تعالیٰ عنہا کا فخر بھی ان کی ازدواجی زندگی کی کامیابی کے راستے میں رکاوٹ تھا۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس صورت حال سے پریشان تھے۔ حضرت زینب کے ساتھ رہنا بھی ان کے لئے ممکن نہ تھا کیونکہ وہ وقتاً فوقتاً ایسا رویہ اختیار کرتی تھیں جس سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عزت نفس مجروح ہوتی تھی۔ وہ ان کو طلاق بھی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہ شادی حضور علیہ السلام کے خصوصی حکم سے ہوئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس ہستی کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا جو مقلب القلوب ہے، دلوں کو جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ اس میں حکمت وہی تھی جس کا ظہور بعد میں ہوا۔

حضور علیہ السلام کے حکم پر جب حضرت زینب نے حضرت زید رضی اللہ عنہما سے شادی کرلی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ حضور علیہ السلام انہیں اپنے رویے میں تبدیلی کا حکم دیتے تو وہ تعمیل میں کوتاہی کرتیں۔ لیکن حضور علیہ السلام نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اس کی وجہ حضرت زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے معلوم ہوتی ہے:

اَوْحَی اللّٰہُ تَعَالٰی مَآ اَوْحَی اللّٰہُ تَعَالٰی بِہٖ اَنَّ زَیْنَبَ سَیُطَلِّقُھَا زَیْدٌ وَتَتَزَوَّجُھَا بَعْدَہٗ (عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ) (1)

"اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام پر یہ وحی فرمائی تھی کہ زید حضرت زینب کو طلاق دے دیں گے اور اس کے بعد آپ ان سے نکاح کریں گے۔"

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ صورت حال سے تنگ آکر بارگاہ نبوت میں حاضر ہو گئے اور زینب کو طلاق دینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حضور علیہ السلام کو بذریعہ وحی یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ زید جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ ہو کر رہے گا کیونکہ بارگاہ خداوندی میں اس کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن حضور علیہ السلام اس فیصلے کے نتائج کو بھی دیکھ رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ زید کے طلاق دینے کے بعد جب آپ حسب حکم خداوندی زینب سے نکاح کریں گے تو مخالفین آسمان سر پر اٹھالیں گے۔ وہ شور مچائیں گے کہ محمد علیہ السلام نے خود بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنے کی ممانعت فرمائی ہے اور اب خود ہی اس قانون کو توڑ دیا ہے۔ آپ نے اپنے قانون کو بھی توڑا ہے اور معاشرے میں جو رسم صدیوں سے چلی آرہی تھی، اس کو بھی توڑا ہے۔ مخالفین اس بات کو آپ کے کردار کو داغدار کرنے کے لئے استعمال کریں گے۔ ان

1۔ ضیاء القرآن، جلد 4، صفحہ 63

خدشات کے پیش نظر حضور ﷺ نے حضرت زید سے فرمایا کہ تم خدا سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ آپ نے ان پر اس حقیقت کو ظاہر نہ فرمایا کہ تمہارے زینب کو طلاق دینے اور عدت گزرنے کے بعد ان کے میرے نکاح میں آنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اس کا حبیب اپنے مشن کے راستے میں کسی قسم کے ذہنی تحفظات یا لوگوں کی باتوں کو پرکاہ کی بھی وقعت دے۔ اس کا کام ہے حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے میدان میں اتر آنا اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا اور مخالفین کو خاموش کرانا اس کا کام ہے جس نے یہ حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رویے پر اپنے حبیب لبیب ﷺ کو ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی:

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَھَا لِکَیْ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِھِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا (1)

''اور یاد کیجئے جب آپ نے فرمایا اس شخص کو جس پر اللہ نے بھی احسان فرمایا اور آپ نے بھی احسان فرمایا، اپنی بی بی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر، اور آپ مخفی رکھے ہوئے تھے اپنے جی میں وہ بات جسے اللہ ظاہر فرمانے والا تھا اور آپ کو اندیشہ تھا لوگوں (کے طعن و تشنیع) کا حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔ پھر جب پوری کر لی زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا تاکہ (اس عملی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ پورا کر لیں اور اللہ کا حکم تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔

حضرت زید نے حضرت زینب کو طلاق دے دی اور حضور ﷺ نے حکم خداوندی کے

1۔ سورۃ الاحزاب 37

مطابق حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس نکاح کے ذریعے حضور ﷺ نے منہ بولے بیٹے کی بیوی کے ساتھ نکاح کی حرمت کی رسم ختم کردی تھی لیکن اس رسم کو توڑنے کی وجہ سے اسلام اور پیغمبر اسلام کے مخالفین کو پروپیگنڈے کے لئے وافر مواد میسر آگیا تھا۔ انہوں نے حضور ﷺ کے خلاف آسمان سر پر اٹھالیا اور آپ پر طرح طرح کے الزام لگانے لگے کہ یہ کیسا مصلح ہے جو خود اپنے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ ان کی ان ہرزہ سرائیوں کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے خود دیا اور فرمایا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (1)

"نہیں ہیں محمد (فداہ روحی) کسی کے باپ تمہارے مردوں میں سے بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا کہ میرا حبیب ﷺ تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں۔ اس آیت کریمہ میں حضور ﷺ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ آپ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ مردوں میں سے کسی کے باپ ہونے کی نفی اور رسالت کے اثبات میں امت کے لئے ایک بڑا مبارک اشارہ ہے۔ آیت کریمہ کہہ رہی ہے کہ محمد ﷺ نہ تو زید کے باپ ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے مرد کے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا تمہارے ساتھ تعلق کمزور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا تمہارے ساتھ جو تعلق ہے وہ باپ بیٹے کے باہمی تعلق سے بھی کہیں گہرا ہے۔ وہ تمہاری طرف اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں۔ بے شک باپ اپنی اولاد پر بڑا مہربان اور شفیق ہوتا ہے لیکن رسول کا جو تعلق اپنی امت کے ہر فرد کے ساتھ ہوتا ہے اور اپنے غلاموں پر وہ جو لطف و کرم فرماتا ہے، اس کے مقابلے میں باپ کی ساری شفقتیں ہیچ ہیں۔ باپ کی مہربانیاں اولاد کی جسمانی اور مادی زندگی تک محدود ہوتی ہیں لیکن رسول کی نگاہ کرم سے امتی کا جسم اور روح، ظاہر اور باطن دل اور عقل سب فیض یاب ہوتے ہیں۔ باپ کی شفقتیں روز حشر کام نہیں آئیں گی بلکہ سارے دنیوی رشتے اس دن ٹوٹ جائیں گے۔

1۔ سورۃ الاحزاب: 40

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (1)

"اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بچوں سے۔"

لیکن رسول کے لطف و عنایت سے دنیا اور آخرت دونوں میں اس کا امتی شاد کام ہوتا ہے۔(2)

اس واقعے کے تمام اہم نکات کو قرآن حکیم نے خود بیان کر دیا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت زینب کو حضرت زید کے لئے پیغام نکاح بھیجا، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی خدا اور خدا کے رسول کا فیصلہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی اعلان فرمادیا ہے کہ زید کے طلاق دینے کے بعد زینب کا اپنے حبیب سے نکاح ہم نے خود کر دیا ہے۔ اس نکاح کی حکمت بھی بتادی ہے کہ اپنے حبیب ﷺ کا یہ نکاح ہم نے اس لئے کیا ہے کہ یہ نکاح امت مسلمہ کے لئے رحمت بن جائے اور اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے طلاق کے بعد نکاح کرنے میں مسلمانوں کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اس حکمت کو ظاہر فرمایا بلکہ اس مشکل ترین حکم کے نفاذ کے وقت حضور ﷺ کے دل میں جو خدشات پیدا ہوئے تھے، ان کو بھی خفیہ نہیں رہنے دیا بلکہ ظاہر فرمادیا۔ اتنی وضاحتوں کے بعد کوئی ایسا شخص ہی اس واقعہ کو غلط معنی پہنا سکتا ہے جس کے دل میں کھوٹ ہو۔ بدقسمتی سے دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے دل مریض ہیں۔ دل کے ان مریضوں نے واضح حقائق کو غلط معنی پہنائے اور اس واقعے کو حضور ﷺ کی کردار کشی کے لئے دل کھول کر استعمال کیا ہے۔

مستشرقین نے اس واقعہ کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں کئی ایسی باتیں لکھی ہیں جو صرف ان کے اپنے تخیل کی اختراع ہیں۔ بعض مسلمانوں کی غیر محتاط تحریروں نے بھی اس سلسلے میں مستشرقین کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس قسم کی تحریروں کے متعلق علمائے محققین کا فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

1۔ سورۃ عبس 36-33

2۔ ضیاء القرآن، جلد 4، صفحہ 6-65

ذَكَرَ اِبْنُ اَبِیْ حَاتِمٍ وَابْنُ جَرِیْرٍ هٰهُنَا عَنْ بَعْضِ السَّلَفِ اٰثَارًا اَحْبَبْنَا اَنْ نَّضْرِبَ عَنْهَا صَفْحًا لِعَدَمِ صِحَّتِهَا فَلَا نُوْرِدُهَا

کہ بعض علماء نے یہاں کئی روایتیں نقل کی ہیں لیکن وہ صحیح نہیں، اس لئے ہم ان کا ذکر نہیں کرتے۔

علامہ ابن حیان اندلسی نے لکھا ہے کہ:

لِبَعْضِ الْمُفَسِّرِیْنَ کَلَامٌ فِی الْاٰیَةِ یَقْتَضِی النَّقْصَ مِنْ مَنْصَبِ النُّبُوَّةِ ضَرَبْنَا عَنْهُ صَفْحًا

یعنی بعض مفسرین نے یہاں ایسی باتیں لکھی ہیں جو شان رسالت کے منافی ہیں، اس لئے ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔

اَمَّا مَا رُوِیَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هَوٰی زَیْنَبَ اِمْرَأَةَ زَیْدٍ وَرُبَّمَا اَطْلَقَ بَعْضُ الْمُجَانِ لَفْظَ عِشْقٍ فَهٰذَا اِنَّمَا یَصْدُرُ عَنْ جَاهِلٍ لِعِصْمَةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی مِثْلِ هٰذَا اَوْ مُسْتَخِفٌ بِحُرْمَتِهٖ

"کہ یہاں جو افسانہ گھڑا گیا ہے یہ ان لوگوں کی طرف سے ہے جنہیں نبی کریم کی عصمت کا علم نہیں یا انہوں نے دانستہ شان نبوت کو گھٹانے کی کوشش کی۔ علامہ آلوسی کی بھی یہی رائے ہے۔" (1)

وہ روایتیں جن کے بارے میں ملت اسلامیہ کے محقق علماء کی رائے وہ ہے جو سطور بالا میں آپ نے ملاحظہ فرمائی، ان روایتوں کے زور پر مستشرقین نے ایک ایسا افسانہ تراشا ہے جس کو نقل کرنے سے بھی دل کانپتا ہے لیکن ان لوگوں کے الزامات کی تردید کے لئے ضروری ہے کہ قارئین کرام کے سامنے ان کی ہرزہ سرائیوں کی ایک جھلک پیش کی جائے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ مستشرقین کس قسم کی غیر جانبدارانہ تحقیق کرتے ہیں۔ ولیم میور یہ افسانہ اس طرح لکھتا ہے:

1۔ ضیاء القرآن، جلد 4، صفحہ 64

"Mahomet was now going on to three-score years; but weakness for the sex seemed only to grow'with age, and the attractions of his increasing harem were insufficient to prevent his passion from wandering beyond its ample limits.

Happening one day to visit the dwelling of his adopted son Zeid, he found him absent. As he knocked, Zeinab, wife of Zeid, started up in confusion to array herself decently for the prophet's reception. But the charms had already through the half-Opened door, unveiled themselves too freely before his admiring gaze; and Mahomet, smitten by the sight, exclaimed, "Gracious Lord! Good Heavens! How thou dost turn the hearts of men!. "The words, uttered as he turned to go, were overheard by Zenab, and she, proud of her conquest, was nothing loth to tell her husband of it. Zeid went at once to Mahomet, and offered to divorce his wife for him." Keep thy wife to thyself. "he answered," and fear God. "But the words fell from unwilling lips." (1)

"محمد (ﷺ) کی عمر اب ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ جنس کے معاملہ میں ان کی کمزوری میں اضافہ ہو رہا تھا اور ان کے بڑھتے ہوئے حرم کی کششیں ان کو اپنی وسیع حدود سے تجاوز سے باز رکھنے کے لئے کافی نہ تھیں۔ ایک روز وہ اپنے منہ بولے بیٹے زید سے ملنے ان کے گھر گئے لیکن وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ انہوں نے دستک دی۔ زید کی بیوی زینب رسول خدا کا مہذبانہ استقبال کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگیں لیکن ان کا حسن، نیم وا دروازے کے راستے، محمد (ﷺ) کی مشتاق نگاہوں کے سامنے اپنے آپ کو منکشف کر چکا تھا۔ اس منظر سے مغلوب

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 126

ہو کر انہوں نے بے ساختہ کہا "سبحان اللہ! اے اللہ! تو لوگوں کے دلوں کو کیسے پھیر دیتا ہے۔" وہ الفاظ جو محمد (ﷺ) نے واپس جاتے ہوئے اپنی زبان سے ادا کئے تھے، وہ زینب نے سن لئے۔ وہ اپنی فتح پر نازاں تھیں اور انہوں نے یہ واقعہ اپنے خاوند کے سامنے بیان کرنے میں ذرا جھجک محسوس نہ کی۔ زید یہ سن کر فوراً محمد ﷺ کے پاس گئے اور ان کی خاطر اپنی زوجہ کو طلاق دینے کی پیشکش کی۔ انہوں نے کہا خدا سے ڈرو اور اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دو۔ یہ الفاظ بے دلی سے ان کی زبان پر آئے تھے۔"

ولیم میور اسی طرح افسانوی رنگ میں اس قصے کو آگے بڑھاتا ہے اور زید کی طرف سے حضرت زینب کو طلاق ملنے کے بعد، حضور ﷺ کے ساتھ ان کی شادی کو افسانوی انداز میں یوں بیان کرتا ہے:

"Even in Arabia, to marry the divorced wife of an adopted son was a thing unheard of, and he foresaw the scandal it would create. But the flame would not be stifled. And so, Casting his scruples to the winds, he resolved at last to have her". (1)

"اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے شادی ایسی بات تھی جو عرب جیسے ملک میں بھی نئی تھی۔ محمد (ﷺ) نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اس نکاح سے ان کی بڑی بدنامی ہو گی لیکن محبت کا شعلہ بجھنے والا نہ تھا۔ انہوں نے ضمیر کی ہر خلش کو جھٹک دیا اور ہر قیمت پر زینب کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔"

حضرت زینب کے ساتھ حضور ﷺ کی شادی حکم خداوندی سے ہوئی تھی۔ اس حقیقت کو ولیم میور اپنے مخصوص انداز میں یہ معنی پہناتا ہے:

"The marriage caused no small obloquy, and to save his reputation Mahomet fell back upon his oracle. A passage was promulgated which purports on the part of the Almighty not only to sanction the union, but even reprehend the prophet for hesitating to

---

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 126

consumate it, from the fear of men". (1)

"اس نکاح سے محمد (ﷺ) کی کچھ کم بدنامی نہ ہوئی۔ اپنی شہرت کو محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے وحی کا سہارا لیا۔ ایک آیت کی تشہیر کی گئی جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ صرف اس شادی کو جائز قرار دیا گیا تھا بلکہ اس بات پر محمد (ﷺ) کو تنبیہ کی گئی کہ انہوں نے لوگوں کے خوف سے اس شادی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیوں کیا۔"

ولیم میور نے اس کے بعد اس پوری آیت کا ترجمہ لکھا ہے جس میں حضرت زینب کی حضور ﷺ کے ساتھ شادی کا ذکر ہے۔ پھر اس نے ان قرآنی آیات کے متعلق یہ تبصرہ کیا ہے:

"Could the burlesque of inspiration be carried further? Yet this verse -as well as the revelation chiding him because he did not marry Zeinab, and the other passages on the prophet's relations with his household-, are all incorporated in the Coran, and to this day are gravely recited in due course, as a part of the word of God, in every mosque throughout Islam!" (2)

"کیا وحی کے مزاح کو اس سے آگے لے جانا ممکن ہے؟ اس کے باوجود یہ آیت اور وہ وحی جس میں زینب سے شادی نہ کرنے پر محمد (ﷺ) کو تنبیہ کی گئی ہے، اور دیگر آیات جن میں محمد (ﷺ) کے اپنے اہل خانہ کے ساتھ تعلقات کا ذکر ہے، وہ سب قرآن کا حصہ ہیں اور آج تک دنیائے اسلام کی ہر مسجد میں کلام اللہ کے طور پر ان کی تلاوت ہوتی ہے۔"

گویا ولیم میور یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا کی طرف سے جو قانون نازل ہو اس میں انسانوں کی خانگی زندگی کے متعلق کوئی لفظ نہ ہو۔ کسی الہامی کتاب میں خانگی معاملات پر گفتگو ان کے نزدیک وحی کے ساتھ مذاق ہے، حالانکہ ولیم میور ایک پکے عیسائی ہیں، بائبل ان کے پاس

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 127

2۔ ایضاً، صفحہ 30-129

موجود ہوگی اور وہ اس کا مطالعہ بھی کرتے ہوں گے۔ بائبل میں خدا کے مقدس نبیوں اور رسولوں کی طرف جو ننگ انسانیت حرکتیں منسوب ہیں، وہ تو ولیم میور کو وحی کے ساتھ مذاق نظر نہیں آئیں اور قرآن حکیم اگر انسانوں کی خانگی زندگی کو منظم کرنے کے لئے قانون اور ضابطے مقرر کرے تو ان کے نزدیک یہ وحی سے مذاق بن جاتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ انسانی فطرت کا خالق خود خداوند قدوس ہے۔ فطرت کے جو تقاضے قدرت نے پیدا کئے ہیں ان کو کچل دینا انسانیت نہیں، بلکہ انسانیت یہ ہے کہ ان تقاضوں کو منظم کیا جائے۔ اسلام نے یہی کام کیا ہے۔ عیسائیت نے ان تقاضوں کو کچلنے کی کوشش کی ہے، اس کا نتیجہ انہیں آج دنیائے عیسائیت کے گلی کوچوں میں دندناتی ہوئی فحاشی اور بدکاری کی شکل میں دیکھ لینا چاہیے۔

جس طرح ولیم میور نے حضرت زینب کے ساتھ حضور ﷺ کی شادی کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے، ٹار انڈرائے نے بھی اس قصے کو وہی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس قصے کو زیادہ دلچسپ بنانے کیلئے حضرت زینب رضی اللہ تعالی عنہا کے حسن اور غرور کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت زینب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بڑی پاکباز تھیں لیکن، اس کے خیال میں، اس پاکبازی کا تعلق ان کی عمر کے آخری حصے سے ہوگا۔(1)

Fidenzio (فدنزیو) نے اس قصے کو اپنے قارئین کے لئے زیادہ پرکشش بنانے کے لئے تاریخ کے تمام حقائق کو پس پشت ڈال کر اور صرف اپنے تخیل پر اعتماد کر کے، افسانے کے انداز میں اس کو لکھا ہے۔ اس کا انداز یہ ہے:

"اس علاقے میں سیدروس نامی ایک شخص رہتا تھا جس کی بیوی کا نام زینب تھا۔ یہ اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھی۔ محمد (ﷺ) نے اس کے حسن و جمال کا شہرہ سنا اور ان کے دل میں اس کی محبت نے ڈیرہ لگا لیا۔ محمد (ﷺ) نے اس عورت کو دیکھنے کا ارادہ کیا اور خاوند کی عدم موجودگی میں اس کے گھر گئے۔ انہوں نے عورت سے اس کے خاوند کے متعلق پوچھا: عورت نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کیسے ہمارے گھر تشریف لائے؟ میرا خاوند تو اپنے کام پر گیا ہے۔ عورت نے اس ملاقات کی خبر اپنے خاوند سے پوشیدہ نہ رکھی۔ خاوند نے

1۔ محمد، دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 153

اس سے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ یہاں تشریف لائے تھے؟ اس نے جواب دیا: ہاں! وہ یہاں آئے تھے۔ اس نے پوچھا: کیا انہوں نے تمہارا چہرہ دیکھا تھا؟ اس نے کہا: ہاں! انہوں نے میرا چہرہ دیکھا تھا اور دیر تک اسے دیکھتے رہے تھے۔ اس پر اس عورت کے خاوند نے کہا: اس کے بعد میرا تمہارے ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے۔(1)

"ر۔ف۔ بودلے" نے بھی اس واقعے کو اسی طرح افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کردار کو بھی خصوصی طور پر مسخ کیا ہے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ایسی عورت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو اس افسانے کی کہانی سے مناسبت رکھتی ہو۔(2)

مستشرقین غیر جانبدار محقق سمجھے جاتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ تاریخ اور افسانے میں فرق ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضور ﷺ کی تاریخ کو افسانوی رنگ میں لکھنے کی سازش جان بوجھ کر کی ہے۔ اگر وہ حضور کی حیات طیبہ کے واقعات کو تاریخ نویسی کے اصولوں کے مطابق پرکھیں تو انہیں آپ کی زندگی میں کوئی چیز ایسی نہیں مل سکتی جس کے ذریعے وہ آپ کے کردار کو داغ دار کر کے لوگوں کو آپ کے دین سے متنفر کر سکیں۔ چونکہ حضور ﷺ کے متعلق کچھ لکھنے سے ان کا اصل مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ آپ کے کردار کو مشکوک کر کے دین اسلام کی بنیادیں کمزور کریں، اس لئے یہ اصل مقصد ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے اور کسی مقام پر بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ لیکن مستشرقین اس معاملہ میں سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ خواہ افسانہ لکھیں یا ڈرامہ، جس ہستی کو اللہ تعالیٰ نے ہر خامی سے پاک رکھا ہے، اس کے دامن پر دشمنوں کی طرف سے لگایا جانے والا کوئی دھبہ ٹھہر نہیں سکتا۔ کیونکہ باطل میں اتنی طاقت کبھی نہیں ہوتی کہ وہ حق کو مغلوب کر سکے۔ روشنی کی ایک کرن اندھیروں کا سینہ چیر دیتی ہے اور شب دیجور کی تاریکیاں ایک چراغ کی روشنی کو مدھم نہیں کر سکتیں۔

ہم یہاں مستشرقین سے صرف ایک سوال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں یہ بتائیں کہ انہوں

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 335

2۔ ایضاً، صفحہ 336

نے حضور ﷺ کی حضرت زینب سے محبت کا جو افسانہ تراشا ہے، کیا اس قسم کے افسانے کے مرکزی کردار سے زندگی میں کسی عظیم کارنامے کی توقع کی جاسکتی ہے؟ جو شخص ساٹھ سال کی عمر میں بھی اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں کر سکتا، صنف نازک کی کشش سے وہ رشتوں کے تقدس کو بھی بھول جاتا ہے، اپنی شہرت اور اپنے وقار کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایسے کام کرتا ہے جو خود اس کے اصولوں کے بھی خلاف ہوں اور اس کے وقار کے لئے بھی تباہ کن ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا شخص جب عنفوان شباب میں تھا تو اس وقت اس کے جذبات کنٹرول میں ہوں گے اور وہ جذبات سے آزاد ہو کر انسانیت کی خدمت میں مگن ہو گا؟ اس بات کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ ہی انسانی تجربہ۔ ساٹھ سال کی عمر جذبات کی طغیانی کی عمر نہیں۔ اس عمر میں انسان کی عقل اس کے جذبات پر غالب ہوتی ہے۔ جس شخص کی حالت ساٹھ سال کی عمر میں یہ ہو، لامحالہ وہ اپنے دور شباب میں اپنی خواہشات کے ہاتھوں ایک کھلونا بنا ہو گا، اور ایسے شخص سے کسی عظیم کام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لیکن مستشرقین جس ہستی کو اس افسانے کا مرکزی کردار بناتے ہیں، اس کے کارناموں کا انکار کرنے کی جرات کوئی دشمن بھی نہیں کر سکتا۔

یہ ہستی وہ ہے جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا تھا۔ جس نے زمانے کی نس نس میں رچی ہوئی رسموں کے بت ریزہ ریزہ کر دیئے تھے۔ جس کی تاریخ اور زندگی کے کارناموں کا مطالعہ کرنے کے لئے لاکھوں یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی زندگیاں وقف کی ہیں۔ جس کی لائی ہوئی کتاب کے یورپی زبانوں میں سینکڑوں ترجمے اس کے دشمنوں نے کئے ہیں۔ جس نے قیصر وکسریٰ کی اکڑی ہوئی گردنیں جھکا دی تھیں۔

اب ایک غیر جانبدار محقق کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو اس ہستی کے ان کارناموں کا انکار کر دے جو تاریخ کے ایک ایک صفحے پر بکھرے پڑے ہیں اور یا پھر یہ فیصلہ کرے کہ جن لوگوں نے مذکورہ افسانے کے ذریعے اس عظیم ہستی کے کردار کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے وہ پرلے درجے کے بدنیت ہیں۔ تاریخ کا انکار کرنے کی کسی میں جرأت نہیں اس لئے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ مستشرقین نے اس افسانے کے ذریعے محمد عربی ﷺ کو جس رنگ میں دکھانے کی کوشش کی ہے آپ کا دامن اس سے پاک ہے۔ آپ اسی قسم کے انسان تھے جس قسم کا انسان آپ کو وہ لوگ سمجھتے تھے جو صبح و شام آپ کے ساتھ رہتے تھے

اور آپ اس قسم کے انسان نہ تھے جس قسم کا انسان آپ کو مستشرقین قرار دیتے ہیں۔

مستشرقین کے اس افسانے کی تردید تمام متعلقہ تاریخی واقعات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حضرت زینب کو اچانک دیکھا تو آپ ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ ان کا یہ کہنا بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ حضرت زینب حضور ﷺ کے لئے اجنبی نہ تھیں بلکہ وہ آپ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں۔ آپ نے خود اصرار کر کے ان کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید سے کی تھی۔ وہ حضور ﷺ کے اپنے خاندان میں آپ کی نگاہوں کے سامنے پلی بڑھی تھیں۔ حضور ﷺ اگر ان سے شادی کرنا چاہتے تو آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کی شادی حضرت زید سے کر دی۔ ان تمام حقائق کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں کا انصاف ہے کہ حضور ﷺ کی نظر اچانک ان پر پڑی تو آپ ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ امام ابو بکر ابن عربی اس الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِنَّهٗ بَاطِلٌ لَا يَصِحُّ النَّظَرُ اِلَيْهِ فَاِنَّهٗ كَانَ مَعَهَا فِيْ كُلِّ وَقْتٍ وَّ مَوْضِعٍ وَلَمْ يَكُنْ هُنَاكَ حِجَابٌ يَمْنَعُهَا مِنْهُ فَكَيْفَ تَنْشَأُ مَعَهٗ وَيَنْشَأُ مَعَهَا وَيَنْظُرُهَا فِيْ كُلِّ سَاعَةٍ وَلَا تَقَعُ فِيْ قَلْبِهٖ اِلَّا اِذَا كَانَ لَهَا زَوْجٌ وَقَدْ وَهَبَتْهُ نَفْسَهَا وَكَرِهَتْ غَيْرَهٗ فَلَمْ يَخْطُرْ ذَالِكَ بِبَالِهٖ فَكَيْفَ يَتَجَدَّدُ الْهَوٰى بَعْدَ الْعَدَمِ حَاشَا لِذَالِكَ الْقَلْبِ الْمُطَهَّرِ مِنْ هٰذِهِ الْعَلَاقَةِ الْفَاسِدَةِ (1)

"یہ قصہ باطل ہے۔ اس کی طرف دیکھنا بھی صحیح نہیں ہے۔ حضرت زینب ہر وقت اور ہر جگہ آپ کے ساتھ رہیں۔ ان کے درمیان حجاب نہ تھا کہ حضور ﷺ ان کو دیکھ نہ سکتے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں نے ایک ساتھ پرورش پائی ہو، حضور ﷺ ہمیشہ انہیں دیکھتے رہے ہوں لیکن ان کی محبت حضور ﷺ کے دل میں پیدا نہ ہوئی ہو اور جب ان کی شادی ہو چکی ہو اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ رہ رہی ہوں تو اچانک حضور

1۔ زوجات النبی الطاہرات، صفحہ 64

علیہ السلام کے دل میں ان کی محبت پیدا ہو گئی ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ
انہوں نے اپنی جان حضور کو ھبہ کی تھی اور کسی دوسرے کو پسند نہ کیا تھا
لیکن ان تمام باتوں کی حضور علیہ السلام نے پروا نہیں کی تھی۔ تو وہ محبت جو اتنا
عرصہ حضور علیہ السلام کے دل میں پیدا نہ ہوئی تھی وہ اچانک کیسے پیدا ہو گئی۔
یقیناً حضور علیہ السلام کا قلب اطہر اس قسم کی چیزوں سے قطعاً پاک ہے۔"

حضور علیہ السلام کو عظمتیں عطا فرمانے والا خود رب کریم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین آپ کے مقام کو گھٹانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں ان پر ان کو سوائے حسرت کے کچھ نہیں ملتا۔ مستشرقین نے حضور علیہ السلام کی کردار کشی کے لئے حضرت زینب کی محبت میں گرفتار ہونے کا جو افسانہ تراشا تھا اس سے بھی وہ مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کر سکے بلکہ خود ان کی صفوں میں سے متعدد لوگ سامنے آئے جنہوں نے اس افسانے کی تردید کر دی۔ وہ مغربی اہل علم جنہوں نے مستشرقین کے اس افسانے کو تاریخی حقائق کی روشنی میں پرکھا ہے انہوں نے اس کو بے بنیاد اور ناقابل تسلیم قرار دیا ہے۔ منٹگمری واٹ ان لوگوں میں سے ہے جو حضور علیہ السلام پر اعتراض کرنے کے مواقع تلاش کرتے ہیں۔ لیکن یہ افسانہ اس کو بھی ناقابل تسلیم نظر آیا ہے اور اس نے اس افسانے کے متعلق ایسے تاثرات کا اظہار کیا ہے جو حضور علیہ السلام کو اس قبیح الزام سے بری ثابت کرتے ہیں۔ منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

"Despite the stories, then, it is unlikely that he was swept off his feet by the physical attractiveness of Zaynab. The other wives are said to have feared her beauty; but her age when she married Muhammad was thirty-five, or perhaps rather thirty-eight, which is fairly advanced for an Arab woman." (1)

"ہر قسم کی کہانیوں کے باوجود یہ بات ناممکن ہے کہ زینب کی جسمانی کشش کی وجہ سے محمد (علیہ السلام) کے قدم ڈگمگا گئے ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ محمد (علیہ السلام) کی دوسری بیویاں زینب کے حسن سے خائف تھیں لیکن محمد (علیہ السلام) کے ساتھ شادی کے وقت ان کی عمر پینتیس بلکہ اڑتیس سال تھی۔ ایک عرب عورت

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 331

کے لئے یہ عمر بڑی عمر شمار ہوتی ہے۔

منٹگمری واٹ ایک اور مقام پر اس افسانے کے متعلق یہ تبصرہ کرتا ہے:

"It is most unlikely that at the age of fifty-six such a man as he should have been carried away by a passion for a woman of thirty-five or more". (1)

"یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ محمد (ﷺ) جیسا ایک چھپن سالہ شخص ایک ایسی عورت کے متعلق جذبات کی رو میں بہ گیا ہو جس کی عمر پینتیس سال یا اس سے بھی زیادہ تھی۔"

منٹگمری واٹ حضرت زینب کے ساتھ حضور ﷺ کی شادی کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"The criticism of Muhammad, then was based on a pre-Islamic idea that was rejected by Islam, and one aim of Muhammad in contracting the marriage was to break the hold of the old idea over men's conduct. How important was this aim compared with others which he might have had?" (2)

"زینب بنت جحش سے محمد (ﷺ) کی شادی کے وقت، ان پر جو تنقید ہوئی تھی اس کی وجہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی جس کو اسلام نے ختم کر دیا تھا۔ اس شادی سے محمد (ﷺ) کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کے رویے پر اس پرانی رسم کا جو غلبہ تھا، اس کو ختم کیا جائے۔ اس شادی کا یہ مقصد اس کے دیگر ممکنہ مقاصد کے مقابلے میں کتنا اہم تھا؟"

سطور بالا میں جو حقائق پیش کئے گئے ہیں، ان کے پیش نظر یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح حضور ﷺ کی دیگر تمام شادیاں خواہشات کی تسکین کے لئے نہیں ہوئی تھیں بلکہ عظیم سیاسی، سماجی اور علمی مقاصد کی خاطر تھیں، اسی طرح حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ آپ کا نکاح بھی انہی عظیم مقاصد کی خاطر ہوا تھا۔

1۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 158

2۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 330

اور یہ نکاح حضور ﷺ کے کردار کو داغدار نہیں کرتا بلکہ یہ نکاح بھی آپ کی عظمت کی بے شمار دلیلوں میں سے ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں حضور ﷺ کی تمام ازواج مطہرات کا مختصر تذکرہ کیا ہے اور ان کے ساتھ حضور ﷺ کے نکاح کرنے میں جو حکمتیں پوشیدہ تھیں ان کو بھی بیان کر دیا ہے۔ ہر انسان جو تعصب کی عینک اتار کر حضور ﷺ کی مختلف شادیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے اسے ان شادیوں میں یہ حکمتیں عیاں نظر آجاتی ہیں۔ خود کئی مستشرقین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے زیادہ شادیاں خواہشات کی تسکین کی خاطر نہیں کی تھیں بلکہ ان شادیوں کے مقاصد سیاسی اور سماجی تھے۔ منٹگمری واٹ نے حضور ﷺ کی ہر شادی میں اس قسم کی حکمتوں کو عیاں دیکھا ہے اور اپنے مستشرق بھائیوں کے برعکس اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ تعدد زوجات کے سبب حضور ﷺ پر کسی قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ وہ لکھتا ہے:

"The last feature to be noted about Muhammad's marriages is that he used both his own and those of the closest companions to further political ends. This was doubtless a continuation of older Arabian Practice. All Muhammad's own marriages can be seen to have a tendency to promote friendly relations in the political sphere. Khadijah brought him wealth, and the beginning of influence in Meccan politics. In the case of Sawdah, whom he married at Mecca, the Chief aim may have been to provide for the widow of a faithful Muslim, as also in the later marraige with Zaynab bint Khuzaymah; but Sawdah's husband was the brother of a man whom Muhammad perhpas wanted to keep from becoming an extreme opponent; and Zaynab's husband belonged to the clan of al-Muttalib, for which Muhammad had a special responsibility, while he was also cultivating good relations with her own tribe of

Amir bin Sasaah. His first wives at Medina, Aishah and Hafsah, were the daughters of the men on whom he leaned most, Abu Bakr and Umar ‹and Umar also married Muhammad's grand-daugther, umm Kulthum bint Ali. Umm Salamah was not merely a deserving widow, but a close relative of the leading man of the Meccan clan of Makhzum. Juwayriyah was the daughter of the Chief of the tribe of al-Mustaliq, with whom Muhammad had been having special trouble. Zaynab bint Jahsh, besides being Muhammad's cousin, was a confederate of the Meccan clan of Abd Shams, but a social motive may have outweighed the political one in her case -to demonstrate that Muhammad had broken with old taboos. Nevertheless the clan of 'Abd Shams' and Abu Sufyan b. Harb in particular, were in his thoughts, for Abu Sufyan had a Muslim daughter, umm Habibah, married to a brother of Zaynab bint Jahsh; and when the husband died in Abyssinia, Muhammad sent a messenger there to arrange a marriage with her. The marriage with Maymunah would similarly help to cement relations with her brother-in-law, Muhammad's uncle, al-Abbas. There may also have been political motives in the unions with the Jewesses, Safiyah and Rayhanah." (1)

"محمد (ﷺ) کی شادیوں کے بارے میں جس آخری بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی اور اپنے قریبی ساتھیوں کی شادیوں کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی رسم تھی جو عربوں میں پہلے سے جاری تھی۔ محمد (ﷺ) کی اپنی تمام شادیوں میں سیاسی تعلقات میں اضافے کا مقصد کارفرما نظر آتا ہے، خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے ساتھ

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 287-88

شادی سے آپ کو دولت ملی اور مکی سیاست میں آپ کے اثر کا آغاز بھی اسی شادی سے ہوا۔ سودہ اور زینب بنت خزیمہ سے شادی کا سب سے بڑا مقصد مخلص مسلمانوں کی بیواؤں کو باوقار پناہ مہیا کرنا تھا لیکن سودہ کے خاوند کا بھائی ایک ایسا شخص تھا، جس کے متعلق محمد (ﷺ) یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ کھل کر آپ کے مدمقابل آجائے۔ اور زینب کے خاوند کا تعلق قبیلہ بنو مطلب سے تھا، جن کے متعلق محمد (ﷺ) کی خصوصی ذمہ داریاں تھیں، اس کے ساتھ ساتھ محمد (ﷺ) زینب کے اپنے قبیلے "عامر بن صعصعہ" کے ساتھ بھی اچھے تعلقات بنا رہے تھے۔ مدینہ میں آپ کی پہلی دو بیویاں، عائشہ اور حفصہ، ابو بکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کی صاحبزادیاں تھیں جن کے ساتھ محمد (ﷺ) کا خصوصی تعلق تھا۔ ام سلمہ، صرف ایک مستحق بیوہ ہی نہ تھیں بلکہ وہ مکی قبیلہ بنو مخزوم کے سردار کی رشتہ دار بھی تھیں۔ جویریہ قبیلہ بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں، جن کے ساتھ محمد (ﷺ) کے تعلقات خصوصی طور پر بہت خراب تھے۔ زینب بنت جحش محمد (ﷺ) کی پھوپھی زاد ہونے کے علاوہ قبیلہ بنو عبد شمس کے حلیف قبیلے کی فرد بھی تھیں، لیکن ان کے معاملے میں سماجی محرکات، سیاسی محرکات پر فوقیت لے گئے، کیونکہ اس شادی کے ذریعے محمد (ﷺ) یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ آپ نے پرانی رسموں سے رشتہ توڑ لیا ہے۔ مکی قبیلہ عبد شمس اور ابوسفیان بن حرب خصوصی طور پر محمد (ﷺ) کی نظر میں تھے۔ ابوسفیان کی ایک بیٹی ام حبیبہ تھی جو مسلمان تھی اور اس کی شادی زینب بنت جحش کے ایک بھائی سے ہوئی تھی۔ ان کا خاوند جب حبشہ میں فوت ہو گیا تو محمد (ﷺ) نے ایک قاصد حبشہ اس لئے بھیجا کہ ام حبیبہ سے آپ کی شادی کے انتظامات کو آخری شکل دی جائے۔ میمونہ سے شادی بھی حضرت عباس سے آپ کے تعلقات کو مضبوط کرنے میں مدد دے سکتی تھی جو میمونہ کے برادر نسبتی اور محمد (ﷺ) کے چچا تھے۔ یہودی الاصل عورتوں صفیہ اور ریحانہ سے آپ کے تعلق کے مقاصد بھی سیاسی ہو سکتے ہیں۔"

منٹگمری واٹ نے ہر شادی کے متعلق تسلیم کیا ہے کہ ان شادیوں کے مقاصد سماجی اور

سیاسی تھے۔ ساٹھ سال کی عمر کے جس شخص کے پیش نظر اتنے سیاسی اور سماجی مقاصد ہوں، اس کو ان باتوں کے بارے میں سوچنے کا موقعہ ہی کیسے مل سکتا ہے جن باتوں کو مستشرقین حضور ﷺ کی شادیوں کے مقاصد قرار دیتے ہیں۔

مشہور مستشرق جان بیگٹ گلب (John Bagot Glubb) نے اپنی کتاب دی لائف ٹائمز آف محمد (ﷺ) (The life times of Muhammad) میں حضور ﷺ کی شادیوں کو تمام پہلوؤں سے دیکھ کر ان کے متعلق بڑے حقیقت پسندانہ تبصرہ کئے ہیں۔ اس کی تحریروں کے چند اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"The question of the marriages of the Messenger of God has aroused intense discussion and heated resentments into which we need not enter. It is, however, worthy of note that of all his wives, only Aisha was a virgin when he married her. Zainab bint Jahash was a divorced wife and all the rest were widows, some of them, it would seem, not particularly attractive. Moreover, the apostle had married Khadija when he was twenty-five and she was a widow considerably older than he was. He had remained completely faithful to her for twenty-four years until her death". (1)

"پیغمبر (ﷺ) کی شادیوں کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہم اس بحث میں پڑنا پسند نہیں کرتے۔ تاہم، یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ آپ کے ساتھ شادی کے وقت آپ کی بیویوں میں سے صرف عائشہ کنواری تھیں، زینب بنت جحش مطلقہ تھیں اور باقی تمام بیوہ تھیں۔ ان میں سے کچھ زیادہ پرکشش بھی نہ تھیں۔ مزید براں، پیغمبر ﷺ نے خدیجہ سے پچیس سال کی عمر میں شادی کی تھی، جو اس وقت بیوہ تھیں اور عمر میں آپ سے کافی بڑی تھیں۔ پیغمبر (ﷺ) ان کی وفات تک چوبیس سال کا عرصہ، ان کے ساتھ مکمل طور پر وفادار رہے۔"

1۔ جان بیگٹ گلب، "دی لائف ٹائمز آف محمد"، (ہاڈر اینڈ سٹاٹن، لندن۔ 1970ء)، صفحہ 237

مستشرق مذکور ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"It is noticeable that the apostle, when a young man, had six children by Khadija, yet he had no children by the twelve women who followed her, except for a son by Mary, the Egyptian concubine. Most of his wives, though not in their first youth, were capable of bearing children. In Medina, Muhammad had less and less leisure time and must often have been mentally and physically exhausted, especially as he was in his fifties and laterly over sixty. These are not the circumstances under which men are interested in the indulgence of extreme sexuality". (1)

"یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ پیغمبر (ﷺ) جب نوجوان تھے تو خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کے بطن سے ان کے چھ بچے تھے، لیکن ان کے بعد ماریہ قبطیہ سے ایک بیٹے کے علاوہ بارہ عورتوں سے ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ آپ کی اکثر زوجات گو بالکل نوجوان تو نہ تھیں البتہ وہ بچوں کو جنم دینے کے قابل تھیں۔ مدینہ میں محمد (ﷺ) کو فرصت کا وقت بہت کم ملتا تھا اور اکثر اوقات آپ ذہنی اور جسمانی طور پر بہت زیادہ تھکے ہوئے ہوتے ہوں گے خصوصاً جب کہ آپ کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ حالات ایسے نہیں جن میں مرد زیادہ جنسی تعلقات کی طرف رغبت محسوس کرتے ہوں۔"

حضور ﷺ کی ایک حدیث پاک پر، جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ اس دنیا میں مجھے عورت اور خوشبو پسند ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، تبصرہ کرتے ہوئے جان بیگٹ گلب رقمطراز ہے:

"The connection of his love of women with prayer seems to prove that it never occurred to him that his fondness for female company could be anything but innocent". (2)

1۔ جان بیگٹ گلب، "دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد"، (ہاڈر اینڈ سٹاگٹن، لندن۔ 1970ء)، صفحہ 239

2۔ ایضاً، صفحہ 238

"آپ کا عورتوں کی محبت کو عبادت کے ساتھ جمع کرنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ کا عورتوں کی معیت کا شوق بالکل معصوم تھا۔"

مذکورہ بالا گفتگو سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ کی ساری شادیاں عظیم انسانی مقاصد کی خاطر عمل میں آئی تھیں اور ان شادیوں سے مستشرقین نے جو نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے وہ بدنیتی پر مبنی ہے۔

عورت جس آدمی کی کمزوری بن جائے وہ اپنے گھر میں وہ ماحول قائم نہیں کر سکتا جو حضور ﷺ نے اپنے کاشانہ اقدس میں قائم کر رکھا تھا۔ آپ کے گھر میں بیک وقت نو ازواج مطہرات تھیں لیکن ان کے درمیان سوائے چند معمولی شکر رنجیوں کے کبھی کوئی معرکہ آرائی نہیں ہوئی۔ یہ حضور ﷺ کی عظمت کا ثبوت ہے کہ آپ نے اپنی تمام زوجات کے حقوق کو بھی پورا کیا اور ساتھ ہی اپنے مشن کو بھی پورا کیا جو آپ کو اپنے رب کی طرف سے تفویض ہوا تھا۔ عورتوں کی رغبت ایک لمحے کے لئے بھی آپ کو اپنے مشن سے غافل نہ رکھ سکی۔ عورتوں پر مر مٹنے والے مرد تو ان کی ہر جائز و ناجائز فرمائش کو پورا کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں لیکن حضور ﷺ نے اپنے گھر کے لئے فقر کو پسند فرمایا اور آپ کی تمام ازواج مطہرات کو فقر کی اسی زندگی پر قانع رہنا پڑا۔ اور جب انہوں نے اپنی اس حالت میں تبدیلی کا ایک جائز مطالبہ کیا تو انہیں باذن خداوندی دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا گیا کہ دنیا کی محبت اور خدا کے رسول کی محبت اکٹھی نہیں رہ سکتیں، تمہیں اختیار ہے ان میں سے جسے چاہو اختیار کر لو۔ اگر فقر کی زندگی پسند ہے تو خدا کا رسول تمہارا ہے اور اگر دولت دنیا سے تمہاری آنکھ ٹھنڈی ہوتی ہے تو تمہارا رسول کے ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے۔ یہ دو ٹوک رویہ وہی شخص اپنا سکتا ہے جو اپنے جذبات پر مکمل قابو رکھتا ہو۔ عورت جس شخص کی کمزوری ہو وہ اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔

زوجات رسول کے مسئلے کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لینے والا شخص اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ آپ کی شادیاں بھی آپ کی شان رحمۃ للعالمینی کا ایک مظہر تھیں۔ لیکن دل کے مریضوں کو ان شادیوں میں کئی تاریک پہلو نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تاریکیاں ان کے اپنے دلوں کی سیاہی کا عکس ہیں اور خدا کا حبیب ﷺ ہر اس چیز سے پاک ہے جو اس کی خداداد عظمتوں اور رفعتوں کے منافی ہو۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

پر تشدد پسندی کا الزام

حضور ﷺ پر تشدد پسندی کا الزام

قرآن حکیم نے حضور ﷺ کو رحمت عالم قرار دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (1)

"اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر سراپا رحمت بنا کر سارے جہانوں کے لئے۔"

حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا ایک ایک ورق اس ارشاد خداوندی کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ نے دشمنوں کی طرف سے طعن و تشنیع کے تیر سہے اور گالیاں دینے والوں کو دعائیں دیں۔ جو لوگ آپ کی زندگی کا چراغ گل کرنے اور آپ کے دین کی شمع کو بجھانے کے درپے تھے، آپ کے رؤف ورحیم سینے میں ہمیشہ، ان لوگوں کو دوزخ کے عذاب الیم سے بچانے کی تمنائیں انگڑائیاں لیتی رہیں۔ جن لوگوں نے آپ پر اور آپ کے خادموں پر مظالم کی انتہا کر دی تھی، آپ نے ان کو معاف کرنے کی ایسی مثالیں قائم کیں، جن کی نظیر تاریخ انسانی میں تلاش کرنے کی کوشش کرنا عبث ہے۔ فتح مکہ کے دن آپ نے عفوو درگزر کی جو مثال قائم کی تھی، اس کے ہوتے ہوئے حضور ﷺ پر تشدد پسندی اور سنگدلی کا الزام لگانا پرلے درجے کی سنگدلی ہے۔ اس موقعہ پر حضور ﷺ نے، بیک جنبش لب، ان لوگوں کو معاف کرنے کا اعلان کیا تھا جنہوں نے گزشتہ اکیس سال کے عرصہ میں آپ پر اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ عفوو درگزر کے یہ حیران کن مظاہرے صرف وہی ہستی کر سکتی ہے جس کو بارگاہ صمدیت سے رحمت عالم ہونے کا اعزاز ملا ہو۔

حضور ﷺ کی دعوت کے بسرعت پھیلنے کا راز بھی اسی رحمۃ للعالمینی میں پنہاں تھا اور جو لوگ آپ پر پروانہ وار نثار ہونے کے لئے بے تاب تھے وہ بھی رحمۃ للعالمینی کی ان

1۔ سورۃ الانبیاء: 107

اداؤں ہی کا شکار ہوئے تھے۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم نے بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان فرمایا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (1)

"پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ہیں ان کے لئے اور اگر ہوتے آپ تند مزاج، سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے۔ تو آپ درگزر فرمائیے ان سے اور بخشش طلب کیجئے ان کے لئے اور صلاح مشورہ کیجئے ان سے اس کام میں۔ اور جب آپ ارادہ کرلیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر، بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔"

یہ آیت کریمہ بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی رحمت سے حضور ﷺ کو قلب شفیق عطا فرمایا ہے۔ یہ آیت کریمہ اس حقیقت کو بھی بیان کر رہی ہے کہ اگر حضور ﷺ درشت خو ہوتے تو لوگ پروانہ وار آپ کے گرد جمع نہ ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی یہ آیت کریمہ حضور ﷺ کو اپنی شان رحمۃ للعالمینی کے اظہار کا بھی حکم دے رہی ہے۔

حق یہ ہے کہ بنی نوع انسان کے ساتھ حضور ﷺ کے سلوک کی نوعیت وہی تھی، جس قسم کا سلوک کرنے کی آپ کو اس آیت کریمہ میں تاکید کی جا رہی ہے۔ ان واضح خوبیوں کے باوجود جو لوگ اسلام یا پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات میں کسی قسم کی کوئی خوبی دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی، حضور ﷺ کے دامن رحمۃ للعالمینی پر تشدد، سنگدلی اور قساوت قلبی کے دھبے دیکھنا چاہتے ہیں۔

مستشرقین کا مقصد اولین اسلام کی اشاعت کو روکنا اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کے دین کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنا ہے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اسلام کو ہر قسم کی خوبیوں سے عاری ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس

1۔ سورۃ آل عمران 159

کام کے لئے انہیں تاریخ کے مسلمہ حقائق کا انکار کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اپنے مقصد کی خاطر ایسا کرنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ انسان حیران ہوتا ہے کہ کوئی انسان علم کے نام پر تاریخ کے حقائق کو جھٹلانے کی جرات کیسے کر سکتا ہے، لیکن جن لوگوں نے مخصوص مقاصد کے تحت اپنی الہامی کتابوں کے واضح احکامات اور روشن تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا تھا، ان سے بعید نہیں کہ وہ انہی مقاصد کی خاطر تاریخ کے واضح بیانات کو جھٹلادیں۔

مستشرقین کو معلوم ہے کہ اسلام کی قوت کا راز اس کی رحیمانہ تعلیمات اور اس کے رسول ﷺ کے مشفقانہ کردار میں مضمر ہے، لیکن وہ اس حقیقت کا انکار کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس حقیقت کے انکار کے بغیر وہ اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو لوگ پیغمبر اسلام ﷺ کے گرد جمع تھے، انہیں آپ کی رحیمانہ اداؤں نے آپ کی طرف کھینچا تھا، اگر دنیا اس حقیقت کو پالے کہ اسلام دین رحمت ہے، اس کا پیغمبر رحمۃ للعالمین ہے اور اسلام جس ہستی کے حضور سجدہ ریز ہونے کی تعلیم دیتا ہے وہ "الرحمٰن" اور "الرحیم" ہے، تو پھر ظلم و عدوان کی چکی میں پستی ہوئی نسل انسانی کو، دنیا کی کوئی طاقت، اسلام کے دامن میں پناہ لینے سے نہیں روک سکتی۔

تاریخ میں جن بدبختوں نے نسل انسانی کو صراط مستقیم سے روکنے کے لئے اپنی زندگیاں برباد کی ہیں انہوں نے ہمیشہ حق کے رخ زیبا کو شکوک و شبہات سے گرد آلود کرنے کی کوشش کی ہے۔ مستشرقین میں سے اکثریت کی زندگیاں بھی اسی قسم کی مکروہ کوششوں میں صرف ہوتی ہیں۔ مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لئے حضور ﷺ پر تشدد پسندی کا الزام لگایا ہے۔ یہ الزام لگاتے وقت مستشرقین حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے ان تیرہ سالوں کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں جو آپ نے اور آپ کے پیروکاروں نے دشمنان اسلام کی طرف سے ظلم سہتے اور ان پر صبر کرتے ہوئے گزارے تھے۔ حضور ﷺ پر یہ بے بنیاد الزام لگاتے وقت مستشرقین مکہ کے مشرکوں اور مدینہ کے یہودیوں کی ان کارستانیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو انہوں نے اسلام کو ختم کرنے اور مسلمانوں پر عرصہ حیات کو تنگ کرنے کے لئے مسلسل کئی سال جاری رکھی تھیں۔

یہ الزام لگاتے وقت مستشرقین عفو و درگزر کے ان بے نظیر واقعات کو بھی فراموش

کر دیتے ہیں جو حضور ﷺ کی شان رحمۃ للعالمینی کے طفیل وقوع پذیر ہوئے اور جو ساری تاریخ انسانی کے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔ یہ الزام لگاتے وقت مستشرقین صرف مسلمانوں کی ان کاروائیوں کو دیکھتے ہیں جو انہوں نے اسلام کے دشمنوں سے اپنے محبوب دین کے دفاع کے لئے کی تھیں۔

مسلمانوں کو اذن جہاد ملنے کا پس منظر

تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ حضور ﷺ نے جب چالیس سال کی عمر میں نعرہ توحید بلند کیا تھا، اس سے پہلے مکہ کا ہر شخص آپ کی امانت، صداقت اور خوش خلقی کی شہادت دیتا تھا۔ جب آپ نے بتوں کے ان اجڈ پجاریوں کو بتوں کی پوجا چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی تو چند سعید روحوں کو چھوڑ کر سارا مکہ آپ کا دشمن بن گیا۔ انہوں نے آپ کا بھی مذاق اڑایا، آپ کے پیروکاروں کا بھی اور آپ کے دین کا بھی، لیکن ان کے اس رویہ کے جواب میں آپ نے ان سے نفرت نہیں کی بلکہ اپنے دل کی گہرائیوں سے ان کا بھلا چاہا۔ انہیں گمراہیوں کی دلدل سے نکالنے کی مخلصانہ کوششیں کیں۔ وہ آپ کو ستاتے تھے لیکن آپ کو غم اپنے ستائے جانے کا نہ تھا بلکہ جو ستانے والے تھے، آپ ان لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے بچانے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے آپ کے خادموں کو اذیتیں دینے کے لئے نت نئے طریقے ایجاد کئے لیکن آپ نے ہر موقعہ پر اپنے خادموں کو صبر کی تلقین کی۔ حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما جیسے لوگ اپنے دینی بھائیوں کو مظالم سہتے دیکھتے اور حضور ﷺ سے کفار کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت مانگتے لیکن آپ انہیں یہ کہہ کر خاموش کرا دیتے کہ مجھے جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ہم قوم کافروں کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کی تو قریش مکہ اپنے شکار کے بچ کر نکل جانے پر پریشان ہوئے اور انہیں مکہ واپس لانے کیلئے حبشہ پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو کفار مکہ نے ان کو ہجرت سے روکنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کی۔ حضور ﷺ اپنے صدیق کے ہمراہ عازم مدینہ ہوئے تو کفار مکہ نے آپ کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لانے والے کے لئے گراں قدر انعام مقرر کیا اور جب مسلمان مدینہ میں آباد ہو گئے تو کفار مکہ نے

کبھی خود مسلمانوں کو دھمکی آمیز خط لکھے کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ اب ہماری رسائی سے دور ہو گئے ہو، ہم مدینہ پہنچ کر بھی تمہارا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہودیوں کو اور کبھی منافقوں کو دھمکی آمیز خط لکھے کہ تم مسلمانوں کو ختم کر دو ورنہ ہم تمہیں قتل کر کے تمہاری عورتوں اور بچوں پر قبضہ کر لیں گے۔

اگر مسلمان مشرکین مکہ کی ان تمام زیادتیوں پر خاموش رہتے اور دین کے دشمنوں کو دین کے شجرہ طیبہ کی جڑیں کاٹنے کی کھلی چھٹی دے دیتے تو مستشرقین کو اسلام اور مسلمانوں پر کوئی اعتراض نہ ہوتا کیونکہ اس صورت میں دین کا وہی انجام ہوتا جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ جب کفار مکہ کی سرمستیاں تمام حدوں سے تجاوز کر گئیں تو مکافات عمل کا قانون حرکت میں آیا اور پروردگار عالم نے مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے اور ان کے غرور کو خاک میں ملانے کی اجازت دے دی۔ ارشاد خداوندی ہوا:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (1)

"اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہے۔ وہ (مظلوم) جن کو نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے ناحق صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بچاؤ نہ کرتا لوگوں کا انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر تو (طاقت ور کی غارت گری سے) منہدم ہو جاتیں خانقاہیں اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد

1۔ سورۃ الحج: 39-40

کرے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) سب پر غالب ہے۔"

اس آیت کریمہ میں صرف مسلمانوں کو کفار کے خلاف جہاد بالسیف کی اجازت ہی نہیں دی گئی بلکہ پروردگار عالم نے جہاد اسلامی کے سارے فلسفے کو ان چند سطروں میں سمو دیا ہے۔ آیت کریمہ کہہ رہی ہے کہ وہ مظلوم جن کے خلاف دشمنوں نے ایک عرصہ سے یک طرف جنگ شروع کر رکھی ہے اور انہیں جواب میں تلوار اٹھانے کی اب تک اجازت نہ تھی، اب ان کے صبر کا امتحان ختم ہو گیا ہے۔ اب ان کو بھی اجازت دی جا رہی ہے کہ وہ دشمن کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ مسلمانوں کو یہ اجازت اس لئے دی جا رہی ہے کہ ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے، انہیں ستایا گیا، اذیتیں دی گئیں اور آخر کار انہیں مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنے وطن عزیز سے ہجرت کر جائیں۔ جس جرم کی ان کو اتنی کڑی سزا ملی وہ صرف یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا پروردگار یقین کرتے تھے۔ یہ آیت کریمہ جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت کو بھی بیان کر رہی ہے کہ جو لوگ خدا کی زمین پر خدا کا نام لینے والوں کو برداشت نہیں کرتے، اگر اللہ تعالیٰ انہیں اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو جاری رکھنے کی کھلی چھٹی دے دیتا تو وہ روئے زمین پر کسی ایسے گھر کو باقی نہ رہنے دیتے جو خدا کے ذکر کے لئے قائم ہوا تھا۔

مسلمانوں کو اپنا دین اتنا محبوب تھا کہ اس کی خاطر انہوں نے اپنا گھربار، اپنے رشتہ دار، اپنا مال و دولت اور اپنا وطن، سب چیزیں قربان کر دی تھیں۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ اس دین متین کی خاطر انہیں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے کی اجازت ملے تو وہ وفا کی تاریخ میں ایک ایسے زریں باب کا اضافہ کریں، جس کی مثال تاریخ انسانی میں نایاب ہے۔ جب انہیں اپنے دین کی حفاظت کے لئے تلوار اٹھانے کی اجازت مل گئی تو انہوں نے ہر قیمت پر اپنے پیارے دین کا دفاع کرنے کا تہیہ کر لیا۔

جس دشمن نے انہیں خدا کو اپنا رب ماننے کے جرم میں مکہ جیسے مقدس شہر سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا، وہ انہیں دیس نکالا دے کر مطمئن نہ ہو گیا تھا بلکہ وہ انہیں نیست و نابود کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ وہ عرب قبائل کے مذہبی جذبات کو ابھار کر انہیں اس نئے دین کے خلاف متحد کر رہا تھا۔ عرب قبائل تولیت کعبہ کی وجہ سے قبیلہ قریش کا احترام کرتے تھے اور قریش مکہ اپنی اس خداداد سماجی حیثیت کو رب کعبہ کے دین کا نام و نشان

مٹانے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ کے ماحول کو پرامن رکھنے کے لئے مدینہ میں آباد تمام قبائل سے امن اور دفاع کے معاہدے کئے تھے۔ قریش مکہ، مدینہ طیبہ کی اس پرامن فضا کو مکدر کرنے کے لئے مصروف تگ و دو تھے۔ مسلمانوں کو قریش مکہ سے بھی خطرہ تھا۔ جزیرہ عرب کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے قبائل بھی کسی وقت قریش کی شہ پر مسلمانوں کے لئے خطرہ بن سکتے تھے۔ مدینہ کے غیر مسلم عناصر، جن کو حضور ﷺ نے مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کے اجزا قرار دیا تھا، ان سے بھی یہ خطرہ تھا کہ وہ قریش مکہ کی دھمکیوں میں آ کر یا ان کی ترغیب پر مسلمانوں کے خلاف کہیں اٹھ نہ کھڑے ہوں۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی بقا اور اپنے پیارے دین کے دفاع کے لئے ہمہ وقت چوکنے رہیں۔

معرکہ حق و باطل

مسلمانوں کا پہلا واسطہ نفسیاتی جنگ کے ساتھ تھا۔ کفار مکہ نے انہیں کمزور سمجھ کر مکہ سے نکال دیا تھا۔ وہ انہیں تر نوالہ سمجھتے تھے اور سوچتے تھے کہ وہ جب چاہیں گے مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ مسلمانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ کفار مکہ کی اس غلط فہمی کو دور کریں۔ عرب قبائل قریش مکہ کو ایک بہت بڑی طاقت سمجھتے تھے اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کو پرکاہ کی بھی وقعت نہ دیتے تھے، اس لئے وہ آسانی سے اپنا وزن قریش کے پلڑے میں ڈال سکتے تھے۔ عرب قبائل کے دلوں سے قریش کا رعب نکالنا ضروری تھا تاکہ وہ قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف کاروائی کرنے سے باز رہیں۔ مدینہ طیبہ میں موجود غیر مسلم عناصر بھی قریش مکہ کو بہت طاقتور سمجھتے تھے، وہ بھی کسی وقت قریش کے اشارے پر مسلمانوں کے خلاف کاروائی کر سکتے تھے۔ مدینہ طیبہ کے ان عناصر کے دلوں سے بھی قریش مکہ کا رعب نکالنا ضروری تھا تاکہ وہ ان کی شہ پر مسلمانوں کی مخالفت سے باز رہیں۔ قریش مکہ اب تک یہی سمجھتے رہے تھے کہ مسلمانوں کی مسلسل مخالفت سے خود انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اس لئے وہ بے دھڑک مسلمانوں کے خلاف جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے حضور ﷺ نے اذن جہاد ملتے ہی ایسے اقدامات شروع کر دیئے جن سے دشمنان اسلام پر یہ

حقیقت واضح ہو سکے کہ مسلمان تر نوالہ نہیں بلکہ ایک طاقت ہیں اور جو ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے گا وہ اس کی آنکھ نکال دیں گے۔ آپ نے سب سے پہلے میثاق مدینہ کے ذریعے مدینہ طیبہ کے تمام عناصر کو پر امن بقائے باہمی کے راستے پر گامزن کیا اور پھر سیاست خارجہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

کفار مکہ نے تیرہ سال تک مسلمانوں پر مظالم توڑے تھے اور آخر کار انہیں سب کچھ چھوڑ کر ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ مسلمانوں پر کفار مکہ کے ان بے پناہ مظالم کے باوجود ان کے تجارتی کارواں مدینہ کے راستے شام جاتے اور واپس آتے تھے۔ کافروں نے مسلمانوں کے اموال اور جائدادوں پر غاصبانہ قبضہ بھی کر رکھا تھا اور وہ ان تجارتی قافلوں کے کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں بھی استعمال کر سکتے تھے۔ وہ کسی بھی وقت چھپ کر مدینہ طیبہ پر حملہ آور بھی ہو سکتے تھے اور کسی حلیف قبیلے کے ذریعے بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ وہ تجارتی سفروں کے دوران شام کے راستے پر آباد قبائل سے مسلمانوں کے خلاف جنگی معاہدے بھی کر سکتے تھے اور ان کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف جاسوسی بھی کرا سکتے تھے۔

ان تمام حالات میں مسلمان اگر زندہ رہنا چاہتے تھے اور اپنے پیارے دین کی شمع کو فروزاں دیکھنا چاہتے تھے تو ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس قسم کے تمام ممکنہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاری کرتے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ مدینہ طیبہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے اور اس وقت کا انتظار کرتے جب کفار مکہ پورے طور پر مسلح ہو کر اور عرب قبائل کو متحد کر کے مدینہ طیبہ پر چڑھائی کرتے اور ان کی امیدوں کے اس گلشن کو برباد کر کے رکھ دیتے۔

حضور ﷺ نے اس تمام صورت حال کا جائزہ لیا اور آپ نے دین اسلام اور مدینہ طیبہ کی نوزائیدہ ریاست کے دفاع کے لئے ایک منظم پروگرام بنایا۔ آپ نے اطراف وجوانب میں مختلف مہمیں روانہ کیں۔ کئی مہموں کی قیادت کے لئے آپ نے سرکردہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو منتخب فرمایا اور کچھ مہموں کی قیادت آپ نے بنفس نفیس فرمائی۔ یہ مہمیں روانہ کرنے کے کئی مقاصد تھے۔ ان مہموں کے ذریعے مختلف قبائل کے ساتھ رابطے قائم کئے گئے، ان کو اسلام کی دعوت دی گئی اور ان کے ساتھ باہم جنگ نہ کرنے کے

معاہدے کیے گئے۔ ان مہموں کے ذریعہ کفار مکہ کو یہ احساس دلایا گیا کہ مسلمانوں کے خلاف چپقلش کی صورت میں ان کی اپنی تجارت محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ان مہموں کے ذریعہ قریش مکہ اور دیگر قبائل کو یہ احساس دلانا بھی مقصود تھا کہ مسلمانوں کو کمزور سمجھنا ایک بہت بڑی غلطی ہوگی اور اس کے نتائج انتہائی سنگین ہوں گے۔

اس قسم کی مہموں کو تاریخ میں غزوات و سرایا کہا جاتا ہے۔ ان مہموں میں سے کچھ ایسی بھی تھیں جن کا نتیجہ مسلح تصادم کی صورت میں رونما ہوا، جس کا فریقین کا جانی اور مالی نقصان بھی ہوا۔ حق و باطل کی اس آویزش کے دوران کفار مکہ نے کئی بار مدینہ طیبہ پر مسلح چڑھائی کی اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے عرب قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملایا۔ انہوں نے مدینہ اور خیبر کے یہودیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور مدینہ کے یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کی خلاف ورزی کرنے کی ترغیب دی۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں ایک طرف مسلمان تھے اور دوسری طرف قریش مکہ۔ عرب قبائل اور جزیرہ عرب کے یہودی اسلام کا قلع قمع کرنے کے مشترکہ مقصد کی خاطر یکجا ہو گئے تھے۔ اس کشمکش میں جنگیں بھی ہوئیں فریقین کے آدمی مارے بھی گئے، اسیر بھی ہوئے اور فریقین نے اپنے انتہائی خطرناک دشمنوں کو اپنے راستے سے ہٹانے کی تدبیریں بھی کیں۔

مسلمانوں کی دفاعی کاروائیوں کے خلاف مستشرقین کا واویلا اور اس کا جواب

مستشرقین حق و باطل کی اس آویزش کو مخصوص عینک سے دیکھتے ہیں۔ وہ کفار مکہ کی زیادتیوں، یہودان مدینہ کی عہد شکنیوں اور دشمنان اسلام کے تباہ کن عزائم کو کلیۃً نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان قوتوں کے مظالم اور شرارتوں کے جواب میں مسلمانوں نے جو کاروائیاں کیں، انہیں ظالمانہ کاروائیاں قرار دیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ریاست مدینہ کے دفاع کے لئے مختلف مقاصد کے تحت مہمیں بھیجنے کا جو نظام وضع فرمایا تھا، وہ ان مہموں کو ڈاکے قرار دیتے ہیں۔ وہ اہل مکہ کی تیرہ سالہ کارروائیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور کفار مکہ کے مظالم اور جارحیت کے جواب میں مسلمانوں نے جو کاروائیاں کیں انہیں ظالمانہ

کارروائیاں قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ کارروائیاں اشتعال انگیز تھیں۔ وہ اسیران بدر کے ساتھ مسلمانوں کے بے نظیر رحیمانہ سلوک کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور جن دو قیدیوں کو ان کے تاریک کارناموں کی وجہ سے موت کی سزا دی گئی تھی، ان کے کیس کو اسلام پر دہشت گردی کا الزام لگانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

وہ کعب بن اشرف اور اس جیسے کینہ پرور یہودیوں کی اسلام کے خلاف معاندانہ کارروائیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور انہیں اپنی ان شرارتوں کی جو سزا ملی، اس کی وجہ سے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ حضور ﷺ نے جو مصالحانہ رویہ اپنایا تھا، مستشرقین اس کو بھی خاطر میں نہیں لاتے، یہودیوں نے مسلمانوں کے ساتھ کئے گئے وعدے توڑ کر ان کے خلاف بار بار دشمن کی جو مدد کی، وہ بھی ان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتی لیکن یہودی قبائل کو ان کی مسلسل عہد شکنیوں کی جو سزا ملی، اس کو ظالمانہ کارروائی کہہ کر مستشرقین پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام کے دامن رافت و رحمت پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔ مستشرقین نے حضور ﷺ کی ذات پر تشدد پسندی کا الزام لگانے کے لئے جن واقعات کا سہارا لیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

غزوات و سرایا، دو اسیران بدر کا قتل، کعب بن اشرف اور چند دیگر یہودی سرداروں کا قتل، بنو قینقاع کا اخراج، بنو نضیر کا اخراج اور بنو قریظہ کے خلاف کارروائی۔ ہم مستشرقین کے ان تمام اعتراضات کا ایک ایک کر کے جواب دیتے ہیں تاکہ مستشرقین نے حق کے رخ زیبا کو شکوک و شبہات سے آلودہ کرنے کیلئے جو کوششیں کی ہیں ان کی قلعی کھل جائے اور حق اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قارئین کرام کے سامنے جلوہ گر ہو جائے۔

غزوات و سرایا

مستشرقین نے اذن جہاد کے حوالے سے اسلام کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کیا ہے۔ وہ اسلام سے اس لئے خفا نہیں کہ اسلام نے جہاد کا حکم دے کر کوئی ایسا کام کیا ہے جو پہلے کسی نے نہ کیا تھا بلکہ وہ اسلام سے اس لئے خفا ہیں کہ اسلام ایک دین تھا اور دین کا کام یہ نہ تھا کہ وہ تلوار کے استعمال کی اجازت دیتا۔ دراصل وہ بڑی حسرت سے یہ خواب دیکھتے ہیں کہ کاش اسلام نے اپنے پیروکاروں کو تلوار کے استعمال کی اجازت نہ دی ہوتی اور مدنی تاجدار

ﷺ نے حق کی جو شمع کوہ صفا پر فروزاں کی تھی اس کی روشنی ان علاقوں تک نہ پہنچ سکتی جو علاقے یہودیت اور عیسائیت کی پھیلائی ہوئی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ الہامی دین کہلوانے کا مستحق تو صرف مذہب عیسائیت ہے جس نے ایک رخسار پر تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا رخسار جارح کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام کو الہامی دین کیسے کہا جا سکتا ہے جب کہ اس نے تلوار اٹھانے کی اجازت دے دی۔

مسلمانوں نے جارحین کے خلاف جو فوجی کارروائیاں کیں ان سے مستشرقین کئی نتیجے اخذ کرتے ہیں۔ ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے مختلف مقاصد کے تحت جو مہمیں اطراف و جوانب میں روانہ کیں، مستشرقین ان کو ڈاکہ زنی کا نام دیتے ہیں۔ وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کا کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ تھا لہٰذا ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ عربوں کے دستور کے مطابق تجارتی کاروانوں پر حملے کر کے ان کو لوٹتے، مختلف قبائل پر حملے کرتے اور ان کو لوٹ کر اپنے جسم و جان کے رشتے کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے۔ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو جہاد کا جو حکم دیا ہے اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام نے لوگوں کو بزور شمشیر مسلمان بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہم یہاں اس موضوع پر مستشرقین کی تحریروں سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ قارئین مستشرقین کے اعتراض کی نوعیت کو سمجھ سکیں اور اس کے بعد ان اعتراضات کے جوابات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

جارج سیل تسلیم کرتا ہے کہ حضور ﷺ اور آپ کے پیروکاروں نے تیرہ سال مکہ والوں کے مظالم کو کمال صبر سے برداشت کیا۔ وہ مانتا ہے کہ اس عرصہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے وہ محض تبلیغ کے زور پر مسلمان ہوئے اور ان میں سے کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا گیا، لیکن یہ مستشرق یہ کہہ کر مسلمانوں کی تیرہ سالہ قربانیوں پر پانی پھیر دیتا ہے کہ اگر مسلمانوں نے مکہ میں تلوار استعمال نہ کی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کمزور تھے اور ان کے دشمن طاقتور تھے اور جوں ہی مسلمانوں کے پاس طاقت آ گئی انہوں نے جارحانہ رویہ اپنا لیا۔ وہ لکھتا ہے:

"But this great passiveness and moderation seems entirely owing to his want of power, and the great

superiority of his opposers for the first twelve years of his mission; for no sooner was he enabled, by the assistance of those of Medina, to make head against his enemies, than he gave out, that God had allowed him and his followers to defend themselves against the infidels; and at length as his forces increased, he pretended to have the divine leave even to attack them, and to destroy idolatry .and set up the true faith by the sword" (1)

لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنی دعوت کے پہلے بارہ سالوں میں آپ کا یہ غیر مزاحمانہ اور معتدل رویہ محض اس وجہ سے تھا کہ آپ بہت کمزور تھے اور آپ کے مخالفوں کی طاقت آپ کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ کیونکہ جوں ہی آپ اہل مدینہ کے تعاون سے اس قابل ہوئے کہ آپ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں تو آپ نے فوراً یہ اعلان کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے پیروکاروں کو کافروں کے خلاف اپنے دفاع کی اجازت دے دی ہے اور جب آپ کی طاقت میں اضافہ ہوا تو آپ نے یہ بہانہ بھی کیا کہ آپ کو دشمنوں پر حملہ کرنے، بت پرستی کو تباہ کرنے اور تلوار کے زور پر اپنے دین کو قائم کرنے کی اجازت بھی بارگاہ خداوندی سے مل گئی ہے۔"

عیسائیت کے برعکس اسلام کے تلوار کے زور سے پھیلنے کے متعلق جارج سیل ان خیالات کا اظہار کرتا ہے:

"It is certainly one of the most convincing proofs that Mohammadism was no other than a human invention, that it owed its progress and establishment almost entirely to the sword; and it is one of the strongest demonstrations of the divine origin of christianity, that it prevailed against all the force and powers of the world by the mere dint of its own truth." (2)

1۔ The Koran، صفحہ 38

2۔ ایضاً

"اسلام کے انسانی ذہن کا اختراع ہونے کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ اسلام نے اپنی ترویج واشاعت کے لئے کلیۃً تلوار پر انحصار کیا اور عیسائیت کے الہامی دین ہونے کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ محض اپنی صداقت کے زور پر دنیا کی تمام طاقتوں کی مخالفت کے باوجود زندہ رہا۔"

منٹگمری واٹ نے اپنی مختلف تحریروں میں زور شور سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کا کوئی معقول ذریعہ معاش نہ تھا، اس لئے انہوں نے عربوں کے دستور کے مطابق تجارتی کاروانوں کو لوٹنے اور مختلف قبائل پر ڈاکے ڈالنے کا پیشہ اختیار کر لیا۔ وہ لکھتا ہے:

"As these expeditions, even that to Badr, were razzias, where the aim was to capture booty without undue danger to oneself." (1)

"بدر کی مہم سمیت یہ مہمیں ڈاکے تھے، اور ان کا مقصد یہ تھا کہ غیر ضروری خطرات مول لئے بغیر مال غنیمت اکٹھا کیا جائے۔"

یہی مستشرق ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

"When one looks at all alternatives, however, it seems clear that even before he left Mecca Muhammad must have looked on raids on Meccan caravans as a possibility, even a probability. In the raids the Muslims were taking the offensive. Muhammad cannot have failed to realize that, even if the raids were only slightly successful, the Meccans were bound to attempt reprisals. In these little raids, then, he was deliberately challenging and provoking the Meccans. In our peace-conscious age it is difficult to understand how a religious leader could thus engage in offensive war and become almost an aggressor." (2)

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 231

2۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 105

"جب انسان ان تمام معاشی امکانات کا جائزہ لیتا ہے جو محمد (ﷺ) کے پیش نظر تھے تو یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ محمد (ﷺ) نے ہجرت سے پہلے ہی مکی کاروانوں پر حملوں کے امکان بلکہ غالب امکان پر غور کیا ہوگا۔ ان حملوں میں مسلمانوں کا رویہ جارحانہ تھا۔ محمد (ﷺ) اس بات کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتے تھے کہ گو ان حملوں میں ان کو معمولی کامیابی حاصل ہو، لیکن مکہ والے انتقامی کارروائی ضرور کریں گے۔ ان چھوٹے حملوں میں محمد (ﷺ) مکہ والوں کو چیلنج کر رہے تھے بلکہ ان کو اشتعال دلا رہے تھے۔ ہمارے امن پسند زمانے میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایک مذہبی راہنما کیونکر جارحانہ جنگوں میں مشغول ہو کر ایک جارح بن سکتا ہے۔"

غزوات کو ڈاکے ثابت کرنے کی کوشش میں منٹگمری واٹ ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"Thsu whether Muhammad incited his followers to action and then used their wrongs to justify it, or whether he yielded to pressure from them to allow such action, the normal Arab practice of the razzia was taken over by the Islamic community. In being taken over, however, it was transformed. It became an activity of believers against unbelievers, and therefore took place within religious context." (1)

"خواہ محمد (ﷺ) نے اپنے پیروکاروں کو جارحیت پر ابھارا ہو اور پھر ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو اس عمل کو جواز مہیا کرنے کے لئے استعمال کیا ہو یا انہوں نے اپنے پیروکاروں کی طرف سے اس عمل کی اجازت دینے کے مطالبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہوں، دونوں صورتوں میں نتیجہ یہ تھا کہ، عربوں کے ہاں معروف، ڈاکہ زنی کے عمل کو امت مسلمہ نے اپنا لیا اور اس عمل کو اپنا لینے کے بعد انہوں نے اس کی ہیئت میں تبدیلی کر دی۔ اس طرح یہ ایک ایسا عمل بن گیا جو مومن کافروں کے خلاف سر انجام دیتے تھے اور (ڈاکہ

1۔ محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 108

زنی کا) یہ عمل مذہبی دائرے کے اندر سر انجام پاتا تھا۔"
پھر مستشرق مذکور اس تبدیلی کی نوعیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"The change from razzia to the Jihad may seem to be no more than a change of name, the giving of an aura of religion to what was essentially the same activity".(1)

"ڈاکے اور جہاد میں فرق صرف نام کی تبدیلی کا تھا۔ اس طرح وہ کام جو دراصل ڈاکہ ہی تھا اس کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔"
منٹگمری واٹ اسلامی جہاد کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Another point was doubtless present in Muhammad's mind. He forbade fighting and raiding between Muslims, and consequently, if a large number of Arab tribes accepted Islam or even merely accepted Muhammad's leadership, he would have to find an alternative outlet for their energies. Looking ahead, Muhammad probably realized that it would be necessary to direct the predatory impulses of the Arabs outwards, towards the settled communities adjacent to Arabia, and he was probably conscious to some extent of the development of the route to Syria as a preparation for expansion". (2)

"بلاشک و شبہ ایک اور نکتہ بھی محمد (ﷺ) کے ذہن میں تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو باہم لڑائی کرنے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اگر عرب کے قبائل کثرت سے اسلام قبول کر لیتے یا محض محمد (ﷺ) کی قیادت کو تسلیم کر لیتے تو آپ کے لئے ضروری تھا کہ آپ عربوں کی قوت کے اظہار کے لئے کوئی متبادل راستہ تلاش کرتے۔ غالباً مستقبل کے متعلق سوچتے ہوئے آپ نے یہ محسوس کیا ہو گا کہ عربوں کے غارت گرانہ رجحانات کا رخ

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 108
2۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 45

خارج کی طرف موڑنا ضروری ہوگا، ان پر امن علاقوں کی طرف جو عرب سے ملحق تھے۔ اور غالباً اپنی مملکت کی حدود کو وسیع کرنے کی خاطر، شام کے راستے پر آپ کی خصوصی نظر ہوگی۔"

جنگ بدر کے موقعہ پر کفار مکہ ایک ہزار کا لشکر لے کر میدان میں اترے تھے اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد تین سو سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا تھا لیکن اس موقعہ کے متعلق ولیم میور لکھتا ہے کہ مسلمان کافروں کے خلاف اس لئے لڑے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس لشکر کو شکست دینے کے بعد وہ قریش کے تجارتی قافلے کو لوٹ سکیں گے۔ وہ لکھتا ہے:

"The Moslems were chagrined at the prospect of a rich and easy prey turned into that of a bloody battle. They still, indeed, seem to have hoped that a victory would enable them to pursue and seize the Caravan." (1)

"مسلمان اس بات پر بہت پریشان ہوئے کہ ایک آسان اور قیمتی شکار کے امکانات ایک خون ریز جنگ میں بدل گئے تھے۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اب بھی یہ امید تھی کہ وہ لشکر کو شکست دے کر کاروان کو لوٹنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

مارانڈرائے بھی دیگر مستشرقین کی طرح ڈاکہ زنی کو مسلمانوں کا ذریعہ معاش قرار دیتا ہے وہ لکھتا ہے:

"The method, then, which the prophet employed in order to provide sustenance for himself and all his companions, was that of plundering the caravans which passed Medina on the way to or from Syria". (2)

"پیغمبر (ﷺ) نے اپنی اور اپنے تمام صحابہ کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے جو طریقہ اپنایا وہ ان تجارتی کاروانوں کو لوٹنے کا تھا جو شام جاتے ہوئے یا شام سے واپس آتے ہوئے مدینہ کے پاس سے گزرتے تھے۔"

1۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 87

2۔ محمد، دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 140

مستشرق مذکور مسلمانوں پر یہ الزام بھی لگاتا ہے کہ انہوں نے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے تلوار استعمال کی بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اسلام کی اصل مبلغ ہی تلوار ہے، وہ جنگ بدر کے اثرات کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"The satisfaction and joy of victory increased the prophet's consciousness of his calling. The thought grew in him that the world must be compelled by force to obey Allah's word and commandments, if preaching did not succeed.... Thus, even at this time, shortly after the battle of Bedr, the principle is formulated which for a season made the sword the principal missionary instrument of Islam." (1)

"فتح کی خوشی اور اطمینان نے محمد (ﷺ) کے دل میں اپنی دعوت کا احساس تیز تر کر دیا۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر دنیا تبلیغ کے ذریعے خدا کے احکام کے سامنے نہیں جھکتی تو اسے بزور شمشیر ایسا کرنے پر مجبور کرنا چاہئے۔ بدر کی جنگ کے فوراً بعد طاقت کے استعمال کا اصول وضع کیا گیا جس کی بنا پر ایک مدت تک تلوار ہی اسلام کی تبلیغ کا اصل ذریعہ رہی۔"

سطور بالا میں ہم نے مستشرقین کی تحریروں کے جو اقتباسات نقل کئے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر دو بڑے اعتراض ہیں۔

ایک یہ کہ حضور ﷺ ایک مذہبی راہنما ہو کر تلوار کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ نے اپنے دین کی اشاعت کے لئے تلوار کو استعمال کیا جب کہ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح تلوار کی نہیں بلکہ امن کی دعوت دیتے۔

دوسرا اعتراض مستشرقین کو یہ ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کو صرف اپنے دین کی تبلیغ کے لئے ہی استعمال نہیں کیا بلکہ انہوں نے تلوار کو ذریعہ معاش بھی بنایا اور انہوں نے ڈاکہ زنی کو بطور پیشہ اختیار کیا۔

1۔ محمد، دی مین اینڈ ہز فیتھ، صفحہ 147

دین اور تلوار

جو لوگ تلوار کے استعمال کی وجہ سے اسلام پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں وہ خود تلوار کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کے اکثر قومی ہیرو وہی ہیں جن کو تلوار استعمال کرنے کے فن میں کمال حاصل تھا۔ وہ صرف یہ کہ کر اسلام کے خلاف یک طرفہ ڈگری جاری کرتے ہیں کہ دنیوی معاملات میں تو تلوار کا استعمال ناگزیر ہے لیکن دین کے حوالے سے تلوار کے استعمال کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

معترضین کے اس اعتراض کا جواب دینے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلام ایک دین ہے اور دین کا تعلق انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے ہوتا ہے۔ دین کو صرف چند عبادات اور فرد کے روحانی تجربات تک محدود رکھنا اور زندگی کے باقی معاملات سے دین کو خارج کر دینا، الحاد ہی کی ایک قسم ہے۔ اسلام کے نزدیک دینی زندگی اور دنیوی زندگی کی تفریق کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اسلام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ہدلیات مہیا کرتا ہے۔ ان ہدلیات پر ایمان لا کر ان کے مطابق زندگی گزارنا دینداری ہے اور ان ہدلیات کا انکار کرنا یا ان کو نظر انداز کرنا لادینیت ہے۔ تلوار کا استعمال اگر دین کی تعلیمات کے مطابق ہے تو وہ دینداری کے زمرے میں داخل ہے اور اگر اس کا استعمال دین کی تعلیمات کے خلاف ہے تو یہ دین کی مخالفت ہے۔

حضور ﷺ سے پہلے جو انبیائے کرام تشریف لائے ان کے نزدیک بھی دین فرد کے چند روحانی تجربات تک محدود نہ تھا۔ ان کے نزدیک بھی دین ایک ضابطہ حیات تھا، جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام باطل قوتوں کے خلاف برسرپیکار نظر آتے ہیں۔

اس کائنات میں حق و باطل کی آویزش روز اول سے جاری ہے۔ دونوں قوتیں اپنے حریف کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ نظریات اور مفادات کے تصادم کے سبب افراد اور اقوام ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور اپنے مدمقابل کو شکست دینے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اس ہمہ گیر آویزش کے دوران کسی فرد یا جماعت کو تلوار کے استعمال سے روک دینا، اس کو زندگی کے حق سے محروم کرنے کے

مترادف ہے۔ تلوار کا استعمال، ظلم ہے یا انصاف؟ اس کا فیصلہ صرف کسی شخص کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ جس شخص نے تلوار اٹھا رکھی ہے اس نے یہ تلوار کسی دوسرے شخص کی آزادیوں کو چھیننے کے لئے استعمال کی ہے یا اس نے اپنے حقوق کی طرف اٹھنے والے دست تعدی کو روکنے کے لئے تلوار کا سہارا لیا ہے۔ اگر کسی شخص نے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تلوار اٹھائی ہے تو وہ ظالم ہے، اور اگر کسی نے تلوار اس لئے اٹھائی ہے کہ ظالم کے ظلم کا راستہ روک سکے تو ایسا شخص نہ صرف حق پر ہے بلکہ ایسا شخص تو معاشرے کے ان تمام کمزور افراد کے لئے فرشتہ رحمت بن جاتا ہے، جو ظالم کے دست تعدی کو روکنے کے قابل نہیں ہوتے۔

اس بات کو سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تلوار کے استعمال کا حق خود زندگی کے حق کی طرح مقدس ہے۔ جس طرح کسی کو زندگی کے حق سے محروم کرنا ظلم ہے اسی طرح، بوقت ضرورت، اس کو اپنے دفاع میں تلوار استعمال کرنے کے حق سے محروم کرنا بھی ظلم ہے۔ اگر تلوار کے استعمال کو جائز سمجھنے کی وجہ سے اسلام کو مورد الزام ٹھہرا لیا جائے تو پھر اس الزام سے ماضی کے اولوالعزم انبیاء و رسل اور عظیم دینی راہنما بھی نہیں بچ سکتے۔

مستشرقین کو یہ بات تو بڑی عجیب نظر آتی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مذہبی راہنما ہو کر اپنے پیروکاروں کو تلوار اٹھانے کی اجازت کیوں دے دی، لیکن ان کی نظر جہاد و قتال کی ان متعدد ترغیبات پر نہیں پڑتی جو عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔ بائبل اپنے پیروکاروں کو دشمن کے ساتھ جو سلوک کرنے کا حکم دیتی ہے، اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

کتاب استثناء، باب 20 کی آیات نمبر 10 تا 17 کے الفاظ یہ ہیں:

"In case you draw near to a city to fight against it, you must also announce to it terms of peace. And it must occur that if it gives a peaceful answer to you and it has opened up to you, it must even occur that all the people found in it should become yours for forced

labor, and they must serve you. But if it does not make peace with you, and it actually makes war with you and you have to besiege it, Jehovah your God also will certainly give it into your hand, and you must strike every male in it with the edge of the sword. Only the women and the little children and the domestic animals and everything that happens to be in the city, all its spoil you will plunder for yourself; and you must eat the spoil of your enemies, whom Jehovah your God has given to you. That is the way you will do to all the cities very far away from you that are not of the cities of these nations. It is only of the cities of these peoples that Jehovah your God is giving you as an inheritance that you must not preserve any breathing thing alive, because you should without fail devote them to destruction".

"اگر تم کسی شہر کے خلاف جنگ کے لئے اس کے قریب پہنچو تو تمہیں دشمن کے سامنے امن کی شرطوں کا اعلان کر دینا چاہئے۔ اگر وہ تمہاری شرطوں کو مان لیں اور اپنے دروازے تمہارے لئے کھول دیں تو شہر میں موجود تمام لوگ تمہارے جبری خدمت گار بن جائیں گے اور وہ تمہاری خدمت کریں گے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ صلح نہ کریں اور عملاً جنگ کریں اور تمہیں ان کا محاصرہ کرنا پڑے، تمہارا خدا یقیناً ان لوگوں کو تمہارے قبضے میں دے گا۔ تمہیں چاہئے کہ تم ان کے تمام مردوں کو تہ تیغ کر دو۔ صرف عورتیں، بچے، جانور اور شہر میں موجود دوسری چیزیں تمہارا مال غنیمت ہوں گے۔ خدا نے جن دشمنوں کو تمہارے قبضے میں دیا ہے تم ان کے مال پر قبضہ کرو اور اسے کھاؤ پیو۔ یہ سلوک وہ ہے جو تمہیں ان شہروں سے کرنا ہے جو تم سے بہت دور ہیں اور ان قوموں کے شہر نہیں (جن کے علاقوں کو خدا نے تمہیں دینے کا وعدہ کیا ہے)۔ جن شہروں کو خدا تمہیں وراثتہ دے رہا ہے ان کے بارے میں تمہیں حکم یہ ہے کہ ان

شہروں کی کسی ذی روح چیز کو زندہ نہ رہنے دو کیونکہ تمہیں چاہئے کہ انہیں تباہ و برباد کردو۔"

کتاب استثناء، باب 7، کی آیات نمبر 1 تا 2، یہودیوں کو یہ حکم دے رہی ہیں:

"When Jehovah your God at last brings you into the land to which you are going so as to take possession of it, he must also clear away populous nations from before you, the Hittites..... seven nations more populous and mighty than you are. And Jehovah your God will certainly abandon them to you, and you must defeat them. you should without fail devote them to destruction. You must conclude no covenant with them nor show them any favor".

"جب تمہارا خدا تمہیں اس سرزمین میں پہنچا دے، جس پر قبضہ کرنے تم جا رہے ہو اور وہ "حتیوں" وغیرہ سات قوموں کو جو تم سے تعداد اور قوت میں زیادہ ہیں، ان سے ان علاقوں کو خالی کر دے، اور تمہارا رب یقیناً ان قوموں کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑے گا، تمہیں چاہئے کہ تم ان کو شکست دو۔ تمہیں چاہئے کہ تم ان کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ تم ان کے ساتھ نہ تو کسی قسم کا کوئی معاہدہ کرو اور نہ ہی ان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کرو۔"

قارئین کرام نے عہد نامہ قدیم کے احکام جہاد ملاحظہ فرمائے۔ مستشرقین اسلام کے حکم جہاد پر اعتراض کرتے وقت موسوی قانون کی طرف توجہ نہیں دیتے اور بار بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت کا حوالہ دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ عیسائیت کی تعلیمات یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرامین میں تلوار کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ ہم مستشرقین کی اس غلط فہمی کی تردید بھی بائبل سے کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے تو پورے تیرہ سال تک کلمہ حق کہنے کی پاداش میں کفار کے مظالم سہے تھے اور اپنے خادموں کی گزارشات کے باوجود انہیں تلوار کی اجازت نہیں دی تھی اور جب کفار آپ کو اور آپ کے پیروکاروں کو اڑھائی سو میل دور مدینہ طیبہ میں بھی امن کا سانس لینے کی اجازت دینے پر

تیار نہ ہوئے تو آپ نے بحکم خداوندی اپنے پیروکاروں کو جہاد بالسیف کی اجازت دی تھی، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے، جن کی امن پسندی کو مستشرقین بطور مثال پیش کرتے ہیں، صرف پونے تین سال بنواسرائیل کو صراط مستقیم کی طرف آنے کی دعوت دی اور آپ ان پونے تین سالوں کے مختصر عرصہ میں ان کی سازشوں اور دل آزاریوں سے تنگ آ گئے اور اپنے حواریوں کو تلواریں اٹھانے کا حکم دے دیا۔ لوقا کی انجیل کے باب بائیس کی آیت نمبر 36 کے مطابق آپ نے اپنے حواریوں کو یہ حکم دیا:

"Then he said to them:" But now let the one that has a purse take it up, likewise also a food pouch; and let the one having no sword sell his outer garment and buy one".

"اس نے کہا: مگر اب جس کے پاس بٹوہ ہو، وہ اسے لے اور اسی طرح جھولی بھی اور جس کے پاس تلوار نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں کو تلواریں خریدنے کا حکم دے رہے ہیں اور تلواریں جس مقصد کے لئے خریدی جاتی ہیں وہ مستشرقین سے مخفی نہیں۔ یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام تلواریں خریدنے کا حکم اس لئے نہیں دے رہے تھے کہ وہ اپنے حواریوں کو دہشت گرد بنانا چاہتے تھے بلکہ آپ نے تلوار کی ضرورت اس لئے محسوس کی تھی کہ جو لوگ حق کی آواز کو اپنی طاقت کے زور پر دبانا چاہتے تھے، وہ صرف تلوار کی زبان سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ تلوار کی زبان میں بات کرنا، انصاف بھی تھا، حکمت بھی تھی اور امن پسند انسانیت کے لئے رحمت بھی۔

مستشرقین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صلح جوئی اور امن پسندی کو اسلام کے اذن جہاد کے خلاف بطور دلیل استعمال کرتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنا اعلان جو بائیبل کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، وہ مستشرقین کے مزعومات کی تردید کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"Do you imagine I came to give peace on the earth? No, indeed, I tell you, but rather division. For from now on there will be five in one house divided, three against two and two against three. They will be divided, father against son and son against father,

mother against daughter and daughter against [her] mother, mother-in-law against [her] daughter-in-law and daughter-in-law against [her] mother-in-law". (1)

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں؟ نہیں، بلکہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں جدائی کرانے آیا ہوں۔ آج کے بعد ایک گھر میں پانچ اشخاص ہوں گے جن میں باہم اختلافات ہوں گے۔ تین دو کے خلاف ہوں گے اور دو تین کے خلاف۔ باپ بیٹے کے خلاف ہوگا اور بیٹا باپ کے خلاف ہوگا۔ ماں بیٹی کے خلاف ہوگی اور بیٹی اپنی ماں کے خلاف ہوگی۔ ساس بہو کے خلاف ہوگی اور بہو اپنی ساس کے خلاف ہوگی۔"

بائبل کے ایک اور مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ اعلان درج ہے:

"Do not think I came to put peace upon the earth; I came to put not peace, but a sword. For I came to cause division, with a man against his father, and a daughter against her mother, and a young wife against her mother-in-law". (2)

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں؟ میں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں، کیونکہ میں جدائی ڈالنے آیا ہوں، باپ اور بیٹے کے درمیان، بیٹی اور ماں کے درمیان اور ساس اور بہو کے درمیان جدائی ڈالنے آیا ہوں۔"

جہاد کے متعلق عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کی تعلیمات کی ایک جھلک آپ نے سطور بالا میں دیکھی ہے۔ اسلام نے جہاد کے متعلق جو تعلیمات دی ہیں وہ بھی قرآن حکیم کی متعدد آیات کریمہ اور حضور ﷺ کی کثیر احادیث طیبہ کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ یہودی اور عیسائی اقوام کی تاریخ بھی سب کے سامنے ہے اور اسلام کی تاریخ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ غیر جانبدار تحقیق کا تقاضا تو یہ ہے کہ جہاد کے متعلق مذاہب ثلاثہ کی تعلیمات کا باہم موازنہ کیا جائے اور تینوں مذاہب کے پیروکاروں کی تاریخ کو سامنے رکھ کر

1۔ لوقا کی انجیل، باب 12، آیات 51-53

2۔ متی کی انجیل، باب 10، آیات 34-35

یہ فیصلہ کیا جائے کہ کس مذہب کی تعلیمات میں تشدد کا رجحان زیادہ ہے اور کس مذہب کی تعلیمات اپنے دامن میں شان رحمت لئے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی تینوں مذاہب کے پیروکاروں کی تاریخ کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جائے کہ کس مذہب کے پیروکار بنی نوع انسان کے لئے تباہی و بربادی کا پیغام بن کر آئے اور کس مذہب کے پیروکاروں نے دنیا کو رافت و رحمت کا درس دیا۔ دیگر مذاہب کی جہاد کے متعلق تعلیمات کو بھی پس پشت ڈال دینا اور ان کی سفاکیوں کی تاریخ کو بھی فراموش کر دینا، اور اسلام کو صرف اس بنیاد پر دہشت گردی اور سفاکی کا دین قرار دینا کہ اس نے اپنے پیروکاروں کو جہاد کی اجازت دی ہے، تحقیق نہیں بلکہ علم اور تحقیق کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہے۔

یہودیت و عیسائیت کی تعلیمات کا مختصر تذکرہ پہلے گزر چکا ہے، اب ہم جہاد کے متعلق اسلامی تعلیمات کی ایک جھلک قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ ان کے لئے مذاہب ثلاثہ کی تعلیمات جہاد کے درمیان موازنہ کرنا آسان ہو۔ اس سے پہلے سورہ حج کی وہ آیت کریمہ بیان کی جاچکی ہے جس میں مسلمانوں کو قتال کی اجازت دی گئی ہے۔ اس آیت کریمہ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ اجازت ان لوگوں کو دی جا رہی ہے، جن پر مظالم توڑے گئے اور جن کو محض اس جرم کی پاداش میں اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا، کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا پروردگار یقین کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دینے کے بعد آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ تم جس طرح چاہو اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرو اور خدا کی زمین پر تباہی و بربادی کے علمبردار بن جاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دینے کے بعد ان کے لئے جنگ کے ایسے اصول مقرر فرمائے کہ ان اصولوں کی وجہ سے اسلامی جہاد ان جنگوں سے ممتاز ہو جاتا ہے جو تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں انسانوں نے توسیع پسندی اور دیگر قوموں کے استیصال کے لئے دوسروں پر مسلط کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (1)

"اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی

1۔ سورۃ البقرہ 190

نہ کرنا۔ بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو۔"

ایک دوسری آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (1)

"اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ (وفساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لئے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو (سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر۔"

جنگ کے اصولوں کی مزید تشریح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (2)

"تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو (لیکن) اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے۔ اور جان لو یقیناً اللہ (کی نصرت) پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاں دشمنان دین کے خلاف جہاد کی تیاریوں اور عملاً جہاد کرنے کا حکم دیا ہے وہاں ساتھ ہی یہ ارشاد بھی فرمایا ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (3)

"اور اگر کفار مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جائیے اس کی طرف اور بھروسہ کیجئے اللہ تعالیٰ پر۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔"

مندرجہ بالا آیات کریمہ میں جہاد اسلامی کے اصول وضوابط کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کے حکم جہاد کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل تین چیزوں پر

1۔ سورۃ البقرہ: 193

2۔ سورۃ البقرہ: 194

3۔ سورۃ الانفال: 61

خصوصی طور پر غور کرنا ضروری ہے:

1۔ جنگ کس مقصد کے لئے ہو۔

2۔ جنگ کس کے خلاف لڑی جائے۔

3۔ جنگ میں کن کن شرائط اور قیود کی پابندی ضروری ہے۔

مندرجہ بالا آیات کریمہ وضاحت سے بتا رہی ہیں کہ اسلامی جنگیں نہ آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے لڑی جاتی ہیں، نہ کسی قوم کی نسلی برتری کو ثابت کرنے کے لئے اور نہ صنعتی اور تجارتی مفادات کی خاطر بلکہ یہ جنگیں صرف حق کی سربلندی کی خاطر لڑی جاتی ہیں۔ یہ جنگیں ان لوگوں کے خلاف لڑی جاتی ہیں اَلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ جو تمہارے خلاف جنگ کرتے ہیں اور ان شرائط کے ساتھ وَلَا تَعْتَدُوْا کہ کسی پر زیادتی مت کرو۔

قرآن حکیم نے جہاد کے جو اصول پیش کئے تھے حضور علیہ السلام نے اپنے فرامین میں ان کی تفصیل بیان فرمادی۔ آپ نے مختلف لشکروں کو مہموں پر روانہ فرماتے وقت مختلف ہدایات دیں۔ ایک لشکر کو الوداع کہتے ہوئے حضور علیہ السلام نے انہیں یہ وصیت فرمائی:

اِنْطَلِقُوْا بِاسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی بَرَکَۃِ اللّٰہِ لَا تَقْتُلُوْا شَیْخًا فَانِیًا وَلَا طِفْلًا وَلَا امْرَاَۃً وَلَا تَغُلُّوْا وَضُمُّوْا غَنَائِمَکُمْ وَاَصْلِحُوْا وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ

"اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اور اس کے نام کی برکت کے ساتھ سفر جہاد پر روانہ ہو جاؤ۔ کسی بوڑھے شخص کو، کسی بچے کو یا کسی عورت کو ہرگز قتل نہ کرنا اور خیانت نہ کرنا۔ غنائم کو اکٹھا کرنا اور حالات کو درست کرنے کی کوشش کرنا۔ دشمن کے ساتھ بھی احسان کرنا بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (1)

ایک دوسرے لشکر کو رخصت کرتے ہوئے حضور علیہ السلام نے آخری وصیت یوں فرمائی:

سِیْرُوْا بِاسْمِ اللّٰہِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَقَاتِلُوْا اَعْدَآءَ اللّٰہِ وَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تُمَثِّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِیْدًا

"اللہ کا نام لے کر راہ خدا میں جہاد کرنے کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ اللہ کے

1۔ ضیاء النبی، جلد 3، صفحہ 6-285

دشمنوں کو تہ تیغ کرنا، خیانت نہ کرنا، کسی سے دھوکا نہ کرنا، کسی مقتول کی لاش کا مثلہ نہ کرنا اور کسی بچے کو قتل نہ کرنا۔"(1)

سرکار دوعالم علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنی امت کے سالار اعظم حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ارشاد فرمایا:

لَا تَقْتُلْ ذُرِّيَّةً وَّلَا عَسِيْفًا (2)

"بچوں کو قتل نہ کرنا اور نہ کسی مزدور کو قتل کرنا۔"

رحمت کائنات ﷺ اپنی فوجوں کو کھیت اجاڑنے، درختوں کو بے ضرورت کاٹنے، شیر دار جانوروں کو قتل کرنے اور کنوؤں میں زہر ملانے سے بھی سختی سے منع فرمایا کرتے تھے۔

فَقَدْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ يُوْصِيْ بِاَلَّا يَقُوْمَ الْجَيْشُ بِاِتْلَافِ زَرْعٍ اَوْ قَطْعِ شَجَرٍ اَوْ قَتْلِ الضِّعَافِ مِنَ الذُّرِّيَّةِ وَالنِّسَآءِ وَالرِّجَالِ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ رَأْيٌ فِي الْحَرْبِ وَلَمْ يَشْتَرِكُوْا فِيْهِ بِاَيِّ نَوْعٍ (3)

"نبی کریم ﷺ اپنے لشکر کو وصیت فرمایا کرتے کہ وہ سرسبز کھیتوں کو برباد نہ کریں، درختوں کو نہ کاٹیں، کمزور بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کریں اور ان مردوں کو بھی قتل نہ کریں جو جنگ کے سلسلہ میں کوئی رائے نہیں دیتے اور کسی طرح جنگ میں شرکت نہیں کرتے۔"

مسلمانوں کو جہاد کے متعلق جو ہدایات خدا اور خدا کے رسول ﷺ نے دی تھیں، انہوں نے ان ہدایات کو فراموش نہیں کیا بلکہ جس طرح ہر لشکر کی روانگی سے پہلے حضور ﷺ مجاہدین کو تاکید فرماتے تھے کہ وہ اسلامی جہاد کی خصوصیات کو قائم رکھیں، آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے بھی آپ کی اس سنت پر عمل کیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ فرمایا تو انہیں نصیحت کی۔

1۔ ضیاء النبی، جلد 3، صفحہ 286

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

وَاِنِّیْ مُوْصِیْكَ بِعَشْرٍ: لَا تَقْتُلَنَّ اِمْرَأَةً وَلَا صَبِیًّا وَلَا كَبِیْرًا هَرِمًا وَلَا تَقْطَعَنَّ شَجَرًا مُثْمِرًا وَلَا نَخْلًا وَلَا تَحْرُقْهَا وَلَا تُخَرِّبَنَّ عَامِرًا وَلَا تَعْقِرَنَّ شَاةً اَوْ بَقَرَةً اِلَّا لِمَا كَلَةٍ وَلَا تَجْبُنْ وَلَا تَغُلَّ (1)

"میں تمہیں دس باتوں کی وصیت کرتا ہوں۔ نہ کسی عورت کو قتل کرنا۔ نہ کسی بچے یا بوڑھے شخص کو قتل کرنا۔ پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا۔ کھجور کے درختوں کو نہ کاٹنا اور نہ انہیں نذر آتش کرنا۔ کسی آبادی کو تباہ و برباد نہ کرنا۔ کسی گائے یا بکری کو کھانے کے مقصد کے بغیر ذبح نہ کرنا۔ نہ بزدلی دکھانا اور نہ خیانت کرنا۔"

یہود و نصاریٰ کے قوانین جہاد اور اسلامی قوانین جہاد، ان مذاہب کے الہامی صحیفوں کے حوالے سے ہم نے قارئین کرام کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ ایک منصف شخص کے لئے ان کے درمیان موازنہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ اسلام اپنی راہ کے مجاہدوں کو عدوان اور خیانت سے منع کرتا ہے اور ایسے تمام کاموں سے روکتا ہے جن کا نتیجہ عام تباہی ہو۔ اسلام ہر ایک کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ صرف ان لوگوں کے خلاف طاقت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے جو خود تلوار کی زبان بولنا چاہتے ہیں۔ اسلام نے اس وقت تک تلوار کے استعمال کی اجازت دی ہے جب تک خدا کی زمین پر فساد کے آثار موجود ہوں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو کفار کے خلاف صرف اتنی ہی طاقت استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے جتنی انہوں نے مسلمانوں پر زیادتی کی ہو۔ اسلام بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع کرتا ہے، پھلدار درختوں کو کاٹنے اور بلاوجہ جانوروں کو ہلاک کرنے سے منع کرتا ہے، جبکہ عیسائی اور یہودی قوانین جہاد میں رحمت کے ان مظاہر میں سے کسی کا سراغ نہیں ملتا۔

یہودی قانون جن قوموں کو تباہ و برباد کرنے کا حکم دیتا ہے اور جن پر کسی قسم کا رحم کرنے کی اجازت نہیں دیتا، ان کا جرم صرف یہ بتاتا ہے کہ خدا نے ان کی سرزمین اپنی لاڈلی مخلوق نسل اسرائیل کے قبضے میں دے دی ہے، اس لئے ان کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں

1۔ الامام محمد ابوزہرہ، "خاتم النبیین ﷺ"، (دار الفکر العربی قاہرہ۔ س ن)، جلد 2، صفحہ 752

ہے۔انجیل کے مصنفین خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ اعلان کروا رہے ہیں کہ وہ زمین پر صلح کرانے نہیں آئے بلکہ تلوار چلوانے اور خونی رشتوں میں جدائیاں ڈلوانے کے لئے آئے ہیں۔ان مقدس مذاہب کے قوانین جہاد میں مکمل تباہی سے پہلے جنگ روک دینے کا کوئی اشارہ نہیں جبکہ اسلام کا حکم ہے کہ کفار جب صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن مذاہب کے قوانین جہاد دشمن پر رحم نہ کرنے کا حکم دیتے ہیں، مستشرقین کے نزدیک وہ مذاہب تو امن پسند اور مہذب ہیں اور جس دین متین کے قوانین جہاد رافت ورحمت کا عمدہ نمونہ ہیں، وہ اس دین پر اور اس کے پیغمبر ﷺ پر دہشت گردی اور سفاکی کا الزام لگاتے ہیں۔

گزشتہ سطور میں ہم نے جو حقائق بیان کئے ہیں ان سے دو باتیں ثابت ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ جہاد کی اجازت صرف اسلام ہی نے نہیں دی بلکہ یہودیت و نصرانیت جو مستشرقین کی اکثریت کے پیارے ادیان ہیں، ان مذاہب نے بھی جہاد کا حکم دیا ہے۔ اور دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ اسلام کے قوانین جہاد، یہودیت و نصرانیت کے قوانین جہاد کی نسبت، کہیں زیادہ رحیمانہ اور مشفقانہ ہیں۔ اور جس طرح ان مذاہب کے قوانین جہاد میں زمین و آسمان کا فرق ہے اسی طرح ان قوموں کی جنگی تاریخ بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تصویریں پیش کرتی ہے۔

یہودیوں کی تاریخ ظلم، عہد شکنی، خیانت اور ان کارستانیوں کے رد عمل میں ان کی تباہی کے واقعات کے ایک طویل سلسلے کا نام ہے۔ اس قوم کو جب بھی موقعہ ملا ہے، اس نے اپنے مذہبی صحیفوں کی تعلیمات کے مطابق تباہی و بربادی کی خوفناک مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کے مظالم سے نہ تو دشمن بچ سکے ہیں اور نہ خدا کے مقدس پیغمبر ان کے ہاتھوں قتل ہونے سے محفوظ رہے ہیں۔ عیسائیوں نے صلیبی جنگوں کے دوران جن سفاکیوں کا مظاہرہ کیا، سان بارتملی میں عیسائیوں کے ہاتھوں عیسائیوں کے خون کی جو ندیاں بہیں اور مصر و شام کے مختلف عیسائی فرقے ایک دوسرے کے خلاف جو جہاد کرتے رہے اور انسانیت کے نام پر ایک بد نما دھبہ لگاتے رہے، وہ ان کی مذہبی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔

اسلام کی تاریخ کا نقشہ یہود و نصاریٰ کی تاریخ کے مذکورہ بالا نقشے سے قطعاً مختلف ہے۔ حضور ﷺ نے اذن جہاد ملنے کے بعد مختلف مقاصد کے تحت جو مہمیں روانہ کیں، جن کو

مستشرقین ڈاکے کہتے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ اسلام پر دہشت گردی کا الزام لگاتے ہیں، ان میں اگر ان مہموں کو بھی شامل کیا جائے جن میں کسی ایک شخص کو کسی مقصد کے تحت روانہ کیا گیا تھا، تو ان مہموں کی کل تعداد قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے "رحمۃ للعالمین، جلد دوم" میں بیاسی شمار کی ہے۔ اور منٹگمری واٹ نے "محمد ایٹ مدینہ" میں ان غزوات وسرایا کی جو فہرست دی ہے، اس میں غزوات وسرایا کی تعداد نوے کے قریب ہے۔ ان تمام واقعات پر، جن کو غزوات وسرایا کے عنوان کے تحت لکھا جاتا ہے، غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے تقریباً نصف ایسے تھے جن میں تلوار کا کسی حد تک استعمال ہوا۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ ایک آزاد ریاست کی دس سالہ انتظامی اور عسکری تاریخ کی بات ہو رہی ہے۔ ان واقعات میں ایسے واقعات بھی ہیں جن میں ریاست نے کسی مجرم کو اس کے جرم کی سزا دی اور ان میں ایسے واقعات بھی ہیں جن میں دشمن نے دھوکے سے کسی مسلمان کو قتل کیا۔ اگر آج کی کسی مہذب ترین ریاست کے اس قسم کے واقعات کو جمع کیا جائے، تو صرف ایک دن میں واقعات کی تعداد اتنی ہو جائے جتنی تعداد میں ایسے واقعات ریاست مدینہ کی دس سالہ تاریخ میں پیش آئے تھے۔

اس عرصے میں جتنی جنگیں یا جھڑپیں ہوئیں، ان میں "رحمۃ للعالمین" کے مطابق فریقین کے کل 1018 آدمی کام آئے۔ (1) اس تعداد میں بدر، احد، خندق، طائف اور حنین کی جنگوں کا جانی نقصان، رجیع اور بئر معونہ کے غدارانہ قتل اور حضرت سعد بن معاذ کے حکم پر بنو قریظہ کے قتل ہونے والے لوگ سب شامل ہیں۔

اسلام نے انسانی جانوں کی اس قیمت پر بنی نوع انسان کو کیا دیا؟ اشرف المخلوقات کو بت پرستی کی لعنت سے نجات دلا کر توحید کی عظمتوں سے روشناس کرایا، مدینے کے باسی جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کی ندیاں بہا رہے تھے، ان کو بھائی بھائی بنایا، عرب، جو اپنی خونخواری کی وجہ سے ننگ انسانیت بنے ہوئے تھے، ان کے دلوں میں رحمت ورافت کے جذبات کی تخم ریزی کی، جو قوم کسی قانون کی پابندی کو اپنی توہین سمجھتی تھی اسے قانون کا پابند بنایا اور تہذیب وثقافت سے ناآشنا عربوں کو تہذیب کا وہ درس دیا کہ دنیا صدیوں ان سے تہذیب وثقافت کا درس لیتی رہی۔ اگر مذکورہ بالا اعداد وشمار کو پیش نظر رکھا جائے تو نبی

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 2، صفحہ 213

رحمت ﷺ کے اس فرمان کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے:

اَنَا نَبِیُّ الرَّحْمَةِ اَنَا نَبِیُّ الْمَلْحَمَةِ

"یعنی میں رحمت کا پیغام بر ہوں، میں جنگ کا علمبر دار ہوں۔"

1018 انسانی جانوں کی قیمت پر انسانوں کی روحانی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کی کایا پلٹ دینا رحمۃ للعالمینی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ کارنامہ یقیناً اسی ہستی کا ہو سکتا ہے جو انسانی جان کو اتنا قیمتی سمجھتی تھی کہ ایک انسانی جان کے ناحق قتل کو ساری انسانیت کا قتل قرار دیتی تھی۔ ظلم کی انتہا یہ ہے کہ اسلامی جہاد کے ان قابل رشک اعداد و شمار کے باوجود اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر خون ریزی اور دہشت گردی کا الزام وہ لوگ لگاتے ہیں جن کے دامن میں انسانیت کے لئے تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کچھ نہیں اور جنہوں نے نصف صدی سے کم عرصہ میں انسانیت کو دو ہولناک عالمی جنگوں کا تحفہ دیا۔ "ان جنگوں کی تباہ کاریوں کا اندازہ لگانے سے انسانی عقل و دانش قاصر ہے۔ پر امن شہری آبادیوں، ہسپتالوں، درس گاہوں بلکہ مذہبی عبادت گاہوں کو بھی جس سنگ دلی سے مہیب بمباری کا نشانہ بنایا گیا اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، اس کے تصور ہی سے انسانیت اور شرافت کا سر بار ندامت سے خم ہو جاتا ہے۔ دیگر ہر قسم کے نقصان کو اگر آپ ایک لمحہ کے لئے نظر انداز بھی کر دیں، فقط انسانی جانوں کے نقصانات کا ہی سر سری جائزہ لیں تو انسانی خون کی ارزانی دیکھ کر آپ پر لرزہ طاری ہو جائے گا۔ ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکہ کے ایٹم بموں نے جو قیامت برپا کی، کیا اس خونچکاں داستان کو سننے کا آپ میں حوصلہ ہے؟ صرف جانی نقصانات کے اعداد و شمار پیش خدمت ہیں جو دوسری جنگ عظیم میں ہوئے۔ اتحادی ممالک برطانیہ، امریکہ وغیرہ کا جانی نقصان ایک کروڑ چھ لاکھ پچاس ہزار ہے۔ فریقین کا مجموعی جانی نقصان ڈیڑھ کروڑ کے قریب ہے۔ صرف روس کے بہتر لاکھ فوجی مارے گئے۔ جاپان کے پندرہ لاکھ پچاس ہزار جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار اگیا۔ جرمنی کے اٹھائیس لاکھ پچاسی ہزار فوجیوں نے اپنی قیمتی زندگیوں کو جنگ کی کالی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھایا۔"(1)

ایک طرف ترقی یافتہ اور مہذب اقوام کے یہ کرتوت ہیں اور دوسری طرف حضور

1۔ ضیاء النبی، جلد 2، صفحہ 282، بحوالہ انسائیکلو پیڈیا۔ برٹانیکا

ﷺ کی دس سالہ تاریخ۔ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدنی زندگی کا سارا دور مشرکوں، یہودیوں اور دیگر اسلام دشمن قوتوں کے خلاف حالت حرب میں گزرا۔ آپ کو بارہا ایسے مواقع بھی ملے جب دشمن مکمل طور پر آپ کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر حضور ﷺ کے نزدیک انسانی جان کی وہی قیمت ہوتی جو آج کے مہذب انسان کے نزدیک ہے، تو آپ کے غزوات و سرایا میں فریقین کے مقتولین کی تعداد صرف 1018 نہ ہوتی۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے یہودی قبائل ریاست مدینہ کے غدار تھے، اگر حضور ﷺ ان کے ساتھ وہ رویہ اپناتے جو آج کی مہذب ریاستیں غداروں کے ساتھ اپناتی ہیں تو ان کا انجام بھی وہی ہوتا جو بنو قریظہ کا ہوا تھا۔ اگر حضور ﷺ بنو مصطلق، بنو ہوازن، بنو ثقیف اور قریش مکہ کو شکست دینے کے بعد، ان سے وہی سلوک کرتے جس سلوک کو مفتوحین کے ساتھ یہودی قانون روا رکھتا ہے تو تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ حضور ﷺ نبی الرحمہ اور نبی الملحمہ تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے شریر انسانوں کی تباہ کاریوں سے انسانیت کو بچانے کے لئے تلوار اٹھائی ضرور لیکن شدید مجبوری کے بغیر کسی انسانی جان کو ضائع نہیں کیا۔ آپ کی انہی خوبیوں کی وجہ سے صرف 1018 انسانی جانوں کی قیمت پر تاریخ انسانی میں وہ ہمہ گیر انقلاب برپا ہوا جس کی نظیر ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔

لہٰذا ہم مستشرقین کی خدمت میں یہ ایک انتہائی معقول گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حضور ﷺ اور آپ کے دین پر تشدد پسندیدی کا الزام لگانے سے پہلے یہودی اور عیسائی مذاہب کی تعلیمات جہاد کو بھی دیکھ لیا کریں، ان مذاہب کے اکابر کے عمل پر بھی ایک اچٹتی نگاہ ڈال لیا کریں اور آج کے مہذب زمانے کے مہذب اہل مغرب کے طرز عمل کو بھی نظر انداز نہ کیا کریں۔ یقیناً اس موازنے اور تجزیے کے بعد حضور ﷺ کے غزوات و سرایا اور ان کے نتائج انہیں رحمت کے بے نظیر نمونے نظر آئیں گے۔

گزشتہ سطور میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، ان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام وہ واحد دین نہیں ہے جس نے تلوار استعمال کی ہے بلکہ یہودی اور عیسائی ادیان کی تعلیمات بھی تلوار اٹھانے کے حق میں ہیں، البتہ یہ فرق ضرور موجود ہے کہ اسلام نے رحمت کو جنگ کے ساتھ منسلک کر دیا ہے جبکہ یہ بات دیگر مذاہب کی تعلیمات میں نہیں ملتی۔

اسلام پر تبلیغ کی خاطر تلوار استعمال کرنے کا الزام اور اس کا جواب

مستشرقین نے اپنے تخیل کے زور پر اسلامی جہاد کے دو اسباب تراشے ہیں: ایک لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا اور دوسرا جہاد کے نام پر ڈاکے ڈال کر دولت اکٹھی کرنا۔

مستشرقین کی یہ انوکھی تحقیق، ان کے قلوب و اذہان کے مریض ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ جہاں تک لوگوں کو بزور شمشیر مسلمان بنانے کا تعلق ہے یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کو بزور شمشیر مسلمان بنانا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور ایمان کا تعلق دل سے ہے۔ تلوار کا وار جسم پر اثر انداز ہوتا ہے دل پر نہیں۔ تلوار کے ذریعہ کسی شخص کی زبان سے تو کلمہ پڑھوایا جا سکتا ہے لیکن تلوار میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ کسی انسان کے دل میں عقیدۂ توحید و رسالت کی تخم ریزی کر سکے۔ جو شخص زبان سے کلمہ پڑھتا ہے اور اس کا دل توحید و رسالت کے عقیدے سے خالی ہے، اسلامی اصطلاح میں وہ شخص مسلمان نہیں بلکہ منافق ہے اور منافق کو اسلام نے عام کافروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ یہ کون سی عقل مندی ہے کہ مسلمان لوگوں کو بزور شمشیر منافق بناتے رہیں؟ مستشرقین جانتے ہیں کہ مدینہ کے منافق حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے مکہ کے مشرکوں اور مدینہ و خیبر کے یہودیوں سے کم خطرناک نہ تھے۔

کسی کو بزور شمشیر مسلمان بنانے کی کوشش سے مسلمانوں کو نہ کوئی مذہبی فائدہ تھا نہ سیاسی فائدہ تھا اور نہ ہی اس طریقے سے ان کے سماجی مسائل حل ہو سکتے تھے۔ اسلام دین حکمت ہے اور وہ کسی بے مقصد کام کا حکم نہیں دے سکتا۔ اسی لئے اسلام نے اپنے پیروکاروں کو واضح ہدایات دیں کہ وہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کریں۔ قرآن حکیم نے انتہائی واضح الفاظ میں مسلمانوں کو حکم دیا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (1)

"کوئی زبردستی نہیں ہے دین میں بے شک واضح ہو گئی ہے ہدایت گمراہی سے"

1۔ سورۃ البقرہ: 256

قرآن حکیم وضاحت سے بتاتا ہے کہ حضور ﷺ کا کام یہ نہیں ہے کہ آپ زبردستی لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں بلکہ آپ کا کام تو صرف یہ ہے کہ حقیقت کے جو جلوے بذریعہ وحی آپ کے قلب انور پر ظاہر ہوئے، آپ لوگوں تک ان کی روشنی پہنچا دیں، آپ لوگوں کو بتادیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا، جنت کی ابدی بہاروں کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے اور کون سا راستہ انسان کو دوزخ کی آگ میں گرانے کا سبب بنے گا۔ ان حقائق کی تبلیغ سے آپ کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے۔ اب جس کی مرضی ہے وہ حق کی روشنی سے اپنے دل کی دنیا کو منور کر لے اور جو چاہے باطل کی تاریکیوں میں دھکے کھاتا رہے۔ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (1)

"پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں، آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں۔"

قرآن حکیم نے ایک اور مقام پر واضح الفاظ میں حضور ﷺ کو ہدایت فرمائی، ارشاد فرمایا:

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَآ أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْءَانِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ (2)

"ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں۔ پس آپ نصیحت کرتے رہیے اس قرآن سے ہر اس شخص کو جو (میرے) عذاب سے ڈرتا ہے۔"

قرآن حکیم کی یہ آیات کریمہ وضاحت سے حضور ﷺ اور آپ کی امت کو حکم دے رہی ہیں کہ وہ کسی کو مسلمان بنانے کے لئے طاقت کا استعمال نہ کریں۔ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے حبیب اور اولوالعزم رسول ہیں، آپ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن کاموں سے منع فرمایا تھا، آپ خدا کو راضی کرنے کے لئے وہی کام کرتے۔ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ایک ایک ارشاد پر پورا پورا عمل کیا۔ آپ نے اپنا فریضہ تبلیغ کماحقہ ادا کیا اور تبلیغ کے بعد اس بات کو سننے والوں پر چھوڑ دیا کہ وہ اس دعوت کو قبول کریں یا اس

1۔ سورۃ الغاشیہ 22-21

2۔ سورۃ ق 45

کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضور ﷺ نے کسی ایک شخص کو بھی جبراً مسلمان نہیں بنایا۔ امام محمد ابو زہرہ لکھتے ہیں:

لَمْ يَثْبُتْ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْرَهَ اَحَدًا عَلَى الدِّيْنِ بَلْ ثَبَتَ اَنَّهُ اَرَادَ بَعْضُ الْاَنْصَارِ اَنْ يُكْرِهِ وَلَدَهُ عَلَى الْاِسْلَامِ فَنَهَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذٰلِكَ (1)

"یہ بات ثابت نہیں کہ حضور ﷺ نے کسی شخص کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو بلکہ یہ بات ثابت ہے کہ بعض انصار نے اپنے بچوں کو زبردستی حلقہ اسلام میں داخل کرنے کا ارادہ کیا تو حضور ﷺ نے ان کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔"

کسی کو بزور شمشیر مسلمان بنانا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اسلام نے مسلمانوں کو ایسا کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس لئے مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ انہوں نے لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا، البتہ اس بات میں شک نہیں کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کے جرم میں مظالم کا نشانہ بنایا، انہیں اپنے دین سے پھیرنے کی کوشش کی، تبلیغ اسلام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور حق کی آواز کو اپنی طاقت کے زور سے دبانے کی کوشش کی، اسلام نے ان لوگوں کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کی نہ صرف اجازت دی بلکہ حکم دیا اور اس راستے میں جان کی قربانی کو مومن کا عمدہ ترین عمل قرار دیا۔ مسلمانوں نے طویل مدت تک مسلسل مظالم سہنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے جہاد کیا۔ وہ انہی قوتوں کے خلاف برسرپیکار ہوئے جنہوں نے تبلیغ اسلام کے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ طاقت کی زبان بولنا چاہتے تھے، ان کو دلیل سے مطمئن کرنے کی کوشش کرنا عبث تھا۔ اذن جہاد کے بعد جو لوگ مسلمانوں کے خلاف آمادہ جنگ ہوئے، مسلمانوں نے ان سے جنگ کی اور جن لوگوں نے جنگ سے ہاتھ روک لیا، مسلمانوں نے ان کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی۔ مسلمانوں نے حبشہ کے خلاف لشکر کشی نہیں کی، حالانکہ وہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ تو وہ مسلمانوں

1۔ خاتم النبیین، جلد 2، صفحہ 583

کے راستے میں مزاحم ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے مسلمانوں پر مظالم توڑے تھے۔ کسریٰ کے خلاف مسلمانوں نے اس لئے تلوار اٹھائی تھی کہ اس نے یمن کے والی کو حضور ﷺ کو سبق سکھانے یا آپ کی شمع حیات کو گل کر دینے کا حکم بھیجا تھا۔ مسلمان رومیوں کے مقابلے میں اس لئے آئے تھے کہ انہوں نے اپنے فوجی دستے تبوک بھیجے تھے اور مسلمانوں کا لشکر جب تبوک پہنچا تھا تو وہاں سے جنگ کئے بغیر مدینہ طیبہ واپس اس لئے چلا گیا تھا کہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ رومی جنگ کی تیاری نہیں کر رہے۔

اگر حضور ﷺ اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلانا چاہتے تو مختلف جنگوں اور غزوات میں جو لوگ شکست کھا کر مسلمانوں کے قبضے میں آتے، ان کی جان بخشی کی ایک ہی صورت ہوتی کہ وہ اسلام قبول کرتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جو لوگ حضور ﷺ کے قبضے میں آئے، آپ نے ان میں سے محدودے چند کو ان کے سیاہ اعمال کی وجہ سے قتل کرنے کا حکم دیا اور باقی اسیروں کو یا تو اپنی رحمۃ للعالمینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آزاد کر دیا اور یا ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا۔ جو آدمی آپ کو قتل کرنے کی نیت سے آیا، آپ نے اس کے ارادے پر مطلع ہو کر بھی، اپنی رحمت سے اسے معاف فرما دیا۔ قریش مکہ نے بیس، اکیس سال کا عرصہ حضور ﷺ، آپ کے دین اور آپ کے پیروکاروں کے ساتھ عداوت کی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر غلبہ عطا فرمایا تو آپ نے انہیں معاف فرما دیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس دن معافی کا جو اعلان کیا گیا اس میں یہ شرط موجود ہی نہ تھی کہ جو مسلمان ہو جائے اس کو معاف کر دیا جائے گا بلکہ اس دن معافی کا اعلان ان الفاظ میں ہوا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا یا مسجد میں داخل ہو گا یا دروازے بند کر لے گا اس کو امن دیا جائے گا۔ (1) ہم مستشرقین کو علم اور عقل کا واسطہ دے کر ان سے پوچھتے ہیں کہ اگر تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود ہوتا تو کیا حضور ﷺ فتح مکہ جیسے تاریخی موقعہ کو اس مقصد کے لئے استعمال نہ کرتے؟

مستشرقین جو الزام اسلام پر لگانا چاہتے ہیں اس کا صحیح مصداق تو ان کا اپنا پیارا دین عیسائیت ہے۔ عیسائی پوپ اور پادری اپنے دین کو بطور شمشیر پھیلانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جن جن ممالک میں عیسائیوں کی حکومتیں قائم ہوئیں وہاں سے ان تمام مذاہب کا صفایا

1۔ محمد رضا، "محمد رسول اللہ"، صفحہ 309

ہو گیا جو عیسائیت کی حکومت قائم ہونے سے پہلے ان علاقوں میں موجود تھے۔ مسلمانوں نے آٹھ سو سال سپین پر حکومت کی لیکن اتنے طویل اسلامی غلبے کے باوجود ان علاقوں سے عیسائیت اور یہودیت کے مذاہب ختم نہیں ہوئے بلکہ ان مذاہب کے پیروکار بڑی آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مذاہب کی تعلیمات کے مطابق زندگیاں بسر کرتے رہے اور اسلامی حکومت میں اونچے اونچے عہدوں پر فائز رہے لیکن جب وہاں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوا اور عیسائیت کے ہاتھوں میں اقتدار آیا تو سپین میں موجود مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے کہ یا تو اپنا دین چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لیں اور یا اپنے دین کی خاطر آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں کود جائیں۔

اسلام اگر تلوار کے زور سے پھیلایا جاتا تو جن ممالک میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے، ان ممالک سے دیگر مذاہب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ اگر ہم آج دنیا کے نقشے پر، مسلمانوں کی آبادی کے نقطہ نظر سے، نگاہ ڈالیں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنی تعلیمات کی کشش کی وجہ سے پھیلا ہے، تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ کیونکہ آج مسلمانوں کی اکثریت ان علاقوں میں آباد ہے جہاں تک قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی تلوار نہیں پہنچی۔ انڈونیشیا، ہندوستان، چین، براعظم افریقہ کے ساحلی علاقے اور افریقہ کے صحراوہ علاقے ہیں جہاں آج کروڑوں کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کی کافروں کے ساتھ جنگیں یا تو بالکل نہیں ہوئیں اور اگر ہوئی ہیں تو اتنی کم تعداد میں کہ ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی وجہ سے کروڑوں لوگوں نے اپنے آبائی مذاہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسلام کے اپنی تعلیمات کی کشش کے زور پر پھیلنے اور اشاعت اسلام میں تلوار کا عمل دخل نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آج امریکہ ساری دنیا کا چوہدری بنا ہوا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جس کی داخلی پالیسیوں میں مداخلت کرنا امریکہ اپنا حق نہ سمجھتا ہو۔ آج دنیا میں کوئی مسلمان حکومت ایسی نہیں جو امریکہ کے شہریوں کو بزور شمشیر مسلمان بنانے کی طاقت رکھتی ہو لیکن اس کے باوجود امریکہ میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ یورپ کا کوئی ملک ایسا نہیں جس کی فضاؤں میں آذان کی آواز نہ گونجتی ہو اور دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس کے کثیر افراد نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام کے دامن میں پناہ نہ لی ہو۔

اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور کئی مستشرقین خود اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ تھامس کارلائل اسلام پر لگائے جانے والے اس الزام کی، کہ یہ دین شمشیر کے سہارے پھیلا، تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Much has been said of Mahomet's propagating his religion by the sword..... The sword indeed: but where will you get your sword! Every new opinion, at its starting, is precisely in a minority of one. In one man's head alone, there it dwells as yet. One man alone of the whole world believes it; there is one man against all men. That he take a sword and try to propagate with that, will do little for him. you must first get your sword. On the whole, a thing will propagate itself as it can. We do not find, of the christian religion either, that it always disdained the sword, when once it had got one. Charlemagne's conversion of the Saxons was not by preaching. "(1)

"اس بات کو بہت ہوا دی گئی ہے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے دین کو تلوار کے زور سے پھیلایا...... اگر دین تلوار کے زور سے پھیلا تھا تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ تلوار آئی کہاں سے تھی۔ ہر نئی رائے آغاز میں صرف ایک اکیلے شخص کے ذہن میں جنم لیتی ہے۔ ابتدا میں صرف ایک شخص اس رائے پر یقین رکھتا ہے۔ ایک آدمی ایک طرف ہوتا ہے اور ساری انسانیت دوسری طرف۔ ان حالات میں وہ اکیلا آدمی تلوار لے کر کھڑا ہو جائے اور اپنی رائے کی تبلیغ تلوار کے زور سے شروع کر دے تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ پہلے تلوار حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ ابتدا میں ہر چیز اپنی استطاعت کے مطابق اپنا پرچار خود کرتی ہے۔ عیسائی مذہب کے متعلق بھی تاریخ ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ جب تلوار اس کے ہاتھ میں آ گئی تو اس کے بعد بھی اس نے ہمیشہ اس کے استعمال سے پرہیز

1۔ آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ، صفحہ 96-395

کیا۔ شارلیمان نے سیکسن قبائل کو تبلیغ کے ذریعے عیسائی نہیں بنایا تھا۔"

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ امت مسلمہ کے ہاتھوں میں جب طاقت آگئی تو انہوں نے اس طاقت کو اپنے دین کی اشاعت کے لئے استعمال کیا، تو یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ جو لوگ اشاعت اسلام کی خاطر تلوار استعمال کر رہے تھے، ان لوگوں کے اپنے مسلمان ہونے کا سبب کیا تھا۔ یقیناً ان لوگوں کے مسلمان ہونے کا سبب تلوار نہ تھا بلکہ انہوں نے تعلیمات اسلام کے حسن پر اپنا سب کچھ نثار کیا تھا۔ اس دین نے ان کے اذہان و قلوب کو اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ اس دین متین کی خاطر اپنا گھربار، اولاد، رشتہ دار اور وطن سب کچھ لٹانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طاقت نے ان ابتدائی مسلمانوں کو اسلام کا شیدائی بنایا تھا وہی طاقت ہر دور میں اسلام کے سرعت سے پھیلنے کا سبب بنی ہے۔ اور وہ طاقت تلوار کی نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات کے حسن کی طاقت ہے۔ مستشرقین خالد بن ولید، ابو عبیدہ بن جراح اور عمرو بن العاص رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی خارہ شگاف تلوار کو اسلام کی اشاعت کا سبب قرار دیتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ خود ان لوگوں کے دلوں سے بتوں کی محبت نکال کر وہاں اسلام کی محبت کا بیج کس طاقت نے بویا تھا۔

دین کی تبدیلی یا تلوار، کسی دور میں اسلام کا نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں کو ان کے دین کا حکم تھا کہ وہ جب کبھی دشمن کے مقابلے میں صف آرا ہوں تو ان کے سامنے تین چیزیں رکھیں:

پہلی یہ کہ دشمن حلقہ اسلام میں داخل ہو کر ملت اسلامیہ کا حصہ بن جائے۔

دوسری یہ کہ وہ جزیہ دے کر ان تمام حقوق سے متمتع ہو جن سے ایک مسلمان متمتع ہوتا ہے۔ اور اگر یہ دونوں باتیں انہیں منظور نہ ہوں تو پھر فیصلہ تلوار کرے گی۔

اسلام خدا کی زمین پر ان لوگوں کے غلبے کو گوارا نہیں کرتا جو خدا کی خدائی پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں، لیکن اسلام ایسے لوگوں کو نہ تو زبردستی مسلمان بناتا ہے اور نہ ہی ان کو زندگی کے حق سے محروم کرتا ہے۔

مستشرقین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام نے جزیہ دے کر اپنے دین پر قائم رہنے کی سہولت صرف اہل کتاب کو دی ہے اور باقی تمام مشرکین کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جزیے کی رعایت صرف اہل کتاب کے لئے ہے لیکن اسلام نے اس حکم میں اتنی فراخدلی کا ثبوت دیا ہے کہ مجوسی جو آگ کے پجاری تھے ان

کو بھی اہل کتاب میں شمار کیا ہے کیونکہ وہ لوگ بنیادی طور پر اہل کتاب تھے۔ بت پرستوں کے لئے جزیے کی سہولت نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے سامنے دو ہی راستے تھے اسلام یا موت، کیونکہ یہ صورت اکراہ فی الدین کی ہے جس سے اسلام نے سختی سے منع کر دیا ہے۔
حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں مسلمانوں نے جو جنگیں لڑیں ان میں سے اکثر بت پرستوں کے خلاف تھیں۔ ان جنگوں میں سے اکثر میں بت پرست مغلوب ہوئے لیکن حضور ﷺ نے کبھی ان سے یہ نہیں فرمایا کہ اسلام قبول کر لو ورنہ موت کے لئے تیار ہو جاؤ بلکہ آپ نے ان میں سے اکثر کو ان کی درخواست پر معاف فرما دیا۔ بت پرستوں کے لئے جزیے کی رعایت واقعی نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو اہل کتاب جزیہ دے کر مسلمانوں کی پناہ میں آتے ہیں ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور دین و عقیدہ کی حفاظت امت مسلمہ کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اور اسلام امت مسلمہ کے کندھوں پر ان لوگوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتا جو خدائے واحد و قدوس کو چھوڑ کر پتھر کی مورتیوں کے سامنے سر بسجود ہوتے ہیں۔
فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ نے خانہ کعبہ کے تمام بتوں کو توڑ دیا تھا اور مکہ کے گرد و نواح میں موجود تمام بتوں اور بت کدوں کو بت شکن بھیج کر تباہ کر دیا تھا۔ بت پرست اپنے بتوں کی بے بسی، اسلام کی قوت اور حضور ﷺ کی شفقت دیکھ کر خود بخود مسلمان ہو گئے تھے۔
جزیرہ عرب کے باہر مسلمانوں کی جن لوگوں سے جنگیں ہوئیں ان میں افریقہ کے کچھ بت پرستوں کو چھوڑ کر باقی سب اہل کتاب تھے۔ ان کے لئے جزیہ دے کر اپنے سابقہ ادیان پر قائم رہنا ممکن تھا لیکن جب انہوں نے اسلامی تعلیمات کے حسن کو دیکھا تو وہ خود بخود اپنے سابقہ ادیان کی ناقابل فہم، معمہ نما تعلیمات سے دل برداشتہ ہو گئے اور جوق در جوق حلقہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اور جن لوگوں کو اپنے سابقہ ادیان عزیز تھے وہ مسلمانوں کی وسیع النظری کے سائے میں اپنے اپنے ادیان پر قائم رہے اور مسلمانوں کے ساتھ مذہبی اختلافات کے باوجود ہر قسم کے مذہبی، سماجی اور اقتصادی حقوق سے متمتع ہوتے رہے۔
ڈاکٹر فلپ، کے۔ ہٹی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں کسی دوسرے مستشرق سے پیچھے نہیں، وہ تسلیم کرتا ہے کہ "ذمیوں کے ساتھ جزیہ اور خراج کی ادائیگی میں انتہائی رحیمانہ سلوک کیا جاتا تھا اور ان کے اکثر معاملات کے قانونی فیصلے ان کے اپنے مذہبی راہنما کرتے تھے۔"(1)

1۔ مفتریات المستشرین علی الاسلام، صفحہ 7-206

مائیکل اکبر جو بارہویں صدی کے نصف آخر میں زندہ تھا اور جس نے عیسائیوں پر رومیوں کے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کا یہ قول تھامس آرنلڈ نے نقل کیا ہے:

> "مجھے عربوں کی فتوحات میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب رومیوں کے مظالم کو دیکھا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کے عربوں کو بھیجا کہ وہ رومیوں کے مظالم سے عیسائیوں کو نجات دلائیں۔" (1)

عیسائیوں نے کثرت سے اسلام کے دامن میں پناہ لی تھی۔ یہ کام انہوں نے کسی مجبوری سے نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے اسلام کو اس لئے اپنے سینے سے لگایا تھا کہ اس زندگی بخش نظام حیات میں انہیں دنیا اور آخرت کی کامیابی نظر آتی تھی۔

بت پرستوں کو جزیہ دے کر امت مسلمہ کی پناہ میں آجانے کی رعایت حاصل نہ تھی لیکن ان کے سامنے بھی کئی راستے کھلے تھے۔ ان کے سامنے جب ان کے خدا ریزہ ریزہ ہوئے تھے اور وہ مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے تو ان بے بس مورتیوں کا یہ حشر دیکھ کر ان کیلئے ان کا پجاری رہنا تو ممکن نہ تھا لیکن انہیں اگر دین عیسائیت یا دین یہودیت وغیرہ کسی کتابی دین میں روشنی کی کوئی معمولی سی کرن بھی نظر آتی تو وہ اپنے خداؤں کا ستیاناس کرنے والی قوم کے دین کے پیروکار بننے کے بجائے کسی دوسرے کتابی دین کے پیروکار بن کر مسلمانوں کے ذمی بن سکتے تھے اور وہ تمام مراعات حاصل کر سکتے تھے جو اہل کتاب کو مسلمانوں کے زیر سایہ حاصل تھیں۔ لیکن انہوں نے کسی دوسرے کتابی دین کا پیروکار بننے کے بجائے اس قوم کا دین قبول کیا جس نے ان کے آبائی دین کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ یہ تاریخی حقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ جب آفتاب اسلام طلوع ہوا اس وقت اس آفتاب کی روشنی کے علاوہ کوئی اور روشنی ایسی نہ تھی جو بت پرستی کی شب دیجور میں بھٹکنے والے انسانوں کو اپنی طرف مائل کر سکتی۔ انبیائے سابقین نے ہدایت کے جو چراغ روشن کئے تھے، ان کو ان کے پیروکاروں نے خود اپنی پھونکوں سے بجھا دیا تھا اور دنیا میں ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ یہ بات جو مستشرقین کے اپنے ادیان کے خلاف جاتی ہے اس کو بھی انہوں نے اسلام کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ حق یہ ہے کہ حضور ﷺ کے پاک دامن پر الزام لگانے والے جس طرح اپنے دیگر الزامات میں جھوٹے ہیں اسی

1۔ مفتریات المبشرین علی الاسلام، صفحہ 207

طرح ان کا یہ الزام بھی جھوٹا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے دین کی اشاعت کے لئے تلوار استعمال کی۔ حضور ﷺ کا دامن دیگر الزامات کی طرح اس الزام سے بھی پاک ہے۔

اسلام پر ڈاکہ زنی کی حوصلہ افزائی کرنے کاالزام اور اس کا جواب

مستشرقین نے اسلامی غزوات و سرایا کو ڈاکوں کا نام دیا ہے اور اسلام کے خلاف اس الزام کو ثابت کرنے کے لئے دلیل یہ دی ہے کہ ڈاکے ڈالنا اور دوسروں کے اموال چھیننا عربوں کا عام معمول تھا۔ مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کے سامنے چونکہ کوئی اور ذریعہ معاش نہ تھا اس لئے عربوں کے عام دستور کے مطابق انہوں نے بھی ڈاکہ زنی کو ہی اپنا پیشہ بنالیا۔ مستشرقین کا یہ شوشہ متعدد وجوہات کی بنا پر بے بنیاد ہے۔ اولاً یہ کہ اسلام نے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت ڈاکے ڈالنے کے لئے نہیں دی تھی بلکہ یہ اجازت انہیں زمین سے فتنہ وفساد کو ختم کرنے اور دعوت دین کے راستے سے ہر قسم کی رکاوٹوں کو ختم کرنے کی خاطر دی تھی۔ جن آیات کریمہ میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی گئی تھی انہی میں یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ کسی پر ظلم نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ ظلم اور زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اسلام نے مسلمانوں کو فتنہ وفساد کے ختم ہونے تک قتال کو جاری رکھنے کا حکم دیا تھا، اس نے مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ خود زمین پر فتنہ وفساد کی آگ بھڑکائیں۔ اگر مسلمان ڈاکوں کو اپنا ذریعہ معاش بناتے اور دوسروں کا مال لوٹ لینے کو جائز سمجھتے تو زمین پر فتنہ وفساد برپا ہوتا اور اسلام کی نظر میں زمین پر فتنہ وفساد برپا کرنا ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اسلام نے اس جرم کی جو سزا مقرر کی ہے وہ اتنی عبرت ناک ہے کہ اسلام کے نقاد اس سزا کو انتہائی ظالمانہ سزا قرار دیتے ہیں۔

سارے مسلمان بدو قبائل سے تعلق نہ رکھتے تھے

مستشرقین غزوات و سرایا کو ڈاکوں کا نام دیتے وقت بہت سی تاریخی حقیقتوں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جن لوگوں نے حضور ﷺ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا تھا ان کی اکثریت عرب بدوؤں پر مشتمل نہ تھی بلکہ ان کا تعلق مکہ اور مدینہ کے مہذب شہروں سے تھا۔ مکہ والوں کا ذریعہ معاش تجارت تھا اور وہ شام سے لے کر یمن

تک تجارت کرتے تھے۔ مدینہ والے زراعت پیشہ تھے، ڈاکہ زنی نہ ان لوگوں کا اپنا پیشہ رہا تھا اور نہ ہی ان کے آباؤ واجداد کا۔ اس لئے یہ کہنا کہ انہوں نے اپنی فطرت کے مطابق ڈاکہ زنی کا پیشہ اختیار کیا، سادہ لوح لوگوں کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔

مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کو درپیش مسائل

مستشرقین دوسری حقیقت یہ بھول جاتے ہیں کہ حضور ﷺ مکہ سے مدینہ پہنچتے ہی اتنے طاقتور نہ ہوگئے تھے کہ وہ نہ صرف قریش مکہ بلکہ عرب کے تمام قبائل سے بیک وقت جنگ کرسکتے۔ مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کو کئی انتہائی نازک مسائل کا سامنا تھا۔ مکہ میں ان کا مقابلہ قریش مکہ سے تھا تو مدینہ طیبہ میں ان کا مقابلہ ایک ایسی قوم سے تھا جو قریش مکہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ خطرناک تھی۔ یہودیوں کے ساتھ حضور ﷺ نے انتہائی رحیمانہ سلوک کیا تھا لیکن ان کے دل اس بات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ منصب نبوت بنو اسرائیل سے بنو اسماعیل کی طرف منتقل ہو جائے۔ قریش مکہ نے تو اپنی جہالت اور اجڈپن کی وجہ سے حضور ﷺ کی مخالفت کی تھی لیکن یہودیوں نے آپ کو پہچان لینے کے بعد محض حسد کی وجہ سے آپ کی مخالفت کی تھی۔ جہالت کی دشمنی اور حسد کی دشمنی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مدینہ طیبہ میں حضور ﷺ کو ان حاسد دشمنوں سے واسطہ تھا۔ اس کے علاوہ مدینہ طیبہ میں ایک اور اسلام دشمن عنصر منافقین کی شکل میں موجود تھا۔ "ہاتھ میں چھری اور منہ میں رام رام" کا مصداق یہ طبقہ ہمہ وقت مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ اس طبقے نے بارہا مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کرنے کی کوشش کی اور کئی مقامات پر وہ اس حد تک کامیاب بھی ہوگئے کہ مسلمانوں نے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں سونت لیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد ابتداء میں وہ کام کئے جو مدینہ میں امن وامان قائم رکھنے اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیدا کرنے کے لئے ضروری تھے۔ آپ نے ہجرت کے بعد سب سے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر کا اہتمام کیا، پھر مسلمانوں کے درمیان رشتہ مواخات قائم کیا اور اس کے بعد میثاق مدینہ کے ذریعہ شہر میں مقیم مختلف عناصر کو پرامن بقائے باہمی کے راستے پر گامزن کیا۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے جنگ کا خطرہ مول لینے کا نہ تھا بلکہ مسلمانوں

کو امن کی ضرورت تھی تاکہ وہ مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کی بنیادوں کو مضبوط بنا سکیں۔

مسلمان اس وقت نہ تو جارحانہ رویہ اختیار کرنے کی پوزیشن میں تھے اور نہ ہی یہ رویہ ان کے لئے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے ان کو امن کی ضرورت تھی لیکن کفار مکہ اور دیگر قبائل عرب مسلمانوں کو یہ اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ پرامن طریقے سے ریاست مدینہ کی بنیادیں مضبوط بنائیں اور اس کے سائے میں عزت اور وقار کی زندگی بسر کریں۔ وہ کبھی ان کو براہ راست دھمکیاں دیتے، کبھی ان کے دشمنوں سے ساز باز کرتے اور کبھی مدینہ کے مختلف عناصر کو ان کے خلاف ابھارتے تھے۔ یہی وہ کیفیت تھی جس کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَاذْكُرُوٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ (1)

''اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، کمزور اور بے بس سمجھے جاتے تھے ملک میں (ہر وقت) ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں اچک نہ لے جائیں تمہیں لوگ، پھر اللہ نے پناہ دی تمہیں اور طاقت بخشی تمہیں اپنی نصرت سے۔''

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کی جس حالت کو بیان کیا گیا ہے، ان کی وہ حالت ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں بھی تھی اور ہجرت کے فوراً بعد مدینہ منورہ میں بھی۔ کیونکہ اگرچہ انہیں اب انصار مدینہ کی صورت میں ایک مضبوط جماعت کی حمایت حاصل ہو گئی تھی لیکن دوسری طرف ان کے دشمنوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ مکہ مکرمہ میں صرف قریش مکہ مسلمانوں کے دشمن تھے جب کہ مدینہ طیبہ میں یہودی، منافق اور متعدد عرب قبائل بھی اسلام دشمنی میں کفار کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔

ایک اور بات جس کی وجہ سے ابتداء میں مسلمانوں کے لئے جارحانہ رویہ اپنانا ممکن ہی نہ تھا، وہ یہ تھی کہ مہاجرین کو ابتداء میں مدینہ طیبہ کی فضا راس نہ آئی تھی۔ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں مسلمان اس کثرت سے مبتلائے امراض ہوئے کہ یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ یہودیوں نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بخار کی شدت کی وجہ سے ایسے اشعار پڑھتے تھے جن میں موت کے قریب ہونے کا ذکر تھا۔

1۔ سورۃ الانفال، 26

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ صفہ میں پڑے کروٹیں بدلتے اور مکہ کی فضاؤں کو یاد کرتے تھے۔ دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی یہی حالت تھی۔ (1) ان حالات میں مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ کفار مکہ بلکہ پورے جزیرۂ عرب کے قبائل کے خلاف جارحانہ اقدام کریں۔

غزوات کو ڈاکے قرار دینے کی انوکھی دلیل

مستشرقین یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ انصار نے حضور ﷺ کے ساتھ صرف یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے خلاف آپ کا دفاع کریں گے جو آپ پر حملہ آور ہوں گے، ان کا آپ کے ساتھ یہ معاہدہ نہ تھا کہ وہ آپ کے ساتھ مل کر دوسروں پر حملہ آور بھی ہوں گے۔ اس کے باوجود انصار ابتدائی غزوات میں اس لئے شامل ہوئے کہ وہ لوٹ مار میں مہاجرین کے ساتھ شریک بننا چاہتے تھے۔ مستشرقین شاید یہ سمجھتے ہیں کہ مدینہ والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ دیگر قبائل پر حملہ کرنے کا انجام کیا ہوگا۔ کسی تجارتی کارواں یا کسی قبیلے پر حملہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جن لوگوں پر حملہ کیا گیا وہ کسی بھی وقت انتقامی کارروائی کے لئے مدینہ طیبہ پر حملہ کر سکتے تھے۔ اہل مدینہ جنگجو لوگ تھے ان کو جنگ کا صدیوں کا تجربہ تھا۔ وہ دشمن کی نفسیات سے واقف تھے۔ دشمن پر ڈاکہ ڈالنے کا انجام ان سے پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ انصار مال غنیمت کے لالچ میں مہاجرین کے ساتھ ڈاکوں میں شامل ہوئے تھے۔

فوجی مہموں کی حقیقت اور ان کے اسباب

اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ نے کفار مکہ کے تجارتی کاروانوں پر چھاپے مارنے کے لئے مہمیں روانہ فرمائی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش مکہ مسلمانوں کے ساتھ حالت حرب میں تھے۔ وہ مسلمانوں کو مسلسل دھمکیاں دیتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مال واسباب پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ان کی تجارت بھی مسلمانوں کے لئے ایک خطرہ تھی۔ کیونکہ یہ بات ظاہر تھی کہ وہ لوگ تجارتی منافع کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریوں کے لئے استعمال کریں گے۔ اس لئے ان کے تجارتی کاروانوں پر مسلمانوں کے حملے اس

1۔ رسول مبین، صفحہ 541

جنگ ہی کا حصہ تھے جو کفار مکہ نے خود مسلمانوں کے خلاف کئی سالوں سے شروع کر رکھی تھی۔ اگر مسلمانوں کو عزت سے زندہ رہنا تھا تو ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ قریش کو احساس دلائیں کہ مسلمانوں کے ساتھ مسلسل جنگ انہیں مہنگی پڑے گی۔ اس مقصد کے لئے حضور ﷺ نے مکی کاروانوں پر چھاپے مارنے کے لئے مہمیں بھیجیں اور ان کے لئے صرف مہاجرین کو منتخب فرمایا اور انصار کو ان میں شرکت کی دعوت نہ دی، کیونکہ ابھی تک صرف مہاجرین ہی قریش مکہ کی ستم رانیوں کا نشانہ بنے تھے۔

کفار مکہ کے علاوہ دیگر قبائل کی طرف جو مہمیں بھیجی گئیں، ان کے متعدد مقاصد تھے۔ یہ مہمیں یا تو دعوت اسلام کی خاطر تھیں، یا قبائل کے ساتھ صلح کے معاہدے کرنے کی خاطر یا کسی قبیلے کو اس کی اسلام دشمنی کی سزا دینے کی خاطر تھیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قبائل کے خلاف اکثر مہمیں یہی مقاصد حاصل کر کے مدینہ طیبہ واپس آئیں۔

ابتدائی مہموں میں شریک مجاہدین کی تعداد کو دیکھا جائے اور اس کا موازنہ ان کے مدمقابل لشکر کی تعداد سے کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان مہموں کا مقصد حالات سے باخبر رہنا یا دشمن کو احساس دلانا تھا کہ مسلمان ہر حال میں ان کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان مہموں میں مسلح مڈبھیڑ مسلمانوں کے مفاد میں نہ تھی۔ رمضان 1ھ میں جو پہلی مہم حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں بھیجی گئی اس میں مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف تیس تھی اور قریش کے جس قافلے پر چھاپہ مارنے کے لئے یہ مہم روانہ کی گئی تھی اس کی حفاظت کے لئے ابوجہل کی سرکردگی میں تین سو مسلح قریشی تھے۔ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں جو مہم بھیجی گئی اس میں مجاہدین کی تعداد صرف ساٹھ تھی اور ابوسفیان کی قیادت میں قریش کے جس دستے سے ان کا آمنا سامنا ہوا تھا، اس کی تعداد دو سو تھی۔ سریہ نخلہ جو رجب 2ھ میں پیش آیا، اس میں صرف بارہ مسلمان شریک تھے۔ حضور ﷺ کو اس حقیقت کا علم تھا کہ قریش اپنے قافلوں کے ساتھ بڑی تعداد میں مسلح محافظ بھیجتے ہیں۔ اگر ان مہموں کا مقصد صرف ان قافلوں پر حملہ کرنا ہی ہوتا تو ان مہموں میں شامل مجاہدین کی تعداد یقیناً زیادہ ہوتی۔

مستشرقین کا یہ کہنا کہ مسلمانوں کا ذریعہ معاش کوئی نہ تھا لہٰذا وہ ڈاکے ڈالنے پر مجبور تھے، اس بنا پر غلط ہے کہ ان میں سے متعدد مہمیں مختلف قبائل کے ساتھ معاہدوں پر منتج

ہوئیں، اور جو لوگ ڈاکہ ڈالنے کے لئے جاتے ہیں، وہ اپنے شکار سے معاہدہ کر کے اپنے گھر واپس نہیں لوٹ آتے۔ اس کے علاوہ جن غزوات و سرایا میں مسلمانوں کے ہاتھ کافروں کا مال لگا تھا، ان کی تعداد بالکل معمولی ہے۔ سریہ نخلہ میں پہلی بار مسلمانوں کے ہاتھ کافروں کا مال لگا تھا۔ یہ واقعہ ہجرت کے سترہ ماہ بعد پیش آیا تھا۔ اگر مستشرقین کی منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو سوچنا پڑے گا کہ اگر ڈاکوں پر ہی مسلمانوں کی نان شبینہ کا انحصار تھا تو وہ سترہ ماہ تک کیسے زندہ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اپنی گزر بسر کے لئے تجارتی قافلوں کے مال کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ انہوں نے حالات کے مطابق تجارت اور محنت مزدوری کر کے رزق حلال کمانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کی آبادکاری کے لئے بے نظیر ایثار کے مظاہرے کئے تھے۔ مہاجرین کی زندگی گو عسرت میں بسر ہو رہی تھی لیکن وہ خوش تھے کہ ان کا پیارا دین روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔

غزوات و سرایا کے عنوان سے مستشرقین نے حضور ﷺ پر جتنے الزامات لگائے ہیں وہ سب بے بنیاد ہیں۔ یہ غزوات و سرایا نہ تو دشمن کو مشتعل کرنے کے لئے تھے، نہ یہ ڈاکے تھے اور نہ ان کا مقصد لوگوں کو بزور شمشیر مسلمان بنانا تھا بلکہ یہ غزوات و سرایا ایک ایسی قوم کی دفاعی حکمت عملی کا حصہ تھے جسے چاروں طرف سے خونخوار دشمنوں نے گھیر رکھا تھا، لیکن وہ قوم دشمنوں کے اس ہجوم کے درمیان عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ ساری انسانیت کی خاطر زندہ رہنا چاہتی تھی۔ رب قدوس نے جس الہامی ہدایت سے اس قوم کو سرفراز فرمایا تھا، یہ قوم ہدایت کی اس روشنی کو دنیا کے چپے چپے میں پہنچانا چاہتی تھی اور اس عظیم مقصد کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ نہ مغربی ممالک کی استعماری کاوشوں کو ڈاکہ زنی کا نام دیتے ہیں، نہ مشرق وسطی کے تیل پر قبضہ کرنے کے لئے لاکھوں انسانوں کا خون بہانے والوں کو ڈاکو کہتے ہیں اور نہ ہی ان مہذب درندوں کو ڈاکو کہتے ہیں جنہوں نے اپنے سیاسی اور اقتصادی مفادات کی خاطر کروڑوں انسانوں کی انسانی آزادیاں سلب کر رکھی ہیں، وہ لوگ خدا کے رحمۃ للعالمین نبی اور اس کے جاں نثاروں پر ڈاکہ زنی کا الزام لگاتے ہیں۔ انصاف کا

اس سے بڑا قتل ممکن نہیں ہے۔

یہودیوں کے خلاف کارروائیاں

مدینہ طیبہ میں حضور علیہ السلام کو جن نئے دشمنوں کے ساتھ واسطہ پڑا تھا ان میں سرفہرست یہودی تھے۔ یہودی اہل کتاب تھے اور قرآن حکیم میں اہل کتاب کو بت پرستوں پر فوقیت دی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گو اہل کتاب نے تحریفات کے ذریعے اپنے اپنے ادیان کی شکلیں مسخ کر دی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ بت پرستوں کے مقابلے میں مسلمانوں سے قریب تر تھے۔ ان میں اور مسلمانوں میں کئی چیزیں مشترک تھیں۔ وہ خدائے بزرگ و برتر کے تصور سے آشنا تھے۔ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لئے نبی اور رسول بھیجتا ہے اور انہیں کتابیں عطا فرماتا ہے۔ وہ حیات بعد الموت پر بھی ایمان رکھتے تھے اور اخروی زندگی کے ثواب و عذاب کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ اسی لئے متعدد اسلامی قوانین میں ان کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

حضور علیہ السلام جب مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو آپ نے مدینہ کے یہودیوں کو دعوت اسلام دینے کا فریضہ بھی ادا کیا اور کئی ایسی تدابیر بھی کیں کہ مسلمان اور یہودی اپنے اپنے ادیان پر قائم رہتے ہوئے، مدینہ کی سرزمین پر امن و سلامتی سے رہیں۔ حضور علیہ السلام کا رویہ ان کے ساتھ انتہائی مشفقانہ تھا۔ جن امور کے بارے میں حضور علیہ السلام کو بذریعہ وحی نئی ہدایات نہ ملتی تھیں، ان میں آپ سابقہ شریعتوں کے قوانین پر عمل کرتے تھے۔ یوم عاشورہ کا روزہ اور بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ایسی چیزیں تھیں جو مسلمانوں اور یہودیوں کو قریب تر کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اہل کتاب کو ان الفاظ میں دعوت توحید دو۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (1)

1۔ سورۂ آل عمران 64

"(میرے نبی!) آپ کہیے: اے اہل کتاب! آؤاس بات کی طرف جو یکساں ہے ہمارے اور تمہارے درمیان (وہ یہ کہ) ہم نہ عبادت کریں (کسی کی) سوائے اللہ کے اور نہ شریک ٹھہرائیں اس کے ساتھ کسی چیز کو اور نہ بنالے کوئی ہم میں سے کسی کو رب اللہ کے سوا۔ پھر اگر وہ روگردانی کریں (اس سے) تو تم کہہ دو: گواہ رہنا (اے اہل کتاب!) کہ ہم مسلمان ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ حکم بھی ملا:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (1)

"اور (اے مسلمانو!) بحث مباحثہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر شائستہ طریقہ سے۔ مگر وہ جنہوں نے ظلم کیا ان سے اور تم کہو: ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہے ہماری طرف اور اتارا گیا ہے تمہاری طرف اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔"

حضور ﷺ نے انہی ربانی ہدایات کے مطابق یہودیوں کے ساتھ انتہائی رحیمانہ سلوک کیا۔ آپ نے ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت ضرور دی، کہ یہ آپ کا فرض منصبی تھا، لیکن آپ نے ان کو اپنا آبائی دین چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ آپ نے ایسے انتظامات کیے کہ مسلمان اور یہودی پرامن بقائے باہمی کے اصول پر ایک ساتھ رہ سکیں۔ مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد جلد ہی حضور ﷺ نے میثاق مدینہ کے ذریعے مدینہ طیبہ میں مقیم تمام عناصر کو ایک دستور کا پابند بنادیا۔ اس دستور کی اہم دفعات یہ تھیں۔ (2)

1۔ یہ تحریری دستاویز ہے اللہ کے نبی محمد (ﷺ) کی قریش، یثرب کے اہل ایمان اور ان لوگوں کے باب میں جو ان کے اتباع میں ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے ہمراہ جنگ

1۔ سورۃ العنکبوت: 46

2۔ ضیاء النبی، جلد 3، صفحہ 95-190 (ملخص)

میں حصہ لیں۔

2۔ مدینہ کا کوئی مشرک (غیر مسلم اقلیت) قریش کے کسی شخص کو مالی یا جانی کسی طرح کی پناہ نہ دے گا اور نہ مسلمانوں کے مقابلہ پر اس (قریشی) کی حمایت و مدد کرے گا۔

3۔ اور یہ کہ جب تک جنگ رہے، یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ مل کر مصارف اٹھائیں گے۔

4۔ اور یہود بنی عوف اور ان کے اپنے حلفاء و موالی سب مل کر مسلمانوں کے ساتھ ایک جماعت (فریق) متصور ہوں گے۔ یہودی اپنے دین پر (رہنے کے مجاز) ہوں گے اور مومن اپنے دین پر کاربند رہیں گے، البتہ جس نے ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو وہ محض اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو مصیبت میں ڈالے گا۔

5۔ اور یہودی قبائل کی ذیلی شاخوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو اصل کے ہیں۔

6۔ اور یہ کہ ان قبائل میں سے کوئی شخص حضرت محمد (ﷺ) کی اجازت کے بغیر نہیں نکلے گا۔

7۔ اس صحیفہ والوں کے خلاف جو بھی جنگ کرے گا تو تمام فریق (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ نیز خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے اور ان کا شیوہ وفاداری ہو گا نہ کہ عہد شکنی اور ہر مظلوم کی بہر حال مدد کی جائے گی۔

8۔ اس صحیفہ والوں کے لئے حدود یثرب (مدینہ) کا داخلی علاقہ (جوف) حرم کی حیثیت رکھے گا۔

9۔ اس صحیفہ کے ماننے والوں میں اگر کوئی نئی بات پیدا ہو (جس کا ذکر اس دستاویز میں نہیں) یا کوئی اور جھگڑا جس سے کسی نقصان اور فساد کا اندیشہ ہو تو اس متنازعہ فیہ امر میں فیصلہ کے لئے اللہ اور اس کے رسول محمد (ﷺ) کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ اور اللہ کی تائید اس شخص کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

10۔ اور قریش (مکہ) اور ان کے حامیوں کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی۔

11۔ اور یثرب (مدینہ) پر جو بھی حملہ آور ہو تو اس کے مقابلہ میں یہ سب (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

12۔ یہ نوشتہ کسی ظالم یا مجرم (کو اس کے جرم کے عواقب سے بچانے کے لئے) آڑے نہ

آئے گا۔ جو جنگ کے لئے نکلے (کسی اور جگہ نقل مکانی کرے) وہ بھی اور جو گھر (مدینہ) میں بیٹھا رہے (سکونت کرے) وہ بھی امن کا حق دار ہو گا۔ اس پر کوئی مواخذہ نہیں البتہ اس سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو ظلم یا جرم کے مرتکب ہوں اور جو اس نوشتہ کی وفا شعاری اور احتیاط سے تعمیل کرے گا تو اللہ اور اس کے رسول محمد (ﷺ) بھی اس کے نگہبان اور خیر اندیش ہیں۔

اس تاریخی صحیفہ کی ہر شق انتہائی اہم ہے لیکن ہم نے یہاں صرف وہ شقیں بیان کی ہیں جن کا تعلق ہمارے موضوع کے ساتھ ہے۔ اس دستاویز کی رو سے مدینہ کے تمام باسیوں کو اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہنے کی آزادی دی گئی ہے۔ اس کی رو سے مدینہ کے تمام لوگوں کے لئے مدینہ طیبہ کو حرم قرار دیا گیا ہے۔ یہ دستاویز تمام فریقوں کو اس بات کا پابند بناتی ہے کہ وہ قریش مکہ کی کسی قسم کی حمایت نہیں کریں گے۔ یہ دستاویز تمام فریقوں کے لئے ضروری قرار دیتی ہے کہ اگر اس دستاویز میں شریک کسی پر حملہ ہو گا تو تمام فریق مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ یہ دستاویز تمام فریقوں کو جنگ کے اخراجات برداشت کرنے کا پابند بناتی ہے۔ اس دستاویز کی رو سے ہر قسم کے جھگڑوں یا تنازعات کی صورت میں فیصلہ کے لئے تمام فریقوں کا حضور ﷺ کی طرف سے رجوع کرنا ضروری ہے۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ دستاویز مسلمانوں اور مدینہ کے غیر مسلم عناصر کے درمیان امن اور دفاع کا ایک معاہدہ تھا یا یہ دستاویز ریاست مدینہ کا دستور تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے جب اس دستاویز پر بحث کی ہے تو انہوں نے اس کا عنوان ہی "دنیا کا پہلا تحریری دستور" تجویز کیا ہے اور اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ یہ دستاویز معاہدہ نہیں بلکہ مدنی ریاست کا دستور ہے جس کی پابندی اس کے ہر شہری پر لازم تھی۔ (1)

اس دستاویز کے پہلے جملے پر ہی نظر ڈالی جائے تو یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ یہ چند جماعتوں کے درمیان طے پانے والا معاہدہ نہیں بلکہ قوت حاکمہ کی طرف سے جاری کردہ ایک فرمان ہے جس کی پابندی ہر شہری پر طوعاً و کرہاً لازم ہے۔ اس دستاویز کا پہلا جملہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم- هٰذَا كِتَابٌ مِنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

2۔ ضیاء النبی، جلد 3، صفحہ 195

اس جملہ پر غور کرنے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ وہ فرمان ہے جسے اللہ تعالی کے نبی اور رسول اور ریاست مدینہ کے حاکم اعلیٰ نے جاری کیا ہے۔ نیز اس کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ فرمان مدینہ کے تمام باشندوں اور تمام جماعتوں پر یکساں طور پر عائد ہوتا ہے۔ مہاجرین، انصار، مشرکین اور یہود وغیرہ سب اس کے پابند ہیں۔ اپنی مرضی سے کوئی اس سے اپنے آپ کو مستثنیٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر اس دستاویز کو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہی قرار دیا جائے تب بھی معاہدہ میں شرکت کرنے والے افراد اور جماعتوں پر، اس کی ہر شق کی پابندی لازم ہے۔ اگر کوئی طے شدہ معاہدہ سے اپنے آپ کو لاتعلق رکھنا چاہتا ہے تو وہ اس کا مجاز ہے لیکن اس پر ضروری ہے کہ وہ علی الاعلان اس معاہدہ سے قطع تعلق کرے۔ اس معاہدہ کا فریق رہتے ہوئے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرے۔ اور اگر ایسا کرے گا تو اسے عہد شکنی اور غداری کی سزا بھگتنی پڑے گی۔(1)

اگر یہ دستاویز ایک معاہدہ ہے تو بھی اسلام کے دین رحمت ہونے کی دلیل ہے کیونکہ یہ دستاویز تمام غیر مسلم عناصر کو وہ حقوق فراہم کرتی ہے جو مسلمانوں کو حاصل تھے اور ان سے صرف دو مطالبے کر رہی ہے۔ ایک یہ کہ وہ مدینہ کے داخلی امن میں خلل اندازی نہ کریں اور دوسرا یہ کہ مدینہ پر خارجی حملہ کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدینہ طیبہ کا دفاع کریں اور کسی ایسے شخص کو دوست نہ بنائیں جو اس معاہدے کے کسی فریق کا دشمن ہو۔ اور اگر یہ دستاویز دستور ہے تو بھی اسلام کے دین رحمت ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اس میں اقلیتوں کو وہ حقوق دیئے گئے ہیں جو آج کی کسی بڑی سے بڑی سیکولر سٹیٹ نے بھی اپنی اقلیتوں کو نہیں دیئے۔ اس دستور کی شق نمبر 16 کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

> "یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا اتباع کرے گا اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ ان (یہود) پر نہ تو ظلم کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے خلاف کسی (دشمن) کی مدد کی جائے گی۔"(2)

حضور ﷺ نے اس دستاویز کے ذریعے ریاست مدینہ کے تمام شہریوں کے حقوق و

2۔ ضیاء النبی، جلد 3، صفحہ 96-195

2۔ ایضاً، صفحہ 192

فرائض کا تعین کیا تھا اور ان کی حفاظت کی ضمانت بھی دی تھی۔ اس دستاویز کے ذریعے مدینہ کے امن اور سلامتی کی حفاظت کے بھی انتظامات کئے گئے تھے۔

یہ دستاویز انصاف اور مساوات کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس کی تیاری کے لئے میکیاولی سیاست کے حربے استعمال نہیں ہوئے تھے۔ اسی لئے مدینہ طیبہ میں مقیم تمام عناصر نے اس دستاویز کو خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ یہودیوں کو بھی اس دستاویز پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ اس کی کوئی شق ان کے مفادات کے خلاف نہ تھی بلکہ یہ دستاویز ان کے حقوق کی حفاظت کی ضمانت دیتی تھی۔ ابتداء میں یہودیوں نے کچھ عرصہ اس کی پابندی بھی کی لیکن بنو اسماعیل میں ایک نبی کے ظہور پر ان کے دلوں میں جو کدورت پیدا ہو چکی تھی وہ زیادہ عرصہ چھپی نہ رہ سکی۔ خصوصاً بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کے قبلہ بننے پر وہ بہت سیخ پا ہوئے۔ ممکن ہے ابتداء میں انہیں یہ غلط فہمی ہو کہ جس طرح یثرب کے بت پرست قبائل ان کے دین سے مرعوب ہو گئے تھے اسی طرح اسلام بھی ان کے دین سے مغلوب ہو جائے گا۔ کچھ مستشرقین تو یہ خواب بھی دیکھتے ہیں کہ اگر یہودی مسلمانوں کی مخالفت مول نہ لیتے اور ان کے ساتھ پرامن طریقے سے رہتے تو اسلام یہودیت ہی کا ایک فرقہ بن جاتا اور آج دنیا کی شکل مختلف ہوتی۔ ممکن ہے اس وقت کے یہودیوں نے بھی کچھ عرصہ انہی خطوط پر سوچا ہو لیکن جوں جوں اسلام کے احکام نازل ہوتے گئے اور قرآن حکیم یہودیوں کو ان کی گمراہیوں اور بداعمالیوں پر تنبیہ کرتا گیا ان کے رویئے میں تبدیلی آتی گئی اور انہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ اس قسم کی کارروائیوں میں انہوں نے اس دستاویز کا بھی خیال نہ رکھا جو ریاست مدینہ کا شہری ہونے کی حیثیت سے ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتی تھی۔ انہوں نے مدینہ کے داخلی حالات کو خراب کرنے اور قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی سازشیں بھی کیں اور مسلمانوں کے خلاف خارجی دشمنوں سے ساز باز بھی کی۔ خصوصاً کفار مکہ جن کے ساتھ کسی قسم کے دوستانہ تعلقات رکھنے سے میثاق مدینہ میں منع کیا گیا تھا، یہودیوں نے ان کے ساتھ مل کر اپنے شہر اور اپنی ریاست کے خلاف سازشیں بھی کیں۔

حضور ﷺ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ آپ میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کرتے کیونکہ مدینہ طیبہ کے امن و سلامتی کا انحصار میثاق مدینہ کی

پابندی پر تھا۔ یہودیوں کی یہ کارروائیاں یا تو معاہدے کی خلاف ورزی شمار ہوتی تھیں اور یا دستور ریاست کے خلاف بغاوت۔ اور دونوں صورتوں میں ان کی ان منفی اور تباہ کن کارروائیوں کو خاموشی سے برداشت کرنا ریاست کے امن اور سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

یہودیوں نے اپنے تمام وسائل کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ شاعری ان کا بہت بڑا ہتھیار تھا۔ اس ہتھیار کو وہ لوگوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی ریاست مدینہ کے دستور کی خلاف ورزی کی۔ حضور علیہ السلام نے کچھ ایسے افراد کے خلاف بھی تادیبی کارروائی کی جو عہد شکنی یا بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے اور بعض ان قبائل کے خلاف بھی کارروائی کی جنہوں نے علی الاعلان ریاست مدینہ سے بغاوت کی تھی۔ اس سلسلے میں عصماء بنت مروان غداری کے جرم میں قتل ہوئی، ابو عفک اور کعب بن اشرف قتل ہوئے، بنو قینقاع اور بنو نضیر کو غداری کے جرم میں مدینہ طیبہ سے جلاوطن کیا گیا اور بنو قریظہ کو ان کی غداری اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی سازش کے جرم میں، ان کے اپنے حلیف اور ان کے اپنے مقرر کردہ جج حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے، جنگجو مردوں کو قتل کرنے اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنانے کی سزا سنائی۔ جن لوگوں نے مدینہ سے جلاوطنی کے بعد بھی مسلمانوں کے خلاف معاندانہ کارروائیاں جاری رکھیں، ان میں سے سلام بن الحقیق اور اسیر بن رزام کو ان کی معاندانہ کارروائیوں کی وجہ سے کیفر کردار تک پہنچایا گیا۔

مستشرقین اس قسم کی تمام کارروائیوں کو بربریت قرار دیتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو قتل کیا گیا تھا ان کا اس کے سوا کوئی قصور نہ تھا کہ وہ مسلمانوں اور محمد (علیہ السلام) کی ہجو میں اشعار کہتے تھے۔ ان کے خیال میں بنو قینقاع اور بنو نضیر کو جلاوطن کرنے کے لئے جن واقعات کو بنیاد بنایا گیا تھا وہ واقعات بالکل معمولی نوعیت کے تھے اور ان معمولی واقعات کی بنا پر ان قبائل کے خلاف اتنا سخت اقدام کرنا ٹھیک نہ تھا۔ بنو قریظہ کے مردوں کا قتل انہیں انتہائی سفاکانہ عمل نظر آتا ہے۔

میثاق مدینہ کی پابندی یہودیوں پر لازم تھی

اپنے ان مزعومات کو ثابت کرنے کے لئے مستشرقین کبھی یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہودیوں کے جن قبائل کے خلاف کارروائی کی گئی، ان کا حضور ﷺ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔ کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ ان قبائل کا مسلمانوں کے ساتھ جنگ بدر کے بعد معاہدہ ہوا تھا۔ اپنے ان مفروضوں کے ذریعے مستشرقین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہودی کسی قسم کی عہد شکنی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے اور ان کے خلاف جو کارروائیاں کی گئیں وہ سب بلاجواز تھیں۔ دراصل مستشرقین یہودیوں کے جرائم کو نہیں دیکھتے وہ صرف اس سزا کو دیکھتے ہیں جو ان کو دی گئی۔ وہ یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہودیوں کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اہل کتاب تھے اور وہ ان علوم کے ذریعے جو الہامی کتابوں کے ذریعے ان تک پہنچے تھے، اس قابل تھے کہ اسلامی تعلیمات کو علمی سطح پر جھٹلا سکیں۔ مستشرقین کے خیال میں حضور ﷺ یہودیوں کے علمی اعتراضات کی وجہ سے پریشان تھے اور آپ کو یہ خدشہ تھا کہ یہودیوں کے اعتراضات لوگوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق شکوک و شبہات پیدا نہ کر دیں، اس لئے یہودیوں کی مدینہ طیبہ میں موجودگی حضور ﷺ اور مسلمانوں کے لئے ایک مستقل چیلنج تھا۔ حضور ﷺ اس خطرے کو کم کرنا چاہتے تھے اور مدینہ میں یہودیوں کا زور توڑنے کے لئے بہانے کی تلاش میں تھے۔ مستشرقین یہ شوشہ بھی چھوڑتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جنگ بدر سے پہلے ہی مدینہ طیبہ کو یہودیوں سے پاک کرنے کی پالیسی وضع کر لی تھی۔

مستشرقین اس قسم کے مسائل پر بھانت بھانت کر بولیاں بولتے ہیں۔ ان کا اصل مقصد اسلام کے موقف کو کمزور کرنا ہوتا ہے اور اس مقصد کے لئے انہیں جو کچھ کہنا پڑے وہ کہہ گزرتے ہیں۔ یہاں ان کے تمام شوشوں کو نقل کرنا ممکن نہیں اس لئے صرف چند اشاروں پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے۔

مستشرقین مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کسی قسم کا معاہدہ موجود نہ ہونے کا شوشہ اس لئے چھوڑتے ہیں تاکہ وہ یہ کہہ سکیں کہ اگر معاہدہ موجود ہی نہ تھا تو عہد شکنی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، کہ یہودیوں کو اس کی سزا دی جاتی۔ ان کا یہ شوشہ کلیۃً غلط ہے۔ اگر

یہودی میثاق مدینہ کے فریق نہ تھے تو پھر اس میثاق کا کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ مسلمان تو کلمہ طیبہ پڑھ کر اور عہد مواخات کے ذریعہ ہی امت واحدہ بن چکے تھے، ان کے درمیان اتحاد کی فضا پیدا کرنے کے لئے مزید کسی میثاق کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اوس و خزرج کے جن لوگوں نے دل سے اسلام قبول نہ کیا تھا، بظاہر وہ بھی مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو چکے تھے اور مسلمان شمار ہوتے تھے۔ ان حالات میں اگر یہودی بھی اس معاہدے کے فریق نہ ہوں تو پھر اس معاہدے کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے حالانکہ اکثر مستشرقین، مثلاً مسٹر ہیل (Hell)، ول ہاؤزن (Well Hausen) اور مسٹر نکلسن نے اس معاہدے کو حضور ﷺ کی سیاسی بصیرت کا ایک بہت بڑا ثبوت قرار دیا ہے۔ (1) اور اس معاہدے کے متعلق ڈاکٹر حمید اللہ نے یہ بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔

> "ایک چھوٹی سی بستی کو جو بیس ایک محلوں پر مشتمل تھی، شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں اور کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے ماتحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا جو بعد میں ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہیت کا بلا کسی دقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔" (2)

جس معاہدے کے متعلق مبصرین کی آراء یہ ہیں اس کے متعلق یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ وہ معاہدہ کرتے وقت یہودی قبائل کو نظر انداز کر دیا گیا تھا جو مدینہ کی آبادی کا اہم جزو تھے اور مدنی زندگی کے تمام شعبوں خصوصاً اقتصادی شعبے پر ان کا زبردست اثر تھا۔ ان کی شمولیت کے بغیر یہ معاہدہ مدینہ کے امن و سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ یہ معاہدہ یہودیوں کو نظر انداز کر کے کیا گیا یا یہودیوں کو جنگ بدر کے بعد اس معاہدہ کا فریق بنایا گیا۔ اکثر مستشرقین خود تسلیم کرتے ہیں کہ یہودی اس معاہدے کے فریق تھے۔ منٹگمری واٹ کی تحریروں سے کبھی یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ وہ یہودیوں کو میثاق مدینہ کا فریق شمار نہیں کرتا یا ان کے متعلق یہ موقف رکھتا ہے کہ انہیں جنگ بدر کے بعد

1۔ ضیاء النبی، جلد 3، صفحہ 201-199

2۔ ایضاً، صفحہ 200

اس معاہدہ کی فریق بنایا گیا، لیکن یہ مستشرق خود دبے الفاظ میں تسلیم کرتا ہے کہ یہودی میثاق کے فریق تھے، وہ لکھتا ہے:

"As allies of the Arab clans the Jews were in a sense included in the new community at Medina. There may even have been a direct treaty between some of them and Muhammad." (1)

"عرب قبائل کا حلیف ہونے کی وجہ سے یہودی ایک لحاظ سے مدنی معاشرہ کا حصہ تھے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض کے محمد (ﷺ) کے ساتھ براہ راست معاہدے بھی ہوں۔"

ولیم میور اسلام دشمنی میں مستشرقین کا امام ہے وہ بھی واضح الفاظ میں تسلیم کرتا ہے کہ ہجرت کے تھوڑا ہی عرصہ بعد مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ طے پایا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"No concession was too great that might secure the countenance and allegiance of the jews. Accodringly, not long after his arrival, Mahomet entered into a treaty with them, which, both offensive and defensive guaranteed their safety and independence". (2)

"یہودیوں کی حمایت اور وفاداری حاصل کرنے کی خاطر انہیں کوئی سہولت دینا بھی خسارے کا سودا نہ تھا۔ اس لئے محمد (ﷺ) نے مدینہ پہنچنے کے بعد جلد ہی ان سے دفاع اور جنگ کا ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق ان کی آزادی اور سلامتی کی ضمانت دی گئی۔"

اس معاہدے یا دستور کی رو سے یہودی ریاست مدینہ کے شہری تھے اور ریاست کے قوانین کی پابندی ان پر لازم تھی۔ ان کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی تھی کہ وہ مدینہ طیبہ کے شہری ہوتے ہوئے ایسے کام کریں جن سے ریاست کا امن اور سلامتی خطرے میں پڑ جائے۔ حضور ﷺ نے میثاق مدینہ کے ذریعے ان کے تمام حقوق اور آزادیوں کے تحفظ کی

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 98

2۔ محمد اینڈ اسلام، صفحہ 70

ضمانت دی تھی، اس لئے ان پر لازم تھا کہ ریاست کی طرف سے ان پر جو فرائض عائد ہوتے تھے، وہ ان کو بھی پورا کریں۔ مختلف یہودیوں کے خلاف انفرادی یا اجتماعی طور پر جو کارروائی کی گئی اس کا سبب یہ تھا کہ وہ لوگ ریاست کے خلاف بغاوت کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے اور جس دستاویز کے ذریعے انہیں ہر قسم کی انسانی آزادیوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی، انہوں نے اسی دستاویز کے مندرجات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ جو لوگ اپنے آپ کو مہذب سمجھتے ہیں وہ بھی اپنی ریاست کے غداروں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو حضور ﷺ نے اپنی ریاست کے غداروں کے ساتھ کیا تھا۔ ہم یہاں ان تمام کیسوں پر اختصار سے نظر ڈالتے ہیں جن کو مستشرقین نے اسلام کے خلاف بربریت کا الزام لگانے کے لئے استعمال کیا ہے۔

عصماء بنت مروان اور ابو عفک کا انجام

یہودیوں کے خلاف انفرادی اور اجتماعی طور پر جو کارروائیاں کی گئیں، ان میں سب سے پہلی کارروائی جنگ بدر کے بعد عصماء بنت مروان اور عفک یہودی کے خلاف کی گئی۔ عصماء ایک عورت تھی اور ابو عفک، ایک سو بیس سال کا ایک بوڑھا شخص تھا۔ اگر ان کے جرائم محدود ہوتے تو ان کے سزا سے بچ جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ کیونکہ حضور ﷺ اپنے غلاموں کو خصوصی طور پر حکم دیتے تھے کہ وہ جنگ میں عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کریں۔ یہ دونوں اگر مسلمانوں کے معاہد اور مدینہ کے شہری نہ ہوتے اور ان کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہوتا جو مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار تھی، تو بھی حضور ﷺ کے ارشادات کے مطابق یہ موت کی سزا سے بچ جاتے کیونکہ یہ بات ممکن ہی نہ تھی کہ حضور ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع کرتے، اس کے باوجود صحابہ کرام انہیں قتل کر دیتے۔ لیکن ان دونوں کے جرائم اس قسم کے تھے کہ ان کو معاف کرنا ریاست مدینہ کے امن و سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ یہ دونوں شاعر تھے اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ صرف شعر کہنا اور بات ہے، اور شاعری کے ذریعے شہری امن و امان کو درہم برہم کر دینا دوسری بات ہے۔ آج بھی اگر کوئی قادر الکلام شاعر یا خطیب اپنی شاعرانہ اور

خطیبانہ صلاحیتوں کو ریاستی امن کو تباہ کرنے اور عوام کو حکومت کے خلاف بھڑکانے کے لئے استعمال کرے تو اس کے اس جرم کو بغاوت ہی کا نام دیا جاتا ہے اور وہ بغاوت ہی کی سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ ہم یہاں جن لوگوں کے متعلق بحث کر رہے ہیں وہ اپنی شاعری کے ذریعے انصار مدینہ کو اس بات پر ملامت کرتے تھے کہ انہوں نے باہر سے آنے والوں کو اپنے شہر میں اقتدار سونپ دیا ہے۔ منٹگمری واٹ عصماء بنت مروان کے متعلق لکھتا ہے:

"Asma bint Marwan...... composed verses taunting and insulting some of the Muslims......., the chief point was that the persons addressed were dishonouring themselves by submitting to a stranger not of their blood". (1)

"عصماء بنت مروان اپنے شعروں میں بعض مسلمانوں پر طعنہ زنی کرتی اور ان کی بے عزتی کرتی تھی۔ جس بات پر وہ ان کو برا بھلا کہتی تھی، وہ بات یہ تھی کہ انہوں نے ایک اجنبی کو جو ان کی نسل سے نہیں، اپنا حاکم بنا کر، اپنی توہین کی ہے۔"

منٹگمری واٹ ابو عفک یہودی کے متعلق لکھتا ہے:

"Abu Afak had taunted his hearness with allowing an outsider to control their affairs." (2)

"ابو عفک اپنے سامعین کو طعنے دیتا تھا کہ انہوں نے اپنے معاملات ایک اجنبی کے حوالے کر دیئے ہیں۔"

حضور ﷺ کو ریاست مدینہ کا سربراہ بنانے کا فیصلہ شہر مدینہ کے باسیوں کی اکثریت نے کیا تھا۔ منٹگمری واٹ خود لکھتا ہے کہ جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو مدینہ کے تقریباً تمام بااثر افراد کی آپ کو حمایت حاصل تھی۔ وہ کہتا ہے:

"Muhammad when he went to Medina, had the support for one reason or another of all the most influential men among the Arabs; and, apart from sa'd b. Muadh and Ibn Ubayy, they all came to the great

---

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 178

2۔ ایضاً، صفحہ 179

convention of al-Aqabah'. (1)

"محمد (ﷺ) جب مدینہ تشریف لے گئے تو آپ کو کسی نہ کسی سبب سے مدینہ کے تمام بااثر افراد کی حمایت حاصل تھی۔ اور سعد بن معاذ اور ابن ابی کے سوا سب نے عقبہ کے عظیم اجتماع میں شرکت کی تھی۔"

شہر کے تمام بااثر افراد کی آپ کو حمایت حاصل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ان بااثر افراد کے قبائل کی بھی آپ کو مکمل طور پر حمایت حاصل تھی، کیونکہ عربوں میں قبیلے کی رائے وہی ہوتی تھی جو ان کے سردار کی رائے ہوتی تھی۔ جب غالب اکثریت نے حضور ﷺ کو اپنا سیاسی اور انتظامی سربراہ مان لیا تھا تو آپ ریاست کے قانونی سربراہ تھے۔ ریاست کے کسی شہری کو حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اکثریت کے مقرر کردہ حکمران کو مسترد کر دیتا۔ جو لوگ اکثریت کے مقرر کردہ حکمران کی اتھارٹی کو چیلنج کر رہے تھے اور رائے عامہ کو ریاست کے آئینی سربراہ کے خلاف منظم کرنے کے لئے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو علی الاعلان استعمال کر رہے تھے، وہ آج کے ترقی یافتہ جمہوری دور کے معیار کے مطابق بھی، بغاوت کے جرم کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اس لئے ان کو وہی سزا ملنی چاہئے تھی جو مہذب معاشرے غداروں کو دیتے ہیں۔ عصماء بنت مروان اور ابو عفک ریاست کے خلاف بغاوت کے مجرم تھے اور انہیں وہی سزا دی گئی جو اس قسم کے مجرموں کو ملنی چاہئے۔ ان خطرناک مجرموں کو معاف کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ریاست مدینہ کے ذمہ دار افراد کو ریاست کے امن و سلامتی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں اور حضور ﷺ سے اس قسم کے رویے کی توقع رکھنا فضول ہے۔

کعب بن اشرف کا قتل

ایک اور واقعہ جس کی وجہ سے مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر شدید تنقید کی ہے وہ کعب بن اشرف یہودی کا قتل ہے۔ کعب کا باپ عرب تھا اور اس کی ماں یہودی قبیلہ بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھی۔ وہ بڑا مالدار تھا اور قبیلہ بنو نضیر میں اس کو بڑا اہم مقام حاصل تھا۔ وہ بھی میثاق مدینہ کی رو سے ریاست مدینہ کا ایک شہری تھا۔ وہ ابتدا میں کچھ عرصہ مسلمانوں کے ساتھ پرامن رہا لیکن بعد میں، اس کے سینے میں دفن یہودی حسد نے

1۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 80-179

پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے اور وہ مسلمانوں کو ستانے لگا۔ یہ شخص بھی ایک شاعر تھا۔ اس نے بھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو مسلمانوں کی دل آزاری اور ان کے شیرازے کو بکھیرنے کے لئے استعمال کیا۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی شاندار فتح اور کفار مکہ کی ذلت آمیز شکست نے کعب بن اشرف کے سینے میں آگ لگادی اور مسلمانوں کے خلاف جو کینہ اب تک اس کے سینے میں مخفی تھا وہ ظاہر ہونے لگا۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح اور قریش سرداروں کے قتل کی خبر جب مدینہ طیبہ پہنچی تو اس نے پہلے اس خبر کو ناقابل تسلیم قرار دیا لیکن جب اس نے قریش کے بیسیوں سورماؤں کو غلامان محمد کی قید میں دیکھا تو حقیقت کا انکار اس کے لئے ممکن نہ رہا۔ اس موقعہ پر اس نے کہا کہ اگر جزیرہ عرب کے یہ سردار واقعی قتل کر دیئے گئے ہیں تو:

لَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ مِنْ ظَهْرِهَا (1)

"کہ زمین کی پشت پر زندہ رہنے سے تو یہ بہتر ہے کہ ہمیں زمین میں دفن کر دیا جائے۔"

اس نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ خود مکہ پہنچا اور مکہ کے مقتولین پر رونا پیٹنا اور مکہ والوں کو مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائی پر ابھارنا شروع کر دیا۔ منٹگمری واٹ خود لکھتا ہے:

"When he heard the news of Badr, he set out for Mecca, and by his verses helped to rouse the Meccans to grief and anger and the desire for revenge". (2)

"جب اس نے بدر کی خبر سنی تو مکہ گیا اور اپنے شعروں کے ذریعے مکہ والوں کے دکھ اور غم میں اضافہ کیا اور انہیں انتقام پر ابھارا۔"

حضور ﷺ کے حکم سے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے شعروں کا جواب اپنی شاعری کے ذریعے دیا تو مکی میزبانوں نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ وہ مدینہ طیبہ واپس آیا اور یہاں بھی مسلمانوں کی دلآزاری کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ اب مسلمانوں کی عفت مآب خواتین کے نام لے کر ان کے ساتھ اپنے عشق و محبت کے افسانے

1۔ حیات محمد، صفحہ 272

2۔ محمد ایٹ مدینہ، صفحہ 18

ظلم کرنے لگا۔ اسے ان حرکتوں سے باز آنے کے لئے کہا گیا تو اس نے کوئی پروا نہ کی۔ یہ ایسی حرکت تھی کہ اگر حضور ﷺ نے عربوں کو اپنی زریں تعلیمات کے ذریعے قانون کے احترام کا پابند نہ بنا دیا ہوتا تو کعب بن اشرف کسی مسلمان کے ہاتھ سے بہت پہلے قتل ہو جاتا کیونکہ عربوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا کوئی ان کی ماؤں، بہنوں کے ساتھ اپنی عشق بازی کے افسانے تراشے اور وہ اس کے خلاف کارروائی نہ کریں۔ اس نے اپنی مجرمانہ کارروائیاں انہی حرکتوں تک محدود نہ رکھیں بلکہ اس نے حضور ﷺ کو شہید کرنے کا منصوبہ بھی بنایا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص قدرت سے حضور ﷺ کو محفوظ رکھا۔"(1)

جب اس کی مجرمانہ کارروائیاں حد سے بڑھ گئیں اور اس کی دلآزاریاں ناقابل برداشت ہو گئیں تو حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے اس شخص کو واصل جہنم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے پہلے باتوں باتوں میں اسے اپنے اعتماد میں لیا اور پھر اسے اس کے قلعے سے کچھ فاصلے پر لے جاکر قتل کر دیا۔

جس شخص کی مجرمانہ کارروائیوں کا سلسلہ رکنے میں آتا ہی نہ تھا، اس کو کیفر کردار تک نہ پہنچانا مدینہ کے امن کے لئے بھی خطرناک تھا اور سلامتی کے لئے بھی۔ اس شخص کی شرارتوں سے مدینہ طیبہ کو محفوظ رکھنے کیلئے اسے راستے سے ہٹانے کا جو طریقہ اپنایا گیا، زیادہ خون خرابے سے بچنے کے لئے یہی طریقہ موزوں تھا۔

مستشرقین اس بدبخت کے سیاہ کارناموں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان سیاہ کارناموں پر اس کو حکومت مدینہ کی طرف سے جو سزا ملی، اس پر وہ تنقید کرتے ہیں۔ یقیناً یہ رویہ صرف وہی لوگ اپنا سکتے ہیں جو مجرموں پر رحم کرنے اور مظلوم کی بے بسی کو نظر انداز کرنے کا نام ہی انصاف رکھتے ہیں، حالانکہ انصاف یہ نہیں کہ حکومت پرامن شہریوں کی عزت و آبرو اور جان و مال سے کھیلنے والوں کو ڈھیل دیتی رہے اور اسے رحم کا نام دے کر اپنی انصاف پسندی کا بھرم رکھے۔ اس قسم کا رحم دراصل ظلم ہے اور کوئی معاشرہ اس قسم کے ظلم کی موجودگی میں قائم نہیں رہ سکتا۔

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 308

سلام بن الحقیق کا قتل

مستشرقین نے سلام بن الحقیق نضری کے قتل کو بھی حضور علیہ السلام کے دامن رحمت کو داغدار کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ شخص قبیلہ بنو نضیر کا سردار تھا۔ اس قبیلے کو بغاوت کے جرم پر قتل کی سزا نہیں دی گئی تھی بلکہ اس جرم کی سزا انہیں یہ دی گئی تھی کہ وہ مدینہ طیبہ سے نکل جائیں۔ اپنا مال اسباب ساتھ لے جانے کی ان کو اجازت دی گئی تھی۔ انہوں نے خیبر میں ڈیرے ڈال دیئے تھے اور مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ سلام بن الحقیق ان لوگوں میں سے تھا جن کی کوششوں اور ترغیب سے مکہ کے قریش اور عرب کے دیگر قبائل نے ایک لشکر جرار کے ساتھ مدینہ طیبہ پر چڑھائی کی تھی اور مسلسل کئی روز تک مدینہ کا محاصرہ کئے رکھا تھا۔ یہ لشکر مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے کے لئے مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ سلام بن الحقیق نے جنگ خندق میں لشکر کفار کی عبرت ناک شکست کے بعد بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی معاندانہ کارروائیاں جاری رکھیں اور قبائل عرب کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے بھڑکاتا رہا۔ اس کی یہ کارروائیاں ریاست مدینہ کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ تھیں اور جو دشمن مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتا ہے، مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ بھی اس کے خلاف جنگ کریں۔ حضور علیہ السلام نے اس کی پوری قوم پر عام حملہ کرنے کی بجائے چند صحابہ کرام کو بھیج کر اس بدبخت کو قتل کروادیا، تاکہ زیادہ خون خرابہ نہ ہو۔ سلام بن الحقیق نے خود جو راستہ اپنایا تھا اس کا انجام وہی ہو سکتا تھا جو ہوا۔ مجرم کو جرم کی سزا ملے تو اس انجام کا ذمہ دار وہ خود ہوتا ہے نہ کہ اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے والے۔

اسیر بن رزام اور اس کے ساتھیوں کا انجام

سلام بن الحقیق کے بعد اسیر بن رزام نے بھی وہی کارروائیاں شروع کر دیں جن کی وجہ سے سلام بن الحقیق کیفر کردار کو پہنچا تھا۔ یہ شخص بھی مدینہ طیبہ کے امن وسلامتی کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے اس کو قتل کرنے کے احکامات صادر نہیں فرمائے بلکہ آپ نے اس کو گفت وشنید کے لئے مدینہ طیبہ طلب کیا۔ حضرت عبداللہ

بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے تیس ساتھیوں کے ساتھ اس کو لینے کے لئے گئے۔ وہ بھی اپنے تیس ساتھیوں کے ہمراہ حضرت عبداللہ بن رواحہ کے ساتھ ہی عازم مدینہ ہوا۔ راستہ میں اس نے غداری سے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عبداللہ اس کے ارادوں کو بھانپ گئے اور اس کے وار کرنے سے پہلے اس کو واصل جہنم کر دیا اور دوسرے مسلمانوں نے اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ اسیر بن رزام اپنی اور اپنے ساتھیوں کی موت کا ذمہ دار خود تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ غداری سے ایک صحابیِ رسول کو قتل کرنے کی کوشش کرتا اور اس کی اسے سزا نہ دی جاتی۔

گزشتہ صفحات میں جن واقعات کا ذکر ہوا ہے، ان میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جس میں کسی شخص کو محض اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ وہ اسلام کی تکذیب کرتا تھا اور دلائل کے زور پر اسلام کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ تمام لوگ جو مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اپنے سابقہ ادیان پر قائم تھے، وہ سب اسلام کی تکذیب کرتے تھے اور دلائل کے زور پر اسلام کی مخالفت کرتے تھے۔ حضور نے ایسے تمام لوگوں کے خلاف نظریاتی جنگ لڑی، آپ نے ان کے خلاف طاقت استعمال نہیں کی۔ کیونکہ اگر آپ نظریاتی اختلافات کے تصفیے کے لئے طاقت استعمال کرتے تو یہ بات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہوتی اور دعوت اسلامی کو اس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے نقصان پہنچتا۔

جن لوگوں کے خلاف کارروائی کی گئی، وہ اسلام کے نظریاتی مخالف تو ابتدا ہی سے تھے لیکن اس مخالفت کے باوجود حضور ﷺ نے انہیں ریاست مدینہ کا آزاد شہری قرار دیا تھا اور ان کے تمام حقوق کی حفاظت کی ضمانت بھی دی تھی۔ انہیں اسلام کی نظریاتی مخالفت کی سزا نہیں ملی تھی بلکہ انہیں جس جرم کی سزا ملی تھی وہ جرم یہ تھا کہ انہوں نے ریاست مدینہ کے پرامن شہریوں کی دلآزاری کو اپنا معمول بنا لیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف شہری امن وامان کو خطرے میں ڈالنے کی سازشیں کی تھیں بلکہ انہوں نے مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کو تباہ و برباد کرنے کے لئے مسلمانوں کے ان دشمنوں سے ساز باز بھی کی تھی جو ہر قیمت پر اس ریاست کو ختم کرنا چاہتے تھے اور کئی بار مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہو چکے تھے۔

کوئی شخص جو عالم خواب میں نہیں بلکہ حقیقت کی دنیا میں رہتا ہو، وہ تسلیم کرے گا کہ ریاست کے امن و سلامتی کی خاطر اس قسم کے خطرناک عناصر کا خاتمہ ضروری تھا اور یہی

کچھ مسلمانوں نے کیا۔ مسلمانوں کا یہ عمل کسی بھی مہذب معاشرے کے معیار کے مطابق معیوب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مستشرقین بھی اس قسم کی کارروائیوں کو قابل اعتراض اسی صورت میں سمجھتے ہیں جب یہ کارروائیاں مسلمان یا اسلامی ریاست اپنے داخلی امن اور سلامتی کی خاطر انجام دیں۔ مستشرقین کی پسندیدہ حکومتیں غداروں اور سازشیوں کے خلاف اگر اس سے بھی زیادہ سخت کارروائیاں کریں تو وہ انہیں تشدد پسندی نہیں بلکہ قانون کی حکمرانی قرار دیتے ہیں۔ مستشرقین کا یہ رویہ علم، تحقیق، غیر جانبداری اور انصاف پسندی کے استشراقی دعووں کا مذاق اڑا رہا ہے۔

قبائل یہود کی اسلام دشمن کارروائیاں اور ان کا انجام

ریاست مدینہ کے خلاف جس قسم کے جرائم کا ارتکاب کعب بن اشرف وغیرہ نے انفرادی طور پر کیا تھا اور کیفر کردار تک پہنچے تھے، اسی قسم کے جرائم کا ارتکاب تین یہودی قبائل نے قبیلے کی سطح پر بھی کیا۔ ان یہودی قبائل کے نام بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ تھے۔ یہ سب ریاست مدینہ کے اجزاء تھے اور میثاق مدینہ کی رو سے ان کا یہ فرض تھا کہ مدینہ کو حرم سمجھیں، اس کے دشمنوں کے ساتھ تعاون نہ کریں اور مدینہ طیبہ کی سلامتی کے خلاف کوئی حرکت نہ کریں۔ وہ ابتدا میں کچھ عرصہ پر امن رہے لیکن پھر ان کے دلوں میں چھپے ہوئے بغض و کینہ نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ جنگ بدر سے پہلے تو انہوں نے اپنی سازشوں کو کسی حد تک خفیہ رکھنے کی کوشش کی لیکن جنگ بدر میں مسلمانوں کی شاندار فتح نے ان کے دلوں کو حسد کی آگ سے بھر دیا اور وہ اعلانیہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی مخالفت کرنے لگے۔

بنو قینقاع

قبائل یہود میں سے میثاق مدینہ کی مخالفت سب سے پہلے قبیلہ بنو قینقاع نے کی۔ اس قبیلہ کے لوگوں نے جنگ بدر کے بعد اعلانیہ کہنا شروع کر دیا کہ اب ہمارے درمیان اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا، اب ہم پر اس سابقہ معاہدے کی پابندی ضروری نہیں۔ یہ صورت حال مدینہ طیبہ کے امن کے لئے خطرناک تھی اس لئے

حضور ﷺ حالات کو سنبھالنے کے لئے بنو قینقاع کے بازار میں تشریف لے گئے۔ آپ نے انہیں آرام سے سمجھایا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر بھی وہی عذاب نازل ہو جائے جو میدان بدر میں کفار مکہ پر نازل ہوا تھا۔ حضور ﷺ کی اس نرم گفتگو کا جواب انہوں نے یہ کہہ کر دیا:

يَا مُحَمَّدُ! اِنَّكَ تَرٰى اَنَّا مِثْلُ قَوْمِكَ- لَا يَغُرَّنَّكَ اَنَّكَ لَقِيْتَ قَوْمًا لَا عِلْمَ لَهُمْ بِالْحَرْبِ فَاَصَبْتَ مِنْهُمْ فُرْصَةً وَاَنَّا وَاللّٰهِ لَئِنْ حَارَبْتَنَا لَتَعْلَمَنَّ اَنَّا نَحْنُ النَّاسُ- (1)

"اے محمد! (فداہ ابی وامی) تم ہمیں بھی اپنی قوم کی طرح خیال کرتے ہو۔ اس قوم کو شکست دے کر جنہیں فن حرب کا کچھ علم نہ تھا، تم مغرور نہ ہو جانا۔ اگر ہم تمہارے مقابلے میں آئے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔"

بنو قینقاع کی طرف سے یہ واضح اعلان جنگ تھا لیکن حضور ﷺ نے حالات کو بگاڑنا مناسب نہ سمجھا اور آپ خاموشی سے واپس تشریف لے آئے۔ شاید انہوں نے حضور ﷺ کے اس رویے کو کمزوری سمجھا اور وہ اور زیادہ دلیر ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے ایک ایسی حرکت کی جس کے بعد حضور ﷺ کے لئے انہیں مزید مہلت دینا ممکن ہی نہ رہا۔ انہوں نے ایک مسلم خاتون کو، جو ان کے بازار میں کسی کام کے لئے گئی تھی، اپنا چہرہ کھولنے کے لئے کہا۔ اس کے انکار پر انہوں نے ایک ایسی شرارت کی جس سے اس خاتون کا ستر کھل گیا اور ارد گرد کھڑے ہوئے یہودی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

مستشرقین اس واقعہ کو معمولی قرار دے کر بنو قینقاع کے جرم کی شدت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جن لوگوں کے نزدیک غیرت کی کوئی قیمت ہوتی ہے، ان کے لئے تلواروں کے بے نیام ہونے کا اس سے بڑا سبب کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ ایک غیرت مند مسلمان کو جب اپنی دینی بہن کی اس عصمت دری کا علم ہوا تو اس نے موقعہ پر ہی اس یہودی کو قتل کر دیا جس نے یہ حرکت کی تھی۔ یہودیوں نے جوابی حملہ کر کے اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ آپ اس یہودی

1۔ ضیاء القرآن، جلد 3، صفحہ 437

قبیلہ کو مزید مہلت دیتے جو مدینہ طیبہ کے امن کو تباہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ آپ نے بنو قینقاع کی بستی کا محاصرہ کر لیا۔ بنو قینقاع کے جنگجو مردوں کی تعداد سات سو تھی، جو ہر قسم کے اسلحہ سے لیس تھے لیکن ان کو اصل کمال سازشوں کے میدان میں حاصل تھا، دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے حوصلے سے وہ محروم تھے۔ وہ ایک دن بھی مسلمان مجاہدوں سے مقابلے کے لئے میدان میں نہ نکلے اور آخر کار اپنے بارے میں فیصلے کے لئے حضور علیہ السلام کو حکم تسلیم کر لیا۔ انہوں نے خود یہ درخواست کی کہ انہیں مدینہ طیبہ سے زندہ سلامت نکل جانے کی اجازت دے دی جائے۔ حضور علیہ السلام نے ان کی اس درخواست کو منظور فرمالیا اور مدینہ سے عورتوں اور بچوں سمیت نکل جانے کے لئے انہیں تین دن کی مہلت دی اور وہ اسی عرصہ میں مدینہ طیبہ سے نکل گئے۔

بنو قینقاع کو جو سزا ملی وہ ان کے جرائم کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ اگر ان کا واسطہ کسی دنیادار حکمران سے ہوتا تو ان کا انجام بڑا عبرت ناک ہوتا لیکن وہ خوش قسمت تھے کہ ان کا واسطہ خدا کے ایک مقدس رسول سے تھا جو رحمۃ للعالمین تھا۔ اسی رحمۃ للعالمینی کا فیض تھا کہ انہیں انتہائی شنیع جرائم کی بالکل معمولی سزا ملی۔ مستشرقین حضور علیہ السلام کے اس رحیمانہ سلوک پر آپ کو خراج تحسین پیش کرنے کے بجائے اس سزا کو ظالمانہ قرار دیتے ہیں۔ مستشرقین کا یہ طرز عمل تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے کی ایک بھونڈی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

قبیلہ بنو نضیر

جب قبیلہ بنو قینقاع کو اپنے جرائم کی سزا ملی تھی، اس وقت بنو نضیر اور بنو قریظہ، دو یہودی قبائل بھی مدینہ طیبہ میں موجود تھے۔ ان کے سینوں میں بھی مسلمانوں کے خلاف حسد کے وہی شعلے بھڑک رہے تھے جو بنو قینقاع کے سینے میں بھڑکتے تھے لیکن وہ اپنے ان جذبات کو خفیہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے، اسی لئے حضور علیہ السلام نے ان سے تعرض نہ کیا۔ جب جنگ احد میں مسلمانوں کا سخت جانی نقصان ہوا اور اس کے بعد رجیع اور بئر معونہ کے واقعات میں مسلمانوں پر کوہ الم ٹوٹا تو قبیلہ بنو نضیر نے مسلمانوں کو کمزور سمجھنا شروع کر دیا اور وہ یہ سوچنے لگے کہ مسلمانوں کی یہ پے درپے شکستیں اس بات کا اشارہ ہیں کہ اب اس قوم میں وہ دم خم نہیں رہا جس کا مظاہرہ انہوں نے جنگ بدر میں کیا تھا۔ انہوں نے اعلانیہ

اس معاہدے کی خلاف ورزیاں شروع کر دیں جو ان کے درمیان اور مسلمانوں کے درمیان طے پایا تھا۔ انہوں نے عملاً دوبار حضور علیہ السلام کو شہید کرنے کی سازش بھی کی۔ ایک بار انہوں نے مذہبی معاملات پر تبادہ خیالات کے لئے حضور علیہ السلام کو تیس آدمیوں کے ہمراہ اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ حضور علیہ السلام نے ان کی یہ دعوت قبول فرمالی۔ پھر انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ فریقین کے تین تین آدمی گفتگو میں حصہ لیں۔ جو فیصلہ وہ کریں وہ سب کے لئے قابل قبول ہو گا۔ حضور علیہ السلام دو آدمیوں کے ساتھ جائے گفتگو پر پہنچے۔ جو تین یہودی گفتگو کے لئے منتخب ہوئے انہوں نے اپنی آستینوں میں خنجر چھپا رکھے تھے کہ موقعہ ملتے ہی حضور علیہ السلام اور آپ کے ساتھ آنے والے صحابہ کا کام تمام کر دیں۔ بنو نضیر قبیلے کے دو افراد جو آپس میں بہن بھائی تھے اور سچے دل سے مسلمان ہو چکے تھے انہوں نے حضور علیہ السلام کو یہودیوں کے ارادوں سے مطلع کر دیا اور یہ سازش ناکام ہو گئی۔(1)

بنو نضیر نے حضور علیہ السلام کو شہید کرنے کی دوسری سازش اس وقت کی، جب آپ خون بہا کی ادائیگی کے سلسلے میں چندہ کرنے کے لئے ان کی بستی میں تشریف لے گئے۔ انہوں نے آپ سے گفتگو تو انتہائی خوش اخلاقی سے کی لیکن ساتھ ہی یہ سازش بھی کی کہ مکان کی چھت سے ایک شخص پتھر پھینک کر آپ کو شہید کر دے۔ حضور علیہ السلام کو باعلام الٰہی یہودیوں کی اس سازش کا علم ہو گیا اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

بنو نضیر کی سازشیں حد سے بڑھ گئی تھیں۔ مدینہ طیبہ کے امن اور سلامتی کی خاطر ان کے خلاف کارروائی ناگزیر ہو گئی تھی۔ حضور علیہ السلام نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ مدینہ سے نکل جاؤ لیکن ان کو اپنی طاقت اور اپنے قلعوں کی مضبوطی پر ناز تھا۔ منافقین نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی اور وہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضور علیہ السلام نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ جب انہیں کسی طرف سے مدد نہ پہنچی اور خود بھی وہ کھل کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرات نہ کر سکے تو انہوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ شہر چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ حضور علیہ السلام نے ان کی اس پیشکش کو قبول فرمالیا البتہ فرمایا کہ چونکہ تم نے پہلے جنگ کا راستہ اختیار کیا ہے اس لئے اب تم نہ تو اپنے ساتھ ہتھیار لے جا سکتے ہو اور نہ ہی تمہیں سارا مال لے جانے کی اجازت ہے بلکہ اب تم اتنا ہی مال لے جاسکو گے

1۔ ضیاء النبی، جلد 3، صفحہ 597، بحوالہ البیہقی و ابوداؤد وغیرہ

جتنا تم اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہو۔ انہوں نے فوراً ان شرائط کو قبول کر لیا اور مدینہ طیبہ چھوڑ کر چلے گئے۔

بنو نضیر کے جرائم کا اگر اس سزا سے موازنہ کیا جائے جو انہیں ان جرائم پر حضور ﷺ نے دی تو اس میں بھی خدا کے حبیب کی شان رحمۃ للعالمینی اپنے جوبن پر نظر آتی ہے، لیکن مستشرقین اس کارروائی کو بھی ظلم قرار دیتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو محض شک کی بنا پر جلاوطنی جیسی سخت سزا دی گئی تھی۔ مستشرقین کا یہ الزام باطل ہے۔ بنو نضیر جو کچھ کر رہے تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ حضور ﷺ نے ان کے خلاف کارروائی شک یا ظن کی بنا پر نہیں کی تھی بلکہ آپ نے ان کی سازشوں کی پوری تحقیق کی تھی اور ان کی سازشوں کا یقین ہونے کے بعد ہی آپ نے کارروائی کی تھی۔ خدا کے پیارے حبیب اور آخری نبی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر کوئی معمولی سا فیصلہ بھی کرے۔ اگر حضور ﷺ محض شک کی بنا پر بنو نضیر کے خلاف کارروائی کرتے تو انصار میں جو لوگ مدتوں بنو نضیر کے حلیف رہے تھے ان کو اس سے تکلیف پہنچتی اور ملت اسلامیہ کی صفوں میں دراڑیں پڑ جاتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، کیونکہ سب مسلمانوں کو یقین تھا کہ بنو نضیر کو جو سزا ملی ہے وہ ان کے جرائم سے بھی بہت کم ہے۔

بنو قریظہ

بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد بھی یہودیوں کا ایک طاقتور قبیلہ بنو قریظہ مدینہ طیبہ میں موجود رہا۔ ان کے دلوں میں بھی مسلمانوں کے خلاف جذبات تو وہی تھے جو دوسرے یہودی قبائل کے دلوں میں تھے لیکن انہوں نے اپنے ان جذبات کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔ جنگ بدر میں انہوں نے مسلمانوں کے خلاف قریش مکہ کو اسلحہ سے مدد دی تھی لیکن حضور ﷺ نے ان کی یہ خطا معاف فرما دی تھی۔ خیبر کے یہودی سرداروں کی کوششوں سے قبائل عرب نے جنگ خندق کے موقعہ پر مدینہ طیبہ کا محاصرہ کیا تھا۔ معاہدہ کے مطابق بنو قریظہ کا فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کرتے اور مدینہ طیبہ کا دفاع کرتے۔ ابتدا میں انہوں نے کسی حد تک معاہدے کی پابندی کی بھی تھی لیکن پھر قبیلہ بنو نضیر کے سردار حی بن اخطب نے ان کو مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کی ترغیب دینا شروع

کر دی۔ ابتدا میں وہ اس یہودی سردار کی باتیں ماننے کے لئے تیار نہ تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کافروں کے ٹڈی دل لشکر نے شہر مدینہ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ اب مسلمانوں کے بچ رہنے کا کوئی امکان نہیں تو انہوں نے شہر کے امن میں خلل اندازی شروع کر دی۔ حضور ﷺ نے ان کے پاس آدمی بھیجے اور انہیں معاہدے کی پابندی کا حکم دیا تو انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا:

"محمد (ﷺ) کون ہیں؟ ہم ان کی بات نہیں مانیں گے۔ ہمارا ان کے ساتھ کوئی عہد و پیمان نہیں۔"(1)

بنو قریظہ کے یہودیوں نے اس قلعے پر حملے کی سازش بھی کی جس میں مسلمانوں نے عورتوں کو حفاظت کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کے لئے یہ صورت حال بڑی تشویش ناک تھی۔ خارجی دشمن کے مقابلے میں یہ داخلی دشمن زیادہ بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ مجبوراً مسلمانوں کو اپنے لشکر کا، جو پہلے ہی دشمن کے مقابلے میں بہت کم تھا، ایک حصہ بنو قریظہ کے حملوں کے دفاع کے لئے مقرر کرنا پڑا۔ بنو قریظہ کی یہ حرکت معمولی نہ تھی بلکہ یہ ملت اسلامیہ کو کلیۃً ملیامیٹ کرنے کی ایک گھناؤنی سازش تھی۔ بنو قریظہ نے عہد شکنی، بے وفائی اور غداری کی حد کر دی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان مایوس کن حالت میں اپنے دین اور اس کے مخلص پیروکاروں کی حفاظت فرمائی۔ خدائی لشکر طوفان کی شکل میں حرکت میں آیا اور تمام کفار مدینہ کا محاصرہ اٹھا کر بھاگ گئے اور وہ مدینہ کے غدار اور عہد شکن یہودی قبیلے بنو قریظہ کو عہد شکنی اور غداری کی سزا بھگتنے کے لئے تنہا چھوڑ گئے۔

حضور ﷺ نے انہیں اپنے طرز عمل کی وضاحت کے لئے طلب فرمایا تو وہ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ پچیس دن جاری رہا۔ جب انہیں اپنی شکست کا یقین ہو گیا تو انہوں نے پیشکش کی کہ ان کے حلیف قبیلہ بنو اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے بارے میں جو فیصلہ کریں، انہیں وہ فیصلہ منظور ہو گا۔ حضور ﷺ نے ان کی درخواست مان لی اور آپ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فیصلہ کرنے کے لئے طلب فرمایا۔ حضرت سعد، جن کے لئے بنو قریظہ کے جنگی جرائم کی شدت کو سمجھنا مشکل نہ تھا، انہوں نے اس قبیلہ کے جرائم کے مطابق ان کی سزا تجویز کی۔ انہوں نے فیصلہ کیا۔

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 1، صفحہ 132

1۔ بنو قریظہ کے جنگ جو مرد قتل کیے جائیں۔ 2۔ عورتیں اور بچے مملوک بنائے جائیں۔
3۔ ان کے اموال تقسیم کر دیے جائیں۔ (1)

یہ فیصلہ بنو قریظہ کے جرائم کے بالکل مطابق تھا۔ آج کے مہذب زمانے کے کسی ملک کو اگر حالت جنگ میں اپنے ہی شہریوں کی ایک جماعت کی طرف سے اس سلوک کا سامنا ہو جس کا سامنا جنگ خندق کے موقعہ پر مسلمانوں کو بنو قریظہ کی طرف سے کرنا پڑا تھا تو یقیناً اس ملک کے اصحاب اقتدار موقع ملنے پر اپنے شہریوں کی اس جماعت میں سے کسی کو زندہ رکھنے کو حماقت سمجھیں گے اور ان غداروں سے اپنے ملک کو پاک کر کے ہی چین کا سانس لیں گے۔

یہ فیصلہ یہودیوں کے اپنے قانون سے بھی پوری مطابقت رکھتا تھا اور یہ فیصلہ اس شخص نے کیا تھا جسے یہودیوں نے خود ثالث مقرر کیا تھا۔ اس فیصلے کی وجہ سے حضور ﷺ پر صرف وہی شخص اعتراض کر سکتا ہے جس کے سینے میں عداوت رسول کے الاؤ روشن ہوں اور حضور ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کر کے ہی اس کو سکون ملتا ہو۔

ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی معقول وجوہات موجود ہیں کہ اگر بنو قریظہ اپنی مرضی سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ثالث مقرر نہ کرتے اور حضور ﷺ خود ان کا فیصلہ فرماتے تو آپ ان کو بھی وہی سزا دیتے جو پہلے بنو قینقاع اور بنو نضیر کو دی گئی تھی۔

یہودیوں کو ان کے انفرادی اور اجتماعی جرائم کی جو سزائیں دی گئیں، ان کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو ان میں حضور ﷺ کی شان رحمۃ للعالمینی جھلک رہی ہے اور مجرموں کو ان کے جرائم کی نسبت سے بہت ہلکی سزائیں دی گئی ہیں اور یا وہ سزائیں مجرموں کے جرائم کے عین مطابق اور انصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر دی گئی ہیں، جو مدینہ طیبہ کے امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے انتہائی ضروری تھیں۔

اس بحث سے یہ بات بلاشک وشبہ ثابت ہو جاتی ہے کہ مستشرقین نے مذکورہ بالا واقعات کی وجہ سے حضور ﷺ پر جو الزام تراشیاں کی ہیں، آپ کا دامن رحمت ان تمام الزامات سے پاک ہے۔

تمت بالخیر

29 شعبان المعظم 1417ھ 10 جنوری 1997ء

1۔ رحمۃ للعالمین، جلد 1، صفحہ 133

قرآن کتاب ہدایت ہے۔
مکمل ضابطۂ حیات ہے۔
قرآن ہماری دنیوی اور اُخروی کامیابی کا ضامن ہے۔
قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔
پیر محمد کرم شاہ صاحب ازہری کی معرکہ آراء تفسیر
خوبصورت ترجمہ ! بہترین تفسیر
ضیاء القرآن
فہمِ قرآن کا بہترین ذریعہ ہے
ترجمہ: جس کے ہر لفظ سے اعجازِ قرآن کا حُسن نظر آتا ہے
تفسیر: اہلِ دل کے لیے درد و سوز کا ارمغان
ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور